تاریخ القرآن

از

ڈاکٹر محمود رامیار

مترجم

سید انوار احمد بلگرامی

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ

Presented by Ziaraat.Com

تاریخِ قرآن

از

ڈاکٹر محمود رامیار

ترجمہ

سیّد انوار احمد بلگرامی

ناشر

مصباحُ القرآن ٹرسٹ

۱۰۔ گنگارام بلڈنگ، شاہراہ قائداعظم

پی۔او بکس ۲۲۳۶ لاہور

محمد علی بک ایجنسی (اسلامی ثقافتی مرکز)

امام بارگاہ امام الصادق G-9/2 اسلام آباد۔ 0321-5291921

امام بارگاہ یادگار حسین [illegible] راولپنڈی۔ 0321-5291922

[illegible] 0543-427045 0543-551611

Presented by Ziaraat.Com

نام کتاب ——— تاریخ قرآن

مؤلف ——— ڈاکٹر محمود رامیار

مترجم ——— سید انوار احمد بلگرامی

ناشر ——— مصباح القرآن ٹرسٹ

کتابت ——— محمد شاد اللہ

مطبع ——— معراج دین پرنٹرز

اشاعت دوم ——— جمادی الثانی ۱۴۲۱ھ

ہدیہ ——— ۲۰۰ روپے

ملنے کا پتہ:

قرآن سنٹر

۲۴۔ الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور

www.Ziaraat.com
Sabeel-e-Sakina

Presented by Ziaraat.Com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

قرآن ـــــ قرآن مجید، فرقان حمید، کتابِ خدا اور منبعِ ہدیٰ ہے۔

قرآن ـــــ بے مثل و بے نظیر کتاب، اس کی آیات دلنواز، مطالب بلند، مفاہیم مُدرس اور لہجہ دلنشین ہے۔

قرآن ـــــ کتابِ لاجواب، درسِ انقلاب اور رہنمائے شیخ و شاب ہے۔

قرآن ـــــ حرکت و عمل کا سبق، عدل و فضل کا مرقع، موت و حیات کی وضاحت اور جزا و سزا کا بیان ہے۔

قرآن ـــــ سابقہ کتُب آسمانی کا محافظ، دین کا نگہبان، آئین و قانون کی بنیاد اور حق و باطل کا معیار ہے۔

قرآن ـــــ فوز و فلاح کی نوید، عذاب و عقاب کی وعید، خیر و نیکی کا نقیب اور شر و برائی کا مخالف ہے۔

قرآن ـــــ خالق کا ترجمان، مخلوق کی داستان، انسانیت کا دبستان اور سرچشمہ دین و ایمان ہے۔

قرآن ـــــ خدائے رحمان کا کامل ترین پیغام، آخری الہامی کتاب اور نوعِ بشر کے لیے مکمل ضابطہ حیات ہے۔

حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ـــــ خطیبِ قرآن، تاجدارِ ختم نبوت، رحمۃ للعالمین اور تمام حاضر و غائب انسانوں کے نبی و پیشوا ہیں۔ آپ کا زندۂ جاوید معجزہ "قرآن عظیم" بنی نوعِ انسان کیلیے سعادتِ دارین کے حصول کا وسیلہ ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ خطیبِ قرآن کی سیرت اور قرآن کی جامعیت پر جتنا کچھ لکھا گیا اور آئندہ

Presented by Ziaraat.Com

لکھا جائے گا وہ کسی نبی اور کسی الہامی کتاب کے بارے میں نہ کسی نے لکھا اور نہ کوئی لکھے گا۔ لیکن قرآنِ کریم کہ جس نے تاریخِ انسانی کو بامقصد طریقہ سے بیان کرنے کی بنیاد رکھی ہے اس کی تاریخ یعنی آغازِ وحی سے موجودہ تحریر و ترتیب تک پہنچنے کے حالات پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ اگرچہ گذشتہ صدیوں میں بہت سے افاضل نے مختلف عنوانوں سے قرآن کے مختلف مراحل سے متعلق وقیع کتابیں تالیف فرمائی ہیں، تاہم خصوصی طور پر "تاریخِ قرآن" کے عنوان سے کچھ زیادہ کتابیں نہیں لکھی گئیں۔ اس سلسلے میں "تاریخِ قرآن" ابوعبداللہ محمد زنجانی (۱۳۶۰ھ) اور "تاریخِ قرآن" ڈاکٹر عبدالصبور شاہین (۱۳۸۶ھ) کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اس عنوان کے تحت تیسری کتاب "تاریخِ قرآن" ڈاکٹر محمود رامیار نے بزبانِ فارسی تالیف کی جو ۱۴۰۴ھ میں تہران سے شائع ہوئی تھی۔

چنانچہ ہند و پاکستان میں قرآنیات کے معروف ناشر مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور نے موضوع کی اہمیت اور اس کتاب کی جامعیت کے پیشِ نظر ممتاز اسکالر سید انوار احمد بلگرامی سے اس کا اردو ترجمہ کروایا اور اسے زیورِ طبع سے آراستہ کیا ہے۔

اس کتاب میں آغازِ وحی، نزولِ قرآن، حفظ و جمعِ قرآن در عہدِ نبوی، جمعِ قرآن در عہدِ خلفائے ثلاثہ، ترتیبِ آیات، ترتیبِ سورہ ہا، روشِ کتابت (رسم الخط)، اعراب و نقطہ گذاری اور موجودہ ترتیبِ قرآن ایسے موضوعات اور ان کے ذیلی عنوانات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور اس ضمن میں علماءِ اسلام اور مستشرقین کے بیانات مع حوالہ جات پیش کیے گئے ہیں۔ کتاب کے آخر میں ترتیبِ قرآن سے متعلق مفید جداول نیز عہد بہ عہد کتابتِ قرآن کے نمونے شامل ہیں۔

یہ کتاب قرآنیات اور اردو ادب میں یقیناً ایک اہم اضافہ ہے۔ ہمیں امید ہے کہ صاحبانِ علم و تحقیق ہماری اس پیش کش "تاریخِ قرآن" کا شایانِ شان استقبال کریں گے اور اس کی توسیعِ اشاعت میں حصہ لے کر سعادتِ دارین سے ہمکنار ہوں گے۔

اس کتاب کی طبعِ ثانی میں الحاج شیخ عمران علی منصدی نے اپنے مرحومین کے ایصالِ ثواب کے لیے خصوصی تعاون فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی توفیقات میں اضافہ فرمائے اور ان کے مرحومین کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

اراکین مصباح القرآن ٹرسٹ

Presented by Ziaraat.Com

پیش لفظ

باسمہ تعالیٰ عزّ شانہ

درگاہ حضرت عزّ اسمہٗ میں حمد و سپاس اور خاتم پیغمبران و اہلِ بیت علی الاتبار اور اصحاب گرامی پر درود بے پایاں کے بعد عرض ہے:

جو کتاب اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے وہ پہلی بار ۱۳۴۶ ھ ق میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے دوران خصوصاً پچھلے چند سالوں میں اس کے نئے ایڈیشن کے لیے اصرار بڑھتا رہا۔ شروع میں مصروفیات کچھ ایسی رہیں کہ اس کام کی طرف متوجہ نہیں ہو سکا اور بعد میں یہ کتاب جب درس میں داخل ہوئی تو طلباء کے اپنے نوٹس ان کی ضرورت کو پورا کرتے رہے۔ مگر دوسروں کی ضرورت کو نظر میں رکھتے ہوئے موقع نکال کر اس کتاب پر تجدید نظر کی گئی اور اب دوبارہ اس کا جدید ایڈیشن شائع کیا جا رہا ہے۔ خوش قسمتی سے شروع ہی سے اس کتاب کی بار بار تلخیص اور اس کے اقتباسات شائع ہوتے رہے ہیں۔ ابتداء میں اسی کو کافی خیال کیا گیا مگر ایسا نہیں ہو سکا اور نئے ایڈیشن کی بہر حال ضرورت باقی رہی۔ چنانچہ اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے دوبارہ شائع کی جا رہی ہے۔

اس دوران جو نئے نوٹس اور یادداشتیں تیار ہوئیں وہ یکجا کی گئیں اور ساتھ ساتھ پہلے ایڈیشن (تا صفحہ ۲۸۸ موجودہ کتاب) پر نظر ثانی بھی کی گئی، اگر یہ سلسلہ جاری رہتا تو اس کتاب کا حجم بہت بڑھ جاتا۔ چنانچہ اس کے آگے ہاتھ روک لیا گیا۔ امید ہے کہ آئندہ توفیقات الٰہی سے یہ کام بھی انجام پا جائے گا۔ ہر مصنف کو اپنی تصنیف کے بارے میں یہ خیال آتا رہتا ہے کہ فلاں جملے کو میں اس طرح لکھتا تو بہتر تھا یا فلاں نکتے کو اس طرح پیش کیا ہوتا۔ مجھے بھی اس نوع کے خیالات آتے رہے خصوصاً ۱۳۶۰ ھ ق میں یہ اوراق ناشر کے حوالے کرنے کے بعد بعض مزید قیمتی کتابیں میرے ہاتھوں میں آئیں۔ ان میں سے ایک علامہ سید مرتضیٰ عسکری کی کتاب "نقش ائمہ در احیاء دین" ہے اور توشیہیکو ایزوتسو کی کتاب "خدا و انسان در قرآن" ہے جس کا فارسی ترجمہ آقای احمد آرام نے کیا ہے۔ اسی کی دوسری کتاب "مفاہیم اخلاقی دینی قرآن" ہے جس کا فارسی ترجمہ آقای فریدون بدرہ ای نے کیا ہے۔ ان کتابوں پر بحث اور گفتگو کی جا سکتی تھی۔ لیکن کتاب کی ضخامت بڑھ جاتی اور ممکن ہے بحث کچھ اس نوعیت کی ہوتی کہ اصل مواد سے زیادہ فروعات کا ذکر آ جاتا۔ چنانچہ اس کو شامل نہیں کیا گیا بلکہ بعض بنیادی جداول جو سالہا سال کی محنت کا نتیجہ ہیں ان کی جگہ اس کتاب میں شامل کیے جا رہے ہیں۔ جو لوگ تحقیقات اور ریسرچ کے دلدادہ ہیں ان کے لیے یہ جداول یقیناً مفید ثابت ہوں گے۔

Presented by Ziaraat.Com

مگر تاریخِ قرآن کیوں لکھی جائے؟

آج کے زمانے میں اس نام نے اصطلاح کی صورت اختیار کر لی ہے اور مختلف کتابیں اس نام سے موجود ہیں۔ مگر جب یہ نام شروع میں منتخب کیا گیا تو بعض اصحاب کی طرف سے اس بارے میں سوال ہوا تھا۔ چنانچہ مختصراً اس کی وضاحت کی جاتی ہے۔ یہاں اس بحث کو نہیں چھیڑنا چاہتا کہ خدا کا کلام قدیم ہے، ازلی ہے اور خدا کی ذات کا جزو ہے اور اس کے وجود کی طرح سرمدی اور ازلی ہے یا مخلوق ہے اور پروردگار کا آفریدہ ہے۔ مگر یہ کہوں گا کہ جب یہ کلام مصدرِ جلال و عزت سے صادر ہوا اور پیغمبر کے پاک دل پر نقش ہوا اور آپ کے لبہائے مبارک سے دنیا کے لوگوں میں پھیلا تو ابنائے بشر نے اس کلام کے ساتھ کیا کیا؟ یہ وہ کلمات تھے جو ہوا میں تحلیل ہو گئے یا مومن افراد کے دلوں میں اترے اور انہوں نے پوری تاریخ میں ایک بلند و بالا نقش پیدا کیا۔ دنیا میں لوگوں نے ان نازل شدہ کلمات کے ساتھ زندگی بسر کی، ان سے وابستگی پیدا کی، ان کو اپنی جان سے زیادہ عزیز جاننے لگے اور اپنی زندگی کی بنیاد ان کلمات پر استوار کی؟ قدرتی بات ہے کہ جب یہ کلامِ الٰہی انسانوں کی زندگی کا سرمایہ بن جائے تو اس کی ایک سرگذشت اور تاریخ مرتب ہو جاتی ہے۔

مگر اس نام سے مراد یہ نہیں کہ قرآن مثال کے طور پر رسول اللہ کے بعد جمع ہوا ہو یا خدا کے علاوہ کسی کا کلام ہو۔ یہ اس کتاب کی تاریخ یا سرگذشت ہے جو لوحِ محفوظ سے ایک فرشتے کے توسط سے جس کا نام جبرئیل ہے پیغمبرِ خدا پر نازل ہوئی تھی۔ یہ اس کی سرگذشت ہے نازل ہونے کے لمحے سے یا اس کے پہلے سے آج تک جب وہ ہمارے ہاتھوں میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ مگر تاریخ کیا ہے؟ ماضی کا ذکر اور یہ بھی اس مقدس آسمانی کتاب کی تاریخ ہے۔ بیشک پہلے لوگوں نے اس کا دوسرا نام رکھا ہوا تھا اور زیادہ تر اس کو علومِ قرآن کے نام سے پکارتے تھے۔ مگر یہ عنوان اس قدر وسیع ہے کہ یہاں لاگو نہیں ہوتا۔ علومِ قرآن کے لیے تو سالہا سال کی محنت اور تحقیقات کا موقع چاہیے اور ایک نہیں بیسیوں جلد کتاب چاہیے، بہرحال تاریخِ قرآن، علومِ قرآن کا ایک حصہ ہے۔ اسلامی کتابوں میں پہلی بار یہ نام علامہ فقید مرحوم مجتہد زنجانی طاب ثراہ نے منتخب کیا تھا، اس کے بعد اس کتاب کے پہلے ایڈیشن میں یہ نام لوگوں تک پہنچا۔

دوسری بات یہ کہ ممکن ہے اس کتاب کے بعض مطالب کے سلسلے میں بعض دانشور اختلافِ نظر رکھتے ہوں۔ مصنف کی نگاہ میں جو بھی مسلّم ہے وہ تسلیمِ محض اور واقعات اور حقائق سے متعلق ہے۔ اگر مصنف کے نتائج بعض دوسرے نظریات سے مختلف ہوں تو یہ ان مواد اور مطالب کی تحقیقات کے نتیجے میں ہے جن تک مصنف کی رسائی تھی۔ اگر کوئی اختلاف ہے تو بحث اور گفتگو کا در کھلا ہے اور محقق کا کام بھی یہی ہے۔ ان چیزوں میں جہاں واضح احکام نہیں اور قطعی اور حتمی امر نہیں ملتے تو وہاں بحث اور استدلال کا موقع ہے۔ اصلی اطمینان کی بات یہ ہے وہ تعصب اور خامی سے پاک ہو، خود غرضی اور خود بینی سے دور ہو۔ ہر وہ بات جو شرعی اور عقلی مقدمات اور بنیاد کے مطابق ثابت ہو وہی مطاع اور قابلِ اتباع ہوگی۔

یہاں پھر بنیاد کا مسئلہ بھی سامنے آئے گا۔ اس بات کی بہت زیادہ کوشش کی گئی ہے کہ اس موجودہ کام میں محکم اسناد اور دستاویزات پر تکیہ کیا جائے اور جو سند قدیمی ہو وہ اپنائی جائے۔ چنانچہ ان محکم اور استوار اسناد سے استفادہ میں کوئی کوتاہی نہیں کی گئی، خواہ وہ برادرانِ اہلِ تسنن سے متعلق ہوں یا اہلِ تشیع کے علمائے اعلام سے مربوط ہوں۔ بیشک

Presented by Ziaraat.Com

جیسا کہ کتاب سے واضح ہے اول قرآن کو پیش نظر رکھا گیا ہے پھر سنت و تاریخ سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد عقل و روایت سامنے ہے۔ سعی یہ رہی ہے کہ حتی الامکان مروجہ غیر جانبداری سے کام لیتے ہوئے قدیم ترین اور محکم ترین اسناد و دستاویزی شہادت کو پیش کیا جائے اور دستیاب اسناد کسوٹی پر پرکھی جائیں۔

اس کی کوشش کی گئی ہے کہ منابع و ماخذ قابل اعتماد اور دست اول اور بلاواسطہ ہوں تاکہ جو نتائج اخذ کیے جائیں وہ قابل اطمینان و وثوق ہوں۔ بہر صورت کوئی بات بغیر سند اور ماخذ کے پیش نہیں کی گئی ہے۔ اگر کہیں کبھار کسی کتاب سے یا اس کے منبع کی ندرت کی بنا پر اس سے کچھ نقل کیا گیا ہے تو ایسی کتاب کا اعتماد کی وجہ سے اور تحقیقی منابع تک رسائی نہ ہو سکنے کی وجہ سے ایسا بہت کم ہوا ہے اس لیے امید ہے کہ اس طریقے سے کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا ہوگا۔

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ بعض مواقع پر بعض مختلف اقوال کو نقل کرنے کو کافی سمجھا گیا ہے اور مخصوص نتیجہ نہیں نکالا گیا اور بحث بغیر کسی واضح نتیجے کے چھوڑ دی گئی ہے۔ مثال کے طور پر رسول اللہ کی ولادت یا آپ کی بعثت کے سلسلے میں مختلف اقوال نقل کیے گئے ہیں، ممکن ہے پڑھنے والے کے ذہن میں ان سے مختلف نظریے وجود میں آئیں۔ مگر ایسا نہیں کیونکہ رسول اللہ کی زندگی اور آپ کی سیرت تاریخ عالم کا ایک واضح اور روشن ترین باب ہے شاید ہی کوئی سوانح عمری ایسی ہوگی جو موجودہ دور کی ہو جو اس قدر محنت سے مرتب کی گئی ہو۔ اس سلسلے میں اسلام کے مختلف مکاتب فکر ان معتبر اسناد کی بنا پر جو ان کے پاس موجود ہیں خاص نتیجے پر پہنچ چکے ہیں۔ مثلاً رسول اللہ کا روز تولد یا روز بعثت انہوں نے متعین کیا ہوا ہے اور اس دن کو بہت عقیدت و احترام سے مناتے بھی ہیں، ان کی نگاہ میں یہ دن قطعی اور طے شدہ ہے۔ ہمارے پیغمبر گرامی کے بارے میں تاریخی واقعات قطعی اور روشن ہیں، اگر ایسے ایام (حضرت عیسیٰؑ کے یوم ولادت کی طرح) بالکل فرضی بھی ہوتے تو کسی زیادہ بحث کی ضرورت نہ تھی۔ بس یہ کافی تھا کہ ایک دن کسی واقعے سے متعلق معین کر کے اس کی یاد احترام سے منائی جاتی، خواہ وہ واقعہ حقیقتاً اسی دن پیش آیا ہو یا کچھ دن آگے پیچھے ہوا ہو۔ یہ چند دنوں کا آگے پیچھے ہونا اس واقعے کی اہمیت پر اثر انداز نہیں ہوتا، اہمیت اس کی یاد منانے اور اس کو زندہ رکھنے کی ہے۔ اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ رسول اللہ کا یوم ولادت مثلاً ۱۲ ربیع الاول یا ۱۷ ربیع الاول کو تھا، اہمیت تو عظیم ہستی کے تولد کی یاد منانے اور اس عظیم رسالت اور روشن ہدایت کا ہر سو ہر جگہ ذکر کرنے کی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہم بارہ ربیع الاول سے لے کر سترہ ربیع الاول تک مسلسل آپؐ کی ولادت کی یاد منایا کریں اور اس طرح آپؐ کے اخلاق حسنہ کے اتباع کی سعی کریں۔ اس ضمن میں مختلف اقوال جو نقل کیے گئے ہیں وہ صرف معلومات مہیا کرنے کے لیے ہیں، کسی کے عقیدے پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔

یہاں کچھ لفظ "حنیف" اور "حنیفیت" کے بارے میں بھی ذکر ہو جائے، کاش کہ کتاب کے متن میں اس کی مزید تفصیل بیان ہو سکتی۔ لفظ "حنیف" کے بارے میں تصریح ہے کہ یہودی اپنی سریانی اصطلاح کے مطابق اس لفظ سے عرب کے مشرک قبائل مراد لیتے تھے، عربی لغت میں "حنیف" کے معنی "پاک دین" اور "دین حق کی طرف مائل" تھے۔ یہودی ہر جگہ پیغمبر اکرمؐ سے بحث و تکرار کرتے رہتے، ان کی یہ بحث حضرت ابراہیمؑ اور ان کے حنیف ہونے پر زور پکڑ گئی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اگر آپؐ کا دعویٰ یہ ہے کہ آپؐ حضرت ابراہیمؑ کے پیرو ہیں تو وہ تو ہم میں سے ہیں اور وہ وہی ہیں جیسا کہ ہم کہا کرتے ہیں،

Presented by Ziaraat.Com

اس صورت میں آپ نے ان کا قبلہ کیوں ترک کیا اور انکی سنت کیوں چھوڑ بیٹھے ہیں۔ ایک دن پیغمبر اکرمؐ مدینے کے بیت المدارس (تورات کی تدریس کی جگہ) گئے اور وہاں یہودیوں کو دعوت اسلام دی۔ ایک یہودی نے سوال کیا: آپ خود کس دین پر ہیں؟ فرمایا: ملت ابراہیمؑ اور ان کے دین پر ہوں؟ وہ کہنے لگے کہ ابراہیمؑ تو یہودی تھے! فرمایا: تورات سے کراؤ تاکہ وہ ہمارے تمہارے درمیان فیصلہ کر دے، مگر انہوں نے یہ بات قبول نہیں کی اور تورات کو حکم بنانے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔

یہودی اپنے آپ کو حضرت یعقوبؑ (اسرائیل) کی نسل سے کہتے ہیں۔ حضرت یعقوبؑ کے ۱۲ فرزندوں سے یہود کے ۱۲ قبیلے اپنا سلسلۂ نسب ملاتے ہیں حضرت ابراہیمؑ کو یعنی حضرت یعقوبؑ کے دادا کو اپنی کتاب میں بزرگ باپ اور بعد میں پدر جماعت FATHER OF TROOP لکھنے لگے مگر کوشش یہ تھی کہ ان کو یعقوبؑ (اسرائیل) کا پیرو شمار کیا جائے! ان کی نظر میں ابراہیمؑ پیغمبر اور توحید پرستی کے بانی نہیں تھے، مزید یہ کہ ان کی حنیف ہونے کی صفت کو چھپاتے تھے۔

قرآن نے صاف صاف اعلان کیا حنیف وہ ہے جو نہ تو یہودی ہے اور نہ عیسائی بلکہ خدائے واحد کی عبادت میں مخلص اور مستحکم ہے۔ یہ مفہوم یہودیوں سے قطعی مختلف تھا (جو عرب مشرکوں کو حنیف پکارتے تھے)۔ قرآن بار بار اصرار کرتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ حنیف تھے اور مشرکین میں سے قطعی نہیں تھے۔ یہودیوں نے جو 'حنیف' کے لفظ کو شرک کے ساتھ ملا دیا تھا اس سے الگ کر کے قرآن نے اس کے اصل معنی یعنی گناہ سے دوری اور پاکیزگی کی خواہش کو دوبارہ اجاگر کیا۔ یہ نکتہ بطور خاص واضح کیا کہ حضرت ابراہیمؑ مشرک نہیں تھے (شرک، کو حضرت ابراہیمؑ سے دور ہٹایا کہ یہود حنیف کے لفظ کو مشرک کے معنی میں عربوں کے لیے استعمال نہ کر سکیں۔

اس طرح حضرت ابراہیمؑ کا پیغمبروں کے ایک سلسلے میں سرفہرست اور توحید پرستی کے بانی کی حیثیت سے اعلان ہوا آپ ہی تھے جنہوں نے کعبہ تعمیر کیا اور توحید پرستی کی دعوتِ عام دی۔ ان کی اور ان کے دین کی پیروی نہ یہودیت ہے اور نہ عیسائیت۔ آپ کا قبلہ شروع سے کعبہ اور آپ کا طریقہ توحید پرستی تھا۔

ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ صرف حضرت اسماعیلؑ کی ذریت کو کہ جس نسل سے پیغمبر گرامیؐ ہیں، آل ابراہیمؑ کہا گیا ہے، جس کو کتاب و حکمت کے نازل ہونے کی فضیلت کا افتخار حاصل ہوا ہے۔ یہ بات ذہن میں رہے یہاں تک کہ کتاب کے متن میں اس کی تفصیل بیان ہو۔

اس کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ حتی الامکان کتاب کا بیان سادہ ہو تاکہ وہ بھی جو اسلام کے مبادی سے کم واقفیت رکھتے ہیں، اس کو بآسانی سمجھ سکیں۔ چنانچہ جہاں تک ممکن ہو سکا علمی بحث کو اختصار سے پیش کیا گیا ہے اور سادہ طریقۂ بیان اختیار کیا گیا ہے۔ بنیادی طور سے تتبع پر تکیہ کیا گیا ہے اور جہاں ضرورت ہوئی ہے تحقیق بھی کی گئی ہے۔ ہر نکتہ جہاں تک ممکن ہوا تتبع کے طریق سے ذکر ہوا، منابع تلاش کیے گئے اور کہیں کہیں تحقیق ہوئی یا اس کو مناسب جگہ پر بیان کیا گیا ہے۔

کتاب کے متن اور طبع شدہ متن سے ہم آہنگ شمارہ دراصل قرآن مجید کی سورتوں اور آیات کے شمار ہیں، اول سورتوں کا شمار ہے اور اس کے بعد آیت یا آیات کا شمار دیا گیا ہے۔ آیات کا شمار عبدالرحمن سلمی کوفی کی قرائت کے

Presented by Ziaraat.Com

مطابق تحریر کیا گیا ہے۔ جہاں کسی سورۃ کا نام نہیں دیا گیا بلکہ صرف شمارِ سورۃ پر اکتفا کیا گیا وہ اس لیے کہ بعض سورتوں کے مختلف نام ہیں اور ذہن میں ان میں سے ایک نام نہیں آتا، چنانچہ آسانی کے لیے سورتوں کے شمار دیئے گئے ہیں۔

متن یا حاشیے میں بعض اوقات کوئی نام فارسی، عربی یا انگریزی میں مختصر طور پر لکھا گیا ہے، اس کی تفصیل کتاب کے ضمیمے "کتاب نامہ" میں دیکھی جا سکتی ہے۔

اب سپاس، تشکر اور ستائش ہی رہ گئی کہ جو انسانوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کا شکر کس طرح ادا کر سکتا ہے۔ یہاں بے اختیار علامہ فقید ماسوف علیہ مرحوم سید محمد فرزان طاب ثراہ یاد آ گئے، خداوند عالم ان کے درجات بلند فرمائے کہ بڑی خوبیوں کے مالک اور گوہرِ ناشناختہ تھے۔ پہلی بار جو یہ کتاب لکھی گئی تو گھنٹوں ان کو پڑھ پڑھ کر سنائی گئی، انہوں نے بہت زیادہ حوصلہ افزائی کی اور بجز تشویق کے دوسرا جملہ ان سے نہیں سنا گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب یہ کتاب جمع و تیار ہوئی تو ایک عرصہ گذر گیا مگر شائع ہونے کا مرحلہ پیش نہیں آیا اور میں اس زمانے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ ایک دن علامہ نے مجھ سے دریافت کیا کہ تمہاری کتاب کی طباعت کہاں تک پہنچی؟ میں نے عرض کیا کہ بات یہ ہے کہ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا۔ سوچتا ہوں کہ اس کتاب کا فائدہ کیا ہے۔ جو لوگ اس علم سے واقف ہیں ان کو ان صفحات کی کیا حاجت اور جو اس میدان کے لوگ نہیں ان کو اس کتاب سے کیا واسطہ؟ انہوں نے میری طرف بغور دیکھا اور فرمایا! یقین کرو کہ اس قسم کا کام میرا حاصلِ زندگی ہوتا تو میں اپنی زندگی سے مطمئن ہوتا! جو لوگ علامہ فرزان سے واقف ہیں وہ اس کی تصدیق کریں گے کہ انہوں نے یہ بہت بڑی بات کہی تھی۔ بیشک یہ بات ایک متذبذب آدمی کی دلدہی کے لیے کہی گئی تھی مگر تہہ دل سے بھی کہی گئی تھی۔ مرحوم ایسا چشمۂ فیض تھے جو ہر وقت جاری تھا اور یہ ان کی عالی ظرفی اور شفقت و محبت کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔ خدا ان کو غریقِ رحمت کرے، مجھے افسوس ہی رہے گا کہ لوگ ان کو صحیح طرح پہچان نہیں سکے۔

اُس زمانے میں مرحوم فرزان حوصلہ افزائی فرماتے تھے تو خوش قسمتی سے آج بھی ہمارے بہی خواہ اور یاور موجود ہیں۔ استاد دانشمند آقای ڈاکٹر عباس زریاب خوئی نے نوازش فرمائی اور کتاب کا پہلا آدھا حصہ ملاحظہ کیا اور کچھ الفاظ کی اصلاح فرمائی، کتاب کے آخر میں ضمیمے بھی ان کے کہنے سے شامل کیے گئے۔ ان کی اس محبت اور مہربانی کے ہم بہت مشکور ہیں۔ اپنے پرانے دوست دانشمند آقای ڈاکٹر حسن مؤیدی کے بھی ہم تہہ دل سے مشکور ہیں کہ انہوں نے از اول تا آخر اس کتاب کو ملاحظہ کیا اور فہرستِ موضوعات کی تیاری میں بھی رہنمائی فرمائی۔

غرض کہ سب ہی اشخاص کا بے انتہا شکر گزار ہوں اور ان کے لیے حد درجہ احترام اور سپاس گزاری ہے کہ ان کی بے لوث محبت، خلوص، اعتماد اور بھروسہ ہی وہ زادِ راہ تھا جو اس راہرو کو منزل تک لے آیا۔

شاید کہ اس موقع پر بھی عزت و سلامتی اور شرف و اعتماد کے راہرو آن بزرگوار کے دل سے نکلی ہوئی دعا میرے شاملِ حال ہو اور خداوند تعالیٰ کی عنایت و مہربانی کا سبب بنے جس کی برکت سے یہ مرحلہ بھی بہ آسانی طے ہو جائے۔ بمنہ وکرمہ۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ ۔ آل عمران ۸

شوال ۱۴۰۲ھ

محمود رامیار

Presented by Ziaraat.Com

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ نمبر	مضمون	صفحہ نمبر
آئیے قرآن کے حضور دست بستہ چلیے	۱۴	دور فترت نزول	۷۲
۲۔ قرآن کے نام	۲۵	فترت وحی (وحی کے درمیان وقفہ)	۷۵
[illegible]	″	۴۔ وحی کی کیفیت	۸۱
[illegible]	۲۸	وحی لغت میں	″
[illegible]	″	وحی ماضی میں	۸۳
فرقان	۳۶	قرآن میں وحی	۸۹
کتاب	۳۹	وحی [illegible] پر قرآن کی گواہی	۹۳
ذکر	۴۱	سنت و حدیث	۹۶
[illegible]	۴۲	حدیث قدسی	۹۸
قرآن کے دوسرے نام	″	وحی کی خصوصیات	۹۹
۳۔ آغاز وحی	۴۵	۱۔ قرآن کی زبانی	۱۰۰
[illegible]	″	۲۔ قول پیغمبر اکرمؐ	۱۰۱
غیب	۴۹	۳۔ مشاہدہ کرنے والے	۱۰۳
رؤیائے صادقہ (سچے خواب)	۵۵	وحی کن موقعوں پر نازل ہوئی؟	۱۰۶
پیغمبر اکرمؐ [illegible]	۵۹	وحی کے حالات	۱۰۸
[illegible]	۶۰	وحی کے مراحل	۱۱۱
[illegible]	[illegible]	صادق امین	″
جبرئیل [illegible]	[illegible]	[illegible] علم	[illegible]
[illegible]	[illegible]	۵۔ مدارِ وحی	۱۲۷

Presented by Ziaraat.Com

مضمون	صفحہ نمبر
وحی کیا ہے؟	۱۲۷
الہام اور وحی	۱۲۷
افسانۂ غرانیق	۱۴۰
قرآن سے	۱۴۵
احادیث سے	۱۴۸
عقل کی رو سے	۱۵۱
تاریخ کی رو سے	۱۵۳
پیغمبر اور فراموشی	۱۵۴
رسول اور نبی	۱۶۲
۶۔ نزولِ قرآن	۱۶۹
نزولِ قرآن کے معنی	"
نزول کے مراحل	۱۷۱
لیلۃ القدر	۱۷۹
کلماتِ قرآن کس کے ہیں؟	"
اس نزول کی مدت	۱۸۲
نزولِ تدریجی کی دلیل	۱۸۳
نزولِ وحی کی کیفیت	۱۸۵
اس نزول کا راز	۱۸۶
نزول کے بعد حکم	۱۹۲
حکم کے بعد نزول	۱۹۴
۷۔ رسول اللہ کے زمانے میں تالیفِ قرآن	
تالیف۔ سینوں میں محفوظ کیا جانا	۱۹۵
قرآن کی جمع آوری	۱۹۵
تاثیرِ قرآن	۱۹۷
پیغمبر اکرم کی نگرانی	۲۰۴
عربوں کا حافظہ	۲۱۲
صحابہ کی سعی اور کوشش	۲۱۸
قرآن کے حافظ	۲۲۶
ب۔ قرآن لکھا جانا	۲۳۴
کاتبانِ وحی	۲۳۷
مکے کے زمانے کے کاتب	۲۳۸
مدینے کے دور کے کاتب	۲۳۹
کس چیز پر لکھا جاتا تھا؟	۲۴۸
تالیفِ قرآن	۲۵۱
خلاصہ:۔	۲۶۴
۸۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں جمعِ قرآن	۲۶۵
پہلا جامعِ قرآن	"
روئدادِ یمامہ	۲۶۷
حضرت عمر کی تجویز	۲۷۰
زید کام شروع کرتا ہے	۲۷۷
سورۂ توبہ کی آخری دو آیات	۲۷۸
زید کے معاونین	۲۸۰
زید کا انتخاب کیوں ہوا؟	۲۸۲
قرآن کا یہ نسخہ کس چیز پر لکھا گیا؟	۲۸۶
قرآن کی اس جمع آوری کی تاریخ	۲۸۷

www.ziaraat.com
Sabeel-e-Sakina
Presented by Ziaraat.Com

مضمون	صفحہ نمبر
یہ نسخہ کیا ہوا؟	۲۸۸
زید کے کام کی نوعیت	۲۸۹
حضرت ابو بکر کا مقصد	۲۹۱
۹۔ حضرت ابو بکرؓ کے زمانے کے مصاحف	۲۹۵
ذاتی مصاحف	״
۱۔ مصحف فاطمہؑ	۲۹۸
۲۔ سالمؓ	۲۹۹
۳۔ ابو زیدؓ	۳۰۰
۴۔ سعدؓ بن عبید	״
۵۔ معاذؓ بن جبل	״
۶۔ اُم ورقہؓ	۳۰۱
۷۔ اُبی بن کعبؓ	״
ان کے مصحف کی خصوصیات	۳۰۲
الف۔ فہرست ابن ندیم	۳۰۴
ب۔ اتقان سیوطی	۳۰۵
ج۔ مقدمتان	۳۰۷
اختلاف قرائت	״
دو اضافی سورتیں	۳۰۸
۸۔ ابن مسعود	۳۱۱
ان کے مصحف کی خصوصیات	۳۱۴
مصحف ابن مسعود کی ترتیب	״
۱۔ ابن الندیم	״
۲۔ الاتقان	۳۱۶

مضمون	صفحہ نمبر
اختلاف قرائت	۳۱۷
الف۔ لہجے کا اختلاف	״
ب۔ مترادف کا استعمال	۳۱۸
ج۔ تفسیر کا اضافہ	״
۹۔ ابو الدرداء	۳۲۰
۱۰۔ مقداد بن اسود	۳۲۱
۱۱۔ علی بن ابی طالبؑ	״
مصحف علیؑ	۳۲۴
اس مصحف کے نسخے	۳۲۷
۱۲۔ ابو موسیٰ اشعری	۳۳۳
ابو موسیٰ کا مصحف	۳۳۴
۱۳۔ مصحف حفصہؓ	۳۳۶
۱۴۔ زید بن ثابت	۳۳۷
۱۵۔ مجمع بن جاریہ	۳۳۹
۱۶۔ عائشہؓ	״
۱۷۔ عقبہ بن عامر	۳۴۰
۱۸۔ اُم سلمہ	۳۴۱
۱۹۔ عبداللہ بن عمرو	״
۲۰۔ انس بن مالک	۳۴۲
۱۰۔ حضرت عمرؓ کا زمانہ	۳۴۵
حضرت ابو بکرؓ کے کام کی تکمیل	״
حضرت عمرؓ اور جمع قرآن	۳۴۸
قرآن کے کام میں اہتمام	۳۵۰

www.ziaraat.com Sabeel-e-Sakina

Presented by Ziaraat.Com

مضمون	صفحہ نمبر
مصحف عمرؓ	۳۵۴
۱۱ ۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں مصاحف کا ایک کیا جانا	۳۵۵
اختلافات	"
حذیفہ کون تھے ؟	۳۵۹
حذیفہ کی آذربائیجان سے واپسی	۳۶۰
مجلس کی تشکیل	۳۶۳
مجلس کا طریقہ کار	۳۶۶
کوئی اختلاف سامنے نہیں آیا	۳۷۱
سورۂ انفال اور سورۂ توبہ کا ایک ہونا	۳۷۲
مصاحف کا جلایا جانا	۳۷۴
اس جمع آوری کا وقت	۳۷۵
ابن مسعود کا اعتراض	۳۷۸
حضرت علی ابن ابی طالب کا نظریہ	۳۸۵
خاموشی اور تجاہل	۳۸۷
ان کے کام کی حیثیت اور قدر و قیمت	۳۸۸
کتنے نسخے لکھے گئے ؟	۳۹۴
صحابہ کا بھیجا جانا	۳۹۷
مصحفِ عثمان کا رواج	۴۰۲
مصاحف کے لکھنے والے	۴۰۵
خلاصہ	۴۰۷
دوسرے مصاحف	۴۰۸
۱ ۔ مصحف ابن عباس	"

مضمون	صفحہ نمبر
۲ ۔ عبداللہ بن زبیر	۴۱۰
۳ ۔ عبید بن عمیر	۴۱۱
۴ ۔ اسود بن یزید	"
۵ ۔ علقمہ بن قیس	"
۶ ۔ حطان	"
۷ ۔ سعید بن جبیر (م ۹۵ھ)	۴۱۲
۸ ۔ طلحہ بن مصرف	"
۹ ۔ عکرمہ (م ۱۰۵ھ)	"
۱۰ ۔ مجاہد	۴۱۳
۱۱ ۔ عطاء بن ابی رباح	"
۱۲ ۔ ربیع بن خثیم	"
۱۳ ۔ اعمش	۴۱۴
۱۴ ۔ مصحف امام جعفر صادقؑ	"
۱۲ ۔ قرآن کا طرز تحریر	۴۱۷
عربی طرزہائے تحریر	"
خطِ مسند	۴۲۰
خطِ نبطی	۴۲۲
خطِ کوفی	"
خطِ نسخ	۴۲۳
مکے اور مدینے کا رسم الخط	۴۲۴
پیغمبرؐ کا اہتمام	۴۲۵
پیغمبرؐ امی	۴۲۸
پیغمبرؐ پڑھنا نہیں جانتے تھے	۴۳۳

Presented by Ziaraat.Com

مضمون	صفحہ نمبر
پیغمبر پڑھا جاتے تھے	۴۲۵
دانشوروں کا نقطۂ نظر	۴۳۹
قرآن کا رسم الخط	۴۴۰
رسم عثمانی کی خصوصیات	۴۴۳
موجودہ دور میں خط قرآن	۴۴۴
چند کتابیں	۴۴۵
۱۳۔ قرآن میں نقطے اور حرکات	۴۴۷
قرآن پڑھنے میں مشکلات	″
اعجام اور نقطہ گذاری	۴۴۹
پہلی نقطہ گذاری	۴۵۰
ابوالاسود دوئلی	۴۵۱
یحییٰ بن یعمر	۴۵۳
نصر بن عاصم لیثی	۴۵۴
ایرانیوں کا حصہ	۴۵۵
حرکات کے تعین کی تاریخ	۴۵۶
مصحف عثمانی کا تلفظی رواج	۴۵۷
قرآن کے دوسرے رموز	۴۵۹
چند دانشوروں کی رائے	۴۶۱
اعراب کی اہمیت	۴۶۲
۱۴۔ آیتیں اور سورتیں	۴۶۵
۱۔ آیتیں	″
آیت کی پہچان	۴۶۶
بسملہ	۴۶۸
پہلی آیت	۴۷۲
آخری آیت	۴۷۵
چند موضوعات پر پہلی آیت	۴۷۹
۲۔ دفاع اور جہاد کے بارے میں	۴۸۱
آیات کا شمار	۴۸۲
الفاظ اور حروف کی تعداد	۴۸۵
آیات کی ترتیب	۴۸۶
۲۔ سورتیں	۴۸۹
سورہ کے معنی	″
سورتوں کے تعین کی حکمت	۴۹۱
سورتوں کے نام اور ان کا شمار	″
پہلی اور آخری سورة	۴۹۸
سورتوں کی قسمیں	۵۰۰
سورتوں کی ترتیب	۵۰۳
۱۵۔ مکی اور مدنی آیتیں اور سورتیں	۵۰۷
مکی اور مدنی کے معنی	۵۰۷
اس شناخت کا فائدہ	۵۰۸
مکی اور مدنی کی پہچان کا طریقہ	۵۰۹
مکی اور مدنی سورتوں کی خصوصیات	″
مکی اور مدنی سورتوں کی ترتیب اور ان میں اختلاف	۵۱۳
مکی اور مدنی سورتوں کی قسمیں	۵۱۵
دوسری تقسیم	۵۱۷

www.ziaraat.com
sakina

Presented by Ziaraat.Com

مضمون	صفحہ نمبر
مستشرقین کے کام پر ایک نظر	۵۲۱
۱۶۔ سببِ نزول	۵۲۵
سببِ نزول کے معنی	؍
سببِ نزول جاننے کا فائدہ	۵۲۶
سببِ نزول کی پہچان کے طریقے	۵۳۲
الفاظ اور سبب کے درمیان عموم و خصوص	۵۳۸
۱۷۔ قرآن کا ترجمہ	۵۴۱
موضوع کی اہمیت	؍
ترجمہ کے معنی	۵۴۲
قرآن کا ترجمہ جائز ہے یا نہیں	۵۴۴
ترجمہ کی شرائط	۵۴۴
ترجمہ قرآن کے فائدے	[illegible]
دانشوروں کا نقطۂ نظر	؍
قرآن کے سرسری ترجمے	[illegible]
ضمیمہ جات	۵۵۳
سورتوں کے نزول کی ترتیب زمانی	[illegible]
جدول کے کالموں کی تفصیل	[illegible]
صدرِ اسلام کے واقعات ایک نظر میں	۵۶۰
قبل الہجرت	۵۶۱
بعد از ہجرت	۵۶۵

Presented by Ziaraat.Com

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ

لِّلْمُتَّقِيْنَ۔ (۳، آلِ عمران : ۱۳۸)

یہ لوگوں کے لیے ایک بیان ہے اور پرہیزگاروں کے

لیے ہدایت و نصیحت ہے۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ

رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ

اِلَّا خَسَارًا (۱۷، اسراء : ۸۲)

اور قرآن میں سے ہم وہ چیز نازل کرتے ہیں جو مومنین

کے لیے شفا اور رحمت ہے اور ظالموں کے لیے نہیں

بڑھاتا، مگر نقصان۔

www.ziaraat.com
Sabeel-e-Sakina

Presented by Ziaraat.Com

(۱)

قرآن کے حضور دست بستہ

چند جملے

یہ قرآن ہے اور یقیناً کسی خدا کا کلام ہے۔ یہ وہ معجزہ ہے جو شروع سے آخر تک "بسم اللہ" کی "ب" سے "والناس" کی "س" تک حرف بہ حرف، کلمہ بہ کلمہ خدا کے فرشتے کے ذریعے نبی اکرم پر نازل ہوا، آپ کے پاکیزہ دل پر نقش ہوا اور آپ کے مبارک لبوں سے جاری ہوا۔ آج چودہ صدیاں گزرنے کے بعد ہمارے پاس یہ اسی طرح موجود ہے جس طرح یہ آپ کے اصحاب گرامی کو ملا تھا۔ اس کا تواتر قطعی ہے اور اس کی تلاوت عبادت ہے۔

"اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِىْ لِلَّتِىْ هِىَ اَقْوَمُ۔ كِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ۔ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ۔ كِتَابٌ اُحْكِمَتْ اٰيَاتُهُ۔ لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ۔ وَاِنَّهُ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ۔ هٰذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ۔ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ۔"

یہ قرآن ہے جو انسان کی سیدھے راستے پر رہبری کرتا ہے (۱۷ : ۹) وہ کتاب ہے جو انسان کو تاریکی سے نکال کر نور اور روشنی میں لاتی ہے، حکم خدا سے خوب و بہتر راستے پر رہنمائی کرتی ہے (۱۴ : ۱) لوگوں کے لیے بیان ہے اور پرہیزگاروں کے لیے ہدایت و نصیحت ہے (۳ : ۱۳۸) اس کی آیات محکم و استوار ہیں (۱۱ : ۱) باطل اس میں راہ نہیں پاتا (۴۱ : ۴۲) یہ حق اور یقین ہے (۶۹ : ۵۱) اہل یقین کے لیے بصیرت، ہدایت اور رحمت ہے۔ (۴۵ : ۲۰) اس کی نظیر و مثل کبھی نہیں لا سکیں گے (۱۷ : ۸۸)۔

حق ہے کہ خدا کی طرف سے نور اور روشن کتاب آئی۔ جو بھی اس کی رضا کے لیے سلامتی کے راستے پر چلتا ہے، اس کو خدا اس کتاب کے ذریعے ہدایت کرتا ہے۔ اس کو تاریکی سے اپنے نور کی طرف لے جاتا ہے اور سیدھے راستے پر رہنمائی کرتا ہے۔ (۵ : ۱۵، ۱۶) اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ یہ پرہیزگاروں کی رہنما ہے (۲ : ۲) نیکوں کو بشارت دیتی ہے اور بدوں کو ڈراتی ہے۔ (۴۱ : ۴)"

یہ تھی شہادت خود کلام کرنے والے کی طرف سے۔ اب ہم حامل وحی سے سنیں اور پیغمبر کی شہادت پر نظر کریں:

"خدا کی کتاب آسمان سے زمین تک ایک رسی ہے[ل] انسان کا خدا سے رابطہ اسی سے وابستہ ہے۔"

"قرآن گمراہی سے ہدایت ہے، نابینائی سے شفا اور بینائی عطا کرتا ہے، لغزشوں سے بچاتا ہے، تاریکی میں نور ہے، مسائل و مشکلات میں روشنی عطا کرتا ہے، ہلاکت سے بچاتا ہے، گمراہی میں صحیح سمت رہنمائی کرتا ہے، ہر فتنے کی نشاندہی کرتا ہے، انسان کو دنیا سے آخرت کی طرف لے جاتا ہے، اس میں تمہارے دین کا کمال پوشیدہ ہے۔ جو بھی قرآن سے منہ موڑتا ہے وہ

ل مسلم، فضائل الصحابہ ۔ ۳۷ ۔ ترمذی، مناقب ۳۱ ۔ الدارمی، فضائل القرآن ۔ ۱ ۔ مسند احمد بن حنبل [illegible] ۵ : ۱۸۲ ۔

Presented by Ziaraat.Com

آگ کا رخ کرتا ہے۔ قرآن کا ظاہر خوبصورت اور اس کا باطن بہت عمیق ہے۔"

"قرآن کی عمر اور انتہا ہے۔ ہر عمر اور انتہا کے بعد ایک دوسری عمر اور انتہا ہے۔ عجائبات قرآن بے شمار ہیں۔ اس کی تازگی کبھی ماند نہیں پڑتی۔[12]

اور فرمایا:

"قرآن کی مثال سورج اور چاند جیسی ہے۔ اور یہ انہی کی طرح ہمیشہ رواں دواں ہے۔"

"قرآن خدا کی کتاب ہے، وہ کتاب جس میں تمہارے گذرے ہوئے لوگوں کی اور آنے والوں کی خبریں ہیں، تمہارے مسائل کا حل موجود ہے۔ یہ حق کو باطل سے جدا کرتی ہے۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس میں خرافات اور تمسخر کا گذر نہیں۔ جو بھی اس کے علاوہ کہیں ہدایت تلاش کرے گا گمراہ ہوگا۔ یہ کتاب حکمت اور صراط مستقیم ہے۔ انسان کی غرض اور اس کی ہوس اس میں تبدیلی نہیں لا سکتی۔ وقت کے گذرنے سے یہ پرانا نہیں ہوتا۔ یہ روشن چراغ ہے جس سے ہدایت اور علم حاصل ہوتا ہے۔ یہ اچھائیوں کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اس میں غور و تفکر کرنے سے دانشور کبھی سیر نہیں ہوتا۔ جو بھی اس پر عمل کرتا ہے اس کو جزا ملتی ہے۔ جو کسی کو قرآن سکھاتا ہے وہ اس کو سیدھے راستے کی ہدایت کرتا ہے۔[13]

"یہ قرآن پروردگار کا مہمان ہے۔ جو بھی ممکن ہو سکے اس سے سیکھ لو۔ یہ قرآن خدا کی رسی، نور مبین، فائدہ مند شفا ہے۔ جو اس کو گلے لگاتا ہے یہ اس کا نگہبان ہے۔ جو اس کے پیرو ہیں یہ ان کی نجات ہے۔[14]

سب سے مشہور شہادت وہ ہے جو فریقین نے محکم سند سے روایت کی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

..... قریب ہے کہ حق کا پیام آ جائے اور میں اس کو لبیک کہوں۔ میں دو وزنی چیزیں (ثقلین) تمہارے درمیان چھوڑ رہا ہوں۔ ایک کتاب خدا جس میں ہدایت اور نور ہے۔ جو بھی اس کو ہاتھ میں لے گا وہ ہدایت پائے گا۔ جو اس کو چھوڑ دے گا گمراہ ہو جائے گا۔ کتاب خدا کو لو اور اس کو محکم پکڑو۔

دوسرے میرے اہل بیتؑ ہیں۔[15]

پیغمبر اکرمؐ نے قرآن کے بارے میں بہت عمدہ مثال دی ہے:

---

[12] کافی: فضل القرآن ج ۲، ۵۹۸۔

[13] البیان ۲۶ و ۲۷۔ المیزان ۱: ۱۰۔ الدارمی؛ فضائل القرآن ۱۔ فضائل القرآن ابن کثیر: ۹ و ۱۰۔ ترمذی؛ فضائل القرآن ۱۱: ۳۰ (کچھ فرق کے ساتھ) بحار الانوار ۹: ۷، از تفسیر عیاشی۔ اصول کافی ۴: ۴۰۷۔ مجمع البیان ۱: ۱۶۔

[14] فضائل القرآن ابن کثیر ۱۰۔ فضائل القرآن دارمی ۱۔ مجمع البیان ۱: ۱۶۔

[15] ترمذی؛ مناقب ۳۱؛ مسند احمد ۳: ۱۴ و ۱۷، ۲۶، ۵۹ و ۵: ۱۸۲؛ مستدرک حاکم ۳: ۱۴۸؛ اسد الغابۃ ۲: ۱۲، ۳: ۱۴۷؛ مناقب مرتضوی ۹۷؛ ینابیع المودۃ ۳۰، ۳۱، ۲۵، ۱۹۱؛ تاریخ بغداد ۸: ۴۴۲؛ البدایۃ والنہایۃ ۷: ۳۴۸؛ شرح ابن ابی الحدید ۲: ۱۳۰؛ تفسیر ابن کثیر ۴: ۱۱۳؛ عقد الفرید ۲: ۱۱۱؛ طبقات الکبریٰ ۲: ۱۹۴؛ ارجح المطالب ۳۳۶؛ صواعق محرقہ ۱۳۶؛ مناقب مغازلی ۲۳۴؛ ذخائر العقبیٰ ۱۶؛ مجمع الزوائد ۹: ۱۶۳؛ الدر المنثور ۲: ۶۰؛ کنز العمال ۱: ۴۴؛ تاج العروس ۷: ۲۴۵؛ لسان العرب ۱۱: ۸۸؛ صحیح مسلم ۷: ۱۲۲؛ مصابیح السنۃ ۲: ۲۰۴ [illegible] [illegible]۔

Presented by Ziaraat.Com

« قرآن خواں مومن ترنج کے مثل ہے۔ اس کی بو بھی اچھی ہے اور اس کا مزہ بھی اچھا ہے۔
مومن جو قرآن نہیں پڑھتا، وہ خرما کے مثل ہے۔ اس میں خوشبو نہیں ہوتی مگر مزہ اس کا میٹھا ہے۔
وہ فاجر جو قرآن پڑھتا ہے خوشبودار گھاس کی طرح ہے، جس میں خوشبو تو ہوتی ہے مگر مزہ اس کا کڑوا ہوتا ہے۔
وہ فاجر جو قرآن نہیں پڑھتا وہ حنظل کی مانند ہے جس کی نہ کوئی بو ہے اور مزہ بھی سخت کڑوا ہوتا ہے۔»[14]

پیغمبر اکرمؐ کے بعد افصح عرب امیر المومنین حضرت علیؑ سے بھی پوچھا جائے کہ آپ قرآن کے بارے میں کیا شہادت دیتے ہیں۔
آپؑ نے فرمایا؛

..... چنانچہ اس پر کتاب نازل فرمائی جو نور مطلق ہے، جو کبھی غروب نہیں ہو سکتا نہ اس کے لیے زوال ہے۔ روشن چراغ جو کبھی بجھ نہیں سکتا۔ ایسا عمیق سمندر جس کی گہرائی کا کبھی اندازہ نہیں ہو سکتا۔ ایسا سیدھا راستہ کہ اس پر چلنے والے کبھی گمراہ نہیں ہو سکتے۔ ایسی تابانی اور ضوفشانی جس پر ظلمت کا کوئی گذر نہیں۔ ایسا فیصلے کرنے والا کہ اس کے دلائل کبھی کمزور نہیں ہوتے۔ ایسے واضح اور صاف بیان کہ جن کے اصول و برہان محکم ہیں۔ ایسی شفا عطا کرنے والی دوا جس سے درد اور بیماری کا کوئی ڈر نہیں رہتا۔ یہ عزت و سربلندی کا سرمایہ ہے۔ اس کے ساتھی کبھی ذلیل و خوار نہیں ہوتے۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس کے طرفدار کبھی بے یار و مددگار نہیں رہتے۔ یہ ایمان کا خزانہ اور اس کا مرکز و محور ہے۔
یہ علوم کا سمندر، سرچشمۂ دانش اور انصاف اور عدل کا محل ہے۔ قرآن اسلام کی اساس اور بنا ہے۔ حق کی وسیع وادی ہے۔ ایسا دریا ہے جس کا پانی کبھی ختم نہیں ہوگا۔ ایسا چشمہ ہے کہ جس کا پانی کبھی گدلا نہیں ہوتا اور پیاس بجھانے والوں کی کثرت سے کبھی یہاں تنگی نہیں ہوتی۔ ایسی منزل ہے جس تک راستہ صاف ہے اور اس کا مسافر اپنا راستہ نہیں بھولتا۔ قرآن روشنی کی ایسی نشانی اور علامت ہے جو گذرنے والوں کی آنکھ سے اوجھل نہیں ہو سکتی، وہ ایسی بلند چوٹی ہے جسے راستہ چلنے والے کبھی گم نہیں کر سکتے۔ قرآن وہ کتاب ہے جس کو خداوند عالم نے علم کی پیاس رکھنے والوں کو سیراب کرنے والی، فقہا اور علماء کے دلوں کی بہار اور نیکوں اور پاکیزہ لوگوں کا مقصد و منزل قرار دیا ہے .....»[15]

حضرت علیؑ کے بعد حضرت امام جعفر صادقؑ سے بھی رجوع کیا جائے۔ آپؑ نے فرمایا؛
« قرآن زندہ جاوید ہے اور کبھی ختم نہ ہونے والا ہے۔ دن اور رات کی طرح ہر زمانے میں اس کی آمد و رفت رہے گی۔ آفتاب کی طرح جیسے صدر اسلام میں مسلمانوں کو روشنی بخشی، آئندہ آنے والوں پر بھی نور افگن رہے گا اور ان کو روشنی بخشتا رہے گا۔»
آپؑ سے لوگوں نے پوچھا کہ یہ کیا راز ہے کہ قرآن جتنا زیادہ پڑھا جاتا ہے اور اس پر جتنا غور و خوض ہوتا ہے اس کی تازگی اور بڑھتی جاتی ہے۔ فرمایا؛

---

[14] بخاری، فضائل القرآن ۱۷، سنن الدارمی، فضائل القرآن ۸، الجامع الصغیر، مادہ "مثل المومن"۔

[15] نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۹۸۔ اس سلسلے میں یہ خطبات بھی دیکھے جائیں: ۱، ۲، ۱۸، ۸۳، ۸۶، ۹۱، ۱۱۱، ۱۲۱، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۳۳، ۱۳۸، ۱۵۶، ۱۵۸، ۱۷۶، ۱۸۳، ۱۹۸۔

Presented by Ziaraat.Com

قرآن کسی ایک زمانے یا کسی خاص گروہ اور قوم کے لیے نازل نہیں ہوا بلکہ یہ کتاب سارے زمانوں کے لیے اور سارے لوگوں کے لیے نازل ہوئی ہے چنانچہ یہ ہمیشہ نئی اور ہر زمانے میں (اور ہر وقت) تر و تازہ ہے۔[۸]

شیخ صدوق (م ۳۸۱ھ) کے بقول:

"قرآن خدا کا کلام اور اس کی وحی ہے، اس کی بھیجی ہوئی اس کی بات اور کتاب خدا ہے۔ باطل کا اس میں گذر نہیں۔ یہ حکیم و دانا خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ حق کو بیان ہے اور یہ اور درست کلام ہے۔ بلا وجہ نہیں اترا۔ خداوند تعالیٰ نے اس کو ایجاد کیا ہے اور نازل کیا ہے۔ اس نے خود اس کے ذریعے تکلم کیا ہے اور خود اس کا نگہبان ہے۔

ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ وہ قرآن جو خداوند عالم نے پیغمبر پر نازل کیا تھا وہی ہے جو آج بھی لوگوں کے ہاتھوں میں دو دفتیوں یعنی جلد کے درمیان ہے۔ نہ اس سے زیادہ ہے اور نہ اس سے کم۔ جو بھی ہم سے اس بات کی نسبت دے کہ ہم کہتے ہیں (یہ) اس سے زیادہ تھا اس نے جھوٹ بولا ہے۔"[۹]

یہ خدا کا کلام ہے۔ یہ عالمین کے پروردگار کا سخن ہے۔ یہ خدا کی کتاب ہے۔ اس کی ذات سے آیا ہے۔ اس کی کبریائی کے مصدر جلال و عظمت سے وحی الٰہی کے مہبط پر نازل ہوا ہے۔ دنیا کے مقدس ترین دل پر نقش ہوا اور اس ہستی کے مبارک ہونٹوں سے جاری ہوا۔ اس کے چاہنے والوں کے ذہنوں میں حفظ ہوا۔ مومنوں کے محکم ہاتھوں سے کتاب اور دیوان کا نقش و نگار بنا۔ گوشے گوشے کے دوستوں کے شب زندہ داروں کی لمبی راتوں کا مونس بنا۔ عبادت گذاروں کے راز و نیاز کا واسطہ اور راہ بنا اور طریقت حق کے دلدادگان کو راستہ دکھانے والا بنا۔ اس کی ذات سے آشنائی ہے اور وہی اس کا سرچشمہ ہے۔ خود خداوند تعالیٰ اس کا حافظ و نگہبان ہے۔

ایک محدود کم عقل ناقص ذہن اس لا محدود ناپیداکنار سمندر سے، اس بابرکت چشمہ صافی سے جو ازل سے پیوستہ اور ابد سے وابستہ ہے، اس منبع فیض سے جس کا سرچشمہ خود اس کی ذات پاک ہے اس سے کیا ادراک کر سکتا ہے بجز اس کے جو اس ناقص عقل اور محدود فہم میں سما سکتا ہو۔ محدود کہاں اور لامحدود کہاں!

گر بریزی بحر را در کوزه ای — چند گنجد؟ قسمت یک روزه ای

پس، آب کم جو تشنگی آور بدست — تا بجوشد آبت از بالا و پست

نقص کمال تک کیسے پہنچ سکتا ہے؟

قبح حسن سے کیونکر ربط پیدا کر سکتا ہے؟

تاریکی اور بے بصری، روشنی اور نور کے معنی کیا جانے؟

بیشک انسانی عقل نے خدا کے کلام کے سمجھنے کے راستے میں قدم اٹھائے ہیں۔ ہر ایک نے اپنی طبع کی مناسبت سے اس بے کراں و ناپیداکنار سمندر میں غواصی کی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص اپنی نگاہ و فہم و ادراک کے مطابق مقصود کی خبر لایا اور اپنی پیاس کے برابر ہی اس

---

۸ عیون اخبار الرضا۔ طبع سنگی ۔ ص ۳۳۹ ۔

۹ اعتقادات ۔ صدوق (ص ۸۴ ...)

Presented by Ziaraat.Com

خدا کے چشمے سے سیراب ہوا۔ مگر یہ کہ اس کی حقیقت کیا ہے اور اس حقیقت کا مجموعہ کیا ہے اور تحقیق رمز اور اسرار کیا ہے صرف خدا جانتا ہے اور بس۔ کم فہم اور بے بصیرت لا محدود عظمت کو کیسے پہچان سکتے ہیں۔

یہ کتاب سعادت اور نیکی کی رہبر اور رہنما ہے۔ عدل اور حسن و خوبی کی میزان و معیار اور ترازو ہے۔ ایسا رہنما ہے جو زمانے کے خیر و برکت کا رہبر ہے۔

اس میں تعجب کیا کہ چودہ صدیوں سے اور کرۂ ارض پر جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں قرآن نے کروڑوں مسلمانوں کو اسی تہذیب میں رکھا ہوا ہے۔ دانشور، خطیب معاشرے کی اصلاح کرنے والے، فقیہ، سیاستدان اور محقق اس کتاب سے وابستہ ہیں اور آج بھی یہی دنیا میں قرآن جیسی کوئی دوسری کتاب نہیں جو اس قدر بحث اور تحقیقات کا موضوع بنی ہو۔ کوئی دن نہیں گذرتا کہ اس کے بارے میں کوئی کتاب شائع نہیں ہوتی۔ صدیوں سے دانشور اس کتاب پر کام کر رہے ہیں۔ اس کے کلمات اور اس میں جتنے حروف ہیں ان کو شمار کیا گیا ہے۔ اس کے نقطے والے حروف اور بے نقطے کے حروف، چھوٹے کلمات، بڑے کلمات، چھوٹی سے چھوٹی آیت اور بڑی سے بڑی آیت، حتیٰ کلمات کو خمس بہ خمس، عشر بہ عشر، حزب بہ حزب، جزو بہ جزو شمار کیا ہے اور ان کا تعین کیا ہے۔

ہر آیت میں ہر کلمہ کی جگہ پر مفصل بحثیں کی گئی ہیں جو متعدد ضخیم کتابوں میں موجود ہیں۔ ہر کلمہ میں زیر اور زبر پر نحوی، صرفی، کلامی، فقہی، تفسیری غرض ہر انداز و نوع کی بحث کی گئی ہے۔

اس کے کلمات کے رسم الخط پر بحث اور گفتگو ہوئی ہے۔ اصولِ دین کے علماء اور صاحبان اصول کے تدبرات عقلی اور شواہد اصلی و نظری کا سلسلہ استنباط ہوا۔ خطاب کے معانی میں عام و خاص، نص و ظاہر، مجمل اور محکم و متشابہ، امر و نہی، نسخ اور مثال وغیرہ کی ضرورت کیا تھی، ان کا تقاضہ کیا تھا، یہ سب اصول فقہ کا سرمایہ بنا۔ حلال و حرام اور دوسرے فقہی احکام اسی کونپل سے پھلے پھولے تھے۔ داستانیں اور قصے مورخین نے اپنے ذمہ لیے۔ نصیحت، حکمت، تمثیل، وعدے، وعید، حساب و کتاب، عقاب و ثواب، تنبیہ اور عبرت نے خطیبوں اور واعظوں کو وجدان اور تحرک عطا کیا۔ فرائض، مواقیت، معانی، بیان اور بدیع اور ان جیسے علوم کا سرچشمہ یہی کتاب بنی۔

مختصر یہ کہ دنیا میں کوئی کتاب قرآن کی طرح معاشرۂ انسانی کی توجہ کا مرکز نہیں رہی ہے۔ مزید یہ کہ دنیا میں کوئی دوسری کتاب ایسی نہیں جو چودہ سو سال کی طویل مدت کے دوران ہر قسم کی دستبرد اور تحریف سے محفوظ رہی ہو۔ اسی کو زبان صدق سے فرمایا گیا؛

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ○ (۱۵:۹)

یہ مسلمانوں کی مقدس کتاب دنیا میں ہر جگہ موجود ہے۔ ہر روز اس کی آیات زبان پر لائی جاتی ہیں۔ اصول دین، معیار اخلاق، اجتماعی، سیاسی، عدالتی، اقتصادی روابط، ذاتی معاملات حتیٰ کہ ایک مسلمان کے گفتار اور خواب و خیال یعنی اس کی زندگی کے ہر پہلو کا اسی کتاب پر دار و مدار ہے اور اسی کی تعلیم کے تحت ہے اور وہ اسی سرچشمے سے سیراب ہوتا ہے۔

یہی قرآن ہے کہ اس میں انسانوں کے ہاتھوں تحریف، ابطال، کمی اور بیشی کا گذر نہیں ہو سکا۔ اس کو انسانی شاعرانہ تخیل، قیاس آرائیوں اور ذاتی مفاد سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ وحی اور تنزیل ہے۔ ہدایت ہے اور رحمت۔ امر ہے اور نہی۔ . . . کسی انسان کے لیے یا محض کسی امت کے لیے مخصوص نہیں۔ یہ پوری دنیا اور ساری انسانیت کے لیے ہے۔ ہر زمان و مکان کے لیے بہترین رہبر و رہنما ہے۔

قرآن اسلامی معاشرے کی اساس ہے۔ تمدن اسلامی کی بنیاد، تشریع اور فقہ کا منبع ہے اور دینی فکر اور تدبر کا سرچشمہ ہے۔

Presented by Ziaraat.Com

اس کتاب کی رفعت کا یہ عالم ہے کہ گولڈزیہر یہودی کو بھی جیسے حقیقت شناس کو بھی اقرار کرنا پڑا کہ دنیا میں کسی بھی ادب اور تالیف کو قرآن جیسی عظمت اور احترام حاصل نہیں ہو سکا ہے۔ ۱۰

دنیا میں کوئی مذہبی کتاب ایسی نہیں جو قرآن کی طرح علم و دانش کے حصول کی حوصلہ افزائی کرتی ہو اور انسانی تقویٰ، فضیلت اور کرامت پر بھروسہ کرتی ہو۔ اقرا، سے شروع کرتی ہے اور کمال، پر جا کر پہنچاتی ہے۔

یہ ساری کشش کس نکتے میں ہے؟ بیاں پیام کے بارے میں ہے جو اس کتاب میں انسانوں کے لیے موجود ہے۔

قرآن کا پیام انسان سازی کا پیام ہے۔

ایسا انسان جو مادی وابستگیوں سے آزاد ہو ــــ ایک بلند مرتبہ انسان جو ادائے امانت کے لیے تیار ہو۔

بہترین انسان اور بہترین امت سے معاشرے کی تشکیل، تاکہ بہترین طریقے سے امانتِ الٰہی ادا ہو سکے۔ یہ خیر، حق اور ہدایت کی دعوت ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ یہ صبر، حق اور رحمت کی وصیت کرتی ہے۔ ظلم، زیادتی اور گناہ سے جنگ کرتی ہے تاکہ عدل، نیکی، رحمت، منزلت اور کرامتِ انسانی، سچائی اور وفا رائج ہو اور حکومتِ خلقِ عظیم برپا ہو۔

فواحش اور منکرات جڑ سے اکھاڑ دیئے جائیں۔ جہالت اور گمراہی، جور و ستم اور بداخلاقی اور معاشرتی تباہی کی زنجیریں، ظلمت کے ٹکڑے ٹکڑے سے ٹوٹ جائیں اور عدل و خیر اور نور کی طرف ہدایت جاری ہو جائے۔ اس دین میں رحمت ہی رحمت ہے اور شفا اور ہدایت ہے۔

پیام، خدا کا پیام سارے انسانوں کیلیے ہے۔ سب انسان خدا سے ارتباط رکھتے ہیں۔ براہِ راست اور بلاواسطہ رابطہ۔ وہ خود انسان سے بھی زیادہ انسان کے قریب ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس ربط اور قربت میں سب برابر ہیں۔ یہ کتاب کسی سے یہ نہیں کہتی کہ وہ اپنے کو دوسرے کی بہ نسبت خدا سے زیادہ قریب سمجھے۔

خدا سب کا خدا ہے۔ وہ سفید و سیاہ، کہ و مہ، جوان و پیر سبھی کا ہے۔ بڑائی کا سبب یا خدا سے قربت کا وسیلہ صرف تقویٰ اور پرہیزگاری ہے۔

ہر شخص خدا سے، اس لامحدود عظمت سے، ساری کائنات کے خالق سے، ساری موجودات کو وجود بخشنے والے سے براہِ راست اور ہمیشہ رابطہ رکھتا ہے۔ وہ اس کے زیادہ قریب ہے جو زیادہ متقی ہے ــــ دل و عمل سے، چشم و دست سے متقی۔

یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب طویل راتوں میں بے قراروں کی مونس ہے، زبان کی طراوت اور دلوں کی امید ہے۔

تا قیامت می زند قرآں ندا   کای گروہی جہل را گشتہ فدا
من کلام حق و قائم بذات   قوتِ جان جان و یاقوتِ زکات
نورِ خورشیدم فتادہ بر شما   لیک از خورشید ناگشتہ جدا ۱۱

وہ خوش نصیب ہیں جو اس ندا کو لبیک کہتے ہیں اور قبولیت ان کا مقدر ہے۔ پیغمبر اکرم نے خود فرمایا ہے؛

---

۱۰ العقیدۃ والشریعۃ۔ ص ۴۱۔ I GOLDZIHER, LEDOGME ETLALOIDEL ISLAM P-25 PARIS - 1958

۱۱ مثنوی مولوی۔

Presented by Ziaraat.Com

"اہلِ قرآن اہلِ اللہ اور خدا کے خاص بندے ہیں۔"[۲۲]

امام سجاد علیہ السلام کے ساتھ ہم سب کہیں :-

"بارالٰہا ہم کو ان میں سے قرار دے جنہوں نے قرآن کی رسی پکڑ رکھی ہے۔"[۲۳]

---

[۲۲] مجمع البیان ۱ : ۱۵ ، مسند احمد ۳ : ۱۲۸ و ۲۴۲ -

[۲۳] صحیفۂ سجادیہ ؛ دعا - ۴۲ -

www.ziaraat.com
Sabeel-e-Sakina
Presented by Ziaraat.Com

www.ziaraat.com
Sabeel-e-Sakina

Presented by Ziaraat.Com

(۲)

قرآن کے نام

پہلا نام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانے میں وحیِ الٰہی کے مجموعے کو کس خصوصی نام سے پکارا جاتا تھا؟ اس کے بارے میں کوئی قطعی اور واضح بات نہیں کہی جاسکتی۔ ابھی تو وحی کے دروازے کھلے تھے، جب کہ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ قرآن کی جمع آوری گو کہ پیغمبر اکرمؐ کے زمانے ہی میں شروع ہو چکی تھی مگر بنیادی اور قطعی طور پر خلفاء کے زمانے میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ بیشک صدرِ اوّل کی ان ہی آیات میں لفظ "قرآن" بھی نازل ہو چکا تھا۔ اور اس نام کا کلامِ الٰہی کے ایک حصے یا سارے کے سارے پر اطلاق ہوتا تھا۔ مگر دوسرے نام بھی جیسے کتاب، ذکر، فرقان وغیرہ بہتیرے نام قرآن میں درج تھے۔ چنانچہ کوئی ایسا خاص نام نہیں ملتا جو اس زمانے میں عام طور پر مروج ہو اور اس کو سب اسی نام سے پکارتے ہوں۔

احادیث اور اقوال کی روشنی سے یہ پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہؐ کی رحلت کے بعد آیاتِ الٰہی کے مجموعے کا پہلا نام جو زبانوں پر تھا وہ ظاہراً لفظ "مُصْحَف" تھا۔ قرآن مجید میں یہ لفظ اس صورت میں تو نہیں آیا ہے مگر "صُحُف" کا لفظ آٹھ دفعہ حسب ذیل جگہوں پر آیا ہے:

صحف ابراہیم و موسیٰ (۸۷: ۱۹)، صحف موسیٰ (۵۳: ۳۶) صحف اُولیٰ (۲۰: ۱۳۳ و ۸۷: ۱۸)، صحف مکرمہ (نامہائے گرامی، لوحِ محفوظ یا کتبِ انبیاء ۸۰: ۱۳) صحف منشرۃ (نامہائے ارفع و اعلیٰ ۷۴: ۵۲) اور نُشِرَتْ کی صورت میں (۸۱: ۱۰) صحف مطہرہ (پاکیزہ نامے ۹۸: ۲)۔

صحف جمع ہے صحیفہ کی اور صحیفہ وہ چیز ہے جو وسیع اور پھیلی ہوئی ہو، اسی لیے صفحے کو بھی جس پر لکھا جاتا ہے "صحیفہ" کہتے ہیں۔

صحف اور صحیفہ کے عربی الفاظ اسلام سے پہلے ہی رائج تھے[1] اور دوں کے علاوہ لقیط ایادی سے منسوب شعر میں یہ لفظ آیا ہے۔ یہ شخص نوشیرواں کے زمانے کا عرب شاعر تھا[2] مگر قبلِ اسلام کی تاریخ میں مشہور ترین مثال صحیفۂ مُتَلَمِّس کی ہے کہ[3] ہر نحس تحریر کے لیے اس کی مثال دی جانے لگی[4]۔

---

[1] ملاحظہ کریں، دیوان ہذیلی بش ۳ طبع کردہ گارتن مُتَلَمِّس۔ طبع ورلس۔ ۲/۲ و ۹/۲ اغانی ۲۰: ۲۴۔

[2] لقیط ایک عرب اور قبیلۂ ایاد سے تھا جو عراق میں رہتا تھا۔ اس کا قبیلہ رہزنی کرتا تھا اور خراج نہیں دیتا تھا۔ ایک دفعہ شاہی کاروان تک کو لوٹ لیا۔ ان کی سرکوبی کے لیے نوشیرواں نے اپنے کچھ سپاہی بھیجے تو وہ جزیرے میں منتقل ہو گئے۔ لقیط نے نوشیرواں کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

سلام فی الصحیفۃ من لقیط   الی من بالجزیرۃ من ایاد

بان اللیث کسریٰ قد اتاکم   فلا یشغلکم سوق النقاد ....

(الشعر والشعراء ابن قتیبہ ص ۔۔۔ اغانی ۲۰: ۲۴، الاشتقاق ص ۱۶۸، المؤتلف ص ۱۷۵، ابن الشجری، مختارات الشعراء ۔۔۔) [illegible]

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

Presented by Ziaraat.Com

مصحف (بہ ضم، فتح اور میم کی کسرہ کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے) تحریر شدہ صحیفوں کا مجموعہ جو دو جلدوں کے درمیان موجود ہو۔ کبھی مصحف کے معنی بھی یہی ہوتے ہیں۔ بعد میں یہ مصحف کا لفظ قرآن مجید کا نام پڑ گیا[۵] عربوں میں قبل از اسلام یہ لفظ نیا نہیں تھا۔ زمانۂ جاہلیت کے اشعار میں اسفار نصاریٰ کو "مصاحف" کہا گیا ہے[۶]

اس فن کے بعض ماہرین کے مطابق عرب کے دانشوروں مثلاً سیوطی اور مغربی[۷] اور مغربی دانشوروں مثلاً فرنکل، نولدکے اور جفری[۸] کے خیال میں "مصحف" اور اسی طرح "صحف" "کتاب" کے معنی میں دراصل حبشی یا آرامی الفاظ ہیں۔ اگر یہ بات درست ہے تو "صحائف" اور "صحیفہ" کی بھی اصل حبشی یا آرامی ہوگی۔

مگر یہ کیونکر ہوا کہ باوجودیکہ خود قرآن میں نہیں آیا، اس آسمانی کتاب کا یہ نام پڑ گیا۔ روایات کے مطابق جب حضرت ابوبکر نے قرآن جمع کیا اور پیغمبر اکرمؐ کے اصحاب کبار کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اس کا کوئی نام رکھیں تو بعض نے کہا کہ اس کو "انجیل" کہا جائے مگر لوگ اس پر راضی نہیں ہوئے کسی نے تجویز پیش کی کہ اس کو "سفر" پکارا جائے جیسے یہود کی پانچ کتابوں کو سفر پنجگانہ کہا جاتا ہے۔ یہ تجویز بھی قبول نہیں ہوئی۔ آخر کار آنحضرتؐ کے جلیل القدر صحابی عبداللہ بن مسعود نے کہا کہ جب ہم لوگوں نے حبشہ ہجرت کی تھی تو ایک کتاب وہاں دیکھی جس کو "مصحف" کہا کرتے تھے ... غرض

بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ

NOLDEKEL ORIENT AND OECIDENT I, P. 708.

۳ جریر بن عبدالعزی (یا عبدالمسیح) زمانۂ جاہلیت کا شاعر (م تقریباً ۵۰ قبل ہجرت) المعروف بہ متلمس نے ایک قصیدے میں حیرہ کے بادشاہ عمرو بن ہند (۵۶۹ء) کی برائی کی۔ اس کر بادشاہ حیرہ نے اس کو ایک خط دیا کہ حاکم بحرین کو پہنچا دے۔ راستے میں اس نے ایک بچے کو وہ خط دیا کہ پڑھ کر سنا دے۔ پتہ چلا کہ وہ خط خود اس کے قتل کا فرمان ہے۔ اس نے وہ خط پھاڑ ڈالا اور شام کی طرف بھاگ گیا۔ اس واقعے کے بعد سے لوگوں کی زبان پر یہ مثال رواج پا گئی کہ "اشام من صحیفۃ متلمس"
(تاریخ الادب بروکلمن ۱: ۹۳ ... الاعلام ۲: ۱۱۱)۔

۴ ملاحظہ کریں: سنن ابی داؤد، ذکر ۴ ۲۴۴، مسند احمد بن حنبل ۲: ۱۸۱۰۰، اسلام لانے کے بعد بھی ابوہریرہ (م ۵۸ھ) کے مجموعہ احادیث کو صحیفۂ ابوہریرہ کہا گیا ہے جس کو ہمام بن منبہ (۱۰۱ھ) نے نقل کیا ہے۔

۵ التراتیب الاداریہ، کتانی ۲: ۲۸۱

۶ امرؤ القیس سے منسوب ایک شعر ہے،

اتت حجج بعدی علیہ فاصبحت ۔۔۔ کخط زبور مصاحف رھبان (العقد الثمین، ۱۶۱)

حکیم بن عیاش الاعور الکلبی نے بھی قوم مضر کی سرزنش میں سجاح کی کمزوری پر لکھا ہے،

اتوکم بدین قائم و اتیتم ۔۔۔ بمنتسخ الآیات فی مصحف طب (تاریخ طبری ۱: ۱۹۱۹ س ۱۴)

۷ المزہر، الاشتقاق۔

۸ النصرانیہ، ۱۸۱۔

8-FRAENKEL, S. ARAM FREMDW. S 248 GOLDZIHER, MUH. STUDIEN, I, S. 111 (Q 107), NOLDEKE,TH., NEW BEITER S. 49 F JEHREY, THE FOR. VOCA OF THE QURAN

Presented by Ziaraat.Com

یہ نام پسند کیا گیا اور قرآن کریم، کو مصحف بھی کہا جانے لگا۔[۹]

المناشتہ نے اسی قسم کی بات سالم (م ۱۲ھ) سے منسوب کی ہے کہ جب ابی حذیفہ کے غلام سالم نے اپنا مصحف جمع کیا تو اپنے دوستوں سے مشورہ کیا کہ اس کا کیا نام رکھا جائے۔ کسی نے تجویز پیش کی اس کو "سفر" پکارو۔ مگر اس کے دوسرے دوستوں نے اس یہودی نام کو ناپسند کیا۔ آخر کار فیصلہ ہوا کہ اس کو مصحف کے نام سے پکارا جائے۔[۱۰]

بیشک اس حدیث کی اسناد میں تواتر نہیں ہے اور اس حکم صحیح پہونچنے میں تامل کیا جا سکتا ہے مگر یہ روایت اور اس جیسی دوسری روایات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ رسول اکرم کی رحلت کے بعد اور خلفائے مسلمین کے زمانے میں "مصحف"، ہی قرآن کا مروج نام تھا۔

روایات پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں قرآن کی جمع آوری کو "مصحف" کہا جاتا تھا اور حضرت عثمانؓ کے دور میں مجموعے کو زیادہ تر "مصحف" کہتے تھے۔[۱۱] حضرت عثمانؓ نے قرآن کے جو نسخے ملک کے مختلف اطراف میں بھیجے تھے ان کو بھی "مصاحف" کہا گیا ہے۔ بعد میں ان کا "مصاحف عثمانی" نام پڑ گیا۔ صحابہ کے اپنے خصوصی مجموعے کو بھی مصحف کہا جاتا تھا مثلاً مصحف اُبی بن کعب یا مصحف معاذ۔ ہاں حضرت علیؑ سے جو روایت نقل کی گئی ہے اس میں حضرت ابوبکرؓ کے زمانے کے مجموعے کو "جمع بین اللوحین" کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے[۱۲] مگر بعض دوسروں نے اسی روایت کو لفظ "مصحف" کے ذکر کے ساتھ نقل کیا ہے۔[۱۳] بات چیت میں اور خطبوں میں بھی قرآن کو عام طور سے مصحف کہتے تھے۔ دو مثالیں یہاں دی جاتی ہیں۔ ایک جب حضرت عمرؓ نے مدینہ کے لوگوں سے خطاب کیا اور اس میں آیہ رجم کے بارے میں گفتگو کی تو خدا کی کتاب کو مصحف کے نام سے یاد کیا۔[۱۴] دوسرے وہ واقعہ جب مسلمہ بن مخلد انصاری نے اپنی مصر کی فرمانروائی کے دوران (۴۷ تا ۶۲ھ) ایک دن اپنے دوستوں کے "مصحف" میں دو آیات کو تلاش کیا۔[۱۵]

ان دو مثالوں سے "مصحف" کا رواج واضح ہو جاتا ہے۔ اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں مصر کے لوگ بھی اس آسمانی کتاب کو اسی نام سے پہچانتے تھے۔

مختصر یہ کہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں جب قرآن کو کتابی شکل میں لائے تو قرآن کو اول بار مصحف کے نام سے پکارا گیا۔ مگر ایسا نہیں ہو سکا کہ یہ نام اصلی نام "قرآن" کی جگہ لے سکے۔

---

۹ سیوطی (م ۹۱۱ھ) اس روایت کو دو ذرائع تاریخ مظفری اور ابن اشتہ (م ۳۶۰ھ) کی کتاب المصاحف سے نقل کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ابن حجر نے اس روایت کو ایک دوسرے ذریعے سے بھی لکھا ہے۔ (الاتقان ۱: ۱۸۴-۱۸۳ نوع ۱۷۔ ایسی ہی روایات ابوشامہ (م ۶۶۵ھ) نے موسیٰ بن عقبہ (م ۱۴۱ھ) سے نقل کی ہے۔ المرشد الوجیز ۶۴)۔

۱۰ الاتقان ۱: ۲۰۵ نوع ۱۸۔

۱۱ اس حدیث کا نمونہ عمارہ بن غزیہ (تفسیر طبری ۱: ۲۰) اور فضائل القرآن۔ بخاری ۳ اور احکام ، ۳۷ میں موجود ہے۔

۱۲ فضائل القرآن۔ ابن کثیر ۱۵ ، برہان ۱: ۲۳۹۔

۱۳ مصاحف۔ سجستانی ۵ اور دیگر ذرائع

۱۴ طبقات۔ ابن سعد ۲/۳ ، ۱: ۲۴۲۔

۱۵ الاتقان ۲: ۸۴۔ نوع ۴۷ کا آخر۔

www.ziaraat.com
sabeel-e-sakina
Presented by Ziaraat.Com

(۳)

لغت میں قرآن

لفظِ قرآن :

اس آسمانی کتاب کے سارے ناموں یا صفات میں "قرآن" کا لفظ ہی زیادہ رواج پا گیا اور آج ساری دنیا میں خدا کی کتاب کے لیے یہی نام زیادہ جانا پہچانا جاتا ہے۔

چنانچہ دوسرے ناموں سے پہلے ہم اسی نام کو قرآن مجید میں، روایات اور احادیث میں اور اسلامی دانشوروں اور علماء کے یہاں مستشرقین کے نقطۂ نظر سے بھی دوسرے ناموں سے پہلے زیرِ غور لاتے ہیں۔ اس کتاب کو یہ نام پیغمبر اکرمؐ یا صحابہ نے نہیں دیا تھا۔

خداوند تعالیٰ نے خود اس آسمانی کتاب کا نام قرآن رکھا ہے، جب کہ نزولِ وحی کے شروع سالوں ہی میں فرمایا:

بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَجِيدٌ. فِي لَوْحٍ مَحْفُوظٍ (۸۵: ۲۱، ۲۲)

بیشک یہ قرآن مجید ہے۔ لوح محفوظ میں نوشتہ ہے۔ یا

إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ. فِي كِتَابٍ مَكْنُونٍ (۵۶: ۷۷، ۷۸)

یہ قرآن کریم ہے۔ کتاب مکنون (چھپی ہوئی کتاب) میں موجود ہے۔

ان ہی شروع سالوں میں وحی فرمائی:

يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ. قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا. نِصْفَهُ أَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا. أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا (۷۳: ۱-۴)

اے چادر میں لپٹے ہوئے (رسولؐ) تم رات کو (تہجد کے لیے) اٹھا کرو لیکن تھوڑا اس (رات) کا نصف یا اس سے تھوڑا کم کر دو۔ یا اس پر زیادہ کر دو۔ اور تم قرآن کھول کھول کر ترتیل کے ساتھ پڑھو۔

یہ حکم ہے کہ رات کا آرام ریاضت کے لیے ترک کر دیں اور صلات کو قیام کیا کریں۔ قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر اور واضح طور سے پڑھا کریں تاکہ رسالت کے ابلاغ کے اہم کام کے لیے تیار ہوں۔ رسالت ایک ایسی ذمہ داری ہے جس میں تیاری کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نام بار بار قرآن میں آتا رہا۔

خود اس کتاب میں لفظ قرآن ۶۸ دفعہ مختلف موقعوں پر آیا ہے۔ ان ۶۸ بار میں دو مرتبہ مجازاً نماز کے لیے استعمال ہوا ہے (۱۷: ۷۸، دو دفعہ) [مفسرین کی نگاہ میں[1] اس آیت میں قرآن الفجر سے مقصود قراءۃ الفجر یعنی نماز فجر ہے]۔

---

[1] مجمع البیان جلد ۳، ۴۳۴، طبرانی ۲: ۶۵۲، بیضاوی ۱: ۷۸۰، تبیان ۲: ۴۹۴، فخر رازی ۵: ۴۲۸۔

Presented by Ziaraat.Com

بنام کہا کہیں دفعہ صورتِ معرفہ میں (یعنی الف اور لام حرفِ تعریف کے ساتھ)[۳] اور سولہ مرتبہ کتابِ خدا میں بغیر حرفِ تعریف کے آیا ہے[۴]
اس کے علاوہ لفظ قرآن دو بار قرأت یا قرآن پڑھنے کے معنی میں آیا ہے (۷۵ : ۱۷ و ۱۸)۔

علمائے اسلام میں اس لفظ کے تلفظ، اشتقاق اور معنی میں مکمل ہم آہنگی نہیں ہے۔ ہر شخص ایک طور پر اس کا تلفظ کرتا ہے اور اس کی دلیل پیش کرتا ہے۔ ان میں سے بعض اس کو ہمزہ کے ساتھ یعنی قرآن کہتے ہیں۔ بعض بغیر ہمزہ کے یعنی قُران، کہتے ہیں۔ اہلِ سنت عام طور سے اس کو کریم کی صفت کے ساتھ پکارتے ہیں یعنی القرآن الکریم۔ بالخصوص اہلِ تشیع اس کیلیے صفت 'مجید' منتخب کرتے ہیں اور 'قرآن مجید' کہتے ہیں۔

پارسی زبان میں کلام اللہ کو نپی اور نپی اور پاژوک کہتے ہیں[۵]۔ یورپی زبانوں میں بھی یہ نام کچھ معمولی تبدیلیوں کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ مثلاً

لاطینی زبان میں ALCORANUS

قدیم انگلش میں ALCORAN

جدید انگلش میں CORAN ——— ALQURAN, AL-QURAN, AL-KURAN, AL- بعض اوقات GLORIUS, HOLY, THE, NOBLE بھی نام کے ساتھ جڑتا ہے۔

جرمن زبان میں DER KORAN, KORAAN

فرانسیسی زبان میں LE CORAN, L'ALCORAN

البانیہ میں KURANI

ہسپانوی زبان میں EL—CORAN

اطالوی زبان میں IL CORANO, L'ALCORANO

سویڈن کی زبان KORANEN وغیرہ

یہ اختلاف زیادہ تر رسم الخط میں تبدیلی کی بنا پر ہے۔ عربی کے حروفِ تہجی کا ابھی تک لاطینی میں صحیح طور پر متبادل دریافت نہیں ہوا جو عربی الفاظ کی صحیح ترجمانی کر سکے۔ علاوہ ازیں ماضی میں یورپی ترجموں میں اس کو زیادہ تر قرآن محمدی کہا جاتا تھا، جب کہ آج قرآن کو اس کی صفت کے ساتھ پکارا جاتا ہے، جیسے قرآن مقدس، یا قرآنِ کریم یا قرآنِ مجید۔

---

[۳] ۲ : ۱۸۵ [illegible]

[۴] ۱۰ : ۱۵ [illegible] ۲۱ : ۱۸۵ ۔

[۵] نوبی، کلام خدا، مصحف اور قرآن مجید ہے (برہان قاطع : نپی)، کلام خدا اور مصحف ہے۔ یہ پ کے ساتھ بھی آیا ہے یعنی 'نپگ'۔ پہلوی میں (NIWEK) NIPEK ——— تحریر، خط، ادبیات (اوتوالا ۱ : ۷)۔۔۔ برہان قاطع۔
یادداشت ڈاکٹر محمد معین ۴ : ۲۱۱۰ ۔

www.Ziaraat.com
Sabeel-e-Sakina

Presented by Ziaraat.Com

لفظ قرآن کے تلفظ میں اسلامی دانشوروں اور علماء میں اختلافِ نظر کی وجہ اس لفظ کے مادہ سے استنباط میں اختلاف ہے۔ عام طور سے اس بارے میں دانشوروں کے نظریات کی بنیاد دو باتوں پر ہے، کیا اس لفظ کے مادہ میں ہمزہ موجود ہے یا نہیں؟

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس لفظ کے مادہ میں ہمزہ موجود ہے۔ دوسروں کے خیال میں ایسا نہیں اور اس لفظ کے مادہ میں ان کو ہمزہ کا وجود نظر نہیں آتا۔

جو اس بات کے معتقد ہیں کہ ہمزہ موجود ہے وہ بھی اس لفظ کے معنی میں ہم خیال نہیں، کیونکہ اس لفظ کے مختلف معنی ہیں۔

۱۔ پیغمبر اکرم کے صحابی عبداللہ بن عباس (م ۶۸ ھ) سے قول نقل کیا ہے کہ قرآن "رحمان" کے وزن پر قرائت سے مصدر قَرَءَ یَقرَءُ پڑھنے کے معنی میں آیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ نام ہے اس چیز کا جو پڑھی جاتی ہے۔

۲۔ دوسرا قول قتادہ (م ۱۱۸ھ) سے نقل کیا گیا ہے۔ یہ تابعین یعنی صحابہ کے بعد کی نسل سے ہیں۔ وہ کہتے ہیں، قرآن مصدر اور یا صفت ہے قرءٌ (باب نصر و فتح) کے لیے جس کے معنی جمع کرنے کے ہیں۔ جیسا کہ عرب جب کسی چیز کو جمع کرتے ہیں اور ایک جزو کو دوسرے جزو پر رکھتے ہیں تو کہتے ہیں، "قَرَأْتُ الشَّيْءَ قُرْآنًا" فلاں چیز فلاں پر بڑھا دی۔

کچھ لوگوں نے عمرو بن کلثوم التغلبی (م ۴۰ قبل ہجرت) جو عہد جاہلیت کا شاعر ہے اس کے معلقہ معروف کی مثال دی۔

ذِرَاعَيْ عَيْطَلٍ أَدْمَاءَ بِكْرٍ

هِجَانِ اللَّوْنِ، لَمْ تَقْرَأْ جَنِينًا

لَمْ تَقْرَأْ جَنِينًا سے مراد یہ ہے کہ وہ اونٹنی جوابھی تک حاملہ نہیں ہوئی اور ایک بھی بچہ اپنے رحم میں نہیں رکھا ہے [۱]

"قرآن" سے اس کی مناسبت یہ بتاتے ہیں کہ حروف، کلمات، اور سورتیں سب اس میں جمع پائی گئی ہیں، احکام، معارف اور اعلیٰ دینی تعلیم جو پچھلی کتابوں میں بکھری ہوئی تھیں اس ایک کتاب میں جمع ہو گئی ہیں اور یکجا کر دی گئی ہیں۔

ان دونوں اقوال میں سے طبری اور اکثر مفسرین نے ابن عباسؓ کے قول کو سراہا ہے۔ اس لیے کہ اس سے مقصد قرآن کی تالیف اور جمع آوری ہے، جس کی آیات کی پیروی پہلے ہی سے فرض اور واجب تھی۔

یہ اختلاف نظر آیاتِ الٰہی کے معنی میں بھی بعض اوقات ہوتا ہے مثال کے طور پر جہاں خداوندِ عالم نے فرمایا ہے۔

فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ (۷۵:۱۸)

قتادہ کی تاویل کے مطابق اس آیت کے معنی ہوئے، جب ان کی تالیف کی، اس مجموعے کی پیروی کرو، حالانکہ طبری کے... تالیف سے قبل بھی قرآن کی پیروی واجب تھی۔ چنانچہ ابن عباس کے قول کے مطابق اس آیت کے معنی یہ ہوئے، جب اس کو... میں بیان کیا اور جب تم پر اپنی قرات سے اس کو واضح اور روشن کر دیا تو اس کی پیروی کرو۔

---

[۱] یہ ابو عبیدہ کی روایت ہے۔ تفسیر طبری ۱: ۳۳ تا ۳۴ بولاق، سورۂ قیامت آیات ۱۷، ۱۸۔ جلد ۲۹: ۱۱۸ بولاق۔ مقدمہ مکی عطیہ۔ مقدمتان ۲۸۲ غریب القرآن سجستانی ۱: ۱۶۲۔ الاتقان ۲: ۱۹۴۔ ابن قتیبہ: غریب القرآن ۳۳۔ لسان العرب ۱: ۱۲۴۔ مجاز القرآن ۱: ۲۔ شرح القصائد السبع: ۳۸۰ تفاسیر ابو الفتوح رازی ۱۱: ۷۔ مجمع البیان ۵: ۳۸۳۔ بیضاوی ۲: ۵۷۶ فتح القدیر ۵: ۳۲۸۔

Presented by Ziaraat.Com

صحابہ اور تابعین کے بعد دیکھا جائے کہ دانشور کیا کہتے ہیں:

۳۔ زجاج (م ۳۱۱ھ) کہتا ہے کہ قرآن میں ہمزہ موجود ہے۔ اور فُعلان کے وزن پر ہے جیسے غفران۔ "القَرء" سے مشتق ہے جس کے معنی جمع کرنے کے ہیں۔ جیسے کہ "قَرِءَ المَاءُ فِي الحَوضِ" یعنی پانی حوض میں جمع ہو گیا۔ قرآن کو پچھلی کتابوں کا ثمرہ اور مجموعہ کہا گیا ہے[۶] جوہری (م ۳۹۳ھ) اور اس سے پہلے سفیان بن عُیَینہ (م ۱۹۸ھ) بھی اس کی تائید کرتے ہیں[۷] یہ تقریباً وہی قتادہ کا قول ہے اور اس کی نشاندہی کرتا ہے کہ عرب اسلام سے قبل "قرء" کے لفظ کو جمع اور ضمیمہ کے معنی میں جانتے تھے۔

۴۔ لحیانی (م ۲۱۵ھ) اور کچھ دوسروں کا کہنا ہے: لفظ "قرآن" ہمزائی مصدر ہے اور رجحان، غفران کے وزن پر ہے۔ "قرء" سے مشتق ہے جس کے معنی "تلا" یعنی پڑھنے کے ہیں۔ جو کتاب پڑھی جائے وہ اس اسم (مصدر) سے پکاری جاتی ہے۔ جیسے مفعول کو اس کے مصدر کے نام سے پکارتے ہیں۔ جیسے مکتوب جو لکھا گیا اس کو "کتاب" کہتے ہیں۔ یہاں بھی "مقروء" یعنی پڑھا گیا اس کو "قرآن" کہا گیا[۸]

یہاں تک تو ان کا ذکر تھا جو اس لفظ میں ہمزہ کی موجودگی کے قائل ہیں۔ اب وہ لوگ جو ہمزہ کو اس لفظ کے اصل میں نہیں مانتے حسب ذیل ہیں:

۱۔ شافعی (م ۲۰۴ھ): شافعی کے حالات میں خطیب بغدادی کہتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ قرآن کو اسماعیل بن قسطنطین (معروف بہ قسط) کے سامنے پڑھا تو اسماعیل نے کہا کہ قرآن کا لفظ اسم ہے اور اس میں ہمزہ نہیں ہے۔ یہ قراءت سے نہیں لیا گیا ہے اگر قراءت سے لیا گیا ہوتا تو ہر وہ چیز جو پڑھی جائے "قرآن" کہلاتی۔

بیہقی (م ۴۵۸ھ) بھی کہتے ہیں کہ شافعی قرآن کو کتاب خدا کے لیے اسم جانتے تھے بغیر ہمزہ کے۔ ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) اور سیوطی (م ۹۱۱ھ) اسی نظریے کے قائل ہیں[۹]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام شافعی کو اس لفظ کے اصل میں بحث سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اس کو مشتق اور مہموز نہیں جانتے تھے بلکہ کلام الٰہی کے لیے اس کو اسم خاص سمجھتے تھے۔ جیسے حضرت موسیٰ کی کتاب کو توراۃ کہا جاتا ہے۔ ہماری آسمانی کتاب بھی قرآن کہلاتی ہے۔ مطلب یہ کہ نام میں بحث کرنا اور اس نام کی وجہ تلاش کرنا صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ مگر دوسرے علماء حسب عادت اصول اسماء کی چھان بین کے تحت اس نام (یعنی قرآن) پر بھی تحقیقات کرنے لگ گئے۔

۲۔ اشعری (م ۳۲۴ھ) اور اس کے پیرو خیال کرتے ہیں کہ قرآن کا لفظ "قرن" سے مشتق ہے۔ عرب جب کسی چیز کو دوسری چیز سے ملاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ "قَرَنتُ الشَّيءَ بِالشَّيءِ" اور سورتوں اور آیتوں کے مجموعے کو بھی قرآن کہتے ہیں۔ چنانچہ حج اور عمرہ کے ملانے کو بھی قِران کہتے ہیں[۱۰]

---

۶ البرہان ۱: ۲۷۷، الاتقان ۱، نوع ۱۷ ص ۵۱، مفردات ۴۱۱ "قرء"

۷ البرہان ۱: ۲۷۷، ۲۷۸، الاتقان ۱: ۵۱، سفیان بن عیینہ نے کہا: اس کتاب کو قرآن اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کے معنی جمع ہیں۔ حروف جمع ہوئے تو لفظ بنا۔ لفظ جمع ہوئے تو آیت بنی۔ آیات جمع ہو گئیں تو سورہ بن گئیں۔ سورتیں جمع ہو گئیں تو قرآن ہو گیا۔ چنانچہ کوئی وسیلہ اس کا اجماع سے خالی نہیں۔ ابوالفتوح رازی ۱/۸

۸ مجمع البیان طبرسی ۱: ۱۴۔ طبری ۱: ۳۳۔

۹ تاریخ بغداد ۲: ۶۲۔ البرہان ۱: ۲۷۸، الاتقان ۱: نوع ۱۷۔ ص ۵۱۔

۱۰ قِران (بہ کسر قاف) مقارنت اور وصل کے معنی میں ہے۔ علم نجوم میں جب سیارگان میں سے دو ستارے ایک برج میں جمع ہوتے ہیں تو اس کو قِران کہا جاتا ہے۔ اور فقہ میں عمرہ اور حج کے اتصال کو حج قِران کہتے ہیں۔ نماز میں بھی حمد کے بعد دو سورتوں کی قراءت کو قِران کہا جاتا ہے۔

www.ziaraat.com
Sabeel-e-Sakina
Presented by Ziaraat.Com

یعنی جب قرآن کی آیات ایک دوسری سے مقرون ہو جاتی ہیں اور ایک دوسری سے مربوط ہو جاتی ہیں تو اس مجموعے کو یا آیات کے ایک حصے کو قرآن کہتے ہیں[11] دوسرے لفظوں میں ہم وزن، آیات اور حروف میں وہ مشابہت موجود ہے یا یہ کہ قرآن میں فصیح الفاظ صحیح معانی کے ساتھ تقارن پیدا کر چکے ہیں۔ اس صورت میں نون اس لفظ کے اصلی حروف کا جزو ہے اور ہمزہ زائد ہے۔ چنانچہ "قران" بولا جائے گا بغیر ہمزہ کے۔ مگر یہ (دلیل) کچھ کمزور ہے۔

ہاں اس معنی میں لفظ قران، صدر اسلام میں بعض اوقات استعمال ہوا ہے[12] مگر قابل غور بات یہ ہے کہ خود قرآن میں یہ لفظ لکھی ہوئی اور مدون شدہ آیات کے مجموعے کے معنی میں پیش نہیں کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں قرآن کا نام اول بار سورۂ "مزمل" یا "المزمل" میں آیا اور اس وقت تک آیات اتنی تعداد میں نازل نہیں ہوئی تھیں کہ مجموعہ آیات یا مقارن آیات کی مناسبت سے اس کا نام قرآن رکھا جائے۔

۳۔ فراء (م ۲۰۷ھ) کا کہنا ہے کہ قرآن قرینہ کی جمع "قرائن" سے مشتق ہے۔ جیسا کہ اس کے ایک پارے کی آیات دوسرے پارے کی شبیہ اور ان میں سے بعض دوسری بعض آیات کا قرینہ پائی جائیں گی۔ یہ بات واضح ہے کہ "قرائن" میں اور اس لفظ "قران" میں نون بغیر ہمزہ کے ہے۔ قرطبی (م ۶۷۸ھ) بھی اس قول کی تائید کرتا ہے۔ مگر زجاج اور ابو علی فارسی (م ۳۷۷ھ) اس کو رد کرتے ہیں۔ مثلاً زجاج اس کو غلط کہتا ہے اور ہمزہ کو ترک کرنا باب تخفیف سمجھتا ہے بہر حال یہ بھی پہلے کی طرح کا ایک اظہار خیال ہے۔

۴۔ بعض دوسروں نے کہا اس کو ہمزہ کے بغیر جانا ہے مگر لفظ "قری" سے اخذ کرتے ہیں کہ جس کے معنی ضیافت اور مہمانی کے ہیں۔ اس صورت میں قرآن خدا کا پیش کیا ہوا خوان ہے جس سے ہر شخص اپنا حصہ پا لیتا ہے۔ جیسا کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

"إِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ مَأْدُبَةٌ فَخُذُوا مِنْهُ"[13]

یہ قرآن کشادہ دستر خوان ہے۔ اس میں سے (اپنا حصہ) اٹھاؤ۔

تو یہ تھے مسلمان دانشوروں اور مفسرین کے نظریات اور لغت کے سلسلے میں ان کے دلائل۔ اس بارے میں مستشرقین نے بھی اظہار خیال کیا ہے۔ ان پر بھی نظر ڈالنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

جرمن مستشرق تھیوڈور نولڈکے (م ۱۹۳۰ء) نے پہلے پہل اپنی کتاب "تاریخ قرآن" میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ سورۂ علق میں لفظ "اقرأ" تبلیغ کرو اور وعظ و نصیحت کرو کے معنی میں آیا ہے[14] پھر فرانسیسی رژی بلاشر (م ۱۹۷۳ء) نے اس کی تائید کی ہے کہ قرآن کے اوّل معنی "تبلیغ" کے تھے[15] آہستہ آہستہ لوگ عادی ہوتے گئے کہ اس لفظ کو تبلیغ کے مضامین کی کتاب کے معنی میں استعمال کریں[16]

---

[11] البرہان ۱: ۲۷۸۔

[12] جیسا کہ حسان بن ثابت (م ۵۴ھ یا بقول مشہور ۶۰ھ) مداح رسول نے اپنے اشعار میں اس کا ذکر کیا ہے "جحدوا القرآن وكذبوا بمحمد" (ابن ہشام اور مستفاد ۲۷۶) اور "كفرتم بالقرآن وقد أتيتم" (ابن ہشام ۱۳، اس کا دیوان ص ۲۵ س ۹)۔

[13] سنن الدارمی، فضائل القرآن ۱۱۔

[14] نولڈکے، تاریخ قرآن ۱: ۳۱... اور ۸۱ اور اس کے آگے۔

[15] بلاشر، در آستانۂ قرآن، ص ۱۳۲۔

[16] ایضاً۔ ص ۱۳۶، فارسی ترجمہ ۱۵۔

Presented by Ziaraat.Com

دیوبن برگشتراسر (م ۱۳۵۷ھ) لکھتا ہے کہ عربی زبان میں آرامی، حبشی اور فارسی لغت نے لفظی اضافے کئے ہیں۔ اسلام سے قبل صدیوں تک یہ عرب کے ہمسایہ شمار ہوتے رہے ہیں۔ ان کے آپس میں بہت زیادہ روابط تھے۔ چنانچہ ان اثرات پر تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ آرامی زبان بولنے والے تھوڑے بہت لہجے کے اختلاف سے پورے فلسطین، شام اور بین النہرین میں پھیلے ہوئے تھے۔ عربوں کے ہمسایہ ہونے کی وجہ سے لغت بھی آرامی تھی۔ چنانچہ اس کے الفاظ کا عرب سرزمین میں پھیلنا آسان ہو گیا۔ عیسائی مذہب کے پھیلنے میں سریانی زبان نے بڑی مدد کی۔ کرنکو (م ۱۳۷۲ھ) نے بھی اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے[۱۷] مختصر یہ کہ "قرء" کے لفظ کو پڑھنے کے معنی میں اصل عربی لفظ نہیں جانتے بلکہ اسے سریانی یا عبرانی سے عربی میں منتقل ہونا شمار کرتے ہیں۔ کیونکہ ان زبانوں میں قریانا QIRYANA کا لفظ قرائت، پڑھنے اور پڑھے گئے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ کلیسا میں مقدس کتابوں کی قرائت یا ان کی تدریس کو قریانا کہا گیا ہے[۱۸]

بلاشبہ آرامی اور عبرانی زبان کے مذہبی الفاظ کی مثالیں دی ہیں جو ہمسائیگی کی وجہ سے عربی زبان میں بھی رواج پا گئے۔ مثلاً "قرء"، کتب، کتاب، تفسیر، تلمید، قلم، فرقان، قیوم، زندیق، دجال وغیرہ[۱۹]

مگر اسلامی دانشوروں جیسے ابن اسحاق، ابن جریر اور سیوطی نے قرآن کو اصل عربی الفاظ میں سے ایک شمار کیا ہے۔

درحقیقت اس لفظ کے دقیق اور گہرے معنی کو خود قرآن کے اندر استعمال میں تلاش کرنا چاہیے۔ جہاں مختلف موقعوں پر قرآن کو مختلف معنی میں اور اکثر جگہ فعل "قرء" کو بھی مختلف صورتوں میں پیش کیا گیا ہے۔

آیات الہی میں قرآن کا لفظ مختلف معنی میں استعمال ہوا ہے۔

۱۔ بمعنی منقول کتاب یعنی معجزہ پیغمبر کے دل پر وحی کی گئی (۷۳ : ۲۰ وغیرہ)

فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ۔ یعنی بعینہ القرآن۔

۲۔ نماز صبح کو قرآن الفجر کہا گیا ہے (۱۷ : ۷۸) چونکہ نماز دین کا رکن ہے اس لیے اس کو رکوع اور سجدہ بھی کہا گیا ہے۔ قرآن الفجر کو قراۃ الفجر اور صلاۃ الفجر بھی کہا جا سکتا ہے۔

۳۔ قرآن قرائت کے معنی میں بھی آیا ہے۔

إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۝ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ (۷۵ : ۱۷، ۱۸)

قرآن کا جمع کرنا اور اس کی قرائت ہمارے ذمہ ہے۔ جب ہم اس کو تمہارے سامنے پڑھیں تو اس قرائت کی پیروی کرو[۲۰]

---

[۱۷] دائرۃ المعارف اسلام، ذیل "کتاب"۔

[۱۸] شوروالی اور پادری ZDMG سال ۷۶، ۴۴۲۔ ہورووتس ISLAMICA سال ۱۳ : ۶۷۔ آرتھر جفری "لغات بیگانہ قرآن" میں لفظ "قرآن"۔ بل: اصول ۹۰، نولڈکے ۳۲-۸۲۔

[۱۹] درآمد نامہ قرآن۔ ص ۵۔ ترجمہ فارسی۔ ص ۱۶۔

[۲۰] اس سلسلے میں حسان بن ثابت انصاری کے شعر کو گواہ بنایا جا سکتا ہے جنہوں نے عثمانؓ (م ۳۵ھ) کے لئے قرآن کو قرائت کے معنی میں پیش کیا:

ضَحَّوْا بِأَشْمَطَ عُنْوَانُ السُّجُودِ بِهِ ۔ يُقَطِّعُ اللَّيْلَ تَسْبِيحًا وَقُرْآنَا

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

Presented by Ziaraat.Com

یا حقیقی معنی ہو خواہ ان دیکھی پڑھنا ہو خواہ آشکار یا مخفی۔ جہری یا سری، بلند آواز سے یا زیر لب پڑھنا مقصود ہو (۱۰ : ۹۴ و ۱۷ : ۱۴، ۷۱ و ۹۶ : ۱ و ۱۹ : ۷۳ و ۲۰ : ۰۰۰)

ہم کبھی کسی خطبے کو بھی قرآن کہا گیا ہے۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ سورۂ اعراف کی آیت ۲۰۴ میں قرآن سے مراد خطیب کا خطبہ ہے۔

۵۔ لوحِ محفوظ کو بھی قرآن کہا گیا ہے (۸۵ : ۲۱)۔

۶۔ کبھی ایک آیت کو قرآن کہا گیا ہے (مثلاً ۱۰ : ۶۱ و ۱۳ : ۳۱ میں)۔

۷۔ کبھی کچھ آیات اس نام سے پکاری گئی ہیں (جیسے ۱۰ : ۱۵ و ۱۲ : ۳ و ۷۲ : ۱)۔

۸۔ بعض اوقات تمام وحیِ الٰہی جو ابلاغ ہوئی یا وہ جو ابلاغ ہوتی رہی اس کو اس لفظ سے پکارا گیا۔

مگر جب ہم ان سارے پہلوؤں کا لب لباب اور اس کی روح نگاہ میں لاتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ حقیقت میں قرآن، قرأت کے معنی میں ہی کہا گیا ہے۔ لفظ قرأت کے معنی میں اس قدر وسعت ہے کہ وہ ان سب پہلوؤں پر حاوی ہو جاتا ہے۔

سورہ ۷، آیت ۹۳ میں فعل "نقرؤہ۔ ہم اسکی قرأت کریں" واضح طور سے پڑھنے کے معنی میں آیا ہے۔ مگر قرآن میں ازبر کرنا اور درس دینے کے معنی بھی آتے ہیں۔ اس سے ایک لکھے ہوئے متن سے پڑھنے کے معنی ظاہر نہیں ہوتے بلکہ حفظ کر کے سنانے کے معنی کا پتہ چلتا ہے۔ خداوند عالم فرماتا ہے کہ "تم اس قرآن کے ساتھ اپنی زبان کو تیز حرکت نہ دو۔ یقیناً اس کا جمع کرنا اور حفظ کروانا ہمارے ذمہ ہے۔ جب ہم اس کو پڑھا دیں تو تم اس کی پیروی کرو"۔ یہاں حفظ سے قرأت کا ذکر ہے بغیر لکھے ہوئے۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ لغت میں قرأت کے جو معنی ہیں وہ کلاً خود رسول اللہؐ کے مکہ کے زمانے کے حالات سے مطابقت نہیں رکھتے۔ اس کا امکان ہے کہ وحی کے آغاز میں آیات کے لکھنے کا رواج نہیں تھا۔ جب کہ وحی کی ابتدا اسی لفظ کے اصل سے ہوئی یعنی اقرأ (۹۶ : ۱) سے وحی کا آغاز ہوا۔ بعد میں لکھنے کا بھی رواج ہوا مگر بہت سی چیزیں حافظے میں ہی محفوظ تھیں۔ یعنی بغیر حفظ کیے اور پہلے سے مطلب جانے ہوئے کسی آیت کا پڑھنا بہت مشکل کام تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں قرأت بلند آواز سے پڑھنے اور حفظ کر کے پڑھنے کو کہا گیا ہے (۶۹ : ۱۹ و ۷۳ : ۲۰ وغیرہ)۔ یعنی جیسا کہ رواج تھا اس کو حافظے سے اور خوش الحانی سے بلند آواز سے پڑھتے تھے۔

چنانچہ ممکن ہے قرآن اسم فعل قرأ ہوا اور حافظے سے قرأت کے معنی کی طرف اشارہ ہو۔ جیسا کہ ۷۵ : ۱۶ تا ۱۸ میں دیکھا گیا کہ اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔ یا قرآن الفجر (۱۷ : ۷۸) جو نماز فجر ہے اور اس میں قرأتِ قرآن کی طرف اشارہ ہے جو نماز کا رکن اور اساس ہے۔

اسی طرح یہ لفظ ان آیات کے لیے ہے جو پیغمبرؐ پر نازل ہوتی تھیں اور آپ بلند آواز سے قرأت فرماتے (۷ : ۲۰۴ و ۱۶ : ۹۸ و ۱۷ : ۴۵ و ۸۴ : ۲۱۔ یا جب مومنین نماز میں آیات کی قرأت کرتے ہیں (۷۳ : ۲۰) (بنی اسرائیل کی آیت ۴۶ میں فی القرآن کو بھی اسی معنی کا حامل کہا جا سکتا ہے)

بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ: دیوان حسان ۱ : ۱۰۱۔ بعنوان: الاثر الذی یظہر فتستدل بہ علی الشیء۔

لسان ۱۷ : ۱۲۸ و ۱۹ : ۱۰ و ۲۱۱۔ الاقتضاب : ۹۸۔ البیان والتبیین ۱ : ۲۲۰ و ۳ : ۲۷۲ اس شعر کو اوس بن مغراء (م ۵۰ھ) سے بھی نسبت دی گئی ہے۔ بغدادی خزانہ (۴ : ۱۱۸) میں الاخفش سے نقل کرتا ہے کہ یہ شعر کثیر بن عبداللہ النہشلی (م ۰۰ھ) کا ہے۔ عینی بھی مقاصد (حاشیہ خزانہ ۴ : ۱۷) میں اسی قول کو ابن اصبہانی سے نقل کرتا ہے۔

Presented by Ziaraat.Com

علاوہ ازیں اسی کی طرف اشارہ ہے جو رسول اللہ لیتے (حاصل کرتے) تھے اور مومنین کے لیے (مثلاً ۵: ۱۰۱ اور ۱۸۶: ۶) اور لوگوں کے سامنے دہراتے تھے۔

غرض ان ساری مختلف آراء میں سے جو رائے زیادہ قابل قبول معلوم ہوتی ہے وہ وہی ہے جو لحیانی نے پیش کی ہے۔ اسم فعل یا مصدر ہے اسم مفعول کے معنی میں (مفعول پر مصدر کا اطلاق)۔ قرآن "قرء" کی اصل سے "پڑھا ہوا" یا "پڑھنے کے لیے" کے معنی میں ہے۔ شاید یہ بات بھی ہو کہ قبل از اسلام عرب "قرء" کو جمع اور ضم کے معنی میں جانتے ہوں اور اسی معنی میں استعمال کرتے تھے۔ ایک زمانے میں قرائت اور تدریس کے لیے "قریانا" کی اصطلاح استعمال کرتے تھے اور بعد میں بھی اس لفظ کو اسی معنی میں بولنے لگے۔ بہر حال نزول وحی کے آغاز سے اس لفظ کے یہ معنی "نگاہ" میں آتے ہیں۔ پہلی وحی (اکثریت کے قول کے مطابق ۹۶ "اقرأ" ہے) اور بعثت کے اوائل ہی سے وحی الٰہی کے مجموعے کو قرآن کہا جانے لگا۔

سورۂ المزمل شروع کی وحی ہے اس کی چوتھی آیت میں آیا ہے کہ "قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں" چنانچہ یہ نام شروع سے رواج پا گیا تھا۔ روایات اور احادیث بے شمار ہیں کہ جہاں رسول اللہ کی زبان سے یہ نام وحی الٰہی کے اس مجموعے کے لیے نقل کیا گیا ہے۔ اس میں ایک نمونہ وہ تفصیلی فرمان ہے جو پیغمبر اکرمؐ نے عمرو بن حزم (م ۵۳ھ) کو صادر فرمایا تھا۔ جب ان کو یمن بھیجا کہ دین اور سنت کو لوگوں تک پہنچائیں تو ان کو ایک تحریر دی جس میں لکھا تھا:

فلا يمس القرآن انسان الا و هو طاهر

قرآن کو کوئی ہاتھ نہیں لگاتا بجز اس کے جو طاہر ہو۔

ہو سکتا ہے کہ اس خط کے بعض جملے گفتگو کے ضمن میں آئیں مگر یہ جملہ بلاشبہ قرآن کی آیت کو پیش کر رہا ہے۔ اس قسم کے بہت سے نمونے ہیں۔ چنانچہ شروع ہی سے یہ خصوصی نام رواج پا گیا تھا۔

ان مختلف لغوی معنی اور نظریات میں بھی امکان ہے کہ قرآن کا لفظ "قرأ" یعنی پڑھنے سے نکلا ہو یا وہ مجموعہ جو وحی کو لکھ کر کے تیار ہوا ہو یا اس کو ہم اسم خاص سمجھیں کہ جس کے اصل میں کوئی بحث نہیں کی جا سکتی یا ساری آیات کو متشابہ کے طور پر لیا جائے۔

ایک اور بات جو رہ گئی وہ کتاب خدا کا "عربی" تشخص ہے۔

جب "قرآن عربی" کا ذکر کیا گیا (مثلاً ۳۹: ۲۷) زیادہ امکان اس کا ہے کہ اس سے دوسری زبانوں میں مقدس کتابوں کے مقابلے میں عربی زبان میں آسمانی کتاب مقصود ہو جو مسلمانوں کو ان سے بہتر تعلیمات مہیا کرے گی جو عیسائیوں اور یہودیوں کو ان کی زبانوں میں میسر ہے۔ یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ اسلام کے آغاز سے ہی قرآن نماز میں پڑھا جاتا تھا (۱۷: ۷۸ و ۷۳: ۲۰) اور پیغمبر اکرمؐ کے اصحاب میں آیات الٰہی کے سیکھنے سکھانے میں مسابقت رہتی تھی۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ قرآن گذشتہ کتابوں کے مثل ایک کتاب تھی۔ بنیادی طور پر دوسری وحی کے مقابلے میں قرآن کی اپنی انفرادیت ہے (جیسا کہ ۱۰: ۳۷ سے اس کی تائید ہوتی ہے) قرآن کی اعلیٰ تعلیم پہلی کتابوں میں بھی ملتی ہے (۲۶: ۱۹۶ و ۵۳: ۳۶ و ۸۷: ۱۸ و ۱۹) اور یہ موافقت نبوت محمدیؐ پر خود واضح اور محکم دلیل ہے (۲۰: ۱۳۳)۔

کافر کہا کرتے کہ یہ اپنے پروردگار کی جانب سے (اپنی نبوت پر) روشن دلیل اور آیت کیوں نہیں لاتے؟ کیا پہلی کتابوں میں ان پر صاف صاف آیات نہیں اتری تھیں؟ "قرآن عربی میں نازل ہوا کہ اس میں غور و فکر کریں (۴۳: ۳) اور یہ مکہ کے لوگوں کے لیے تنبیہ بھی ہو (۴۲: ۷) پھر تو قدرتی بات ہے کہ اگر قرآن غیر عربی (عجمی) زبان میں نازل ہوا ہوتا تو کہا جاتا کہ عربی میں کیوں نہیں اترا (۴۱: ۴۴)۔ کلام عجمی ہے جب کہ اس کا مخاطب عربی!

مگر "قرآن" کے جو بھی معنی لیے جائیں اس کا ہر ہر لفظ خداوند تعالیٰ کی طرف سے وحی ہوا ہے۔ (۲: ۹۷) اس کی طرف سے آیا ہے، ہم ہوں

Presented by Ziaraat.Com

[illegible] اور دوسرے کی حالت ہے قرآن نہیں ہو سکتا (۱۰ : [illegible])۔ اگر سارے جن و انس مل کر کوشش کریں کہ اس کی مثال لے آئیں تو نہیں لا سکتے (۱۷ : ۸۸)۔ یہ وہی ہے جو پیغمبر کی طرف سے تلاوت ہوتی ہے [illegible]۔ اس لیے کلام کو سکوت سے سننا چاہیے (۷ : [illegible])۔ یہ نصیحت ہے۔ یہ کلام مجید ہے (۵۰ : ۱)۔ حکیم ہے (۳۶ : ۲)۔ کریم ہے (۵۶ : ۷۷)۔ اور مبارک (۳۸ : ۲۹)۔ [illegible] یہ مقدس ہے۔ یہ کتاب مکنون (۵۶ : ۷۸) لکھی ہوئی ہے۔ عزیز ہے (۴۱ : ۴۱) اور حکیم (۳۶ : ۲) اور یہی حقیقت یقینی ہے (۶۹ : ۵۱)۔

قرآن اپنے اس نام کے علاوہ دوسرے ناموں سے بھی پکارا گیا ہے جیسے "فرقان" "کتاب" اور "ذکر" جو آگے آتے ہیں۔ ان کے بارے میں گفتگو کی جا رہی ہے۔ اور دوسرے نام بھی ہیں جن کا تذکرہ آخر میں کیا جائے گا۔

بہرحال یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ اس آسمانی کتاب میں "قرآن" کا نام مخصوص نام کے طور پر کلام خدا کے لیے لیا گیا ہے جس میں دوسری کتابیں اس سے کسی قسم کا اشتراک نہیں رکھتی ہیں۔ مگر دوسرے نام یا صفات ایسی ہیں جن میں قرآن اور دوسری آسمانی کتابیں کچھ نہ کچھ اشتراک رکھتی ہیں۔

فرقان

عربی میں یہ لفظ اصلی لفظ کی طرح "فرق" سے نکلا ہے۔ جیسے "خسر" اور "خسران"۔ اس صورت میں اسم فاعل کی جگہ مصدر ہے مبالغہ کے طور پر۔ جیسا کہتے ہیں "رجل عدل" یعنی بہت ہی عادل شخص۔ فرقان کے معنی ہوئے "بہت فرق کرنے والا"۔ چنانچہ قرآن کے سلسلے میں بعض مفسرین نے اس کو حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والا کہا ہے۔ علاوہ ازیں اس کے معنی "نجات"، "نصرت" اور "فصل" اور "فرج" بھی کہے گئے ہیں۔ مگر طبری کے بقول تمام تاویلیں لفظی اختلاف کے باوجود معنی کے لحاظ سے ایک دوسرے کے نزدیک ہیں۔ اگر تنگ جگہ سے کسی کو نکلنے کا راستہ مل جائے تو یہ راستہ اس کی نجات کا باعث ہوگا۔ بہرصورت فرقان کے حقیقی معنی دو چیزوں میں فرق کرنا اور ان کو جدا کرنا ہے۔ اور قرآن کو اس لیے فرقان کہا جاتا ہے کہ یہ دلائل اور اپنے احکام سے حق و باطل کے درمیان فرق کرتا ہے۔[1]

اس لفظ کے معنی "نجات" کی صورت میں مفسرین کی توجہ اس طرف مبذول ہوئی کہ وہ اس لفظ اور آرامی یا عبری لفظ "پرقان" PURQAN یا سریانی لفظ "پرقانا" PURQANA جن کے معنی نجات کے ہیں کچھ مماثلت تلاش کریں۔[2]

مگر یہ مماثلت اس بات کی دلیل نہیں کہ اس لفظ کی اصل غیر عربی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس لفظ کی ایک معنی کے لحاظ سے سریانی اور عبری زبان یعنی یہود اور نصاریٰ کی اصطلاح سے مشابہت ہے مگر یہ ان زبان کے اثر کا ثبوت نہیں۔

اس کا موازنہ ابدال کے قاعدے سے کیا جا سکتا ہے۔ اس لفظ کی مثال عربی میں "فلق" ہے جو اس لفظ کے اصل سے معنوی قرابت رکھتا ہے۔

---

[1] تفسیر طبری ۱ : ۳۳ بولاق۔

[2] آرتھر جیفری: لغات بیگانہ قرآن۔ نولڈکے: تاریخ قرآن ۱ : ۳۴۔ گیب: مختصر دائرۃ المعارف اسلام ۲۸۹، BELLS, INTRODUCTION ۱۴۰،
145. SCHWALLY, ZDMG, 1 II/P. 134 SQ. J. HOROVITS; KORANISCHE, UNTER SUCHUNGEN, P. 76 SQ

Presented by Ziaraat.Com

جس طرح الفرقان باطل سے حق کو جدا کرنے والا ہے۔ فلق بھی دن کی روشنی کو شب کی تاریکی سے جدا کرتا ہے۔ لام کے حروف کو ماخذ بعد الثالث ڈالنا عربی میں پہلے سے مروج ہے۔ پروردگار کو بھی "فالق الحبۃ" کہتے ہیں یعنی مٹی کے نیچے بیج کو شگافتہ کرنے والا ۔ لفظ "فلق" و لفظ "فرق" میں تبدیل ہو گیا ہو۔ بیشک فلق انشقاق سے ہے اور فرق انفصال سے۔

بہرحال عرب لغت شناس حضرات مثلاً ابن السبکی، ابن درید، ابن جواد و سیوطی نے اس لفظ الفرقان کو عربی کہا ہے اور معرب نہیں کہا ہے۔

اس زمین میں بحث انسان کو بعض اوقات اہل خیالات کا حامل بنا دیتی ہے، جیسے کہ کہا گیا کہ اس لفظ فرقان کا مفہوم ہجرت کے پہلے اور بعد مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ حالانکہ یہ لفظ سورۂ فرقان میں اور بعثت سے تقریباً آٹھ سال پہلے اور سورۂ آل عمران کے طرح مختلف موقعوں کے دو سال بعد) ایک ہی معنی میں نازل ہوا ہے۔ روز بدر کو یوم الفرقان کہا گیا اور رمضان اس کامیابی کی شکر گذاری کے طور پر مقرر ہوا جب کہ ہم سب جانتے ہیں کہ ۲ ہجری کی ۱۵ شعبان کو جنگ شروع ہونے سے پہلے روزے کا حکم آیا۔

اس لفظ کے معنی کی وضاحت کے لیے اور بہترین طریقے سے اس کو سمجھنے کے لیے خود قرآن مجید سے رجوع کرنا چاہیے۔ اللہ دیکھنا چاہیے کہ اس لفظ سے قرآن میں کس طرح استفادہ کیا گیا ہے۔ ترتیب نزول کے لحاظ سے یہ لفظ اس طرح قرآن مجید میں آیا ہے:

۱۔ سورۂ فرقان کی پہلی آیت میں خداوند عالم خود اپنی کتاب کو "فرقان" کے نام سے پکار رہا ہے۔

تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا (۲۵ : ۱)

وہ برکت ہے جس نے اس فرقان کو اپنے بندے پر نازل کیا تاکہ جہان والوں پر نذیر بنے۔

اس پہلی آیت میں، فرقان، قرآن کے متبادل کے طور پر آیا ہے، جس کو ڈرانے اور انسانوں کو خوف دلانے کے مقصد کے تحت نازل کیا گیا ہے۔

۲۔ مکی سورہ ۲۱ (انبیاء) آیت ۴۸ میں فرمایا:

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ وَهَارُونَ الْفُرْقَانَ وَضِيَاءً وَذِكْرًا لِّلْمُتَّقِينَ

اور یقیناً ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فرقان اور پرہیزگاروں کے لیے نور اور نصیحت عطا کی۔

اس آیت میں فرقان (دس احکام) توراۃ کے معنی میں آیا ہے جس میں متقین کے لیے نور اور ذکر شامل ہے یا پھر وہ معجزہ ہے جس نے حق کو اور باطل فرعون کے درمیان فرق ظاہر کیا یا پھر نصرت (مصر سے انخلا اور نجات) مراد ہے۔

۳۔ مدنی سورۂ بقرہ کی آیت ۵۳ میں فرمایا:

BELL'S INTR P. 145.

K. WAGTENDONK FASTING IN THE KORAN, 143.

طبقات ابن سعد ۲/۲/۹ ۔ تاریخ یعقوبی ۱/۱۰۰

مقریزی بیان کرتا ہے کہ آنحضرت نے ایک دو دن روزہ رکھا تھا کہ جنگ بدر کے قصد سے مدینے سے روانہ ہوئے، ابھی دور نہ گئے تھے کہ آپ نے منادی کرا دی یا معشر العصاۃ انی مفطر فافطروا....

Presented by Ziaraat.Com

اس سے پہلے کہ سارا قرآن نازل ہو اور جمع ہو کر کسی دفتر و کتاب کے قالب میں ڈھلے لفظ کتاب کا اس پر اطلاق ہو چکا تھا۔ پہلی بار سورۂ مریم کی آیات میں یہ لفظ ملتا ہے۔ اور یہ الٰہی فرمان کہ "واذکر فی الکتاب" "تم کتاب میں مریم کا ذکر، ابراہیم کا ذکر، موسیٰ کا ذکر، اسماعیل کا ذکر، ادریس کا ذکر کرو (۱۹: ۱۶، ۴۱، ۵۱، ۵۴، ۵۶) اس بات کی طرف قطعی اشارہ کرتا ہے کہ جب یہ آیات نازل ہو رہی تھیں اس وقت تک نازل شدہ آیات کی تعداد اتنی ہو چکی تھی کہ ان پر "کتاب" کا اطلاق ہو سکتا تھا۔ اس سے بھی اہم نکتہ یہ ہے کہ اس وقت یعنی بعثت کے چھٹے سال اور ہجرت سے چھ، سات سال پہلے آیات الٰہی کے لکھنے کا رواج پڑ گیا تھا اور ان کو "کتاب" کے نام سے پکارا گیا۔

اصل قرآن خداوند تعالیٰ کے پاس "ام الکتاب" میں ہے۔ وہ اس قدر بلند پایہ ہے کہ اس تک عقل انسانی نہیں پہنچ سکتی۔ اس میں انتشار اور تفرقے کا گذر نہیں (۴۳: ۴ - اس کے علاوہ ۳: ۷، ۱۳: ۳۹ و ۵۶: ۷۷، ۷۸ دیکھیں)۔ قرآن کی وحی اسی "ام الکتاب"[1] سے نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ اس میں سے "جو چاہتا ہے منسوخ کرتا اور جس کی چاہتا ہے تائید کرتا ہے" (۱۳: ۳۹)۔

اس اصلی نسخے کو اللہ تعالیٰ نے دوسرے ناموں سے بھی یاد کیا ہے، جیسے "لوحِ محفوظ" (جو ہر قسم کے تغیر، تبدیلی اور گزند سے محفوظ ہے) "کتاب مکنون"، "کتاب مبین"، "صحف مکرمہ"۔ یہ سب ایک کتاب اور اصل نسخۂ کتاب ہیں۔ اس میں ہر چیز ہے اور وہیں سے نازل ہوئی ہے۔ (۲۲: ۱۵)۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ

إِنَّ اللهَ كَتَبَ كِتَاباً فِيهِ مَا كَانَ وَمَا يَكُونُ ......

اللہ تعالیٰ نے کتاب لکھی اس میں جو کچھ تھا اور جو کچھ ہوگا وہ سب ہے۔

قرآن مجید لوحِ محفوظ اور خداوند کریم کے علم ازلی سے ہی آیا (۸۵: ۲۲)۔ کتابِ مکنون میں قرآن کریم کا ایسا مرتبہ ہے کہ بجز طاہرین کے کسی کا ہاتھ اس تک نہیں پہنچا۔ (۵۶: ۷۷ - ۷۹) یہ کتاب اس کے لیے تذکرہ ہے جو نصیحت حاصل کرے۔ یہ صحف مکرمہ میں ہے جو بہت بلند مرتبہ اور پاک اور منزہ ہے۔ اور باکرامت اور پاکیزہ سفیران الٰہی کے ہاتھوں میں ہے۔ (۸۰: ۱۱ - ۱۶) یہ کتاب ہے جو رقِ منشور (وسیع صحیفے) میں لکھی ہوئی ہے (۵۲: ۲ و ۳)۔ قرآن پورے کا پورا لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے اور جو کچھ قرآن اور پچھلی کتابوں میں وحی ہوئی نہ صرف وہ اس میں شامل ہے (خواہ پچھلی کتابوں میں کتنی ہی تحریف کی گئی ہو) بلکہ جہانِ ہستی میں ایک ذرہ بھی ایسا نہیں جسے خدا نہ جانتا ہو اور وہ کتاب مبین میں ثبت نہ ہو (۱۰: ۶۱)۔

ایک طرح اس کتاب مبین کا علم خداوندی سے رابطہ ہے۔ دنیا میں کوئی شے حرکت کرنے والی نہیں کہ جس کی روزی خدا کے ذمے نہ ہو۔ خدا اس کے رہنے کی اور آرام کرنے کی جگہ کو جانتا ہے اور یہ ساری چیزیں کتاب مبین (خدا کے علم ازلی کی کتاب) میں ثبت ہیں (۱۱: ۶) یہاں تک کہ اگر بعض کو قتل ہونا ہے اور وہ گھروں میں بیٹھے ہیں تو وہ اس سرنوشت سے دوچار ہوں گے (۳: ۱۵۴، ۴۷: ۲۴) کوئی خشک و تر نہیں جو کتاب مبین میں نہ ہو (۶: ۵۹، ۱۰: ۶۱ و ۳۸: ۲۲ و ۲۷: ۷۵ و ۳۴: ۳، یہ بھی دیکھیں ۵۱: ۲۰ اور اس کے آگے، ۱۷: ۵۸ و ۳۵: ۱۱ و ۵۵، ۵۷ وغیرہ)۔ دنیا میں کوئی رنج اور مصیبت نہیں جو پہلے سے "کتاب" میں نہ لکھی ہو (۵۷: ۲۲)۔ کوئی ذرہ نہیں جس کو خدا نہ جانتا ہو اور کتاب مبین میں نہ ہو (۱۰: ۶۱)۔

---

[1] عارف حضرات نے عقل اول کو اس جہت سے کہ اشیاء پر اس کا احاطہ ہے، ام الکتاب کہا ہے (شرح فصوص قیصری - ۲۷)۔

Presented by Ziaraat.Com

ان آیات میں ممکن ہے خدا کے علم ازلی کی کتاب مراد ہو یا پھر عالم غیب میں ایسا مرکز ہے جسے صرف خدا جانتا ہو۔ مگر قابل غور بات یہ ہے کہ یہ ہر کی تعبیر کتاب ہی کے لفظ سے ہوتی ہے۔ کتاب کا لفظ ایک طرح کے نامہ کے معنی میں بھی آیا ہے (۲۹:۲۷، ۲۸:۳۳، ۲۴) مگر اس سے بھی زیادہ اہم نامۂ اعمال انسانی ہے۔ جس کو بھی قیامت کے دن کتاب کے نام سے پکارا جائے گا۔

قیامت کے دن ہر شخص اپنی کتاب اعمال اپنے ہاتھ میں لیے ہو گا (۱۷:۱۳، ۱۴؛ ۱۸:۴۹؛ ۳۹:۶۹؛ ۴۵:۲۸، ۲۹؛ ۶۹:۱۹، ۲۵؛ ۸۴:۷، ۱۰) ۔ نگہبان فرشتے اور تمہارے کاتبان کرام تم جو کچھ کرتے ہو وہ سب جانتے ہیں۔ اس نامہ پر انہوں نے سب کچھ لکھا ہوا ہے (۸۲:۱۰ - ۱۲) روز قیامت اس کتاب کو سامنے رکھ دیں گے (۱۸:۴۹) خلق کا نامۂ اعمال کھلا ہوا ہے (۸۱:۱۰) بدکاروں کی ایک کتاب ہے (۸۳:۷) کتاب فجار سجین میں ہے (۸۳:۷) اور کتاب ابرار علیین میں ہے (۸۳:۱۸)

اس طرح خداوند عالم نے اپنی وحی کے مجموعے کو کتاب کہا ہے کہ وہ کتاب الہٰی کی نشانی بنے۔ اسی لیے یہ حیات کی طرح واضح اور نمایاں ہے فطرت کی طرح اپنا خاص نظم و ترتیب رکھتی ہے اور انسانوں کے نظم و ترتیب میں راہنما ہے۔

ایک دوسرا قابل غور نکتہ یہ ہے کہ ان ساری ۲۹ سورتوں کے آغاز میں جو مقطعات سے شروع ہوتی ہیں (چار سورتوں کے علاوہ) صاف صاف یا اشارتاً کتاب الہٰی کا نام لیا گیا ہے تاکہ اس کی عظمت بہتر طور سے نگاہوں میں آسکے۔ ان باقی چار سورتوں کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ سورۂ ن، میں فوراً قلم اور اس کی اہمیت اور قدر و قیمت یاد دلائی جاتی ہے۔ تین اور سورتوں (عنکبوت، مریم اور سورۂ روم) میں اہم اور عظیم مسائل جیسے حضرت زکریا کے حیرت انگیز واقعات اور مومنوں کو تنبیہ کرنے اور ڈرانے یا ایسے معجزوں کا بیان ہے جن سے ان میں بیداری کا پیدا کی جا سکے۔

بہر حال ان مختلف ناموں میں "قرآن" اور "کتاب" زیادہ مروج نام ہیں اور بقول ایک معروف عرب مصنف کے "کلام خدا کو قرآن" اور "کتاب" اس لیے کہا گیا کہ زبان سے اس کی تلاوت بھی کی جاتی ہے اور اس کو قلم سے لکھا بھی جاتا ہے۔ یہ نام رکھا جانا اس حقیقت کی نشاندہی ہے کہ کلام الہٰی کو سینوں میں محفوظ رہنا چاہیے اور کتابوں کی صورت میں بھی کیونکہ صرف حافظے پر بھروسہ کرنا بغیر اس نوشتہ کے جس پر سب کو اتفاق ہو اور نسل در نسل اس پر تکیہ کیا گیا ہے کافی نہیں۔ اسی طرح لکھے ہوئے پر حفاظ قرآن کو کئی کا اس پر اتفاق کیے بغیر کہ جو صحیح اور متواتر سندوں سے نقل ہوا ہو اعتماد کرنا صحیح نہیں۔ یہی دو طرفہ اہتمام تھا جس سے قرآن کو ہر نوع کی تبدیلی و تحریف سے دوران کو ہر طرف سے بچایا جا سکا ہے۔[۱]

ذکر

قرآن کا ایک دوسرا نام "ذکر" ہے جیسا کہ فرمایا:

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ ۔ (۱۵:۹)

یقیناً ہم نے ہی اس ذکر کو نازل کیا ہے اور یقیناً ہم ہی ضرور اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

اس کے علاوہ ۳:۵۸؛ ۱۵:۶؛ ۷:۶۳، ۶۹؛ ۳۸:۸؛ ۵۴:۲۵ وغیرہ دیکھیں۔

ذکر یاد کرنا ہے، خواہ زبان سے یا دل سے، خواہ ذہن کو حاضر رکھ کر کیا جائے یا بھولنے کے بعد یاد کیا جائے۔ چونکہ قرآن ذکر خدا ہے لہٰذا وہ لوگ

---

[۱] دیکھیے الاتقان ... ۔ص ۱۲

سے بھی پکارا جاتا ہے۔

خداوند تعالیٰ کی تسبیح اور اس کے نام کو یاد کرنے کے علاوہ یہ لفظ قرآن میں مختلف معنوں میں بھی آیا ہے۔ مثلاً وحی (۴۳ : ۲۵ و ۷، ۱۵) تورات (۱۶ : ۴۳ و ۲۱ : ۷) لوح محفوظ (۲۱ : ۱۰۵) طاعت (۲ : ۱۵۲) نماز جمعہ (۶۲ : ۹) پنجگانہ نمازیں (۲ : ۲۳۹) بزرگی اور شرف (۲۱ : ۱۰ و ۲۳ : ۷۱، ۴۳ : ۴۴) آگاہی (۱۸ : ۸۳ و ۲۱ : ۲۴) زبان سے یاد کرنا (۲ : ۲۰۰ و ۴ : ۱۰۳ و ۳۳ : ۴۱) دل سے یاد کرنا (۳ : ۱۳۵) حفظ کرنا اور نگاہ میں رکھنا (۲ : ۶۳ و ۳ : ۱۰۳) نصیحت کرنا (۷ : ۶۳ و ۶۹ و ۳۶ : ۱۹) تفکر (۳۸ : ۸۷ و ۸۱ : ۲۷) بیان (۷ : ۶۳ و ۳۸ : ۱) توحید (۲۰ : ۱۲۴) تکبیر (۲ : ۲۱ و ۱۰۱ : ۹۵) ذکر اللہ اکبر (۲۹ : ۴۵) خدا کی یاد سب سے بڑی ہے۔

اگر خداوند عالم بندے کا ذکر کرے تو وہ سب کا سب فضیلت و بزرگی ہے، رحمت و مغفرت ہے، قبول و لطف کی نشانی ہے۔ اس کا ذکر کرنا استغنار کی انتہا، فضل ہے اور کرم و توفیق ہے۔

اور اگر بندہ خدا کا ذکر کرے تو سب کا سب بندگی اور تذلل ہے، دعا ہے اور تضرع اور عاجزی ہے۔ خلوص اور صفا کی نشانی ہے۔ ذکر خدا ہر چیز سے زیادہ اہم اور بہتر ہے۔ یاد خدا حلال کا شوق دلانے والی اور حرام سے باز رکھنے والی ہے :

فَاذْكُرُوْنِیْ ...... اَذْكُرْكُمْ

ہماری طرف اگر ایک قدم آؤ گے تو ہم تمہاری طرف فرسنگ کے حساب سے بڑھیں گے۔

قرآن ذکر ہے ۔ اس کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے اور اس پر عمل کرنا چاہیے۔ قرآن عزیز اور گرامی ہے (۴۱ : ۴۱) ذکر ہے اور مبین (۳۶ : ۶۹) خدا نے اس کو نازل کیا ہے (۱۵ : ۶) اور وہ خود اس کی حفاظت کرتا ہے (۱۵ : ۹)۔

حکمت

کتاب خدا کو حکمت کے نام سے بھی پکارا گیا ہے۔ اس کے اس وصف میں پچھلی کتابیں بھی شریک ہیں۔

بعض موقعوں پر یہ خاص قرآن کا وصف ہے (۱۷ : ۳۹ و ۵۴ : ۵ و ۲ : ۱۲۹ و ۲ : ۱۶۲)۔

کتاب و حکمت بھی خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہیں (۲ : ۲۳۱ و ۴ : ۱۱۳) اور گھروں میں ان کی تلاوت ہوتی ہے (۳۳ : ۳۴)۔

قرآن کے دوسرے نام

آیات (۲ : ۲۵۲ و ۳ : ۱۰۱ و ۴۵ : ۵)، احسن الحدیث (۳۹ : ۲۳)، امام مبین (۳۶ : ۱۲)، ام الکتاب (۳ : ۷)، امر (۶۵ : ۵)، ایمان (۳ : ۱۹۳)، برہان (۴ : ۱۷۴)، بشریٰ (۱۶ : ۸۹ ...)، بشیر (۴۱ : ۴)، بصائر (۷ : ۲۰۳)، بلاغ (۱۴ : ۵۲)، بیان (۳ : ۱۳۸)، بینہ (۶ : ۱۵۷)، تبصرہ (۵۰ : ۸)، تبیان (۱۶ : ۸۹)، تذکرہ (۶۹ : ۴۸)، تنزیل (۲۶ : ۱۹۲ ...)، تفصیل (۱۲ : ۱۱۱)، حبل (۳ : ۱۰۳)، حدیث (۳۹ : ۲۳)، حکم (۱۳ : ۳۷)، حکمۃ (۳۳ : ۳۴ ...)، حکیم (۳۶ : ۲)، حق (۴ : ۱۷۰ و ۲۸ : ۴۸ ...)، حق الیقین (۶۹ : ۵۱)، ذکر الحکیم (۳ : ۵۸)، ذکر مبارک (۲۱ : ۵۰)، ذکریٰ (۵۱ : ۵۵)، ذی الذکر (۳۸ : ۱)، رحمۃ (۱۶ : ۸۹ ...)، روح (۴۲ : ۵۲)، بشارۃ (۱۰ : ۵۷)

www.ziaraat.com Sabeel-e-Sakina

Presented by Ziaraat.Com

صحف مکرمہ (۸۰ : ۱۳)، صحف مطہرہ (۹۸ : ۲)، صدق (۳۹ : ۳۳)، صراط مستقیم (۱ : ۶)، عدل (۶ : ۱۱۵)، عربی (۳۹ : ۲۸)، عروۃ الوثقیٰ (۳۱ : ۲۲)، عزیز (۴۱ : ۴۱)، عجب (۷۲ : ۱)، علم (۱۳ : ۳۷)، علی (۴۳ : ۴)، فصل (۸۶ : ۱۳)، القرآن الحکیم (۳۶ : ۲)، القرآن العظیم (۱۵ : ۸۷)، قرآن کریم (۵۶ : ۷۷)، قرآن مبین (۱۵ : ۱ ...)، القرآن المجید (۵۰ : ۱ ...)، القصص (۱۲ : ۳)، القول (۲۸ : ۵۱)، قیم (۱۸ : ۲)، کتاب اللہ (۳ : ۲۳)، الکتاب الحکیم (۱۰ : ۱ ...)، کتاب عزیز (۴۱ : ۴۱)، کتاب مبین (۵ : ۱۵ ...)، کریم (۵۶ : ۷۷)، کلام اللہ (۲ : ۷۵)، کوثر (۱۰۸ : ۱)، مبارک (۶ : ۹۲ ...)، مبین (۶ : ۵۹)، متشابہ (۳۹ : ۲۳)، مثانی (۳۹ : ۲۳)، مجید (۸۵ : ۲۱)، مرفوعہ (۸۰ : ۱۴)، مصدق (۲ : ۸۹)، مطہرۃ (۸۰ : ۱۴)، مفصل (۶ : ۱۱۴)، مکرمہ (۸۰ : ۱۳)، مہیمن (۵ : ۴۸)، موعظۃ (۱۰ : ۵۷)، نبا (۳۸ : ۶۷)، النجوم (۵۶ : ۷۵)، نذیر (۴۱ : ۴)، نعمۃ (۹۳ : ۱۱)، نور (۴ : ۱۷۴)، ہادی (۱۷ : ۹)، الہدیٰ (۲ : ۲)، وحی (۵۳ : ۴)۔

www.ziaraat.com
Sabeel-e-Sakina

Presented by Ziaraat.Com

www.ziaraat.com
Sabeel-e-Sakina

Presented by Ziaraat.Com

آغازِ وحی

گوشہ نشینی

رسول اللہ کی زندگی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ بعثت سے چند سال پہلے سے تھوڑی تھوڑی مدت میں چند راتوں کے لیے یا سر سال ایک مہینے کے لیے آپ غارِ حرا میں اعتکاف میں بیٹھتے تھے۔[1]

جیسا کہ احادیث اور روایات میں آیا ہے آنحضرتؐ اس گوشہ گیری کے لیے اپنے ساتھ کچھ دنوں کے لیے توشہ اور غذا بھی لے جاتے اور جب وہ توشہ ختم ہونے لگتا تو کسی کو بھیجتے یا خود گھر آ کر مزید غذا وغیرہ لے جاتے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ زیادہ تر روغنِ زیتون اور خشک نان پر مشتمل ہوتی۔ کبھی اس قدر مشغول ہوتے کہ اس مختصر غذا کو بھی بھول جاتے۔

اس گوشہ نشینی کے دوران پیغمبر اکرمؐ کیا سوچا کرتے؟ کیا دینی مسائل اور اہم اور مستقبل کی دعوت پر غور کرتے؟ کیا خود کو تیار کرتے کہ بھار وحیِ الٰہی سنیں؟ کیا خلق کی ہدایت کے لیے دین کے فرائض اور ذمہ داریوں پر تیز نگاہ ڈالتے؟ کیا جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے یہ گوشہ نشینی کا زمانہ تازہ اور نئے دین کی پیدائش کے لیے تفکر یا تیاری کا دور تھا؟

بظاہر اس دور میں جو تفکر اور غور و خوض آنحضرتؐ کیا کرتے ہوں گے اس کے بارے میں ہمیں کچھ نہیں بتایا گیا۔ مگر کچھ شہادتیں ایسی ہیں جو اس سلسلے میں ہماری بہترین رہنمائی کرتی ہیں۔

یہ شہادت خود قرآن ہے جو ہر تاریخی شہادت سے بالا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنَاهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا[2]
وَإِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۴۲: ۵۲)

تم تک وحی پہنچنے سے پہلے تم نہیں جان سکتے تھے کہ کتاب کیا چیز ہے اور نہ ہی ایمان اور ہم نے اس کو نور قرار دیا۔ اس کے ذریعے ہم اپنے بندوں میں جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں۔ اور اب تم یقیناً خلق کو سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرتے ہو۔

مزید فرمایا:

---

[1] تاریخ طبری ۲: ۲۰۶-۲۰۷ دلیل ذہبیات ۱: ۱۵۹-۱۱۶۰، ابن ہشام ۱: ۲۵۱ طبع ۱۳۵۵ھ، سیرۃ حلبیہ ۱: ۲۴۰، صحیح بخاری ۱: ۳، تفسیر سورۃ ۹۶ ۱۰، تفسیر اعلم بن کثیر ۴: ۵۲۸، احمد بن حنبل ۶: ۲۳۲۔

[2] ... ۱۱: ۴۹ طبع بیروت۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ إِذًا لَارْتَابَ الْمُبْطِلُونَ (۲۹ : ۴۸)

اس سے پہلے نہ تم کوئی کتاب پڑھ سکتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھ سکتے تھے۔ ایسی صورت میں یہ جھوٹے لوگ نبوت میں شک پیدا کرتے۔

چنانچہ وحی اترنے سے پہلے وہ نہ کتاب جانتے تھے اور نہ خلق کی ہدایت چاہتے تھے وہ کسی بھی صورت میں وحی کے حاصل کرنے کی آمادگی نہیں رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ پہلی وحی کے نازل ہونے پر حیران اور پریشان ہوئے۔ گویا وحی اچانک نازل ہوئی اور آپ اس کے انتظار میں نہیں تھے۔ وہ وحی کے نازل ہونے کی امید میں بھی نہیں تھے۔ جیسا کہ خداوند تعالےٰ نے فرمایا:

وَمَا كُنْتَ تَرْجُوا أَنْ يُلْقَىٰ إِلَيْكَ الْكِتَابُ إِلَّا رَحْمَةً مِنْ رَبِّكَ ۖ فَلَا تَكُونَنَّ ظَهِيرًا لِلْكَافِرِينَ (۲۸ : ۸۶)

اے رسول تم خود کوئی امید نہیں رکھتے تھے کہ تمہاری طرف یہ کتاب نازل کی جائے گی۔ مگر یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے رحمت ہے۔ پس ہرگز کافروں کے پشت پناہ نہ ہونا۔

چنانچہ آپ لوگوں کو دعوت دینے کی تمنا نہیں رکھتے تھے۔ نہ (غار حرا میں) گوشہ نشینی سے پہلے نہ اس دوران۔ یہ نبی کے اخلاص مطلق کی نشانی ہے۔

ایک روشن شہادت بھی موجود ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ ۙ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ ۚ
قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ۖ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ
رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۔ قُلْ لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا تَلَوْتُهُ عَلَيْكُمْ وَلَا أَدْرَاكُمْ بِهِ ۖ فَقَدْ
لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِنْ قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۱۰ : ۱۵ - ۱۶)

اور جب ان پر ہماری واضح آیات پڑھی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے کہتے ہیں کہ اس کے علاوہ کوئی اور قرآن لے آؤ یا اس کو بدل دو۔ اے رسول کہہ دو کہ مجھ سے تو یہ ہو نہیں سکتا کہ میں اسے اپنی طرف سے بدل دوں۔ میں تو صرف اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو میں بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

اے رسول کہہ دو کہ اگر اللہ تعالےٰ چاہتا تو میں اس کو تم پر نہ پڑھتا اور نہ تم کو اس سے آگاہ کرتا۔ میں تو تمہارے درمیان اس سے پہلے ایک عمر بھر رہا ہوں۔ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس سے قبل پیغمبر اکرمؐ نے کسی بھی صورت میں لوگوں کو دعوت دینے کے بارے میں غور و فکر نہیں کیا تھا۔ اگر فرمان الہٰی نہ ہوتا تو بعد میں بھی قرآن کی آیات ان لوگوں کو نہ سناتے۔

اس دور میں جو کچھ تھا وہ خدا میں اور اس کی عظمت اور نعمتوں کے آثار میں استغراق تھا۔ خلقت اور خالق کے بارے میں اور اس کی وحدانیت اور نظام خلقت میں غور و خوض نے آپ کے وجود کو مشغول کر رکھا ہوگا۔ اگر کہا گیا ہے کہ اس زمانے میں سنگریزے آپ کو سلام کرتے تھے اور آپ سے گفتگو کرتے تھے[1] اور جو بہار کے نغمے آپ کے لیے پیغام رکھتے تھے تو یہ بات سچ ہے اور صحیح ہے۔ ایک پاک دل اور

(1) (اعیان الشیعہ جلد ۲)

روشن خیال فرد کیلئے فطرت سے گفتگو اور عظمت الٰہی کی نشانیوں سے ہمکلامی تعجب خیز بات نہیں۔ درخت کے ہر پتے کے نقش و نگار، پھول کی پتی کی ہر لرزش میں ایک سنگیت ہے۔ ہم ہر حرکت سے گئے میں ایک نغمہ اور دل میں جو ایک پیام ہوتا ہے وہ اسکو روح کی گہرائیوں سے سنتا اور شاہدہ کرتا ہے۔ فطرت کے سکوت میں بھی ایسی صدا ہے جو پیغمبر ہی سن سکتے ہیں۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ

کیا ایسا نہیں کہ ساتوں آسمان اور زمین اور ان میں جو کچھ ہے وہ اس کی تسبیح کرتے ہیں۔ یہ تو ہم ہیں کہ اس کا ادراک نہیں کر پاتے۔ (۱۷ : ۴۴)

پہاڑ اور پرندے حضرت داؤدؑ کے ہم نوا ہو جاتے تھے (۳۴ : ۱۰)۔

چنانچہ جو بھی ہے، فطرت میں جو بھی ظاہر ہے وہ آہنگ اور صدا کا حامل ہے۔ اس آہنگ نے مل کر کائنات کو ایک نظم بخشا ہے مگر اس کا درک اور احساس ہر شخص کا کام نہیں۔

ہر کس بزبانی صفت حمد تو گوید   بلبل بہ غزلخوانی و قمری بہ ترانہ

یہاں تک تو اس دور کے بارے میں قرآن کی شہادت کا ذکر تھا۔ اب دیکھیں کہ حدیث کیا کہتی ہے۔

یہ ذکر آچکا ہے کہ اس سلسلے میں کوئی واضح روایت نہیں ہے۔ مگر بعض احادیث کے انداز سے اس زمانے میں مسجد النبیؐ کے روز و شب کے بارے میں کچھ کہا جاسکتا ہے۔

ابوذر غفاری کہتے ہیں کہ ایک دن آپؐ نے فرمایا:

ایک عقلمند شخص جو چاہتا ہے کہ اس کی عقل مغلوب نہ ہو جائے اس کو چاہیے کہ اپنے اوقات تقسیم کرے۔ کچھ وقت اپنے پروردگار کی مناجات کرے۔ کچھ وقت اپنے نفس کا محاسبہ کرے۔ کچھ وقت خدا کی خلقت میں غور و خوض کرے۔ اور کچھ وقت اپنے کھانے پینے کے لیے مخصوص کرے ... [۳]

قیاس کیا جاسکتا ہے کہ حیات نبویؐ کا یہی پروگرام ہوتا ہوگا۔ خصوصاً جب آپ گوشہ نشینی اختیار کرتے ہوں گے۔ اور یہی باقی زندگی میں مستقل عادت ہو گئی جیسا کہ بعد میں آپؐ کی زوجہ حضرت عائشہ اور صحابی مغیرہ ساری ساری رات قیام کرنے اور نماز نافلہ پڑھنے کے شاہد ہوئے۔ یہاں تک کہ نماز کی وجہ سے پاؤں پر ورم آگیا۔[۴]

بہر حال ذکر اس خلوت نشینی کا ہو رہا تھا جس میں آپؐ خود کو دنیا کے کاموں سے علیحدہ کر کے اپنے روحانی غور و فکر میں سرگرم ہوتے تھے۔ کہا گیا ہے کہ یہ خلوت اور گوشہ نشینی پیغمبر اکرمؐ کی زندگی کے بہت پرلطف دن تھے۔ اس ایک ماہ کے دوران ان بے نواؤں اور محروموں کو جو آپؐ کے پاس آتے غذا اور خوراک مہیا کرتے اور کسی نیکی اور احسان سے دریغ نہ کرتے۔ آخری دنوں میں کعبے کی طرف رُخ کر لیتے اور گھر

حاشیہ صفحہ سابقہ [۲] ابن ہشام ۱ : ۲۵۰، طبقات ابن سعد ۱ : ۱۵۷، بیروت، مسلم، فضائل ۲، ترمذی، مناقب ۳، الدارمی، مقدمہ ۳، احمد ۵ : ۸۹، ۹۵، ۱۰۵۔ الروض ۲ : ۲۸۸ اور آگے۔

[۳] حاکم و ابن حیان۔

[۴] بخاری، تہجد ۶، رقاق ۲، مسلم بن حجاج، منافقین ۸۰، احمد بن حنبل ۴ : ۲۵۱۔

www.ziaraat.com Sabeel-e-Sakina

Presented by Ziaraat.Com

جانے سے پہلے کعبے کا سات بار طواف کرتے پھر گھر کا رخ کرتے تھے۷

بہت سی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ پیغمبر گرامی تنہائی کی خاطر غار میں تشریف لے جاتے اور وہاں شب بیداری کرتے تاکہ تفکر اور غور و خوض کا بہتر موقع مل سکے۔ مگر بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ آپ کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہ یا دو ایک بچے ساتھ جاتے یہ بھی کبھی ان خلوت نشینی کے دنوں میں ہوتے۔ بیشک یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ حاضر صرف اس جگہ تک پہنچانے کے لیے یا کھانا پانی لے جانے کے لیے ہوتا ہو گا ورنہ یہ گوشہ نشینی سے کچھ مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ خلوت اور گوشہ نشینی کا لازمہ تنہائی ہے۔ خصوصاً جب کہ احادیث میں واضح طور سے ذکر ہے کہ آغاز وحی کے موقع پر رسول اکرم غار میں تنہا تھے اور وہاں سے حیرانی میں خدیجہ کے پاس تشریف لے گئے۔ علاوہ ازیں حضرت خدیجہ کے رشتہ دار پیغمبر خدا کی تلاش میں نکلے مگر سوائے تنہا ان کے گھر والوں میں سے کوئی بھی غار حرا نہیں گیا۔ حضرت علی بھی فرماتے ہیں کہ ہر سال پیغمبر غار حرا میں گوشہ نشینی اختیار کرتے۔ وہاں میں ان کو دیکھتا تھا اور کوئی دوسرا نہیں جانتا تھا۸

یہاں یہ بھی کہا جا سکتا ہے یہ شروع کے موقعوں کا ذکر ہے آخری زمانے کا نہیں جب وحی نازل ہوئی۔ بظاہر بعثت کے بعد پیغمبر گرامی نے غار حرا کی گوشہ نشینی ترک کر دی تھی۔ یہ سنت شرعی نہیں تھی۔ اس کے بعد سے ہر سال رمضان کے پہلے عشرے۹ یا بیچ کے دنوں میں یا آخری۱۰ رمضان مسجد میں اعتکاف کرتے۱۱

اس زمانے میں یہ گوشہ نشینی جاہلیت کے معاشرے سے دوری اور اس کی رسوم و عادات سے پرہیز تھا۔ مگر اسلام کے زمانے میں وہ پھر "اعتکاف" کی شکل اختیار کر گیا جو مسجد میں انجام پاتا تھا۔ کیونکہ اب معاشرے کو حق اور راہ حق میں جدوجہد کی دعوت کا زمانہ آ گیا تھا اور اس معرکے سے فرار کر کے غار میں خلوت نشین ہونا انبیاء اور مسلمانوں کا شیوہ نہیں ہے۱۲

قریش اس گوشہ نشینی کو "تحنّث" کہتے تھے۔ بعض روایات میں ہے کہ اول اول آنحضرت کے دادا عبدالمطلب غار حرا میں رمضان کے مہینے میں "تحنّث" کے لیے گئے۔ ماہ رمضان کی آمد کے ساتھ آپ حرا گئے اور مساکین میں غذا تقسیم کی۔ ان کے بعد دوسرے لوگ جیسے ورقہ بن نوفل اور ابو امیہ بن مغیرہ نے ان کی پیروی کی اور آخر ماہ تک وہاں رہتے۱۳ ممکن ہے یہ سب حضرات خاص غار حرا ہی میں

---

۷ سیرۂ حلبیہ ۱ : ۲۷۲۔

۸ نہج البلاغہ خطبۂ قاصعہ ص ۳۰۰ طبع ڈاکٹر صبحی صالح۔

۹ بخاری : اذان ۱۳۵، مسلم : صیام ۲۱۱، احمد بن حنبل ۳ : ۴۷۔

۱۰ مسلم : صیام ۲۱۷، احمد ۳ : ۱۰۲، ۴۴۲، بخاری : اعتکاف ۱، ابو داؤد : رمضان ۳، طیالسی : اعتکاف ۹۔

۱۱ بخاری : اعتکاف ۱، ۶، مسلم : اعتکاف ۲، ابو داؤد : صوم ۷۷، ۷۸، ترمذی : صوم ۷۱، ابن ماجہ : صیام ۵۸، ۶۱، احمد بن حنبل ۲ : ۱۳۳، ۲۸۱، ۳۳۶، ۱۹۹، ۲۹۹، ۲۹۰، ۲۹۰، ۴۹۹۔

۱۲ سوائے ایک سال جب جنگ بدر واقع ہوئی اگلے سال ۲۰ روز اعتکاف کیا۔ ۱۰ روز قضا کے سال گذشتہ اور ۱۰ روز اولیٰ بحار الانوار مجلسی۔

۱۳ الروض الانف ۲ : ۴۲۲ و ۴۳۱۔ عرب جاہلی میں گوشہ نشینی کی رسم تھی اور اسلام نے اس کی تصحیح اور تائید کی جیسا کہ پیغمبر اکرم نے عمر کو جاہلیت میں مانی ہوئی نذر کی ادائیگی کی اجازت فرمائی (محقق در المعتبر و بخاری در اعتکاف ۱۲) اعتکاف فقط مسجد میں ہے و خلوت ممکن ہے مسجد سے باہر بھی ہو۔

۱۴ سیرۂ حلبیہ ۱ : ۲۷۱، بلاذری ۱ : ۸۴ و ۱۰۵۔

Presented by Ziaraat.Com

عزلت نشینی (تحنث) اختیار کرتے تھے۔ چنانچہ رمضان کے مہینے میں کوہ حرا میں عزلت اختیار کرتے تھے۔ یہ ایک مدت کی طرف اشارہ ہے جس میں اس مرحوم کی خاندانی عادت تھی جو ماہ رمضان کے بعد بھی ... یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ پہلے سے موجود تھی اور اس کی جڑیں قدیم تھیں۔ انہوں نے اس کو عمل کر اپنے لیے منتخب کیا تھا اور جو لوگ مکمل طور سے بت پرستی کے خلاف تھے ان کو حنفاء یا احناف (حنیف کی جمع) کہا جاتا تھا۔ مگر یہ کون لوگ تھے اور ان کی کیا کیفیت تھی؟

حنیف

بعثت سے پہلے پیغمبر اکرم کے طریقہ کار کے پس منظر میں ان کی ہجرت و شناخت کے لیے علمائے اسلام اور مستشرقین نے تفصیلی بحث کی ہے۔ اس بحث کی طرف اشارہ مفید رہے گا۔

پہلے یہ ذکر کر دیا جائے کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ لفظ حنیف معرب ہے اور قبل اسلام حنفیت موجود تھی۔ بعضوں کا خیال ہے کہ یہ لفظ سریانی، عبری یا حبشی ... سے ماخوذ ہے۔ اور حنیف ہونے کو یہودیوں اور عیسائیوں کا طریقہ کار سمجھتے ہیں۔ بعضوں کا خیال ہے کہ یہ تنظیم کی صورت میں تھا۔ بعض اس کے برعکس خیال کرتے ہیں۔

اس کی تفصیل میں جانے سے ہم اپنی بحث سے آگے نکل جائیں گے اس لیے یہ اشارہ ہی کافی خیال کیا جائے۔

آثارِ اسلامی میں حنیف کے معنی حقیقی اور صحیح دینِ توحیدی کا پیرو ہے۔

قرآن میں یہ لفظ دس مرتبہ اور اس کی جمع "حُنَفَاء" دو بار آیا ہے۔ خصوصاً حضرت ابراہیمؑ کے ذکر میں اس لفظ سے استفادہ ہوا ہے کہ آپ حنیف اور مسلم تھے۔ نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی (۳: ۶۷ و ۲: ۱۳۵) خالص خدا کی عبادت میں یکسو تھے۔ (۲: ۱۳۵ و ۳: ۶۷، ۹۵ و ۴: ۱۲۵ و ۶: ۷۹، ۱۶۱ و ۱۶: ۱۲۰، ۱۲۳ و ۲۲: ۳۱) اہل کتاب کو (۹۸: ۵) اور رسول اللہؐ اور آپؐ کے پیروؤں کو حکم ہوا کہ حنفاء کی طرح اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں، مشرکوں اور بت پرستوں کی طرح نہیں (۱۰: ۱۰۵، ۳۰: ۳۰)۔

حنیف اور مسلم کے یکجا ہونے (سورۂ آل عمران، آیت ۶۷) سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لفظ کسی خاص دینی گروہ کا نام نہیں تھا۔ جیسا کہ حنفاء للہ (۲۲: ۳۱) بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن سے اس بات کی تائید نہیں ہوتی کہ حنفیت کا وجود اسلام سے پہلے کسی تنظیم کی صورت میں بھی تھا (جیسا کہ سپرنگر کا دعویٰ ہے)[1]۔ سورۂ روم کی تیسویں آیت اس بارے میں اہمیت کی حامل ہے۔ جہاں کہا گیا:

> پس (اے رسولؐ) تم خالص دل سے دینِ حنیف کی طرف اپنا رخ کیے رہو، یہی فطرت اللہ ہے جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ خلق خدا میں کوئی تبدیلی نہیں یہی سیدھا اور استوار دین ہے۔

اسی طرح ۶: ۷۹، ۱۰۶ و ۱۰: ۱۰۵ کی آیات اس بات کی وضاحت کرتی ہیں کہ حنفیت بت پرستی اور تحریف شدہ مذاہب کے مقابلے میں حقیقی، فطری اور خالص دینِ اول ہے۔ یہ آیت (۳۰: ۳۰) قطعی مکی ہے اور بعثت کے نویں سال اور ہجرت سے تقریباً چار سال پہلے نازل ہوئی تھی۔

---

[۱۲] تاریخ العرب فی الاسلام: ۱۲۰۔

[1] SPRENGER, LEBEN MUAMMADS I, 46 Sq.

Presented by Ziaraat.Com

یہاں ایک نظریہ کا اظہار کیا گیا ہے کہ جب نبی اکرم مدینہ تشریف لائے تو یہود سے بہت امید تھی کہ ملتِ ابراہیم سے متعلق آیات نازل ہوئیں جو صاف نظر آتا ہے کہ عربیت سے کئی سال پہلے نظریۂ حنیف کی بنیاد کی تائید کرتی ہے۔ کچھ دوسری آیات (۲:۱۳۵، ۱۰:۱۰۵) بھی اس نظریے کی تائید کرتی ہیں۔

ضمناً آیت "اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ" (۳:۱۹) کے بارے میں کہا گیا ہے کہ صحابی عبداللہ بن مسعود اس کو

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الحنیفیۃ

کی صورت میں قرات کرتے تھے[۱۲] یعنی خدا کے سامنے دین حنیفیت ہی ہے۔ اسلام کو حنیفیت کے نام سے یاد کیا ہے اور یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ ابن مسعود نے اس نام کو خود وضع کیا ہوگا[۱۳] بعد کے اسلامی متون میں بھی اس لفظ کو اسی صورت اور اسی معنی میں دیکھتے ہیں۔ اس معنی میں اس لفظ کا استعمال خود قرآن میں ہوا ہے۔ قرآن کا مفہوم اور تعریفی پہلو جو اس لفظ میں موجود ہے اسلامی متن میں بھی محفوظ رہا بعض اوقات حنیف مسلم کے متبادل کے طور پر پیش ہوا ہے[۱۴] حنیفیت (اور کبھی حنیفیت دین ابراہیم) اور اسلام کے لیے بہت بولا جاتا تھا[۱۵] احادیث میں ہے کہ پیغمبر نے فرمایا:

بُعِثْتُ بِالْحَنِیْفِیَّۃِ السَّمْحَۃِ

میں آسان دین حنیف پر مبعوث ہوا ہوں[۱۶]

یعنی ان زاہدانہ تحریکوں کے مقابلے میں آسان مذہب پر۔ ایک دوسری حدیث ہے:

احب الدین الی اللہ، الحنیفیۃ السمحۃ[۱۷]

عرب کی شاعری میں بھی یہ نام اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ابو قیس بن الاسلت انصاری (م ۔ ۱ھ) جو اوس قبیلے کا رئیس بھی تھا اور حکیم اور شاعر بھی اس سے ایک شعر نقل کیا گیا ہے جس میں خالص ایمان کے ساتھ دین حنیف کو برقرار رکھنے کی دعوت ہے[۱۸] ہذلی کے شعر میں ہے کہ عیسائی جو شراب پیتے ہیں ایک حنیف کے چاروں طرف جنجال پیدا کرتے ہیں[۱۹]

شارح، حنیف کو مسلم کے معنی دیتا ہے۔ جب کہ ربلی کا اصرار ہے کہ اس لفظ کو زہد سے مناسبت ہے یعنی شراب خواری سے

---

[۱۲] 2. A. JEFFERY, MATERIALS P. 32

[۱۳] مقالہ حنیف، پروفیسر نظری واٹ۔ دائرۃ المعارف اسلام۔

[۱۴] ابن ہشام ۲۹۳، ۹۸۲، ۹۹۵ ایضاً ۱۸۱ طبع وستنفلد گوتنگن ۱۸۵۹۔

[۱۵] ابن ہشام ۱۴۳، ۱۴۸، ۸۲۲ و ابن سعد ۱/۱/۱۲۸ و ۳/۱/۲۸۷ چاپ دخویہ۔

[۱۶] احمد بن حنبل ۵: ۲۶۶؛ ۶: ۱۱۶، ۲۳۳ و ابن سعد ۱/۱/۱۲۸ و ۳/۱/۲۸۷۔

[۱۷] بخاری: ایمان ۲۹، ترمذی: مناقب ۳۲، ۶۴، احمد ۱: ۲۳۶ ایضاً بحار الانوار مجلسی ۲: ۱۸۷ باب آلدین الحنیف والفطرۃ و صبغۃ اللہ۔ طبع کمپانی

[۱۸] اقیموا لنا دینا حنیفا فانتم لنا غایۃ قد یہتدی بالذوائب (الکامل) ابن ہشام ۱: ۲۰۰ قاموس و عروض ۲۰۳

[۱۹] ہذلیات، طبع کوزگارٹن قصیدہ ۱۸ بیت ۲۔ بہادر نظر، شاعر ہذلی۔

Presented by Ziaraat.Com

دور رہنے والا[۱۰]۔ بہر حال اس کا اطلاق ایک نیک اعتقاد مسلمان پر واضح ہے[۱۱]۔ ایسے اشعار بھی نقل کیے گئے ہیں جن میں حنیف کو عیسائی اور یہودی علماء کے مقابلے میں دکھایا گیا ہے۔ یہ ایک ایسی اصطلاح ہے جو بظاہر مسلمان کے معنی پیش کرتی ہے۔ امیہ بن ابی الصلت (م ۹ھ) جو زمانۂ جاہلیت میں طائف کا شاعر تھا دین حنیف کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ واحد دین ہے جو قیامت کے دن نجات بخش سکتا ہے[۱۲]

مگر قصیدہ جو اذکر نہیں کی طرف منسوب ہے، ایک شاعر جران العود کا زیادہ عمدہ شعر ہے جس میں وہ ایک متحنف عابد کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ نماز پڑھتا ہے[۱۳]

ذوالرمہ (م ۱۱۷ھ) نے بھی حنیف شخص کے بارے میں اشعار کہے ہیں جو نماز کے وقت مغرب کی طرف رخ کرتا ہے[۱۴]

بہر صورت ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ لفظ 'حنیف' مسلمان کے معنی بھی پہنچاتا ہے۔

لفظ 'حنیف' کی اصل کیا ہے اور کیا یہ لفظ بنیادی طور پر عربی زبان کا ہے یا کسی اور زبان سے متعلق ہے؟ اس پر بہت بحث ہوئی ہے۔ اسلامی دانشوروں میں مسعودی (م ۳۴۶ھ) صابئین کو 'حنفاء' کا جزو شمار کرتا ہے[۱۵] اور اس لفظ کی اصل سریانی زبان کے لفظ 'حنیفو' میں بتاتا ہے۔ مگر سریانی زبان میں HANPO (جس کی جمع HANPE) ہے۔ عام طور سے کافر کے لیے یا ایسے شخص کے لیے بولا جاتا تھا جو یونانی کلچر کا حامل ہو[۱۶]۔ غالباً یہ بات مسعودی تک ثابت بن قرہ (م ۲۸۸ھ) کے ذریعے پہنچی ہے۔ اصولی طور سے سریانی مطالب اور مواد کی تحقیقات میں احتیاط برتنی چاہیے۔ اس کی حقیقی وجہ یہ ہے کہ یہ حران کے صابئین سے متعلق ہے۔ ان کی یہ انتہائی کوشش تھی کہ ان کو اہل کتاب شمار کیا جائے اور اس کوشش میں وہ کسی بات سے رکتے نہیں تھے۔ آرامی۔ کنعانی زبان میں یہ لفظ 'حنف' تھا جس کے معنی منافق اور کافر کے تھے۔ عیسائی بھی اس کو اسی معنی میں استعمال کرتے تھے یہاں تک کہ اسپین کے عیسائی بادشاہ نے تقریباً ۹۰۵ھ میں جو خط سلطان الملہاد کو لکھا تھا اس میں اس اصطلاح کو استعمال کیا ہے۔ اتفاقاً یعقوبی شاؤل (طالوت) اور داؤد کی داستان میں فلسطینیوں کو ستارہ پرست حنفاء کہتا ہے[۱۷]۔ ابن العبری (م ۶۸۵ھ) بھی سریانی کے لفظ 'حنفیہ' کو صابئین کے سلسلے میں استعمال کرتا ہے[۱۸]۔

ہرشفلڈ ایسا شخص ہے جس نے اسلام اور یہودیت اور عیسائیت میں شباہت پیدا کرنے (اور ان کو ایک ثابت کرنے) کی بہت کوششیں کی ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ 'تحنث' عبرانی زبان کے لفظ 'تحینوت' TEHINNOT یا 'تحینوث' کا معرب لفظ ہے، اس عبرانی

---

۱۰ مقالہ حنیف بوہل: مختصر دائرۃ المعارف اسلام۔

۱۱ معجم الادباء۔ یاقوت ۲: ۵۱۔ اغانی ۱۹: ۵۴ وغیرہ۔

۱۲ کل دین یوم القیمۃ عند اللہ الا دین الحنیفیہ زور

۱۳ لسان۔ ۱۱: ۳۴۰ رک۔ خزانہ۔ ۴: ۱۹۸ "اقام الصلوٰۃ العابد المتحنف" شاعر کا اصلی نام عامر بن حارث تھا۔ اس کا اسلام کا ادراک تھا۔

۱۴ لسان العرب ۱۳: ۲۰۶۔

۱۵ تنبیہ، ۹۰ اور آگے، ۱۲۲ اور آگے، ۱۳۶، ۱۴۵۔

۱۶ مقالہ حنیف رچرڈ بیل۔ دائرۃ المعارف اسلام نقل از JOURNAL OF PALESTINE ORIENTAL SOCIETY, XIX (1939), 1-13

۱۷ تاریخ یعقوبی ۱: ۵۱ ترجمہ فارسی ۱: ۵۸ نام حنفاء نہیں ہے۔

۱۸ تاریخ مختصر الدول ۱۸۷۔ طبع آکسفورڈ۔ پاس ۱۵۳ بیروت ۱۹۵۸ ۔

Presented by Ziaraat.Com

لفظ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔[19]

ڈوزی اور دوسرے لوگ بھی اس کو عبری زبان سے مشتق مانتے ہیں۔ بعض اسے سریانی زبان سے بھی کہتے ہیں۔ دیا جاتا ہے اس کو ایک عیسائی کا مرادف اور اس کو ایک مسلمان کے معنی میں لیتے ہیں۔

ان سارے مفروضوں میں بعض ایسے بھی ہیں مثلاً لائل اور ولہاوزن کو تحنّف سے مشتق سمجھتے ہیں[20] اور اس بات کو قطعی رد کرتے ہیں کہ یہ عبرانی زبان سے آیا ہے۔

اس کے مقابلے میں علمائے اسلام جیسے طبری نے اس کو "تبرر" (یعنی فرمانبرداری) کے معنی میں لیا ہے[21]۔

کا اشتقاق اخلاص اور دین ابراہیم پر استقامت کو بھی حنیف کہا گیا ہے[22] جو کسی باطل دین سے اسلام کی طرف مائل ہو اس کو بھی حنیف کہا گیا ہے[23]۔ راغب اصفہانی (۵۰۲ھ) کہتا ہے، حنیف وہ ہے جو گمراہی سے استقامت (اسلام اور ہدایت) کی طرف مائل ہو۔

مگر ابن ہشام تحنث کو لفظ تحنف سے لیتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ عربی تلفظ میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ "ث" کا حرف "ف" میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر لفظ "جدث" کو جس کے معنی قبر ہیں "جدف" بھی بولا جاتا ہے۔ یا شعرائے عرب کبھی "ثم" کی جگہ "فم" بولتے ہیں[24]۔ چنانچہ "تحنث" بھی "تحنف" یعنی حنیف بنتا ہے اور عبادت میں شمار ہوتا ہے۔ مگر ابوذر خشنی جس نے سیرۃ ابن ہشام کی شرح کی ہے اس نقطۂ نظر کو رد کرتا ہے اور کہتا ہے:

"اثم" کے معنی گناہ کے ہیں اور "تاثم" گناہ سے نکل آنے اور اس کو ترک کرنے کا مفہوم رکھتا ہے۔ کیونکہ بعض اوقات باب تفعّل خروج کے لیے فعل کے معنی سے ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ یہاں "حنث" بھی جس کے معنی گناہ کے ہیں باب تفعّل میں "تحنث" ہو جاتا ہے اور اس کے معنی گناہ سے خارج ہونے کے ہو جاتے ہیں[25]۔

---

19 H. HIRSCHFELD; NEW RESEARCHES INTO THE COMPOSITION AND EXEGESIS OF THE QORAN, LONDON, 1902, P. 10. [19]

[20] مختصر دائرۃ المعارف اسلام ۱۴۴، مزید مطالعہ کریں:

CAETANI, ANN. 1, P. 181-92; R. BELL," WHO WERE THE HANIFS?" IN MOSLEM WORLD. XX, 1930, P. 120 - 4, N. A. FARIS AND H. W. GLIDDEN, "THE DEVELOPMENT OF THE MEANING OF THE KORANIC HANIF" IN JOURNAL OF THE PALESTINE ORIENTAL SOCIETY. XIX, 1939, P. 1-13.

[21] تاریخ طبری ۱: ۱۱۴۹، ۲۸۲۷ لیدن۔

[22] تفسیر طبری ۱: ۴۴۰-۴۴۲، مفردات راغب ۱۳۳، تفسیر غریب القرآن قرطبی ۱۸۸، لسان العرب ۱: ۳۴۰، نہایۃ ابن اثیر ۱: ۴۵۱۔

[23] منتہی الارب ۱: ۲۸۳۔ تحنف قبول اسلام ہو جاتا ہے (کامل ۵۲۶، جریر کا شعر لسان العرب میں ۱۰-۴۰۴، طبری ۱: ۲۸۲۷، جریر، نقائض ۲: ۵۹۵)۔

[24] سیرۃ ۱: ۲۵۱۔ بعض اہل لغت نے بھی تحنث کو اضداد میں شمار کیا ہے۔ یعنی گناہ کے معنی بھی لیے ہیں اور گناہ ترک کرنے کے معنی بھی (روض ۲: ۳۹۰)۔

[25] ابن ہشام ۱: ۲۵۱ ح ۳۔ طبع ۱۳۵۵ھ مصر، الروض ۲: ۳۹۰، لسان، اثیر کا بھی یہی خیال ہے۔ " فلان يتحنث اى يفعل فعلا يخرج به من الاثم و الحرج " (نہایۃ ۱: ۴۴۹) ایک حدیث میں حکیم بن حزام رسول اللہ سے کہتا ہے "كنت اتحنث بها فى الجاهلية من صلة و عتاق و صدقة" بخاری، مسلم اور احمد نے نقل کیا ہے۔

Presented by Ziaraat.Com

ان لوگوں کے بارے میں سیرت اور لغت میں اس زمانے کی اصطلاحات کی تلاش کے علاوہ وہ لوگ [illegible] کہلاتے ہیں ان کے تعلق
کے بارے میں کچھ وضاحت ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چار افراد ۔۔۔ ورقہ بن نوفل، عبید اللہ بن جحش، عثمان بن حویرث اور زید بن عمرو ۔۔۔ ان لوگوں کو
انحراف بت پرستی سے پرہیز کرتے تھے اور دین حق کی جستجو میں رہتے تھے[15] چونکہ توحید پر نہیں تھے۔ بہت سے دوسرے لوگوں کا بھی حنفاء
کے نام سے روایات میں ذکر آیا ہے۔ ان میں بعض معروف نام بھی نظر آتے ہیں۔ مگر ان لوگوں کا عمل اور عقائد کا واضح نہیں ہے۔ ان کی نظر
یہ ہے [illegible] کی وضاحت نہیں ہو سکی ہے۔ [illegible] روایات کے شاعر [illegible] ابو قیس بن الاسلت کی طرح
کیا تھی یا پھر قس بن ساعدہ ایادی کی داستان کہ بہت سے خطبے بیان کیے گئے ہیں [illegible] ہو سکتی ہے۔ ان کے بارے میں بہرحال ایک
بات طے شدہ ہے کہ یہ سارے لوگ ظہور اسلام کے قریب موجود تھے یا ان کو رسول اللہ کے زمانے کا ادراک تھا۔ ان لوگوں میں شاعر، خطیب،
عام لوگ اور بعض بڑے شاعر لوگ بھی ملتے ہیں۔ روایات کے مطابق ان میں سے بعض نے حضرت نوح کی عمر پائی تھی۔ ان میں سے بعض
کے بارے میں کہانت اور پیغمبری سے ملتے جلتے کاموں کا ذکر ہے اور ان سے پیغمبر آخر الزمان کے ظہور کی پیشگوئی بھی منسوب ہے۔ نتیجہ یہ کہ ان کی
شخصیت کے ساتھ افسانہ اور حقیقت دونوں خلط ملط ہو گئے ہیں کہ ان دونوں کی حدود کا تعین مشکل ہے۔ ان سب کے بارے میں یہ بات طے ہے کہ بھلا
پوری طرح واقف نہ ہونا تاریخی مواد اور مطالب کے واضح نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ مگر ان لوگوں کے وجود کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان تاریخی شخصیتوں
کے بارے میں مزید معلومات کے لیے جو حنفاء کا جزو ہیں، تحقیقات کا کام آگے بڑھنا چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ ان کو حضرت ابراہیم کا حقیقی اور سچا
پیرو نہیں سمجھنا چاہیے۔ سب سے اہم یہ کہ انہوں نے خود اپنے آپ کو حنیف نہیں کہا ہے۔

بہرحال اس زمانے میں جزیرہ نمائے عرب میں جاہلیت کے مذہبی مراسم اور لوگوں کے رسم و رواج کے خلاف حرکت موجود تھی۔ قابل قبول
حصے میں زیادہ قابل توجہ تھی کہ اس کے ابعاد اور اشخاص پر آج مزید تحقیقات ہونی چاہیے۔

مگر خود پیغمبر اکرم کی ذات میں یہ بات مختلف ہے۔ آپ پاک خاندان، اصلاب شامخہ اور ارحام مطہرہ سے دنیا میں تشریف لائے۔ ان

۱۵۔ ابن ہشام ۱: ۲۴۳ - ۲۴۲، الروض ۲: ۲۴۳ ۔۔۔ عثمان بن حویرث قیصر روم کے پاس گیا اور وہاں جا کر عیسائی ہو گیا۔ عبید اللہ بن جحش حبشہ میں عیسائی ہو گیا۔
[illegible] ورقہ بن نوفل [illegible] عیسائی تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مسلمان ہو گیا تھا۔

۱۶۔ ان اشخاص کا نام حنفاء کے طور پر آیا ہے: قس بن ساعدہ الایادی، زید بن عمرو بن نفیل، امیہ بن ابی الصلت، ارباب بن رئاب، سوید بن عامر المصطلقی،
اسعد ابو کرب الحمیری، وکیع بن سلمہ بن زہیر الایادی، عمیر بن جندب الجہنی، عدی بن زید العبادی، ابو قیس صرمہ بن ابی انس، سیف بن ذی یزن، ورقہ بن نوفل
القرشی، عامر بن الظرب العدوانی، عبد الطابخہ بن ثعلب، علاف بن شہاب التمیمی، المتلمس بن امیہ، زہیر بن ابی سلمی، خالد بن سنان، عبد اللہ القضاعی، عبید بن
الابرص، کعب بن لؤی، ابو قیس صیفی بن الاسلت۔

۱۷۔ کہتے ہیں کہ نبی اکرم نے [illegible] کے بارے میں فرمایا "نبی ضیعہ اہلہ" [illegible] تھا مگر کتاب اور شریعت نہیں
رکھتا تھا [illegible]
[illegible]
[illegible]

اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت رسالت مآب کو رسالت عطا کیا گیا تھا۔ چنانچہ آپ نے بت پرستی کے خلاف مبارزہ اور خدائے واحد کی عبادت کی طرف کشش ان کی فطرت سلیم میں موجود تھی۔ اور آپ کے دل میں ان بت پرستوں کی روش سے جو نفرت تھی وہ ان لوگوں سے تھی جن کو زمانے کے رسوم قابل قبول تھے مگر انہوں نے ان کے خلاف جہاد کیا تھا اور کوئی اقدام کیا تھا۔ عام لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے اور زیادہ سے زیادہ معاشی ماحول میں کچھ تجارت وغیرہ کے سلسلے میں اور پھر ان ہی لوگوں کے ساتھ رہ جاتے تھے۔ ان خاندانوں میں سے کسی نے بھی کوئی مثبت یا اعلانیہ اقدام نہیں کیا۔ چنانچہ بت پرستوں سے ان کا تصادم بھی کبھی نہیں ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ اس زمانے کے لوگوں کو شروع سے گمان تک نہ تھا اور اس طرح لوگوں میں عزت اور احترام کی نظر سے دیکھے جاتے۔ جب کہ شعر کو گہری ٹیس پہنچے گی کہ لوگوں کا سماج اس معاشرے کے فساد سے شناسائی اور واقفیت کو پہچانتا نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اس سے کنارہ کش رہ کیے گئے تھے۔ اسی لیے لوگوں کو بت پرستی سے روکنے اور بہبود دین اور قریب سے روشناس کرنے۔ اس راستے میں کسی اقدام اور مثبت عمل سے کنارہ کش رہتے تھے ٹھیک اسی طرح کے لوگ آپ کو آنا جانا اور اذیت دینے میں کوئی کمی نہ کرتے۔ آپ صاحبِ دعوت و رسالت تھے اور ساری انسانیت کو اپنی رسالت پہنچانے پر مامور تھے۔ جبکہ حنفا ایسے اصول کے حامل تھے جو انہوں نے اپنے لیے منتخب کر رکھے تھے ان کے ذمے ابلاغ نہیں تھا۔ اگر ان کی طرف سے کبھی دعوت بھی ہوتی تو نرم انداز میں اور عام طریقے سے۔ اگر ان کے پیرو تھے تو وہ بھی ان کے دوست اور ہم خیال لوگ ہوتے تھے۔

یہ تحنث، لوگوں میں ایسا سلسلہ تھا جس میں رسول اللہ کو غور و فکر کا اس میں تفکر اور غور و خوض کا موقع ملتا ہے اور اس خلوت نشینی سے اطمینانِ قلب نصیب ہوتا ہے۔ ساری بدی اور بدکرداری جو زمانے میں پھیلی ہوئی تھی اس سے الگ تھلگ کائنات اور عظیم آفرینش میں غور و خوض یہاں ممکن ہوتا۔ حق کی تلاش ممکن ہوتی اور جس کی آپ کو تلاش تھی، وہ یہودی احبار کے قصوں اور داستانوں میں اور نصرانی راہبوں کی کتابوں میں دستیاب نہیں تھی۔ آپ کی کتاب ساری دنیا تھی اور آپ کا دیوان صفحۂ کائنات تھا۔ آسمان اپنی پوری بلندی اور عظمت میں آپ کے دل کے سینے کا ایک گوشہ، گرمی کے دنوں میں تپتا ہوا صحرا آپ کی کتاب کا ایک ورق تھا۔ سفیدۂ صبح کا نوری گنبد تا ہر لحظہ اور شام کا ڈوبے پہروں آجانا، ستاروں کی چمک اور صحرا پر مہتاب کی کرنیں، سب کے سب سارے عظمتِ الٰہی کے آثار آپ کی کتاب تھے۔ آپ حقیقتِ عالی کے جویا تھے جو زمانے میں مفقود تھی۔ یہ خضوع و خشوع، یہ ذلت اور خاکساری چند پتھر اور لکڑی کے بتوں کے سامنے! یہ لات، نسر اور ذکر وغیرہ، یہ ستارہ پرستی وغیرہ یہ اپنی اور تخیل خود اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیزوں کے سامنے؟ یہ سب کیا ہے؟ یہ کیسے مفلوک الحال اور زبوں حال لوگ ہیں جو اپنی بنائی ہوئی چیزوں کے غلام اور بندے ہیں۔ یہ بت جو محض پتھر اور مٹی ہیں اور بس ان کے ہاتھوں نہ کسی کا فائدہ ہے نہ نقصان۔ تو پھر ان کو کیوں پوجتے ہیں؟ ... یہ بے کراں وسیع دنیا، پہاڑ، اونچا اور بلند آسمان پر چمکتے ہوئے، چمکتے ہوئے رات کے ستارے کیسے پر شکوہ ہیں۔ یہ اپنے مدار پر گھومتے ہوئے آسمان۔ یہ دن اور رات کی آمد و رفت یہ تو ایک اصول اور رمز کہہ رہے ہیں۔ صحرا کی نسیم دلنواز، ریت کا طوفان ان سب ہی کا ایک پیام ہے جو وہ پہنچا رہے ہیں۔ یہ اصلی رمز یہ حقیقی راز، یہ حقیقتِ مطلق کہاں ہے؟

ہر سال ماہِ رمضان میں ان کے دل کی خلوت میں ایک شور بپا رہتا۔ آپ کا سارا وجود اس فکر میں ڈوبا رہتا کہ وہ حق، وہ رازِ ہستی، وہ راز جو اس کائنات کو وجود میں لایا، وہ عالی ترین اور بزرگ ترین ایسا نہیں کہ جس نے اس کائنات کو اور اس عالم ہستی کو بے مقصد اور بے طور چھوڑ رکھا ہوگا۔ رمضان کا مہینہ ختم ہوتا تو آپ دوبارہ اپنے گھر بیوی بچوں کے پاس واپس آتے۔ ایک سال گزر جاتا تو اگلے رمضان میں پھر یہی گہری سوچ اس دوران آپ کی جو کیفیت تھی وہ بعد میں بھی لوگوں نے کم ہی بیان کی ہے۔ لوگوں کی باتیں اور جسمانی زندگی آپ کو بے چین کیے رہتی۔ کہا

www.ziaraat.com
Sabeel-e-Sakina

Presented by Ziaraat.Com

پیٹنا اور سونا، عبادت اور جنگ، الغرض آپ کی عادات و اطوار ان مقاصد کے لیے تھیں جو ہماری زندگی کا اصل ہدف ہیں۔ شیخ صدوق نے چند عادات ایسی گنوائی ہیں جو آپ سے مخصوص ہیں۔ ان کے علاوہ کسی چیز سے اور کسی آدمی سے کوئی بات نہیں اور کسی کا خوف پاس نہیں۔

رویائے صادقہ (سچے خواب)

اس میں کوئی امر ممکن ہے کہ پہلے سے آپ دو برس بیداری کی حالت میں ان کیفیات سے دوچار تھے بلکہ خواب میں بھی آپ کی ایک خاص کیفیت تھی۔ آپ خواب میں جو کچھ دیکھتے وہ واضح اور روشن دیکھتے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ خواب دیکھتے کیونکہ خواب ایسے نہیں ہوتے۔ وہ رویائے صادقہ تھے جو سپیدۂ سحر کی طرح آپ کے قلب و باطن کو روشن کر رہے تھے۔ ان میں ہر چیز ویسی ہی واضح اور روشن تھی جیسی آپ دیکھتے تھے۔

ابو نعیم (م ۴۳۰ھ) علی بن حسین علیہما السلام سے اور وہ اپنے جد اکرم علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ فرمایا:

پہلی چیز جو رسول اللہ پر آئی وہ رویائے صالحہ تھے۔ آپ خواب میں جو چیز دیکھتے ویسا ہی دیکھتے جیسی کہ وہ تھی۔[1]

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: نبیوں کے خواب وحی ہوتے ہیں۔[2]

آپ کی زوجہ حضرت عائشہ نے اس بارے میں کہا ہے کہ آپ کی نبوت کے آغاز میں خداوند تعالیٰ نے جو آپ پر پہلی وحی کی وہ رویائے صادقہ، صالحہ تھے۔ آپ خواب ایسے دیکھتے جیسے سپیدۂ سحر۔ حضرت عائشہ نے یہ بھی کہا کہ خداوند تعالیٰ نے تنہائی کو ان کا دوست اور مونس قرار دیا تھا۔ آپ خلوت سے زیادہ کسی چیز کو پسند نہیں کرتے تھے۔[3]

ابن شہاب زہری (م ۱۲۴ھ) کہتا ہے کہ شروع میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر گرامی کو سچے خواب دکھائے۔ یہ بات آپ کے لیے دشوار ہوئی تو حضرت خدیجہ سے اس کا ذکر کیا۔ حضرت خدیجہ نے کہا کہ آپ کو بشارت ہو۔ خداوند عالم آپ کے لیے خیر اور نیکی چاہتا ہے۔[4]

احادیث میں جو ان خوابوں کو رویائے صادقہ، رویائے حسنہ[5] یا رویائے صالحہ کہا گیا ہے[6] وہ اس لیے تھا کہ ان کو ان خوابوں سے جدا سمجھا جائے جو ہر انسان دیکھا کرتا ہے۔ بہت سے انبیاء کے لیے خواب کی بڑی اہمیت رہی ہے۔ یہود کی کتابوں میں ان کی ساری تحریفات کے باوجود، آج بھی ان خوابوں کے اثرات کا ذکر ملتا ہے۔ کتاب مقدس میں خواب دیکھنے والے کی اصطلاح COLEM نبی یا ان جیسے کے لیے موجود ہے[7] کیونکہ وحی اور الہام کے ادراک کا ایک وسیلہ یہی خواب تھا۔ بعض انبیاء (بنی اسرائیل) پر موجودہ عبارت خواب

---

1. سبل الہدیٰ ۱۲: ۳۰۶۔
2. شرح اصول کافی۔ ملا صدرا۔ ۴۵۴۔
3. صحیح بخاری، بدء الوحی ۳، تفسیر سورۃ ۹۶: ۱-۳، تعبیر ۱، ۵، مسلم، صلاۃ ۲۰۷، ۲۰۸، رؤیا ۳، ۴، ۶، ابو داؤد، صلاۃ ۱۴۸، ترمذی، رؤیا ۲، ۳، ۲، نسائی، تطبیق ۸: ۲۲۳، ابن ماجہ، رؤیا ۱... ابن ہشام ۱: ۲۳۴، اسباب النزول واحدی: ۵۔
4. الخصائص الکبریٰ سیوطی ۱: ۲۳۱۔
5. بخاری، تعبیر ۲، ابن ماجہ، رؤیا ۱، الدارمی، رؤیا ۴، طیالسی، رؤیا ۱، احمد بن حنبل ۳: ۱۲۶، ۱۳۵، ۱۴۹، ۲۵۶ [illegible]
6. بخاری، بدء الوحی ۳، تفسیر سورۃ ۹۶: ۱-۳، تعبیر ۱، ۵، مسلم، صلاۃ ۲۰۷، ۲۰۸، رؤیا ۲، ۴، ۶، ابو داؤد، صلاۃ ۱۴۸...
7. سفر تثنیہ ۱۳: ۱، ۳۔

Presented by Ziaraat.Com

میں ظاہر ہوا تھا۔ اسی خواب میں اس سے مخاطب ہوا تھا۔[8] مقدس جیکب پر ظاہر ہوا تاکہ اس کی ہدایت کرے ... [illegible] ... اور جب سلیمان کا خواب ہی تھا جس میں وہ خدا سے مخاطب ہوا تھا۔[9] جس میں خدا نے ان کو ہم کلام کا شرف بخشا اور ایسا نظر نہیں آتا تھا۔[10] ایک رات سیل بار خداوند تعالیٰ نے ان سے کلام کیا۔[11] حزقیال اور عاموس نبی کو بھی خواب میں نبوت ملی۔[12] ایک الہام جو فرشتہ کی مانند غیبی کے سبب سے دیکھا گیا بس یہ دیکھا ہے کہ ایسے لوگوں کا رویا سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ پچھلے زمانے کے لوگ رویا کو اعلانات الٰہی میں سے ایک اعلان سمجھتے تھے جس کی تفسیر و تعبیر کے لئے خاص علم ہوتے تھے۔[13] ان خوابوں میں انبیاء کا مشاہدہ کرتے ... کبھی یہ مشاہدہ واضح اور دلکش ہوتا اور زیادہ مبہم جس کا ... واقعہ کے ظہور پذیر ہو گا۔[14] کبھی یہ بھی ... ایک اشخاص خواب میں ... کا خطاب ہوتا یا احکامات کا ایک طویل مکتوب جو میٹھے شہد کی طرح نبی کو کھلا دیا جاتا۔[15]

قرآن مجید میں بھی نبیوں کے خواب دیکھنے کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت ابراہیم ایسے ہی ایک خواب میں اپنے صاحبزادے کے قربان کرنے کا حکم پاتے ہیں (۳۷ : ۱۰۱ تا ۱۱۲) حضرت یوسف نے سورج چاند اور گیارہ ستاروں کو سجدہ کرتے خواب میں دیکھا تھا (۱۲ : ۴)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خواب کا بھی قرآن میں ذکر ہے۔ آپ نے خواب میں دیکھا کہ آپ اپنے صحابہ کے ساتھ مسجد الحرام تشریف لے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض نے سر منڈوائے ہیں اور بعض نے تقصیر کی ہے۔ خداوند عالم نے اپنے رسولؐ کے خواب کے صدق و حقیقت کو بعد میں سچا کر دکھایا (۴۸ : ۲۷) ایسے ہی وہ خواب جو لوگوں کی آزمائش کی خاطر تھا (۱۷ : ۶۰)۔

علقمہ (م ۶۲ھ) کہتا ہے کہ انبیاء کے قلب پہلے خواب میں تیار ہوتے ہیں تاکہ بعد میں وحی کا نزول ہو سکے۔[16] حدیث میں ہے کہ بعض رویا نبوت کا جزو[17] یا وحی کی ایک قسم یا پھر تیاری کا ذریعہ ہوتے ہیں۔

۸۔ سفر اعداد ۱۲ : ۶؛ ۲۴ : ۴ و ۱۶؛ حزقیل ۱ ؛ ۲ : ۲۸؛ دانیال ۲ : ۱۹ ؛ ۷ : ۱ و ۲؛ ۸ : ۱ — ۲۷۔

۹۔ پیدائش ۲۰ : ۶۔

۱۰۔ ایضاً ۳۲ : ۲۔

۱۱۔ اوّل سموئیل ۳ : ۱۔

۱۲۔ ایضاً ۳ : ۱ بعد۔

۱۳۔ حزقیال باب ۱ — ۳؛ عاموس ۱ : ۱؛ ۸ : ۱؛ ۹ : ۱۔

۱۴۔ میکاہ ۳ : ۶۔

۱۵۔ فرعون کا خواب اور تعبیر حضرت یوسف (پیدائش ۴۱ : ۱ بعد) خواب جو جدعون کے لیے دیکھا۔ اس کی تعبیر (صحیفہ قضاۃ ۷ : ۱۳) جو کہ نصر کا خواب (دانیال باب ۲) و۔۔

۱۶۔ اشعیا : باب ۱۰ و ۱۱۔ زکریا : باب ۹ ؛ یوئیل ۲ : ۲۸ — ۳۲۔

۱۷۔ کتاب حزقیال ۱ : ۱ تا ۳ : ۱۵۔

۱۸۔ سیرۃ ابن کثیر ۱ : ۲۸۸۔

۱۹۔ بخاری تعبیر ۲ ، ۴ ، ۲۶ ، ۱۰ … موطا مالک کتاب رؤیا ، ۱ و ۳ ۔ زاد المعاد فی ہدی خیر العباد ابن قیم جوزیہ ۱ : ۱۹؛ سفینۃ البحار ۱ : ۴۹۹ — ۴۹۴۔

Presented by Ziaraat.Com

جب حضرت عائشہ پر تہمت لگائی گئی تو انہوں نے چاہا کہ آپ کو اس سے آگاہ کریں تاکہ ان کی صفائی میں وحی نازل ہو مگر ان کی امید تھی کہ رسول اللہ خواب دیکھیں جس کے ذریعے خداوند عالم ان کو اس الزام سے بری کر دے ۲۹

اس بات میں بہرحال اختلاف ہے کہ پیغمبر اکرم کے خواب میں وحی نازل ہوتی تھی۔ بعض کا خیال ہے کہ سورہ کوثر خواب میں نازل ہوئی جب رسول اللہ نے مسجد میں سب کے سامنے خواب دیکھا اور تبسم ہو کر آنکھیں کھولیں اور لوگوں کو سورہ کوثر کے نازل ہونے کی خبر دی ۳۰ مگر یہ ایک قابل قبول نہیں ہے کیونکہ سورت کوثر کہیں پہلے نازل ہو چکی تھی۔ علاوہ ازیں اگر اس وقت خواب کی سی کیفیت طاری رہی تھی تو وہ وحی نازل ہونے کی مختلف صورتوں میں سے ایک ہو گی لیکن خواب نہیں تھا جس میں وحی نازل ہوا کرتی تھی۔ مگر رات کے وقت وحی کے ظہور کی گواہی قرآن میں بھی ہے (مثلاً ۲:۱۴۴، ۹۴:۱۰۱) روایات میں بھی ان کے بارے میں بہت اشارے ملتے ہیں ۳۱

بہرصورت یہ معیار صادقہ وحی کی قسم نہیں۔ یہ وہی وقت ہے جب رسول خدا کا آمادہ ہونا تھا کہ جبرئیل کے توسط سے وحی الٰہی حاصل کر سکیں۔ رویاء کی اس روشنی کو نورانی شعاعوں کا ایک اشارہ کہا گیا ہے جو آپ کی روح مقدس پر منکشف ہوئیں تاکہ فاضہ روح القدس کو آپ کے لیے حاضر کیا جا سکے۔ بعثت سے پہلے اس کیفیت کو تین سال یا چھ مہینے یا تین مہینے کہا گیا ہے ۳۲

پیغمبر کا خواب دوسروں کے خواب سے مختلف ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

تَنَامُ عَيْنِيْ وَلَا يَنَامُ قَلْبِيْ

میری آنکھیں خواب میں ہیں مگر میرا دل بیدار ہے ۳۳

پیغمبر اکرم ۳۴ کی عمر

چالیس سال انسان کی وہ عمر ہے کہ کمال انسانی اور عقلانی شمار کیا جاتا ہے۔ اس عمر میں عقل اپنے اوج کمال کی منتہا پر پہنچی ہوتی ہے قرآن حکیم میں بھی نشو و نما اور رشد کے اس مرحلے کی طرف اشارہ ہوا ہے (۴۶:۱۵) بہت سی روایات اس بات پر گواہ ہیں کہ پیغمبر خدا پر اسی عمر میں وحی الٰہی نازل ہوئی تھی اور آپ اپنی رسالت کی تبلیغ پر مامور ہوئے تھے ۳۵

---

۲۹ بخاری التفسیر سورہ نور ۶، احمد بن حنبل ۶: ۱۹۷۔

۳۰ در منثور ۶: ۴۰۱۔ اسباب النزول سیوطی۔

۳۱ اتقان ۱: ۲۳۔ مباحث فی علوم القرآن۔ مناع القطان: ۳۷ بیروت ۱۳۹۶ھ

۳۲ اتقان ۱: ۸۱ کے آگے۔ نوع ۳۔

۳۳ مناقب شہر آشوب، بحار الانوار از کتاب مجلس ۲: ۳۱۷۔ مناہل العرفان ۱: ۴۵۔

۳۴ بخاری التہجد ۱۶، تراویح ۱، مناقب ۲۴، مسلم مسافرین ۱۲۵۔ طیالسی، لیل ۹۔ ابو داؤد، طہارۃ ۹۷، ترمذی، مواقیت ۲۰۸، احمد بن حنبل ۱: ۲۲۰، ۲۷۸، ۲: ۲۵۱ ... الدارمی، المقدمہ باب ۱، طبقات ابن سعد ۱/۱/۱۱۲، ۱۳۱۔

۳۵ التمہید فی علوم القرآن [illegible] صحیح حسین بن مبارک زبیدی ۱: ۲۲۰ باب بعث النبی۔ زاد المعاد۔ ابن قیم جوزیہ ۱: ۱۹۔ بخاری، مناقب ۲۳، لباس ۶۸، مناقب الانصار ۱۹۱، مسند طیالسی [illegible] بعثت [illegible] چالیس سال کی عمر [illegible]

Presented by Ziaraat.Com

کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوشنبہ[3] کے دن ۱۷ رمضان یا ۲۷ رجب قبل ہجرت ۱۳ سال پہلے مطابق ۶ اگست یا یکم فروری ۶۱۰ء (جب چالیس سال چھ ماہ اور آٹھ روز قمری (۳۹ سال، تین ماہ اور آٹھ روز شمسی) کے ہو گئے تو مبعوث برسالت ہوگئے۔[4]

پیغمبر اکرم کی بعثت کعبہ کی تعمیر کے پانچ سال بعد، خسرو پرویز ساسانی کی سلطنت کے بیس سال بعد، مدینہ میں یوم الفجار[5] اور ایاس بن قبیصہ طائی کی حیرہ پر حکومت[6] کے دو سال بعد ہوئی۔ عرب میں غسانی علاقے روم کے ماتحت تھے جبکہ لخمی ایران کے ماتحت تھے، آل حمیر جو کہ یمن کے علاوہ قبیلہ کندہ متنازعہ ہو رہا تھا۔ شام، ایشیائے کوچک اور جنوبی عراق ایران اور روم کی کشمکش کا ہدف تھے۔ افغانستان ہنوز ترکوں اور ساسانیوں اور ہیاطلہ کے درمیان تنازع کا سبب تھا۔ ماوراء النہر ترکوں کے زیر فرمان تھا۔ مصر اور شمال افریقہ اور مشرقی یورپ بھی مشرقی روم کے ماتحت تھا۔ اس زمانے میں کلمبا COLUMBA کے مبلغ مسیحیت کو شمالی انگلستان لے گئے اور گریگوری کے مبلغ کینٹ سے شمال اور مغرب کی طرف جا رہے تھے۔ فرانس میں میروونژ MEROVINGE نامی بادشاہ وسیع علاقے پر حکمرانی کر رہے تھے۔ مغربی روم کا شہنشاہ وحشیوں کے حملے سے شکست کھا چکا تھا اور مشرقی روم کا شہنشاہ (قسطنطنیہ) فوکاس کے زمانے میں داخلی شورش میں الجھا ہوا تھا۔[7]

اس دور میں رسول اللہ کی عمر کیا تھی، ماہ و سال کے تعین میں بہت اختلاف نظر آتا ہے۔ بہت سی روایات نے چالیس سال کی عمر بتائی ہے۔ مگر کہیں ۳۷ سال اور ۴۱ سے لے کر ۴۳ سال تک کا ذکر ملتا ہے۔[8] بعثت کس مہینے میں ہوئی؟ اس بارے میں رمضان، رجب اور ربیع الاول تینوں کا ذکر ہے۔ پہلی بار جبرئیل کے نازل ہونے کی تاریخیں یہ لکھی ہیں: ۷، ۱۴، ۱۷، ۱۸ و ۲۴ ماہ رمضان۔ ۳، ۸ و ۱۲ ربیع الاول اور

---

۳ پیغمبر نے بلال سے فرمایا: "... روزِ دوشنبہ کو کبھی نہ بھولنا۔ میں اسی روز دنیا میں آیا، اسی روز مبعوث ہوا اور اسی روز وفات پاؤں گا ..." شرح المواہب واللدنیہ ۲: ۲۸۳؛ مسند احمد ۴: ۱۰۷؛ سیرۃ ابن کثیر ۱: ۳۹۳۔

۴ محمد، محمد رضا۔ ۵۹۔ نور الیقین فی سیرۃ سید المرسلین و محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ، شیخ محمد الخضری۔ ۶۹۔ یہ تاریخ کا حساب کتاب اس کے مطابق ہے جو محمود پاشا (محمود بن علی مصری) استاد ریاضی (۱۲۲۰-۱۳۰۳ھ) نے لگایا تھا۔ انہوں نے ۱۸۵۸ء میں اسلام سے پیشتر کی تاریخ کے بارے میں پیرس (فرانس) میں ایک رسالہ شائع کیا تھا۔ جو بعد میں استاد احمد زکی پاشا (م ۱۹۳۵ء) کے عربی ترجمے کے طور پر چھپا۔ (نتائج الافہام فی تقویم العرب قبل الاسلام۔ طبع بولاق) معروف مصری ریاضی دان نے آغاز وحی کو فروری ۶۱۰ء سے شمار کیا ہے۔ مگر مصری ایک نے اس کو غلط کہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ حساب ان بعض روایات پر مبنی ہے جس میں بعثت کو عمر کے چالیسویں سال کے شروع سے منسوب کیا ہے۔ علاوہ ازیں محمود پاشا کے کام کی بنیاد پر بحث ہو سکتی ہے۔ مگر بہر صورت ان کے زمانے میں یہ کام خاصی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ اس کتاب کو بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے: التوفیقات الالہامیۃ فی مقارنۃ التواریخ الہجریۃ بالسنین الافرنکیہ والقبطیہ۔ مختار پاشا، بولاق ۱۳۱۱۔

۵ مروج الذہب مسعودی۔ ۲: ۲۸۱۔

۶ بلاذری ۱: ۱۰۳ کے آگے۔

۷ BELLS INTRODUCTION, P. 1

۸ طبری ۲: ۲۰۱۔ امتاع الاسماع ۱: ۱۳۔ تاریخ الاسلام ذہبی ۱: ۶۹۔ الکامل ابن اثیر ۲: ۴۶۔ ابن خلدون ۲: ۶۹۳۔ البدایۃ والنہایۃ ابن کثیر ۳: ۱۱۔ ۲۔ شرح المواہب ۱۵: ۹۹۔ الروض ۱: ۲۸۴۔ سبل الہدیٰ ۲: ۳۰۳۔ بخاری، مناقب ۲۳۔ ترمذی، مناقب ۴۔

Presented by Ziaraat.Com

۲۷ رجب[8] دن شنبہ یکشنبہ یا دوشنبہ[9] بیشک دوسرے اقوال بھی ہیں۔

ابن اسحاق اس آیت شریفہ سے استناد کرتے ہوئے،

إِنْ كُنْتُمْ آمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ وَاللّٰهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۸:۴۱)

اگر خدا پر اور اس پر جو اپنے بندے پر روز فرقان یعنی جس دن دو فوجیں (جنگ بدر میں) آمنے سامنے ہوئی تھیں خدا نے نازل فرمایا تھا ایمان لائے ہو تو جان رکھو کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

کہتا ہے کہ رسول خدا جمعہ کی صبح ۱۷ رمضان کو بدر میں مشرکوں کے مقابل ہوئے تھے آپ کی بعثت بھی اسی روز ہوئی تھی[10]۔

یہ امکان ہے تو دلپسند مگر کافی نہیں ہے۔ کیونکہ بہت سے لوگوں نے لیلۃ القدر کو، جب قرآن نازل ہوا اور بعد میں اس کا ذکر بھی آیا، رمضان کے آخری عشرے میں بتایا ہے اور اس کو ۲۱ یا ۲۳ رمضان کی رات جانتے ہیں[11] اور ایسی احادیث اس سے مطابقت نہیں رکھتیں کہ وہ ۱۷ رمضان تھی۔ علاوہ ازیں اس آیت سے صریح نص نہیں ملتی کہ یوم الفرقان اور لیلۃ القدر، جب قرآن نازل ہوا، دونوں ایک ہی ہیں۔ بلکہ آیت کا ظاہر یہ ہے کہ جو کچھ ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا، وہ فرشتے اور کامیابی اس روز خدا کی نصرت سے حق و باطل کے درمیان یا اسلام اور کفر کے درمیان پہلا بڑا فصل پیدا ہوا اور اسلام کی قوت و طاقت مستحکم ہوگی۔

مفسرین کا بھی یہی کہنا ہے اور قرآن کے سیاق سے بھی اسی کا پتہ چلتا ہے۔

شیعہ علماء رسول اکرم کی بعثت ۲۷ رجب المرجب بتاتے ہیں۔ ائمہ ہدیٰ علیہم السلام سے اس سلسلے میں بہت سی احادیث آئی ہیں[12] جیسے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا، ۲۷ رجب کا دن تھا جب رسول اللہ پر نبوت نازل ہوئی[13] اور یہ بھی فرمایا، ۲۷ رجب کا روزہ ترک نہ کرنا کیونکہ اسی دن محمد پر نبوت نازل ہوئی تھی[14]۔ حقیقی اختلاف وحی نازل ہونے کے وقفے کے دنوں کے حساب میں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قرآن ماہ رمضان میں نازل ہونا شروع ہوا۔ مگر بعثت اور نبوت ۲۷ رجب کو ہی تھی۔ بعض لوگوں نے چاہا ہے کہ ان مختلف روایات کو یہ کہہ کر ہم آہنگ کریں

---

[8] طبقات ابن سعد ۱: ۱۹۳۔ سیرۂ حلبیہ ۱: ۲۷۲، عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر ابن سید الناس ۱: ۸۸ قاہرہ ۱۳۵۶۔ ابن کثیر ۳: ۶، یعقوبی ۲: ۱۵۔ زینی دحلان ۱: ۹۲، بحار الانوار ۱۸: ۱۹۰۔

[9] طبری ۲: ۳۰۲۔ امتاع الاسماع ۱: ۱۴۔ یعقوبی ۲: ۱۷۔۱۸۔ مروج ۲: ۲۸۲۔

[10] ابن ہشام ۱: ۲۴۰۔

[11] مسلم، صلوٰۃ المسافرین ۱۷۹ و ۱۸۰، ابو داؤد: رمضان ۲۔۶، ترمذی: صوم ۲، تفسیر سورۂ قدر ۳۔ نسائی: صیام ۵، ابن ماجہ صیام ۲۔ دارمی: صوم ۵۶، موطا: اعتکاف ۱/ ۱۲، ۶/۱۲، ۲۳۰/۲۸۵/۲۵۰، و ۳: ۵۹، و ۵: ۱۳۰/۳۲/۱۳۶۹/۲۱۶، طیالسی: اعتکاف ۹/۱۲، سفینۃ البحار ۲: ۴۱۱۔

[12] بحار الانوار ۷/۱۹: ۲۲ (چاپ جدید ۱۸: ۲۰۶ و ۹۲: ۳۹)، حیاۃ القلوب ۲: ۲۵۷، وسائل الشیعہ حر عاملی، صوم مندوب: باب ۱۵۔

[13] امالی ابو الشیخ ۲۸، بحار الانوار ۱۸: ۱۸۹ طبع آخوندی۔

[14] کافی ۴: ۱۴۹۔ مناقب ابن شہر آشوب ۱: ۱۵۰، بحار الانوار ۱۸: ۲۳۴۔ منتخب کنز العمال در حاشیہ مسند ۳: ۳۶۲۔

Presented by Ziaraat.Com

کہ رمضان سے پہلے وحی خواب میں نازل ہوئی تھی اور رمضان میں بیداری کی حالت میں۔[15] مگر اس بارے میں بھی غلطی کی گنجائش ہے۔ ایک روایت یہ بھی ملتی ہے کہ رمضان میں پورا قرآن اترا اور بعثت کا آغاز ۲۷ رجب کو ہوا تھا۔

غارِ حرا

بعثت کے زمانے پر ہم نے نظر ڈالی۔ کیا اچھا ہو کہ اس جگہ کو بھی دیکھیں جہاں پہلی بار پیغمبر اکرمؐ پر وحی الٰہی نازل ہوئی۔

مکے کے اطراف میں پہاڑیاں واقع ہیں جن کو عرب جبل کہتے ہیں۔ ان میں سے ایک ثبیر ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں حضرت ابراہیمؑ نے حکم الٰہی کے تحت اپنے فرزند حضرت اسماعیلؑ کو قربان کرنا چاہا تھا۔ یہ کافی اونچا ہے اور اس کی اہرام کی سی شکل ہے۔ اس کے سامنے کوہ نور ہے۔ یہ تین میل دور مکے سے شمال مشرق میں ایک مخروطی چوٹی میں ابھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ بائیں ہاتھ عرفات کو راستہ جاتا ہے جو مکے سے دو فرسخ ہے اور ۲۰۰ گز مرتفع ہے۔ پتھریلی چٹانیں اور خاردار جھاڑیاں راستے کو دشوار بنا دیتی ہیں۔ اس پہاڑی کی چوٹی تک پہنچنے میں تقریباً ایک گھنٹہ لگتا ہے۔ یہاں سے رسول اللہؐ کے گھر تک چند کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ چٹانوں کے پیچ و خم سے نکل کر ایک سطح جگہ، ہموار چوٹی نکل آتی ہے۔ یہاں سے مسجد الحرام اور مکے کے گھر نظر آتے ہیں۔ اس سطح جگہ پر یہ پہاڑ آسمان کے درمیان ایک جزیرہ نظر آتا ہے۔ پہاڑی کی چوٹی سے کچھ فاصلے پر ایک بڑا حوض نظر آتا ہے جو حجاج نے پہاڑ کے اندر کھدوا رکھا ہے۔ اس میں وہ پینے کا پانی ذخیرہ کرتے تھے۔ اس پہاڑی کا رنگ زنگ کے جیسا ہے، ابوالہول کی طرح خمیدہ دکھائی دیتی ہے جس کا سر مکہ کی طرف ہو۔ پہاڑی کے جنوب مغربی دامن میں، چوٹی سے ۱۶۰ میٹر پر ایک چھوٹا سا غار ہے جو غارِ حراء کے نام سے مشہور ہے۔ یہ شمال میں ہے اور ۵۰ گز کی مسافت ہے۔ اس غار کے قریب پتھر کے دو بڑے بڑے ٹکڑے جڑے ہوئے ہیں جن کے درمیان سے ذرا مشکل سے گھسا جا سکتا ہے۔ پتھروں کی ان چٹانوں کے ٹوٹنے سے یہ غار وجود میں آیا تھا۔ اس کی دیواریں اور چھت پتھر ہی کی ہیں کہ جو سطح ہیں اور نکیلے نہیں ہیں۔ ایک درمیانہ قد کا آدمی اس میں کھڑا ہو سکتا ہے اور ایک ہی آدمی اس غار میں لیٹ بھی سکتا ہے۔ غار میں جب آدمی بیٹھتا ہے یا لیٹتا ہے تو سامنے کعبہ نظر آتا ہے۔ بقول ابن ابی جمرہ غارِ حرا میں گوشہ نشینی کے تین پہلو ہیں: خلوت، عبادت و ریاضت اور خانۂ خدا پر نظر۔[16] اس غار کا فرش سطح ہے اور اس پر نرم سنہری ریت بچھی ہوئی ہے۔ ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان صحرا خاردار جھاڑیوں سے بھرا ہے۔ افق تک حجاز کا وسیع بیابان پھیلا ہوا ہے جس میں پتھریلی پہاڑیاں دور تک نظر آتی ہیں۔ آج بھی یہ غار زائرین کی آماجگاہ ہے۔[17] پیغمبر اکرمؐ بعثت کے بعد بھی کبھی کبھی اس غار کی طرف جاتے۔ طائف سے واپسی میں بھی آپ یہاں آئے تھے اور کچھ دیر قیام کیا تھا۔

---

۱۵ الخمیس ۱: ۳۱۶۔

۱۶ سبل الہدیٰ۔ ۲: ۳۱۹۔

۱۷ سفرنامہ مکہ — فرہاد میرزا (۱۳۰۵ھ) ۱۹۹ طبع ۱۳۹۶ — پیامبر رحمت — ۱: ۲۲۸ نقل از مرآت الحرمین وفی منازل الوحی — ان کے مؤلف ذاتی طور سے اس پہاڑ پر زیارت کے لیے گئے تھے۔ سیرہ ابن کثیر ۱: ۲۹۰ — اخبار مکہ — ازرقی — مرآت مکہ — صبری ۱۱۱۵ — پیامبر اسلام — ڈاکٹر محمد حمید اللہ، طبع پیرس ۱۹۵۹ دائرۃ المعارف اسلام — ۲: ۳۱۵ — سفر عربستان — برکہارٹ — ۱: ۳۰۲ — یاقوت — معجم البلدان — ۲: ۲۲۸۔

Presented by Ziaraat.Com

آغاز وحی

غارِ حرا میں گوشہ نشینی اور غور و فکر کے دوران ہی ایک مرتبہ حضرت جبرئیل امین پیغمبرؐ پر نازل ہوئے تھے اور پہلی وحی الٰہی لائے تھے۔ اس بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے مگر بہتر ہو گا کہ خود آنحضرتؐ کی زبانِ مبارک سے ایک حدیث سنی جائے جس میں پوری تفصیل موجود ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

"میں سو رہا تھا کہ جبرئیل میرے پاس ریشم کا ایک پارچہ لائے جس میں ایک کتاب[1] تھی۔ اور کہا: پڑھیں! میں نے کہا میں پڑھ نہیں سکتا[2]۔ اس پر مجھ کو ایسا دبا ڈالا کہ میں سمجھا کہ یہ میری موت کا وقت ہے۔ پھر مجھے چھوڑا اور کہا کہ پڑھیں! میں نے کہا میں پڑھ نہیں سکتا۔ پھر مجھ کو ایسا دبا ڈالا کہ میں سمجھا موت کا وقت آپہنچا۔ پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا کہ پڑھیں! میں نے کہا میں پڑھ نہیں سکتا۔ دوبارہ مجھ کو دبا کر ڈالا اور بھینچا کہ میں سمجھا موت آگئی اور پھر چھوڑ دیا[3] اور کہا کہ پڑھیں! میں نے کہا کیا پڑھوں۔ یہ بات اس لیے کہی کہ دوبارہ میرے اوپر وہی حالت نہ گزرے جو ابھی گزر چکی۔ پھر کہنے لگے:

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ. خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ. اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ. الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ. عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (۹۶: ۱-۵)

(اے رسولؐ) اپنے پروردگار کے نام سے پڑھیں جس نے پیدا کیا۔ اس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔ پڑھیں تمہارا پروردگار بہت کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے تعلیم دی۔ اس نے انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔"

یہ قرآن کا پہلی بار آشکار ظہور تھا جو آئندہ ۲۳ سال جاری رہا۔

یہ وہ لمحہ تھا جب پیغمبر اکرمؐ نے اپنے دل پر ایک کتاب لکھی ہوئی پائی جس سے آپؐ نے انسانیت کے سامنے ایک نیا راستہ پیش کیا۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ پیغمبرؐ اس حال میں کہ آپ کا دل ان آیات سے تڑپ رہا تھا حضرت خدیجہؓ کے پاس آئے۔

اس روایت میں خواب اور رویا کی بات ہو رہی ہے۔ پیغمبرؐ سو رہے تھے کہ آپ نے حضرت جبرئیل کو دیکھا۔ بعض احادیث میں کہا گیا کہ یہ واقعہ سحر کے وقت کا ہے۔ سحر روزِ دوشنبہ، ۱۷ ماہِ رمضان، ہجرت سے ۱۳ سال پہلے۔ ایک روایت جو حضرت عائشہ سے نقل ہوئی

---

[1] بعض مفسرین "الٓمٓ ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ" (۲: ۱ اور ۲) کو جبرئیل کی لائی ہوئی کتاب کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں، جب انہوں نے کہا کہ "اقرأ"۔ الروض الانف۔ سہیلی۔

[2] "قلت ما اقرأ" شرح مواہب اور دوسری کتابوں میں "ما انا بقارئ" عینی میں بھی دوسروں کی طرح ہے کیونکہ سنانا پڑھنے کے بعد ہوتا ہے اور میں نے اس کو نہیں پڑھا ہے۔

[3] کہا گیا ہے کہ ممکن ہے "اِقْرَأْ" کی تکرار میں حکمت یہ ہو کہ یہاں تین چیزوں سے ہے، گفتار، کردار اور نیت۔ وحی میں بھی تین چیزیں شامل ہیں، توحید، احکام اور قصص (شرح المواہب)۔ ممکن ہو خود مختار رسول اللہ پر تین قسم کی شدائد کا جن سے آپ دوچار ہوئے اور پھر ان سے چھٹکارا حاصل ہوا۔ اول قریش [illegible] ابی طالب [illegible] دوسرے قریش کا آپ کے قتل کا اجتماع [illegible] سب سے زیادہ شدید تھے۔ سہیلی۔

Presented by Ziaraat.Com

ہے اس میں خواب کا ذکر نہیں ہے۔ مگر اس کے شروع میں رویائے صادقہ پر گفتگو ہے۔ بعد میں حضرت جبرئیلؑ کے آنے اور وحی نازل ہونے تک بات پہنچی ہے۔ درحقیقت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس حدیث میں پہلی وحی خواب کی حالت میں یا بیداری کی حالت میں نازل ہوئی۔ اگر ہم یہ ایک ان دونوں احادیث سے مطلب نکالیں تو کہنا پڑے گا کہ جبرئیلؑ اوّل اس وقت نازل ہوئے جب پیغمبرؐ سوئے ہوئے تھے اور بلا فاصلہ بیداری کی حالت میں ہو گئی۔[۱۴]

آپؐ نے فرمایا:

"چنانچہ میں باہر گیا۔ آدھے پہاڑی راستے پہنچا تھا کہ آسمان سے ایک آواز سنائی دی۔ صدا آئی کہ اے محمدؐ آپ خدا کے پیغمبر ہیں اور میں جبرئیل ہوں۔ میں نے اپنا سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ جبرئیلؑ ایک انسان کی شکل میں کھڑے تھے۔ ان کے دونوں پیر آسمان کے دونوں کناروں پر ٹکے ہوئے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ اے محمدؐ آپ خدا کے پیغمبر ہیں اور میں جبرئیلؑ ہوں۔

میں ان کو دیکھنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ نہ آگے بڑھا نہ پیچھے ہٹا۔ ان سے نظر ہٹائی تو جدھر نگاہ گئی ان کو ہر طرف کھڑا دیکھا۔ اسی طرح میں کھڑا تھا۔ نہ ایک قدم آگے بڑھایا نہ ایک قدم پیچھے ہٹایا۔ خدیجہؓ نے اپنے لوگوں کو مجھے بلانے کے لیے بھیجا ہوا تھا۔ وہ سارے شہر میں گھوم پھر کر واپس آ گئے تھے۔ میں اسی جگہ کھڑا رہا۔ پھر وہ (جبرئیلؑ) میرے پاس سے چلے گئے۔"

یہ پہلی بار تھی کہ جبرئیلؑ کو آمنے سامنے دیکھا تھا۔ جبرئیلؑ نے مقام ظہور میں مغرب و مشرق کے افق کو گھیرا ہوا تھا اور کہا گیا ہے ساری فضا کو ۶۰۰ یا ۶۰۰۰ پروں سے بھر دیا تھا۔ جبرئیلؑ کا یہ وسیع ظہور ان کے اور خلق کے درمیان سارے جہات و جوانب پر جبرئیلؑ کے احاطہ کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ ان کی اس حقیقت عقلی کی مثال پیغمبر اکرمؐ کی نگاہوں میں تھی ورنہ

احمد ار بگشاید آن پر جلیل — تا ابد مدہوش گردد جبرئیل[۱۵]

پیغمبر اکرمؐ نے اپنا اور جبرئیلؑ کا قصہ حضرت خدیجہؓ کو سنایا:

"میں اپنے لوگوں کے پاس گھر واپس آیا اور خدیجہؓ کے پاس جا کر بیٹھا۔ انہوں نے دریافت کیا کہ اے ابوالقاسم آپ کہاں تھے؟ میں نے آپؐ کی تلاش میں کچھ لوگوں کو بھیجا تھا۔ وہ لوگ سارے مکہ میں تلاش کر کے واپس آ گئے۔

(اس کے جواب میں) میں نے جو کچھ دیکھا تھا وہ ان سے بیان کیا۔ (اسے سن کر) انہوں نے کہا کہ اے پسر عم[۱۶] آپ کو بشارت ہو اور آپؐ کی عمر دراز ہو۔ اس کی قسم جس کے ہاتھوں میں خدیجہؓ کی جان ہے مجھے توقع ہے کہ آپؐ ان لوگوں کے پیغمبر ہیں۔[۱۷]

یہ اس بارے میں ان احادیث میں سے ایک تھی جو صحابہ اور تابعین سے نقل ہوئی ہیں۔[۱۸] عبید بن عمیر اس حدیث کو عبداللہ بن زبیر (۱-۲۰۳)

---

۱۴ الروض الانف سہیلی ۲: ۳۹۲۔ سیرۂ حلبیہ ۱: ۲۷۲۔

۱۵ مثنوی معنوی ۳: ۵۰۳۔

۱۶ پسر عم کا خطاب عربوں میں مروج تھا۔ اس سے قربت اور یگانگت مراد ہوتی تھی۔

۱۷ سیرۂ ابن ہشام ۱: ۲۵۲-۲۵۴ طبع ۱۳۵۵ مصر۔

۱۸ آغاز وحی کو ملاحظہ کریں: مناقب ابن شہر آشوب ۱: ۴۰-۴۴، بحار الانوار مجلسی ۱۸: ۲۰۹، بخاری: بدء الوحی ۳، مناقب الانصار ۲۸، تعبیر ۱، مسلم: ایمان ۲۵۲-۲۵۴، ۱۵۳، ۲۲۲، التمہید زبیدی ۱: ۴۲، طبقات ابن سعد ۱/۱/۱۲۹، تاریخ ذہبی ۱: ۷۴، ۹۰، الاستیعاب ۱۲، طبری ۲: عبید بن عمیر

Presented by Ziaraat.Com

کے یہ نقل کرتا ہے۔ وہب بن کیسانی (م ۱۲۷ھ) نے جو وہاں موجود تھا بعد میں اس کو دوسروں سے نقل کیا۔ عبید بن عمیر کے کبار تابعین میں سے ہے۔ رسول اللہ کے عہد میں پیدا ہوا تھا اور شیرخوارگی میں رسول اللہ کی وفات ہوئی۔ رسول اللہ سے براہ راست کچھ نہیں سنا تھا۔ زیادہ تر اپنے باپ اور دوسرے صحابہ سے احادیث نقل کی ہیں۔ مگر اس حدیث کی سند نہیں بتاتا کہ آیا پیغمبر نے فرمایا یا گر نہیں کہتا کہ خود اس نے کس سے سنا جس کے نتیجے میں یہ حدیث مرسلہ ہے یعنی ایسی حدیث ہے جس میں صحابی کا نام نہیں جس نے خود پیغمبر سے سنا ہو۔ یاں عبید رواۃ شش گروہ میں سے ایک ہے[۹] اس کو ثقہ سمجھا گیا ہے[۱۰] مگر مرسل بھی سرزنش کے قابل ہی سمجھا گیا ہے[۱۱]

مگر روایت جو حضرت عائشہ (۹ قبل ہجرت ۔ ۵۸ھ) سے نقل ہوئی ہے مسند اور مرفوع ہے اور زیادہ معتبر ہے۔ بیشک حضرت عائشہ نزول وحی کے زمانے میں ابھی پیدا نہیں ہوئی تھیں اور خود اس کی شاہد نہیں تھیں (ہجرت کے دوسرے سال رسول اللہ کی زوجہ بنیں۔ مگر یقینی طور سے رسول اللہ سے یا کسی صحابی سے سنا ہوگا[۱۲]

بہرصورت گفتار عائشہ ہے، نبی اکرم کے قول کی نقل نہیں ہے۔ اس روایت اور عبید کی روایت میں بنیادی فرق وحی خواب یا بیداری کے ذکر کا ہے۔ اس کے علاوہ آسمان میں جبرئیل کو دیکھے جانے کا بھی یہاں ذکر نہیں تھا۔

ایک دوسری روایت عبداللہ بن شداد بن الہاد سے طبری نقل کرتا ہے[۱۳] جو حضرت عائشہ کی روایت کی ایک طرح تلخیص ہے۔ اس میں بھی خواب یا بیداری کا یا جبرئیل کے دیکھنے کا ذکر موجود نہیں۔ عبداللہ اکابر تابعین اور رواۃ ستہ، ثقہ، فقیہ اور کثیر الحدیث میں سے ہے[۱۴] وہ امیر المومنین حضرت علی کے خاص اصحاب میں سے تھا اور جنگ نہروان میں قتل ہوا[۱۵] یہ حدیث بھی مرسل ہے۔ صحابی کا نام موجود نہیں ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ابو موسیٰ اشعری (۲۱ ۔ ۴۴ھ)، مجاہد (۱۰۲ھ) اور زہری (۱۲۴ھ) نے بھی اس بارے میں کچھ نقل کیا ہے[۱۶] شیعہ حدیثوں میں یہ

بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ:۔ ۲۰۱ (۱ : ۱۴۷ وغیرہ)، عیون الاثر ابن سید الناس ۱ : ۸۰، ۸۴، زاد المعاد ابن قیم ۱ : ۱۹/۳۳، سیرۃ ابن کثیر ۲ : ۳۰۶، اخبار مکہ ازرقی ۲۲۶، ۱۳۳، سیرۃ حلبیہ ۱ : ۲۷۲، تفسیر طبری ۳۰ : ۱۶۲ بولاق، تاریخ الخمیس دیار بکری ۱ : ۲۸۰، ۳۲۰، قسطلانی ۲ : ۳۸ (باب بدء الوحی)، مسعودی ۲ : ۱۳۳، تفسیر امام فخر سورۃ العلق ۹۶، مشکوۃ المصابیح محمد بن عبداللہ تبریزی : ۵۱۳ بہ بعد (باب مبعث و بدء الوحی)، اتقان ۱ : ۱۹ بعد طبع محمد ابو الفضل ابراہیم، دائرۃ المعارف اسلام کلمہ وحی، تاریخ قرآن نلدکے ۸۔

۹ طبقات ابن سعد ۵ : ۳۲، کبیر بخاری ۳ : ۱/۴۵۵، معارف ابن قتیبہ ۱۹۲، حلیۃ الاولیاء ۳ : ۲۶۶، تہذیب عسقلانی ۷ : ۱۱۴، شذرات ابن العماد ۱ : ۸۲۔

۱۰ اسد الغابہ ۳ : ۳۵۲۔

۱۱ کفایۃ خطیب ۱۷۶، باب مفیر لدنا مثل۔

۱۲ فتح الباری ۸ : ۵۸۱۔

۱۳ طبری ۱ : ۱۱۴۸۔

۱۴ مگر منقطع سند ہے معجم رجال الحدیث حضرت آقای خوئی ۱۰ : ۲۲۶۔

۱۵ اسد الغابہ ۳ : ۱۸۳، التقریب ۲۰۲، اختیار معرفۃ الرجال کشی ۵۷، خلاصہ علامہ ۱۰۵، منہج استرآبادی ۲۰۰ب، المنتہی کربلائی ۱۸۶، طبقات ابن سعد ۹ : ۸۶، کبیر بخاری ۳ : ۱/۱۱۵، تہذیب نووی ۳۴۹، بدایہ ابن کثیر ۹ : ۲۷، تہذیب عسقلانی ۱۵ : ۲۵۔ شذرات ابن العماد ۱ : ۹۰۔

۱۶ اتقان سیوطی ۱ : ۹۲ طبع ابراہیم۔

Presented by Ziaraat.Com

ابن شہر آشوب[۱۴] (۵۸۸ھ) مجلسی (۱۱۱۱ھ)[۱۵] نے بھی اس حدیث کو نقل کیا ہے مگر اس کی سند ذکر نہیں کی ہے۔

ایک دوسرا نکتہ لفظ "اقرأ" سے متعلق ہے۔ عام طور سے اس کا ترجمہ "پڑھو" کیا گیا ہے۔ بعض مستشرقین نے اس معنی سے غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے اور پیغمبر کے "امّی" ہونے کو رد کیا ہے (جو امّی ہو اس سے کس طرح کہا گیا کہ پڑھو)۔ بعض دوسروں نے "اقرأ" کے معنی لیے ہیں (پڑھ کر سناؤ، اعلان کرو)۔ یہاں پیغمبر کے امّی ہونے کی بحث چھڑ جاتی ہے[۱۶]

پیغمبر کے امّی ہونے کی بحث میں مستشرقین کا جواب دیا جائے گا۔ مگر اس نکتے (امّی ہونے) کی عظمت کا ذکر یہاں ہونا چاہیے کہ جس نے نیز بیلو تک کو استعجاب میں مبتلا کر دیا اور ان سے تحسین حاصل کی۔ وحی کا آغاز خدا تعالیٰ کا معاشرۂ انسانی کے لیے حیات جاودانی کے پیغام کا آغاز "اقرأ" یعنی "پڑھو" کہنے سے ہوا۔ قرآن پیغمبرؐ پر نازل ہوا۔ انھوں نے نہ کوئی درس پڑھا تھا، نہ کتاب پڑھی تھی، نہ قلم سے آشنا تھے اور نہ کسی استاد سے واقف تھے۔ مگر آغاز اس کا اسی "اقرأ" سے ہوا اور تعلیم سے ہوا، پڑھنے اور سیکھنے سے ہوا۔ سارے کا سارا قرآن تدبر، تفکر، تعقل، تحقیق اور مطالعے کی دعوت ہے۔ وہ پیغمبرؐ جو صحرا میں پلے بڑھے، عرب کے بیابان میں جوان ہوئے، یکایک معاشرۂ انسانی کی اصلاح کی دعوت دیتے ہیں اور پیام "اقرأ و تعلیم" آگے بڑھاتے ہیں۔ اپنے پروردگار کے نام سے پڑھو۔ جس نے انسان کو علق، (جمے ہوئے خون) کے مرحلے سے اس ترقی و کمال تک پہنچایا۔ جس کے سامنے کمالِ معنوی اور جمالِ روحانی کی ایک دنیا پھیلی ہوئی ہے۔

اس طرح "پڑھو اپنے پروردگار کے نام سے" وحی کا آغاز ہوا۔

جبرئیلؑ امین

جو وحیِ الٰہی کو پیغمبر اکرمؐ تک پہنچاتے اور وحیِ خدائی کا واسطہ تھے، وہ جبرئیلؑ نام کے فرشتہ ہیں۔ ان کے ذمہ رسولِ خداؐ تک ابلاغِ وحی تھا۔ وہ چار مقرب فرشتوں میں سے ایک ہیں جن کے نام یہ ہیں ـــ جبرائیل، میکائیل، اسرافیل اور عزرائیل۔ ان میں سے ہر ایک کے ذمہ مختلف کام ہیں۔ ان کے نام کا عربی میں دس انداز سے تلفظ ہوا ہے[۱] اسلامی مفسرین عام طور سے جبرئیلؑ کے معنی "عبداللہ" لیتے ہیں[۲]۔ یہودیوں اور عیسائیوں میں "گابرئیل"، GABRIEL کے معنی "مردِ خدا"، اور "مظہرِ قدرتِ خدا" ہے۔ وہ دانیال نبی پر دو بار (تقریباً ۵۴۷ قبل مسیح) بھیجے گئے۔ ایک دفعہ ایک خواب کی تعبیر بیان کرتے ہیں[۳] دوسری بار، ہفتے کی ان کے لیے پیشین گوئی کرتے ہیں[۴] حضرت یحییٰؑ کی پیدائش کی خوشخبری

---

[۱۴] مناقب ۱: ۴۰ ـــ ۴۴۔

[۱۵] بحار الانوار ۱۸: ۲۰۶ طبع دوم۔

[۱۶] نولدکے، تاریخ قرآن ۱۴، ۸۱، بلاشر، مقدمہ ۸، درآستانۂ قرآن ۲۲۔

[۱] المحتسب ۱: ۹۷، التیسیر ۷۵، النشر ابن جزری ۲: ۲۱۹، اتحاف ۱۴۴، البحر ابن حیان ۱: ۳۱۷ ـــ ۳۱۸، القراءات الشاذۃ ابن خالویہ، المعرب جوالیقی ۱۱۲، ۱۱۴، تفسیر طبری ۱: ۳۴۴۔

[۲] بخاری، تفسیر سورۂ ۲ باب ۶، الروض ۲: ۲۱۴، تفسیر طبری ۱: ۳۴۷۔

[۳] دانیال ۸: ۱۶ ـــ ۲۷۔

[۴] ایضاً ۹: ۲۱ ـــ ۲۷ (اشارہ بار دیگر ۲۵ و ۲۶: ۱۰۱)

Presented by Ziaraat.Com

حضرت زکریا کو دیتے ہیں۵ حضرت عیسیٰ کی پیدائش کی بشارت حضرت مریم کو دیتے ہیں۶

وہ اپنے آپ کا اس طرح تعارف کراتے ہیں، "میں جبرئیل ہوں جو خدا کے حضور رہتا ہے"۔ یہ فرشتوں میں خداوند تعالیٰ کے سب سے بڑے پیغام پہنچانے والے ہیں اور چاروں فرشتوں میں سے دوسرے بڑے ہیں۷ تالمود میں میکائیل کے ساتھ ان کا نام بزرگ ترین فرشتوں میں لیا جاتا ہے۸ وہ دوسرے فرشتوں کے ساتھ حضرت ابراہیم کے دیدار کو گئے۹ اور انہوں نے ان کو آگ سے نجات دلائی۱۰ توراۃ کے ضمیموں (اپوکریفا) رسالہ خنوخ میں ان کا نام تین دوسرے فرشتوں کے ساتھ آیا ہے۔ خداوند عالم ان کو گمراہ انسانوں کو سزا دینے کے لیے بھیجتا تھا۱۱ اس رسالہ میں جبرئیل کو، یا، بہشت کے نگہبان فرشتوں میں سے ایک ہیں۱۲

مگر قرآن مجید میں یہ فرشتہ وحی ایک محترم پیام پہنچانے والے ہیں۔ خدا کے سامنے امین ہیں اور خاص مقام رکھتے ہیں۔ فرشتوں کے درمیان مطاع اور فرمانروا ہیں (۸۱: ۱۹-۲۳ و ۷۸: ۳۸)۔ قرآن کے مطابق ایک ایسا فرشتہ ہے جو باشعور اور مستقل ارادے کا حامل ہے۔

شروع میں رسول کریم کے نام سے (۸۱: ۱۹) پھر روح الامین (۲۶: ۱۹۳) کے نام سے ذکر ہوا ہے۔ پھر روح (۹۷: ۴ و ۷۰: ۴ و ۷۸: ۳۸ و ۱۹: ۱۷) اور رسول رب (۱۹: ۱۹) کہا گیا۔ اس کے بعد روح القدس (۱۶: ۱۰۲) کے نام سے یاد کیا گیا۔ آخر کار جبرئیل کے نام سے پکارا گیا (۲: ۹۷، ۹۸ و ۶۶: ۴)۔ پھر سورۂ بقرہ کے آخر میں (آیت ۲۵۳ و ۸۷، تقریباً ۵ ہجری میں) دوبارہ "روح القدس" کا نام لیا گیا۔ رسول اللہ نے دو مرتبہ ان کو اصلی صورت میں دیکھا (۸۱: ۲۳ و ۵۳: ۱۳) وہ وحی لانے والے پیامبر تھے (۲۶: ۱۹۴) اور رسول خدا کے ساتھی تھے (۲۶۴ م)۔

ہم دیکھتے ہیں کہ شروع ہی سے اس فرشتہ وحی کی صفات تفصیل سے پیش کی گئیں اور ان کا تعارف کرایا گیا،

"پس میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹ جانے والے (ستاروں) کی، چلنے والے چھپ جانے والوں کی۔ قسم ہے رات کی جب وہ جانے لگے اور صبح کی جب وہ روشن ہو، یقیناً یہ (قرآن) ایک رسول کریم کا کلام ہے، جو قوت والا ہے، صاحب عرش کے نزدیک مرتبے والا ہے۔ (اس کی) اطاعت کی جاتی ہے، پھر وہ امین بھی ہے اور تمہارا ساتھی دیوانہ نہیں ہے۔ اس نے یقیناً اس (جبرئیل) کو آسمان کے روشن افق پر دیکھا" (۸۱: ۱۵ تا ۲۳)۔

---

۵ لوقا ۱: ۱۹۔

۶ ایضاً ۱: ۲۶-۳۸۔

۷ تلمود یحیاس با ۲: ۹۔

۸ جبرئیل و میکائیل دونوں ساتھ تھے تدفین آدم میں (برشیت رباہ ۸: ۱۵) وشاہد قبر موسیٰ (دواریم رباہ ۱۱: ۶)۔

۹ تلمود، بابا متسیعا ۸۶ ب۔

۱۰ تلمود، پساحیم ۱۱۸ الف۔

۱۱ خنوخ ۹، ۱۰: ۹۔

۱۲ ایضاً ۲۰: ۷۔

Presented by Ziaraat.Com

یہ آیات صدر نزولِ وحی میں سے ہیں جو بعثت کے پہلے سال کے آخر میں نازل ہوئی تھیں۔[۱۳۳] ان میں جبرئیلؑ کی صفات کو کسی جزوی فرق کے ساتھ اور جزوی تاکید کے ساتھ واضح اور روشن طریقے سے بیان کیا ہے۔

ان آیات کا اہم کردار پیغامِ کریم، "ذی قوۃ" ہے اور خداوند تعالیٰ کے یہاں جاہ و منزلت رکھتا ہے۔ خدا کے مقربوں میں سے ہے۔ دوسرے فرشتے اس کی پیروی کرتے ہیں۔ وہ خود امین ہے۔ امینِ وحی ہے۔ پیغمبرؐ نے اس کو افق میں آشکار دیکھا تھا۔ یہ الٰہی پیام لانے والا کبھی "روح"، کبھی "روح الامین" یا "روح القدس" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ کبھی اس کا نام "جبرئیل" بھی لیا گیا ہے۔ اور آخر میں پھر "روح القدس" کا نام لیا گیا...

مگر یہ اگر ان کا نام "جبرئیل" کی صورت میں نہیں آیا اور مدینے کے زمانے میں دوبارہ یہ نام لیا گیا تو کس قدر سطحی بات تھی جب یہ کہا گیا یہودیوں کا اشتعال کہ حقیقت وحی قرآن میں آئی۔ کیا نام پر بھروسہ کیا گیا تھا۔ کیا اس فرشتے کے سارے اوصاف شروع کی ان آیات میں بیان نہیں کر دیے گئے تھے۔ کیا دوبارہ سورۂ بقرہ کے آخر میں سنہ۲ھ میں "روح القدس" کے نام سے نہیں پکارا گیا۔ یہ وہی نام نہیں جو بعثت کے ساتویں سال اور ہجرت سے چھ سال پہلے لیا گیا تھا؟ (۱۶ : ۱۰۲) کیا ان کے اوصاف میں وحی کے مختلف مراحل میں نازل ہوتے رہنے سے کسی فرق کا پتہ چلتا ہے۔ کیا یہ اوصاف جبرئیلؑ کے علاوہ کسی دوسرے فرشتے پر منطبق ہوتے ہیں؟

یہودی (یا کم از کم مدینے کے یہودی) جبرئیلؑ کو دشمن سمجھتے تھے کیونکہ ان کے عقیدے کے مطابق وہ عذاب لایا کرتے تھے۔ چنانچہ اس دلیل کے تحت کہ وہی وحی لاتے تھے نہ کہ میکائیل، وہ مسلمان ہونے سے کتراتے (۲ : ۹۷ و ۹۸)[۱۳۴] کہا جاتا ہے کہ اس اعتراض کی بنا پر حاملِ وحی کا نام "جبرئیل" لیا گیا۔ گویا اس سے پہلے وحی نہیں اتری تھی اور اگر اتری تھی تو واسطہ اور لانے والا نہ تھا اور یہ پہلی مرتبہ وحی جبرئیل کے توسط سے نازل ہوئی تھی۔ قرآن نے تو بالکل ہی شروع میں بتا دیا تھا کہ پیام لانے والا بزرگ اور امین فرشتہ ہے، قوت والا ہے، صاحبِ عرش کے یہاں مقام و منزلت رکھتا ہے۔ یہ صفات اس شان و دبدبے کے ساتھ سوائے جبرئیلؑ کے اور کسی میں نہیں۔ کیا اب بھی نام اور لفظوں ہی میں الجھا جائے یا مسائل اور آیات کے واضح دلائل پر توجہ دی جائے۔ یہ سخت کور ذوقی ہوگی کہ بعض مستشرقین کی طرح اب بھی کہا جائے کہ جبرئیلؑ وہ نام ہے جو مدینے میں یہودیوں کی موجودگی کی بنا پر اس فرشتہ وحی کو دیا گیا۔

اتفاق یہ ہے کہ اسلامی متکلمین میں بھی یہ بحث رہی ہے کہ کیا روح الامین اور روح القدس دونوں ایک ہیں اور کیا وہ جبرئیل ہی ہیں؟ بعض ان کو جدا سمجھتے رہے۔ یہ روح القدس کو عالمِ ملکوت میں جبرئیل سے بڑے مرتبے کا حامل سمجھتے ہیں۔ جب کہ اسلامی فلسفی فرشتوں کو قوۂ مدرکۂ عالم کا تجسم سمجھتے ہیں جو تکوین کے اول مرحلے میں مبداء الٰہی سے وجود میں آئے۔ متکلمین کے اعتقاد کے مطابق روح الامین اور روح القدس جبرئیلؑ کے القاب ہیں۔ یہ سب ایک ہی فرشتے کے نام ہیں۔ جبرئیل، روح الامین، امینِ وحی، روح اور روح القدس سب ہی حاملِ وحی فرشتے کے نام ہیں۔ ان فلسفیوں میں فارابی نے بھی روح الامین اور روح القدس کو ایک ہی کہا ہے اور دونوں کو "عقلِ فعال" کہا ہے۔ اس کے نظریے کے مطابق جو انسانی روحانی اور معنوی مرتبے تک پہنچ جائے وہ اپنی روح اور عقلِ فعال کو یکجا کر سکتا ہے یعنی بلا واسطہ عقلِ فعال سے اتصال پیدا کر لیتا ہے۔ اور عقلِ فعال "علتِ اولیٰ" سے فیض حاصل کرتی ہے اور اس طرح عقلِ فعال کے واسطے سے "مبداءِ اولیٰ" سے فیض حاصل کیا جا سکتا ہے۔[۱۳۵]

---

۱۳۳ بخاری: الانبیاء ۱، ابن سعد ۱/۱/۱۹۶، احمد ۱: ۲۶۴، ۲۷۸، طیالسی: ح ۲۷۴۱۔

۱۳۴ مقدمہ بیل ۱۹، ۲۳، فراٹکے ۱: ۲۰ اور آگے۔

۱۳۵ السیاستہ المدنیہ ۴۹ بعد۔

جبرئیلؑ پیغمبروں کی نبوت میں ایک بنیادی اور اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ اخبار و احادیث کے مطابق ہر پیغمبر کے پاس جبرئیلؑ آتے رہے۔ کہتے ہیں کہ[۱۶] ہبوط کے بعد آدمؑ پر ۲۱ صحیفے وحی کیے۔ ان کو کھیتی باڑی، لوہے کا استعمال، حروف الف با اور مناسک حج سکھائے۔ ان کو توبہ کا حکم دیا۔ نوحؑ کو کشتی بنانا سکھایا، ابراہیمؑ کو آگ سے نجات دی، قوم لوطؑ کو انہوں نے ہلاک کیا، موسیٰؑ کو جادوگروں سے مقابلہ سکھایا، ان کو مصر سے نکلنے کا راستہ بتایا (مصر سے باہر نکلنے میں وہ سفید گھوڑوں کے گھوڑے پر ظاہر ہوئے۔ فرعون کو دریائے سرخ تک لے آئے تاکہ غرق ہو جائیں۔ ان ہی کے آثار سے سامری نے اپنے بچھڑے میں آواز پیدا کی) طالوتؑ کی فوجیں ذرہ بکتر بنانا اور لوہا پگھلانا داؤدؑ کو سکھایا تاکہ جالوت کو شکست دے سکیں۔ مزامیر اور مناجات بھی داؤدؑ کو سکھائے۔

رسول خدا کے بارے میں روایات اور احادیث میں خصوصاً وحی کے سلسلے میں یہ واضح ہے کہ جبرئیلؑ وحی کا واسطہ تھے۔ (کتب اخبار میں یہاں تک ہے کہ علیہ السلام سے بھی ملتی تھی مگر کہا جاتا ہے کہ جبرئیلؑ اس پر نازل ہوئے تھے[۱۷]) جبرئیل نے بچپن میں پیغمبرؐ کا سینہ آب زمزم سے دھویا تھا[۱۸] وضو کرنا، نماز کے اوقات، رکعات کی تعداد کی نبیؐ کو تعلیم دی[۱۹] معراج کی شب پیغمبرؐ کے ہمراہ تھے یہاں تک کہ اس جگہ پہنچے کہ جبرئیل نے عاجزی کا اظہار کیا، آگے بڑھنے سے معذرت کی اور کہا کہ اگر ایک قدم آگے بڑھتا ہوں تو جل جاؤں گا[۲۰]

عقل چون جبرئیل گوید احمدا   گر یکی گامی زنم سوزد مرا!!

مگر پیغمبرؐ اس جگہ سے بھی آگے بڑھ گئے یہاں تک کہ قاب قوسین او ادنیٰ کے مرتبے تک پہنچے۔ وہاں سے بھی گزر گئے اور مقام جلی آگیا۔[۲۱]

جبرئیل مشتم و سدرہ مقام تونی   من سنیم، عیسیٰ مریم تونی[۲۲]

رسول خدا کے ساتھ ہمیشہ جبرئیل رہے۔ کہا جاتا ہے کہ صرف تین سال اسرافیل آپ کے قریب تھے[۲۳] رمضان میں ہر رات نبیؐ کے دیدار کو آتے تھے[۲۴] اور قرآن کو جہاں تک اترا ہو پیغمبرؐ کے ساتھ دہراتے تھے[۲۵] پیغمبرؐ نے دو تین دفعہ ان کو اصلی صورت میں خود دیکھا تھا[۲۶]

---

۱۶ تفسیر طبری ۱: ۳۲۲، ابن سعد ۱/۱/ ۱۱۵-۱۱۶، مجمع الزوائد ۸: ۲۲۱-۲۲۲، تفسیر ابن کثیر ۱: ۲۳۸۔

۱۷ طبری ۱: ۱۸۰، بلاذری ۹۴۔

۱۸ بخاری: صلاۃ ۱، حج ۷۶، احمد ۳: ۱۲۱، ۱۴۹، ۲۸۸ و ۴: ۲۰۷، ۲۰۸ و ۵: ۱۴۲، ۱۴۳، ابن سعد ۱/۱/ ۹۶ و ۹۷، مسلم صلاۃ ۲۶۰-۲۶۶۔

۱۹ ابن ہشام ۱: ۲۶۰ (۱۵۸ گوٹینگن)، احمد ۴: ۱۶۱، تاریخ طبری ۱/ ۱۱۵۷۔

۲۰ بخاری: مواقیت الصلاۃ ۱، بدء الخلق ۶، مغازی ۱۲، مسلم مساجد ح ۱۶۶، ۱۶۷، موطأ، وقوت الصلاۃ ۱، مسند زید بن علی، ح ۱۰۹، تاریخ طبری ۱: ۱۱۵۷۔

۲۱ تفاسیر در سورۂ اسراء (سورۂ ۱۷)، سفینۃ البحار ۲: ۴۲۱، حتیٰ کہ جبرئیل نے کہا: "لو دنوت انملۃ لاحترقت" بحار الانوار ۶، باب ۲۲ معراج و نحو تصرف ۲: ۴۱۲۔ بہ نقل از احادیث مثنوی فروزانفر۔

۲۲ مثنوی معنوی ۴: ۳۸۹ نیکلسن۔

۲۳ سفینۃ البحار ۱: ۱۴۳، تاریخ طبری ۱: ۱۲۴۹، ۱۲۵۵۔

۲۴ بخاری: بدء الوحی ۵، احمد ۱: ۲۸۸، ۳۶۳۔

بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر

Presented by Ziaraat.Com

قرآن مجید میں فرشتۂ وحی کو دیکھے جانے کا دو جگہ ذکر ہوا ہے۔

اور وہ (پیغمبر) اپنی خواہش سے نہیں بولتے۔ یہ (قرآن) تو حکم خدا ہے جو (ان کی طرف) بھیجا جاتا ہے۔ ان کو نہایت قوت والے (فرشتے) نے سکھایا ہے۔ یعنی طاقتور فرشتہ جس نے شکوہ و کمال سے جلوہ کیا۔ وہ افق اعلیٰ (آسمان کے مشرقی کنارے) میں تھا۔ پھر وہ قریب ہوا اور آگے بڑھا تو دو کمانوں کے فاصلے پر یا اس سے بھی نزدیک ہوا۔ پھر خدا نے اپنے بندے کی طرف وحی کی جو کچھ وحی کی۔ جو کچھ دیکھا اس کے دل نے اس کو جھوٹ نہ جانا۔ کیا جو کچھ وہ دیکھتا ہے تم اس پر جھگڑتے ہو اور یقیناً اس نے ایک بار اور سدرۃ المنتہیٰ کے نزدیک (شب معراج) دیکھا... (۵۳: ۳-۱۴)

ایک دوسری جگہ فرمایا:

بیشک یہ (قرآن) ایک رسول کریم کا کلام ہے جو فرشتہ قوت والا ہے۔ صاحب عرش خدا کے نزدیک مرتبہ والا ہے۔ وہاں اس کی اطاعت کی جاتی ہے۔ وہ امینِ وحی الٰہی ہے۔ تمہارا پیغمبر ہرگز دیوانہ نہیں ہے۔ انہوں نے اس امین وحی کو افق میں آشکار دیکھا تھا... (۸۱: ۱۹ تا ۲۳)۔

مگر زیادہ اوقات وحی سنائی دیتی تھی اور جبرئیل خود نظر نہیں آتے۔ دوسری سورتوں میں اشارہ ہے کہ وحی زبانی ہوتی تھی۔ مثلاً جب حکم آیا:

تم (اے پیغمبر) زبان (قرائت قرآن) پر جلدی جلدی نہ چلاؤ کیونکہ اس کا جمع اور محفوظ کرنا اور اس کا پڑھوانا ہمارے ذمے ہے۔ تو جب یہ تم پر پڑھا جائے تو تم اس کے پڑھنے کی پیروی کرو... (۷۵: ۱۶ تا ۱۸)۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ وحی کا القاء زبانی ہوتا تھا اور وہ سنی جاتی تھی۔ علاوہ بریں ان تمام آیات کے بارے میں جو "قل" کہو سے شروع ہوتی ہیں، کہا جا سکتا ہے کہ وحی زبانی ہوتی تھی اور سنی جاتی تھی یعنی فرشتۂ وحی نظر نہیں آتا تھا۔ وحی سنی جاتی تھی اور محفوظ کی جاتی تھی۔ رسول اللہؐ کی سیرت اور احادیث کی کتابوں سے وحی کی ایک دوسری قسم نگاہوں میں آتی ہے۔

کبھی جبرئیل "دحیۂ کلبی" کی شکل میں رسول اللہؐ کے سامنے ظاہر ہوتے تھے۔[۱۶] اس وقت صحابہ بھی ان کو اسی شکل میں دیکھتے۔ مثلاً غزوۂ بنی قریظہ (۵ھ) میں ان کو سفید خچر پر سوار دیکھا۔[۱۷] پھر ان کو نبی اکرمؐ کے حضور میں بات کرتے دیکھا جب پیغمبرؐ مسجد سے نکلے تو پیغمبرؐ نے فرمایا تھا کہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ: [۱۵] بخاری: الانبیاء/ ۱؛ ابن سعد ۱/ ۱/ ۱۱۶۔

[۱۶] مجمع البیان ۹: ۱۷۲-۱۷۵؛ ۱۰: ۴۴۶؛ معانی ۲: ۲۱۸؛ الدر المنثور سیوطی ۶: ۱۲۲؛ بخاری: بدء الخلق ۷؛ مسلم: الایمان ۲۸۰-۲۸۷؛ سیرۃ حلبیہ ۱: ۲۸۱؛ مجموعۃ الملوک ۱: ۱۲۲؛ تفسیر طبری ۲۷: ۴۳؛ احمد ۱: ۴۱۲، ۴۴۹، ۴۶۰، ۶: ۵۰، ۲۳۶، ۲۴۱؛ ترمذی: تفسیر سورۂ والنجم ۳؛ سیرت ۲: ۵۰۔ بعض صوفیا اس کو رویت الٰہی کا اشارہ سمجھتے ہیں کتاب التعرف کلابازی ۲۰-۲۴)۔

[۱۷] طبقات ابن سعد ۲/ ۲/ ۵۳، ۱/ ۲/ ۱۸۴، ۸: ۲۶؛ مغازی واقدی: ۳۶۰ چاپ برلن ۱۸۸۲م۔ اصابہ ۱: ۲۲۴، اسد الغابہ ۲: ۱۳۰؛ تفسیر القرآن ابن کثیر ۸۱: ۶۸؛ احمد ۲: ۱۰۴؛ ۳: ۳۲۳۔

[۱۸] ابن ہشام ۳: ۲۴۵۔

[۱۹] احمد ۲: ۱۰۷؛ ۴: ۳۲۸؛ طبری ۸: ۲۵۱؛ منبد ۱: ۱۲۳۔

Presented by Ziaraat.Com

جب دحیہ ان کے پاس جاتے تو کوئی حاملہ عورت ایسی نہ ہوتی جو حمل نہ گرا دیتی۔

دحیہ کلبی ایک بہت امیر کبیر تاجر تھے جن کا رومیوں اور شامیوں سے رابطہ تھا۔ اُحد یا خندق کے بعد اسلام لائے اور پیغمبر نے ان کو قیصر روم کے پاس بھیجا کہ اس کو اسلام کی دعوت دیں۔ ان کی ایک بہن تھی جس کا نام شراف تھا۔ پیغمبر نے اس کے لیے پیغام بھیجا تھا مگر زفاف سے پہلے ہی اس کا انتقال ہو گیا۔ جبرئیل کا دحیہ کلبی کی شکل میں ظاہر ہونا احد یا خندق کے بعد ہی ہو سکتا ہے کیونکہ اسی وقت وہ اسلام لائے تھے۔ یہ بات کہ فرشتہ کا کسی شخص کی شکل میں آنا جو ایمان نہ لایا ہو کیوں صحیح نہیں ہو سکتا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ شکل اور تمثل اور پیکر انسانی میں فرشتے کا ظاہر ہونا ایک کاملاً حقیقت ہے۔

دحیہ بہت سے موقعوں پر آنحضرتؐ کے سامنے حاضر ہوا۔ وہ خوبصورتی میں ضرب المثل تھا۔ تقریباً ۵۰ھ میں معاویہ کے دور حکومت میں فوت ہوا۔

کبھی کبھی جبرئیل کسی دوسرے آدمی کی شکل میں آتے اور ایمان، اسلام اور احسان کے بارے میں پوچھتے۔

اور کہا گیا ہے کہ جبرئیل آنحضرتؐ کے حامی اور نگہبان تھے۔ جب یہودیوں نے آپ کے کھانے پر جادو کیا یہ جبرئیل تھے کہ جنہوں نے اس بلا کو رد کرنا چاہا۔ جب بھی رسول اللہؐ کو کوئی شکایت ہوتی وہ دلداری کرتے اور دکھ کو دور کر دیتے۔ رسول اللہ کے سامنے غلاموں کی طرح رہتے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک بار حضرت عائشہ کی صورت میں بھی آئے تھے اور عورتوں میں صرف حضرت عائشہ نے ان کو دیکھا تھا، ان کو سلام کہتے تھے۔ حضرت عمر بن خطاب نے بھی ان کو صاف ستھرے لباس اور خوب گہرے سیاہ کنگھی کیے بالوں میں دیکھا مگر پہچانا نہیں۔ لیکن کہا

۳۰ بحار الانوار ۱: ۳۴۷، ۳۲۶۔

۳۱ بلاذری ۱: ۵۳۱۔

۳۲ بلاذری ۱: ۳۷۰، الاستیعاب ۲: ۱۶۲، اغانی ۱۵۹۷، اصابہ ۱: ۴۷۸، فلانکے ۱: ۲۳۰۔

۳۳ فلانکے ۱: ۲۴۴۔

۳۴ اصابہ ابن حجر ۱: ۴۷۳، اسد الغابہ ابن اثیر ۲: ۱۵۰، ۲۷۴، عمدۃ القاری ۱: ۹۳، کامل ۱۰: ۴۱۱۔

۳۵ تہذیب ابن عساکر ۵: ۲۷۸۔

۳۶ بخاری، ایمان ۳۷، مسلم، ایمان ۱، ۵، ۷، ابوداؤد ۱۶، ترمذی ۴، نسائی ۵، ابن ماجہ ۹، مسند احمد ۱: ۲۷، ۲۸، ۵۱، ۵۲، ۲: ۴۲۶، ۴: ۱۲۹ [illegible]

۳۷ ابن سعد ۲/۲/۱۶۔

۳۸ ابن سعد ۲/۲/۱۹۷، مسلم، اسلام ۳۹، ۴۰، ۴۳، ترمذی ۸۱، مسند ۶: ۱۴۰۔

۳۹ بحار الانوار ۱۸: ۲۷۸، علل الشرائع باب ۷، کمال الدین صدوق ۸۵، سفینہ، کلمہ جبرئیل۔

۴۰ تاریخ طبری ۱: ۱۲۶۲، ۳: ۳۸۰۔

۴۱ ابن سعد ۴: ۲۰۹، طبری ۱: ۱۷۶۳۔

۴۲ بحار الانوار ۹: ۲۵۵، تفسیر الفتوح ۱: ۳۴۰۔

۴۳ سیرۃ حلبیہ ۱: ۲۷۳، سیرۃ الرسول شہرستانی ۳۰ [illegible]

Presented by Ziaraat.Com

ہے کہ ابن عباس نے ان کو دو دفعہ دیکھا تھا[۱۳] اس زمانے سے جبرئیل کے وصف میں اشعار بھی کہے گئے ہیں[۱۴]

گھر میں تشریف آوری

پہلا منظر جو ابن ہشام نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ پر پہلی وحی کس طرح نازل ہوئی کہتے ہیں کہ جب آپ غار سے باہر نکلے اور گھر کی طرف چلے تو ہر قدم پر آپ کی حیرانی اور خوف میں اضافہ ہوتا گیا۔ چاروں طرف سے صدائیں آ رہی تھیں۔ جب جبرئیل کو آسمان میں دیکھا کہ ساری فضا پر چھائے ہوئے ہیں اور جدھر نگاہ کرتے ہیں وہی دکھائی دیتے ہیں تو آپ کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ جو بھی تدبیر کی یہاں تک کہ اپنے چہرے کو ہاتھوں سے چھپایا پھر بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔ جسم پر کپکپی طاری تھی۔ اسی حالت میں آپ گھر پہنچے۔

حضرت خدیجہ بعد میں بیان کرتی تھیں کہ جب پیغمبر خدا گھر پہنچے تو میں نے دیکھا کہ آپ کے چہرے کا رنگ سفید ہو رہا ہے اور بہت تھکے ماندے معلوم ہو رہے ہیں۔ دیوار پر ہاتھ رکھے ہوئے آہستہ قدموں سے گھر میں داخل ہوئے۔

حضرت خدیجہ آپ کو اس حالت میں دیکھ کر بہت ڈر گئیں۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق آپ کے سر کو ٹھنڈے پانی سے دھویا تاکہ ان کی وہ ذہنی کیفیت دور ہو۔ پھر آپ کو کپڑا اوڑھایا۔

پیغمبر نے اپنی زوجہ محترمہ سے جو کچھ بیتی تھی سب بیان کی اور کہا کہ میں اپنے آپ کے لیے پریشان ہوں۔ مگر حضرت خدیجہ نے آپ کو تسلی دی اور کہا کہ پریشانی کی اس میں کوئی بات نہیں۔ خدا آپ کو کبھی پریشان و خوار نہیں کرے گا۔ آپ تو اپنوں کے ساتھ نیکی سے پیش آتے ہیں۔ صرف سچ بولتے ہیں۔ خود مشقت کرتے ہیں۔ مہمانوں کی خاطر مدارات کرتے ہیں اور لوگوں کی پریشانیوں میں ان کے کام آتے ہیں[۱۵]

حضرت عائشہ کا کہنا بھی ہے کہ رسول اللہ اس حال میں کہ ان کے دل میں ایک ہیجان برپا تھا ان آیات کے ساتھ خدیجہ کے پاس آئے اور کہا کہ مجھے کپڑا اڑھا دو۔ ان کو کپڑا اوڑھایا گیا تو کچھ آرام آیا۔ پھر حضرت خدیجہ سے سارا واقعہ بیان کیا اور کہا کہ میں اپنے آپ کے لیے پریشان ہوں مگر حضرت خدیجہ نے آپ کو تسلی دی کہ آپ کسی طرح سے پریشان نہ ہوں۔ خدا کی قسم کہ وہ آپ کو کبھی رسوا نہ کرے گا۔ کیونکہ آپ صلۂ رحمی کرتے ہیں، خود زحمت اٹھاتے ہیں اور عزیز و اقارب تک وہ چیزیں پہنچاتے ہیں جو ان کو دوسرے نہیں دیتے۔ مہمانوں کی خاطر کرتے ہیں اور ان کی مصیبتوں میں ان کا ساتھ دیتے ہیں۔

اس طرح حضرت خدیجہ نے اپنے مہربان شوہر کو تسلی و تشفی دی تو وہ کچھ دیر بعد سو گئے۔ مگر خود حضرت خدیجہ کے دل میں ایک خوف نے جگہ لے لی۔ وہ اپنے شوہر پر جان چھڑکتی تھیں۔ ان کو نیک سمجھتی تھیں۔ ان پر ان کا دل و جان سے اعتماد اور اعتبار تھا۔ ان کی زبان سے کبھی غلط بات نہیں سنی تھی اور یہ ناممکن تھا کہ محمد کوئی بے تکی اور ناروا بات کہیں۔ ان کو آپ کے خدا کے برگزیدہ ہونے میں کوئی شک نہیں تھا مگر یہ تو

---

[۱۳] سنن ترمذی، المناقب باب ۳۲، مقابسہ کنید احمد ۱: ۲۹۴، ۳۱۲ و ۴: ۱۷۔

[۱۴] ورقہ بن نوفل، عمران بن حطان، ابوالعباس و حسان کے اشعار جبرئیل کے بارے میں (خصوصاً غزوۂ بدر میں) نقل کیے ہیں۔ ابوحیان ۱: ۳۱۸، دیوان جریر ۴۹۔ ۵۰۳، خزانۃ بغدادی ۱: ۱۹۹، اوراق شرح بانت سعاد ابن ہشام بغدادی: ۱۲۹ طرماد برما، المعرب جوالیقی ۱۴۳۔

[۱۵] سیرۂ حلبیہ ۱: ۲۴۷، بلاذری ۱: ۱۰۴، ابوجعفر حمد بن الاثیر ۲: ۳۱، حمد بن سیرۂ ابن ہشام ۱: ۲۵۴۔

Presented by Ziaraat.Com

تھیں کہ اس بات کا اعلان کی زبان سے بھی نہیں۔ اس خیال سے اپنے دانشور چچیرے بھائی ورقہ بن نوفل کے گھر چلی گئیں۔

حضرت خدیجہ سے متعلق یہ تاریخی واقعہ دوسروں نے بھی بیان کیا ہے۔ حضرت خدیجہ کا کردار اپنے شوہر کے بارے میں انتہائی وفادار رہا ہے جب اضطراب میں ہوتے تو آپ کو سکون و آرام پہنچاتیں، ہر پریشانی کے موقع پر راحت و آسائش فراہم کرتیں۔ اسی طرح خداوند تعالیٰ نے اس عورت کو بہ کمال اخلاق عالی ترین صفات کے ساتھ ایسی شریک حیات عطا کی تھی جو قدر شناس بھی تھی اور بہ معنوں مشفقہ بھی تھی۔ حضرت خدیجہ ایسی نیک سیرت اور پاکیزہ عمل تھیں کہ خدائے دو جہاں نے ان کو سلام بھیجا تھا اور ان کو بہشت کی خوشخبری دی تھی۔[۱]

واقعات کی ان تفصیلات نے بعض جگہ افسانوی رنگ اختیار کر لیا ہے۔ یہ خدا کے سوا کون بتا سکتا ہے کہ آنحضرتؐ اور ان کی زوجہ محترمہ کے درمیان کیا کیا گفتگو ہوئی۔ بہرحال جو کچھ ہم تک پہنچا ہے اس سے یہ نتیجہ یقیناً نکالا جا سکتا ہے کہ حضرت خدیجہ کا آنحضرتؐ اور خدا پر مکمل ایمان تھا۔

یہاں ایک دوسرا اہم نکتہ بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ ان ساری روایات میں پریشانی، اضطراب اور بے چینی کا ذکر موجود ہے۔ بعض اوقات شک اور خوف بھی پیغمبرؐ سے منسوب کیا گیا ہے مگر افسوس اس بات کا ہے کہ اس کی کیا نوعیت تھی اور وہ واضح نہیں۔ کیا اچھا ہوتا کہ آپؐ کے صحابہ نے اس کی تفصیل پوچھی ہوتی اور آئندہ آنے والی نسلوں تک اس کو پہنچایا ہوتا۔ آخر پیغمبرؐ کا یہ شک و پریشانی کس بات پر ہے۔ شک کے بارے میں تو کہا جا سکتا ہے کہ اگر شک تھا بھی تو وہ کم از کم خدا کے وجود میں نہیں تھا۔ آپؐ کا ایمان، وثوق اور اطمینان کبھی بھی متزلزل نہیں ہوا۔ انہوں نے خدا کو اپنے دل و جان میں بسایا ہوا تھا۔ یہ اعتقادِ راسخ تھا کہ خالق ایک ہے اور اس کے علاوہ کوئی نہیں۔ مگر ذکر ہے کہ شک کبھی پیدا ہوا تو وجود خدا میں نہیں تھا۔ روایات اس بارے میں واضح ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شک اگر تھا تو خود اپنے آپ پر ہو سکتا تھا۔

آپؐ نے انسانی نسلوں کی ذمہ داری کے بوجھ کو اپنے کندھوں پر محسوس کیا ہوگا۔ نسلوں کی ہدایت! جب تک انسان اس زمین پر موجود ہیں ان کی ہدایت آپؐ کے ذمہ ہے۔ یہ کوئی آسان امر یا کام نہیں تھا۔ یہ ایک فرد یا چند افراد کی زندگی سے متعلق نہیں تھا۔ یہ سارے انسانوں کی سرنوشت اور ان کی ہدایت کی راہ تھی۔ یہ تاریخ انسانی کا عظیم انقلاب تھا۔ یہ ایک انسان کامل کے پیغمبر بننے کا عظیم مرحلہ تھا۔ یہ خود اپنے آپ سے حق اور حق سے خلق کی طرف ہجرت تھی۔ یعنی خدا سے خدا ہی کی طرف سفر تھا اور خلق کی ہدایت کے راستے میں نفس کو فنا کرنا تھا۔ یہ کام ایسا آسان بھی نہ تھا کہ کم ہمت میں ممکن ہو جاتا۔ "وہ اختلاف میں نہیں تھے کہ کتاب اور دین حاصل کریں"۔ (۲۸) اور چنانچہ یہ ایک پیغام الٰہی آیا اور ان کے دل میں اترا اور آپؐ نے اس کو حاصل کیا۔ یہ عظیم ذمہ داری، یہ نسلوں کی ہدایت کا بوجھ آپؐ کے کندھوں پر آ گیا تھا۔ یہ قدرتی بات تھی کہ آپؐ پریشانی اور اضطراب سے دوچار ہو گئے۔

چنانچہ اگر کچھ تھا بھی تو وہ دلی پریشانی اور اضطرابِ درونی تھا اس کام کی عظمت کے مقابل۔ یہ باب آپؐ کو درپیش تھا۔ مگر افسوس یہ ہے کہ جو احادیث ہم تک پہنچی ہیں وہ اس شک یا اضطراب کی ماہیت اور کیفیت ہم تک نہیں پہنچاتیں۔ بعض اتنا ہی کہا گیا ہے کہ آپؐ نے دل ہی دل میں اپنی زوجہ محترمہ سے کہا اور پوچھا کہ ایسا تو نہیں کہ کسی نے سحر کر دیا ہو۔ مگر آپؐ کی زوجہ نے تسلی دی اور کہا کہ خدا آپ کو تنہا نہیں چھوڑے گا۔

۱۔ سیرۃ ابن ہشام ۔۔۔ (تلخیص) بخاری، مناقب الانصار ۲۰، [illegible]

اس تاریخی اضطراب کا سبب یہ ہے کہ پہلی دفعہ یہ تجربہ اور ہیبت ملک کا انجانی چیز تھی۔ دوسرے شاید یہ احساس آپ کے دل میں موجود تھا [illegible] سے پہلے [illegible] کے دل و جان کو حقیقت بخش رہا ہے۔ [illegible] کی پیروی ہے۔ ابن حجر نے اس خوف کا ذکر کیا ہے۔ بارہ اقوال نقل کیے ہیں اور [illegible] اس کی توجیہ کی ہے۔[۳۵]

حقیقت یہ ہے کہ [illegible] لازم ہوگیا تھا۔ [illegible] انجام دینے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا۔ یہ خوف کا کوئی موقع نہیں تھا۔ حدیث کی یہ تعبیر کچھ صحیح نہیں۔ دل کی پریشانی اور بار رسالت کا [illegible] تو سمجھ میں آتی ہے مگر خوف کی کوئی وجہ ہے نہ کوئی موقع ہے۔

یہ واقعہ رمضان کی [illegible] ہجرت سے ۱۳ سال پہلے کا واقعہ ہے۔

ورقہ بن نوفل

حضرت خدیجہ کے ورقہ نام کے ایک چچیرے بھائی تھے۔ ایک طرح سے آنحضرتؐ کے بھی رشتہ دار شمار ہوتے تھے[۳۶] یہ مکہ کے دانشور سمجھے جاتے تھے۔ حضرت خدیجہ ان کے پاس گئیں اور جو کچھ دیکھا اور سنا تھا وہ ان سے بیان کیا۔ ورقہ نے یہ بات کو غور سے سنا۔ کچھ دیر سوچ میں پڑ گئے اور پھر کہا قدوس! قدوس! اس کی قسم جس کے ہاتھ میں ورقہ کی جان ہے اے خدیجہ! اگر تم کہہ رہی ہو تو وہ یقیناً ناموس اکبر، جو ایک دن موسیٰ کی طرف آیا تھا، آج ان کی طرف آیا ہے۔ وہ ان لوگوں کے پیغمبر ہیں۔ تم ان سے کہو کہ وہ ثابت قدم رہیں۔[۳۷]

ایک اور موقع پر جب غالباً آپ خلوت نشینی سے باہر آئے اور طواف کعبہ کے لیے گئے تھے تو ورقہ نے جو وہاں موجود تھے، اس واقعے کے بارے میں استفسار کیا تھا۔ تفصیل سننے کے بعد انہوں نے کہا تھا اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے آپ ان لوگوں کے پیغمبر ہیں۔ ناموس اکبر جو موسیٰ کی طرف آیا تھا اس نے اب آپ کی طرف رخ کیا ہے۔ لوگ آپ کو جھٹلائیں گے، آپ کو تکلیفیں پہنچائیں گے۔ وہ آپ کو اپنے شہر سے نکال دیں گے، آپ سے جنگ کریں گے۔ اگر میں اس وقت زندہ رہا تو میں خدا کی طرف ہوں گا اور یہ بات خدا جانتا ہے۔"[۳۸] یا جیسا کہ حضرت عائشہ نے بیان کیا کہ ورقہ نے کہا "یہ وہ ناموس ہے جو خداوند عالم نے حضرت موسیٰ پر بھیجا تھا۔ کاش کہ اس وقت جب آپ کے قوم والے آپ کو اس شہر سے باہر نکالیں میں زندہ رہوں۔" رسول اللہ نے دریافت فرمایا "تو کیا لوگ مجھے خود میرے شہر سے نکال دیں گے؟" ورقہ

---

۳۵ ابن حجر ۱۲ خوف کی توجیہ ـــــ دراصل حدیث کی توجیہ کے ضمن میں کہی ہے۔ (فتح الباری ۱: ۲۴ طبع [illegible]) اگر اس کو اضطراب اور پریشانی سمجھا جائے تو پھر ان توجیہات کی ضرورت نہیں رہتی۔

۳۶ ورقہ کا سلسلہ [illegible] عبد العزیٰ بھائی تھے [illegible] عبد مناف کے بعد رسول اکرمؐ کی چوتھی پشت میں تھے۔ [illegible] مشترک [illegible] ہوئے۔ ایک روایت میں عائشہ نقل کرتی ہیں حضرت خدیجہ رسول اکرمؐ کو ورقہ کا برادر زادہ کہتی ہیں۔ یہ احترام کے طور پر تھا یا پھر اس رشتہ داری کی طرف اشارہ تھا (الروض ۲: ۱۴۷)۔

۳۷ تفسیر طبری [illegible] ابن ہشام ۱: ۲۵۴، سیرۃ حلبیہ ۱: ۲۸۱۔

۳۸ ابن ہشام، حلبیہ [illegible] ۲۰۲ [illegible]

نے جواب دیا: "ہاں جب بھی آپ کے جیسا کوئی شخص آیا تو اس کی قوم نے اس کو تنگ کیا ہے۔ اگر مجھے آپ کا زمانہ ملا تو میں [illegible]
نصرت سے آپ کا ساتھ دوں گا۔" مگر کچھ ہی عرصہ بعد ورقہ وفات پا گئے اور وحی میں وقفہ آ گیا۔[۷]

ساری روایات اس بات پر متفق ہیں کہ [illegible] ہی حضرت خدیجہؓ آپ کو [illegible] لے گئی تھیں [illegible] جب آپ سے [illegible] حضرت خدیجہؓ نے [illegible] انہوں نے پہلے ہی سن رکھا تھا [illegible] ان سے قبول کرنے کی دعا کی تھی۔

بعض روایات میں یہ بات ملتی ہے کہ [illegible] ایک شخص [illegible] کے پاس لے گئیں جو [illegible] تھا۔ اس نے حضرت خدیجہؓ کی بات سن کر [illegible] دوسری روایات میں [illegible] کہا گیا ہے۔[۸] مگر اس بات سے [illegible] کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ عداس جو عتبہ کا غلام تھا رسول اللہؐ کے طائف کے سفر کے دوران شیبہ و عتبہ کے باغ میں آپ کی خدمت میں آیا تھا۔ بعض راویوں نے اس عداس کی جگہ کسی دوسرے کو لانے کی کوشش کی ہے۔ مگر یہ دعویٰ بھی کچھ قابل قبول نہیں۔

مگر خود ورقہ کون تھے؟[۹] ورقہ کے بارے میں جو کچھ کہا جاتا ہے وہ افسانے کے پردے میں چھپا ہوا ہے۔ ان کی جوانی کے ایام کا کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اس کا پتہ نہیں کہ شام یا کسی ملک کا سفر کیا تھا یا نہیں۔ یا روم کی ثقافت اور اس زمانے کے مذاہب سے وہ شناسا تھے۔ ان کو حنفاء میں سے شمار کیا جاتا ہے جو دین حق کی جستجو میں تھے۔ مگر یہ بھی کہا گیا ہے کہ بعد میں عیسائی ہو گئے تھے۔[۱۰] مگر عیسائی حنفاء کو عموماً عیسائی شمار کیا جاتا رہا ہے۔ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ ورقہ حنفاء میں سے ایک تھے جنہوں نے اسلام سے پہلے بتوں کی پرستش چھوڑ رکھی تھی، شراب نہیں پیتے تھے اور مشرکوں کے ہاتھ کا ذبیحہ نہیں کھاتے تھے۔ عبرانی زبان جانتے تھے اور مذہبی کتابوں کو پڑھے ہوئے تھے۔ کہتے ہیں کہ انجیل اور دوسری کتابیں عربی میں لکھی تھیں۔[۱۱] مگر یہ تو ہم جانتے ہیں کہ اس وقت تک یہود و نصاریٰ کی مقدس کتابوں کا عربی ترجمہ نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ وہ انجیل

---

۷ بخاری، بدء الوحی ۳، انبیاء ۲۱، تعریف ناموس بھی ہے، مسلم، ایمان حدیث ۲۵۲—۲۵۸، ابن ہشام ۱: ۲۵۴، مروج الذہب مسعودی ۲: ۹۹، کامل ابن اثیر ۲: ۳۱،
تاریخ الاسلام ذہبی ۱: ۷۵، شرح سیرۃ قسطلانی ۱: ۲۲، الاصابہ ۳: ۶۳۳ ـ

۸ سیرۃ حلبیہ [illegible] ابن ہشام ۲: ۶۰ [illegible] (الروض ۲: ۲۴۷)

۹ ابن ہشام [illegible] تاریخ طبری ۱: ۵۲۱ [illegible]
[illegible] ۲۵۸، تاریخ الاسلام ذہبی ۱: ۷۸، مختار کریم بخاری ۲: ۳۸—۴۱ ـ

SPRENGER, LEBEN UND LEHR, I, 128 - 134. LAMMENS, LES JUIFS DE LA MECQUE. DANS RECHERCHES, DE SCIENCE DES RELIGIONS, VIII, (1918), 18 CAETANI, ANNALI I, P. 129, 155, 220, 238, 260. MONTGOMERY-WATT, MAHOMET A LA MECQUE, (1958) P. 77.

۱۰ یعقوبی [illegible]

۱۱ التجرید [illegible] تاریخ [illegible]
[illegible] تاریخ العرب فی الاسلام [illegible]

Presented by Ziaraat.Com

اور مرتضیٰ بان کی ہجری عبرانی زبان سے لکھتے تھے۔ ورقہ کے دین کے بارے میں بہت بحث کی جا چکی ہے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ظہور اسلام کے بعد مسلمان ہو گئے تھے اور نبی کی مدد کی تھی۔[9] یہاں تک کہا گیا ہے کہ جب بلال حبشی کو اذیتیں دی گئیں اور ان کو جلتی ریت پر لٹایا گیا اور ان کو "احد احد" کہتے سنا تو ورقہ نے ان کو تسلی دی۔ لیکن یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ اس بارے میں خبر بھی کہتے تھے[10] اعلان رسالت کے بعد کچھ عرصہ تک زندہ رہے۔ ابوالحسن برہان الدین ابراہیم بقاعی نے ورقہ کے ایمان اور ان کے صحابی ہونے کے بارے میں ایک کتاب بھی لکھی ہے[11] ان کے بارے میں رسول اللہ سے بھی روایات نقل کی گئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آنحضرت نے ان کو خواب میں سفید لباس میں دیکھا[12] ورقہ کے بھائی عثمان بن حویرث نے بھی عیسائیت قبول کی اور روم کے بادشاہ قیصر کے دربار میں رہے۔[13] ان ساری باتوں کے باوجود بھی ان کے ایمان کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے اور ان کے نام کا صحابی اسلام میں ذکر ملتا ہے۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ وہ رسالت اور دعوت اسلام سے پہلے ہی یعنی آغاز وحی کے بعد وقفہ وحی کے دو تین سالوں کے اندر انتقال کر گئے تھے۔[14] ان سے اشعار بھی منسوب ہیں۔ یہ شعر اگر ان ہی کے ہیں تو وہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ یہود و نصاریٰ جیسے مذاہب اور ایرانی ثقافت پر اچھا علم رکھتے تھے۔[15] انہوں نے اپنے دوست زید بن عمرو کا مرثیہ کہا ہے جس میں توحید خدا پر ایمان، آتش، مرنے کے بعد ثواب اور عذاب کا ذکر ہے اور بتوں کو برا کہا گیا ہے۔[16] ان کی وصیت سے حکیمانہ اقوال نقل ہوئے ہیں جو فلسفیانہ اور دینی مطالب کو پیش کرتے ہیں[17] مگر مجموعی طور سے ان سب پر الگ الگ گفتگو کی جا سکتی ہے۔

ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ آخر عمر میں بینائی جاتی رہی تھی۔ اس وقت وہ نابینا و ضعیف العمر شخص تھے جب حضرت خدیجہ ان کے

---

۹ مروج الذہب مسعودی ۱: ۵۹، شرح نہج البلاغہ ۱: ۷۶، تاریخ اسلام ذہبی ۱: ۲۷۸۔

۱۰ نسب قریش ۲۰۸، النہایۃ ابن اثیر ۱: ۵۲۳، اغانی ۳: ۱۱۳، اصابہ ۶: ۶۱۸۔

۱۱ الاعلام زرکلی ۹: ۱۲۱، خزانۃ الادب بغدادی ۲: ۸۱۲۔۴۱۔

۱۲ اصابہ ۳: ۶۳۳۔

۱۳ نسب قریش ۲۰۷، مجمع الزوائد ۹: ۴۱۶، اصابہ ۶: ۳۱۸، بزار نے بھی اس کی مثل بیان کیا ہے اور اس کو جو صحیح ہے شمار کیا ہے۔ ذہبی اور ابن کثیر نے بھی اسناد کو ٹھیک کہا ہے مگر بہت سے دوسری اسناد کو منقطع کہا ہے۔ حلیہ ۱: ۲۸۵، مسند احمد ۱: ۳۱۴، ۳۲۶، میزان کبیر ۲: ۴۲۹۔

۱۴ اس نظریہ کو ماننے والوں کے نزدیک بخاری اور مسلم وغیرہ، بخاری ۳، اسد الغابہ ۵: ۸۸، ابن سعد ۱/۱۳۷، اصابہ ۶: ۳۱۸۔ ابن عساکر کہتے ہیں کہ کوئی ایسا نہیں ملا کہ وہ اسلام لے آئے تھے۔ اصابہ ابن حجر ۳: ۶۳۳۔

۱۵ شعرا النصرانیہ ۶۱۶۔۶۱۹، اغانی ۳: ۱۲۱، خزانۃ الادب ۱: ۳۹۹، الروض ۲: ۲۴۲۔

۱۶ المحبر، ابن ہشام ۱: ۲۲۴، اغانی ۳: ۱۱۳، بیہقی شعراء النصرانیہ ۱: ۸۱۱، خزانہ ۲: ۲۳۹، ۲۱۱، تاریخ اسلام ذہبی ۱: ۹۸۔ شعر ان سے منسوب ہے کہ کہا کہ اے خدیجہ اگر داستان سچ ہے ... جبرئیل ... خدا کی وحی ... (العرب) ... المحبر ... ابن ہشام ۱: ۲۰۳۔

۱۷ سفینۃ البحار ۱: ۴۸۰۔

Presented by Ziaraat.Com

چاہی گئی تھیں۔ ان کے اولاد نہیں تھی ۔[18] مگر یہ واضح نہیں ہے کہ انہوں نے شادی کی تھی یا نہیں۔ ان کی قتیلہ نام کی ایک بہن تھی جو مذہبی کتابیں پڑھی ہوئی تھیں[19] یہی کہا گیا ہے کہ وہ خاتون جنہوں نے پیغمبر کے والد گرامی حضرت عبداللہ کی پیشانی میں نبوت محمدی کا نور دیکھا تھا اور آرزو کی تھی کہ پیغمبر کی والدہ وہ بنیں، وہ رقیہ "ام قتال" ورقہ کی بہن تھیں[20] مگر کچھ دوسرے لوگ ان کو "فاطمہ دختر مُرّہ" یا "لیلیٰ عدویہ" کہتے ہیں۔

یہ بات صحیح ہے کہ احادیث و روایات سے ان کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔ ساری تفصیلات یکجا کرنے کے بعد بھی ورقہ کی شخصیت دھندلی نظر آتی ہے اور صاف نہیں ابھرتی۔ ان کا اسلام لانا کسی بھی پہلو سے روشن نہیں ہے۔ ان کی وفات کی حتمی تاریخ نہیں ملتی۔ جو چیز ملتی ہے وہ یہ کہ ورقہ نام کے ایک دانشور نے جو کچھ وہ جانتا تھا اس کو سچائی کے ساتھ حضرت خدیجہ زوجہ رسول کے سامنے رکھ دیا تھا۔ ورقہ کے ہم خیال ہونے نے اس واقعے کو بہت اہمیت دی ہے۔ ایک جہاں دیدہ اور دانا آدمی جو اپنے زمانے کے مذاہب سے اچھی طرح واقف ہے، چاہے وہ بعد میں مسلمان ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، حضرت خدیجہ کی بات کان لگا کر سنتا ہے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور ہمت بندھاتا ہے اور وہ بھی وحی نازل ہونے کے بالکل آغاز میں۔ قدرتی بات ہے کہ اس قسم کی ہم خیالی اور ہم آہنگی انسان کو بہت حوصلہ بخشتی ہے۔ سند کے اعتبار سے ان ہی احادیث سے رجوع کیا گیا ہے۔ کسی اور نے پیغمبر یا حضرت خدیجہ سے پھر یہ بات نہیں کہی۔ تابعین مثلاً عروہ اور زہری نے جو نقل کیا ہے وہ قریب ہی کے زمانے کے لوگ ہیں اور یہ تو ہم جانتے ہی ہیں کہ لوگ سالہا سال حدیثیں حفظ کیے رہتے تھے۔ مگر اس حدیث میں جو "ناموس" کا نامانوس لفظ استعمال ہوا ہے اس سے کوئی تردید کا پہلو نہیں نکلتا۔ اتفاق یہ ہے کہ قرآن مجید میں چونکہ یہ لفظ نہیں آیا اس لیے خود اس لفظ کی صحت کی تائید ہوتی ہے۔

علمائے اسلام نے ناموس کے لفظ سے صاحب اسرار اور راز دار اور کتب وحی و شریعت مراد لی ہے[21] مستشرقین بھی اس کو یونانی لفظ NORMOS کی شکل سمجھتے ہیں[22] اس کے معنی بھی شریعت اور مقدس کتابیں ہے۔ یہ لفظ حضرت موسیٰ سے متعلق اور ان کے ذکر کے سلسلے میں آیا ہے۔ یہاں کا یہودیوں کی کتابوں کے الفاظ سے شناسائی کا بھی پتہ دیتا ہے جب کہ قرآن شریف ہر جگہ یہودی کتاب کو تورات کے نام سے پکارتا ہے[23] چنانچہ حضرت خدیجہ سے ورقہ کا ہم خیال ہونا اور پیغمبر آخر الزماں کے ظہور کا منتظر ہونا پچھلی کتابوں کے مطالعے اور شعور و آگاہی کی بنیاد پر تھا۔

فترت وحی (وحی کے درمیان وقفہ)

کہا جاتا ہے کہ جب آنحضرتؐ غارِ حرا سے واپس آئے تو پہلی وحی کے بعد کچھ دنوں کے لیے وحی نہیں آئی۔ اس وقفے کی مدت ۳ دن

---

[18] نسب قریش ۲۰۷۔

[19] بلاذری ۱: ۱۸ کنیت "ام ورقہ"، سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب ۶۱۔

[20] النہایہ ابن اثیر ۵: ۱۷۸، ابن ہشام ۱: ۱۶۴۔

[21] بخاری: بدء الوحی ۳، انبیاء ۲۱، تفسیر سورہ ۹۶/۱، تعبیر ۱، مسلم، ایمان ۲۵۲، احمد ۱: ۳۱۲ و ۶: ۱۹۸، ۲۲۳، ۲۳۳۔

[22] تاریخ طبری ۲: ۲۰۷، بیروت، الروض ۲: ۴۰۳۔

[23] CAETANI, ANNALI, I, P. 238,

[24] مسعودی، دیگر، حوالہ ۱۵۔

سے ۳ سال تک بتائی گئی ہے۔[1] بعض نے اس کو ۱۵ دن یا چھ ماہ بتایا ہے۔ مگر اکثریت وحی کے بعد فترت یادی کے قطع ہونے کی ضرورت پیش آئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کی پریشانی دور ہو جائے اور آپ کا شوق اور بڑھ جائے۔ اس زیادہ وحی ہو جائے اور مستقبل میں وحی کے حاصل کرنے کے لیے اور زیادہ آمادہ ہو جائیں۔

پیغمبرِ اکرم کی زندگی کا یہ دور ناگوار ترین اور بہت سخت تھا۔ رسول اللہ اس فترت سے بے چین تھے۔ پہلے دو سو تیس تزکیۂ نفس اور روحانی پاکیزگی میں اضافہ کی ضرورت تھی۔ اپنے آپ کو پہلے سے زیادہ پاک و پاکیزہ اور منور کرتے جا رہے تھے۔ اپنے سارے وجود سے روحانی فکر و تدبر میں مشغول ہو گئے تھے۔ آرام اور کھانا پینا خواب و خیال ہو گیا تھا۔ مگر آیاتِ آسمانی کے نازل ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے کبھی پہاڑ کی چوٹیوں پر پہنچ جاتے اور اس قدر محزون اور ملول ہوتے تھے کہ بعض اوقات چاہتے خود کو ثبیر یا جبل نور سے نیچے گرا دیں۔[2] یہ وہ پرشوق کرب حالات تھے جن سے آپ گذر رہے تھے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ رسول خدا نے حضرت خدیجہ کے سامنے اپنے اس خیال کا اظہار کیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ خداوند تعالیٰ نے ہم کو چھوڑ دیا ہو۔ حضرت خدیجہ آپ کو تسلی دیتیں کہ ایسا ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حق کے لیے آمادہ کیا ہے اور اپنی نعمتیں آپ پر تمام کرے گا۔[3] اس مدت میں اگرچہ آپ پر قرآنی آیات نازل نہیں ہوئیں مگر اسرافیل فرشتہ آپ کی نبوت کا رفیق رہا۔[4]

غرض یہ فترتِ وحی کا زمانہ ختم ہوا اور فرشتۂ وحی جبرئیل دوبارہ نازل ہوئے اور نزولِ قرآن شروع ہوا۔ اس واقعے کے بارے میں جابر انصاری صحابی[5] جن سے بہت سی روایات نقل کی گئی ہیں، کہتے ہیں، فترتِ وحی کی گفتگو ہو رہی تھی۔ رسول اللہ نے فرمایا:

.... میں غارِ حرا میں خلوت نشین تھا۔ کچھ دنوں کے بعد باہر آیا۔ وادی میں پہنچا تو آسمان سے ندا سنی۔ سر اوپر اٹھایا وہی فرشتہ نظر آیا جو غارِ حرا میں میرے پاس آ چکا تھا۔ وہ آسمان اور زمین کے درمیان کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے ایسا ڈر لگا کہ زمین پر گر پڑا۔ گھر واپس پہنچا اور کہا: دَثِّرُوْنِیْ دَثِّرُوْنِیْ ـ مجھے اڑھاؤ مجھے اڑھاؤ۔ مجھے اڑھا دیا گیا اور خداوند عالم نے یہ وحی نازل فرمائی:

---

[1] مدت ۳، ۴، ۱۲، ۱۵، ۱۹، ۲۵ یا ۴۰ دن یا ۲ سال و ۳ سال بھی کہی گئی ہے۔ فتح الباری میں متعدد روایات ہیں ۱۴: ۱۵، شرح المواہب ۱: ۲۳۶، ابن اسحاق ۲ سال کو قطعی سمجھتا ہے۔ ابن سعد ۱/۱/۱۳۰، سیرۂ حلبیہ ۱: ۲۹۲، امتاع الاسماع ۱: ۱۴۔

[2] بخاری، تفسیر الروض ۲: ۴۱۲، ابن سعد ۱/۱/۱۳۱، مشکوٰۃ ۵: ۲۸ (۲۲۳ ٹیکسٹ) دلائل النبوہ ۱: ۹۹، سیرۂ کابادر، سبل الہدیٰ ۲: ۳۶۱، سیرۂ ابن کثیر ۱: ۴۲۔

[3] روح المعانی ۳۰: ۱۵۸۔

[4] ابن سعد ۱/۱/۱۲۷، البدایہ ابن کثیر ۳: ۴، اتقان ۱: ۱۶۱، یعقوبی ۲: ۱۸، سیرۂ ابن کثیر ۱: ۲۸۸۔

[5] جابر بن عبداللہ انصاری ۷۸ھ، ان کے والد شاید غزوۂ بدر و شہید غزوۂ احد تھے۔ وہ خود ۱۶ سال کی عمر میں ہجرت سے پہلے اسلام لا چکے تھے۔ ۱۹ غزوات میں شرکت کی۔ رواتِ مسند میں سے ہیں اور آخر عمر میں مسجد نبوی میں درس دیا کرتے۔ ۱۵۴۰ حدیثیں ان سے نقل کی گئی ہیں۔ الاعلام زرکلی ۲: ۹۲، بخاری ۱/۱/۲۰۷، مشتبہات ۶۰ و ۱، الکنی دولابی ۱: ۲۲، البدء و مشاہد ۱۶۱، استیعاب ابن عبدالبر ۱: ۶۵، تاریخ ابن عساکر ۳: ۳۸۶، صفوۃ الصفوہ۔ بکر کی بیعت شرکت شجرہ ... حاکم ۳: ۲۳۹، ۲۲۳، ۲۹۳، سنن کبری بیہقی ۶: ۳۰۹، البدایہ ابن کثیر ۳: ۱۴۰۔

Presented by Ziaraat.Com

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ. قُمْ فَأَنذِرْ. وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ. وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ. وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (۷۴: ۱-۵)

اے کپڑا اوڑھنے والے، اٹھو اور لوگوں کو خوف دلاؤ، اپنے پروردگار کی بڑائی بیان کرو، اپنے کپڑوں کو پاک رکھو اور گندگی سے الگ رہو۔

اس کے بعد وحی کا تانتا شروع ہو گیا۔[۶]

اس حدیث میں چند نکتے ہیں جن کی وضاحت کی جاتی ہے۔ حدیث کی عبارت ہے کہ "زملونی" جس سے بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ یہ حدیث سورہ "المزمل" سے مربوط ہے اور اس لیے سورہ "المزمل" سورہ "المدثر" سے پہلے نازل ہوئی ہوگی جب کہ "زملونی" اور "دثرونی" دونوں الفاظ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی مجھے اوڑھا دو۔ سورتوں کے مفہوم کو نگاہ میں رکھنے سے کہ سورہ "یا ایہا المدثر" میں تو اٹھو اور لوگوں کو ڈراؤ کا حکم ہے جب کہ سورہ "یا ایہا المزمل" میں شب کو قیام کرنے اور قرآن کے ترتیل سے پڑھنے کا ذکر ہے اندازہ ہوتا ہے کہ قیام کرنے اور لوگوں کو عاقبت سے ڈرانے کا حکم قرآن کی ترتیل سے پہلے آیا ہوگا۔ جیسا کہ علامہ ابن حجر کا بیان ہے رسالت اس سورہ کے نازل ہونے کے ساتھ شروع کی گئی۔ سورہ مزمل میں قرآن اتنا تو نازل ہو چکا تھا کہ جس کو ترتیل سے پڑھنے کا ذکر کیا جائے اور سورہ "مزمل" کے نازل ہونے تک قرآن کی ۱۰۵ آیات نازل ہو چکی تھیں۔

اور پھر فترتِ وحی کو اسلام کی مخفی دعوت کے تین سالہ دور سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیے چونکہ دونوں کی مدت تین سال بتائی گئی ہے تو دونوں کو ایک ہی دور سمجھا جائے۔ "یا ایہا المدثر" کے نازل ہونے کے بعد لوگوں کو پوشیدہ طور سے اسلام کی دعوت دی جانے لگی اور وحی نازل ہوتی رہی۔ یہ خفیہ دعوت تقریباً تین سال جاری رہی۔[۷] ان تین سالوں میں کم تعداد مسلمان شروع میں مکہ کے پہاڑ کی کھوہ میں لوگوں کی نگاہوں سے چھپ کر نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ مشرکوں میں سے کسی کو پتہ چل گیا تو سعد بن ابی وقاص سے اس کا جھگڑا ہوا اور لڑائی ہو گئی۔[۸] اس کے بعد سے صفا میں ارقم کے گھر کو مرکز اسلامی بنا دیا گیا۔ یہ پوشیدہ طور سے تبلیغ کا سلسلہ تین سال جاری رہا اور پھر یہ آیات نازل ہوئیں:

وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ (۲۶: ۲۱۴)

تم اپنے سب سے زیادہ قریبی لوگوں کو ڈراؤ۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ (۱۵: ۹۴)

جو حکم تم کو دیا جاتا ہے وہ کھول کھول کر سناؤ اور مشرکین سے منہ پھیر لو۔

پیغمبرؐ نے استہزا کرنے والوں اور زبان درازوں کی گستاخیوں پر کوئی توجہ نہ دی۔ ایک دن (تقریباً ۳ بعثت) صفا[۱۰]

---

۶ بخاری، تفسیر سورۃ ۹۶ العلق، مسلم ۱: ۹۸، اسباب النزول واحدی ۷، لباب النزول سیوطی ۱۳۶، سبل الہدی ۲: ۳۲۲۔

۷ سبل الہدی ۲: ۳۲۶۔

۸ ابن ہشام ۱: ۲۸۰، طبری ۱۱۷۸، کمال الدین صدوق باب ۳۴ حدیث ۲۷، ۲۸، یعقوبی ۲: ۱۹۔

۹ ابن ہشام ۱: ۲۸۲۔

۱۰ کوہ ابو قبیس کے جنوب اور کعبہ کے مشرقی سمت کے روبرو بلند پہاڑی۔

Presented by Ziaraat.Com

کی بلندی پر تشریف لے گئے اور لوگوں کو علانیہ اسلام کی دعوت دی۔

چنانچہ اگر پوشیدہ طور سے تبلیغ کی مدت کو تین سال مان لیا جائے اور آشکار دعوت اسلام کو بعثت کے چوتھے سال میں شمار کیا جائے تو فترت وحی کی مدت ایک سال سے زیادہ نہیں ہوتی۔ خصوصاً امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث میں نیز ابن عباس اور شعبی کی روایت میں بھی جملہ ملاکر وحی کے نازل ہونے کی مدت بیس سال کہی گئی ہے[110] اس سے فترت کے تین سال کی تائید ہوتی ہے۔ اس طرح یا تو فترت کی کل مدت تین سال ہے۔ مخفی تبلیغ کی مدت تین سال نہیں تھی۔ اور اسلام کا برملا اظہار بعثت کے چوتھے سال نہیں ہوا تھا۔ عرب اس زمانے میں کسر کا ذکر حذف کر دیتے تھے۔ مثلاً بعثت کی مدت عموماً ۲۳ سال کہتے ہیں۔ جب کہ درحقیقت ۲۲ سال، ۲ ماہ اور ۲۲ روز مدت تھی۔ (یعنی مکہ میں ۱۲ سال ۵ ماہ اور ۱۳ روز اور مدینے ہجرت کے بعد ۹ سال، ۹ ماہ اور ۹ روز کی مدت)۔ بہرحال ان ساری روایات کو مدنظر رکھتے ہوئے فترت وحی کی مدت اور مخفی دعوت کی مدت ملا کر پانچ سال ہوتی ہے۔

جیسا کہ کہا گیا فترت وحی اور آیات قرآنی کے نزول کا قطع ہونا صرف یہی ایک دفعہ نہیں بلکہ اس کے بعد بھی کئی بار ہوا تھا۔ ان میں سے ایک موقع وہ تھا جب مکے کے کافروں نے (بعثت کے ساتویں سال) اپنے دو نمائندوں نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط کو مدینے کے یہودیوں کے پاس بھیجا تاکہ ان سے ایسے مشکل سوالات معلوم کر کے لائیں جن کا جواب رسول اللہ نہ دے پائیں۔ یہودیوں نے تین سوالات بتائے۔ ایک کچھ جوانوں کے بارے میں جو گذشتہ زمانے میں عجیب و غریب احوال سے دوچار ہوئے تھے۔ دوسرا سوال ایک شخص کے بارے میں تھا جو دنیا کے مشرق و مغرب میں گھوم آیا تھا۔ اور تیسرا سوال روح کے بارے میں تھا۔ قریش کے نمائندے مکے واپس آگئے تو سوال پیش کیے۔ پیغمبرؐ نے فرمایا کہ کل جواب دوں گا۔ انشاء اللہ نہیں کہا[111]۔ مگر جبرئیلؑ دوسرے دن نہیں آئے اور یہ تاخیر پندرہ دن طویل ہو گئی (بعض نے ۴۰ دن سے ۴۰ دن تک کہا ہے)۔ وحی کے نازل ہونے میں یہ تاخیر پیغمبرؐ کے لیے بہت پریشان کن رہی۔ اس کے بعد سورۂ کہف نازل ہوئی جس میں معاتبہ رسولؐ کے بعد ذوالقرنین اور اصحاب کہف کا قصہ اور روح کی حقیقت بیان کی گئی[112]۔ مستشرقین میں مارگولوث جیسے لوگ اس واقعے کے منکر ہیں۔ مگر ڈاکٹر ولفنسون اسرائیلی اس کی تائید کرتا ہے[113]۔

سورۂ الضحیٰ کے سبب نزول کے سلسلے میں بھی کہا گیا ہے کہ رسول اللہ ایک دو رات نماز شب میں بیمار ہونے کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔ ایک عورت (کہتے ہیں کہ وہ ام جمیل ابولہب کی بیوی، حرب بن امیہ کی بیٹی، ابوسفیان کی بہن اور معاویہ کی پھوپھی تھی) آئی اور پیغمبر سے کہا اے محمدؐ! لگتا ہے کہ شیطان نے تم کو چھوڑ دیا ہے پچھلی ایک دو راتوں سے اس کو تمہارے نزدیک نہیں دیکھا گیا۔

چنانچہ خداوند عالم نے فرمایا:

وَالضُّحٰى وَاللَّيْلِ اِذَا سَجٰى مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى (۹۳: ۱-۳)

---

[110] اصول کافی ۲: ۴۳۹، اعتقادات ۱۰۱، بحار ۱۸: ۲۵۰، ۲۵۳، اتقان ۱: ۱۶۱، البدایۃ ابن کثیر ۳: ۴، یعقوبی ۲: ۱۸۔

[111] ابن ہشام ۱: ۳۲۰۔

[112] تفسیر طبری ۱۵: ۱۳۰، قسطلانی ۷: ۲۵۰، ترجمہ تفسیر طبری ۱۱: ۲۵، کشف الاسرار ۵: ۶۷۶۔

[113] تاریخ یہود فی بلاد العرب ۹۸، بنقل از محمد (ص) محمد رشید رضا ۹۰۔

Presented by Ziaraat.Com

قسم ہے روزِ روشن کی اور رات کی جب وہ چھا جائے۔ نہ تو تمہارے پروردگار نے تم کو چھوڑ دیا اور نہ وہ ناخوش ہوا [۱۵]

بیشک وحی کا سلسلہ ایسا نہیں تھا کہ جب رسولؐ اللہ چاہتے وحی اسی وقت نازل ہو جاتی۔ کبھی ایسا ہوتا کہ کسی مسئلے پر ایک مدت کے بعد وحی نازل ہوتی۔ مثال کے طور پر جب حضرت عائشہ پر لوگوں نے تہمت رکھی تو ایک مہینے کے بعد قرآن کی گواہی کے ذریعے ان پر سے وہ الزام ہٹا [۱۶] کئی اور ایسے مواقع آئے جب وحی میں کم یا زیادہ مدت کے لیے تاخیر ہوئی [۱۷]

---

۱۵ مجمع البیان ۱۰: ۵۰۴، بخاری تفسیر سورۂ والضحیٰ، اسباب النزول سیوطی، ۱۴۰، سیرۃ ابن کثیر ا: ۴۱۳۔

۱۶ مجمع البیان ۷: ۱۳۰، بخاری ۶: ۱۰۱۔

۱۷ مثلاً ملاحظہ کریں مجمع البیان ۱۰: ۵۰۴۔

Presented by Ziaraat.Com

www.ziaraat.com
Sabeel-e-Sakina

Presented by Ziaraat.Com

(۵)

وحی کی کیفیت

وحی لغت میں

علماء کی تعریف کے مطابق وحی کلام الٰہی ہے جو اس کے رسولوں پر نازل ہوتا ہے۔ در حقیقت یہ خدا اور پیغمبر کے درمیان ارتباط کی اصطلاح اور تعبیر ہے۔ یہ ارتباط یا پیام آنے کا وسیلہ ایسا ہے جو خود دیکھا بھی جاتا ہے اور سنا بھی جاتا ہے۔ جیسے نبی اکرمؐ کو جبریل کا ابلاغ کہ کبھی صرف کلام سنا جاتا ہے جیسے حضرت موسیٰؑ پر وحی کا نازل ہونا یا بعض اوقات الہام اور رویاء (خواب) کے ذریعے سے پیغام آنا۔

وحی کی اصلیت کو تند اور سریع اشارہ کہا گیا ہے۔ اسی سرعت اور تیزی کی بنا پر "امر وحی" یعنی امر سریع کہا جاتا ہے۔ کبھی گفتگو میں رمز و کنایہ کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ کبھی بغیر ترکیب کے صدا یا بعض اعضائے بدن کے اشارے گویا ہاتھ سے لکھ کر اشارہ کرنے کو[۱] وحی کہا جاتا رہا ہے۔ مثال کے طور پر ایک عرب شاعر نے "وحی" کو "اشارہ" کے معنی میں استعمال کیا ہے:

نَظَرْتُ اِلَیْهَا نَظْرَۃً فَتَحَیَّرَتْ　　دَقَائِقُ فِکْرِیْ فِیْ بَدِیْعِ صِفَاتِهَا

فَاَوْحٰی اِلَیْهَا الطَّرْفُ اِنِّیْ اُحِبُّهَا　　فَاَثَّرَ ذَاكَ الْوَحْیُ فِیْ وَجَنَاتِهَا

نگریستم بدو نگاہی، پس حیران ماند　　دقایق فکر من در صفات بدیع او

دیدہ بہ او اشارہ کرد کہ او را دوست دارم۔　　پس اثر گذارد ہمان اشارہ بر چہرہ او

یا انگلی کے اشارے کو وحی کہتے ہیں۔ عربی شعر میں آیا ہے:

فاوحت الینا و الانامل رسلها [۲] یعنی ہم پر اشارہ کیا اور اس کے رسولوں کی انگلیاں تھیں"۔ یا "ہم وحی العیون کلامها" اس کی گفتگو اس کی آنکھوں کے اشارے ہیں۔[۳] حدیث میں آیا ہے کہ "وان کانت خیرا فتوحه" [۴] یعنی اگر نیک اور خیر ہے تو اس کی طرف جلدی کرو۔ وحی "نوشتہ اور کتاب" کے معنی میں بھی آیا ہے۔ روایت میں ہے کہ امیر المومنین حضرت علیؑ کے صحابی حارث اعور نے کہا کہ

تعلمت القرآن فی سنۃ والوحی فی ثلاث سنین

۱۔ مفردات راغب اصفہانی لفظ "وحی"۔

۲۔ لسان العرب لفظ وحی۔

۳۔ یاقوت ۳: ۵۲۰ ص ۲۰۔

۴۔ النہایہ ابن اثیر ۵: ۱۶۳۔

Presented by Ziaraat.Com

یعنی قرآن کو ایک سال اور وحی کو تین سال پڑھا۔[۵] یہاں قرآن سے مراد قراءت قرآن ہے اور وحی سے کتابت اور لکھنا۔
"وحی، فتح کے ساتھ کے معنی اشارہ، کتابت، نامہ، پیغام، مخفی گفتگو اور جو کچھ بھی دوسرے کو دیا جائے"۔[۸]
"وحی اور ایحاء" "القاء المعنی الی الانبیاء" "مخفی طور سے ... جیسے وحی جو فرشتہ کے ذریعے ارسال کی گئی ہو پیغمبر کی طرف کہ سماع کا اعلان کیا جا سکے۔ شرع میں چونکہ اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے اس لیے اس کا یہ مفہوم لیا جاتا ہے۔"[۹]

اسلامی عبارات کے علاوہ یہ لفظ زمانہ جاہلیت کی شاعری میں بھی پایا جاتا ہے۔ اعشیٰ کے اشعار میں "اشارے" کے معنی میں آیا ہے۔[۱۰] ایک دوسرے شعر میں اس سے "کتاب" مراد ہے۔ جیسا کہ جریر کہتا ہے "كَانَّ اَخَا الْيَهُوْدُ يَخُطُّ وَحْيًا" یعنی ایسا تھا کہ یہودی بھائی نے ایک کتاب لکھی۔[۱۱] یہی معنی لبید بن ربیعہ کے شعر میں لفظ "وُحِیّ" (وحی کی جمع) کی صورت میں "کتاب" کے معنی میں آیا ہے۔[۱۲]

مختصر یہ کہ لغت میں وحی کو مصدر وحی یا اسم مصدر اوحی (جس کا مصدر ایحاء ہوتا ہے) سے لیا گیا ہے۔ اس صورت میں وحی اور ایحاء کے ایک ہی معنی ہوں گے۔ جیسے عطا و اعطاء ہم معنی ہوتے ہیں۔ وحی اور ایحاء کے لغت میں معنی "اعلان" کے ہیں۔ یعنی کوئی چھپا ہوا اور سریع مطلب کسی پر ظاہر کیا جائے۔ لکھ کر، بول کر، اشارے سے، سوتے میں یا بیداری میں!

وحی کے ان مختلف معانی میں بقول محمد رشید رضا دو باتیں مشترک ہیں۔ اول مخفی آگاہی اور دوسرے سرعت۔[۱۳] یعنی پیغمبر حقیقت وحی کو دوسروں سے پنہاں اور سریعاً حاصل کرتے ہیں۔

یہود و نصاریٰ میں بھی وحی پر عقیدہ مشہور ہے اور ان کے یہاں بھی اس کے درجات ہیں۔ عبری۔ آرامی میں یہ لفظ اوحی (AOHY) ہے جس کے معنی جلدی کرنے کے ہیں۔ اور حبشی میں وَحَیَ (WAHAYA) ــــــ ہے جس کے معنی پہچاننے کے ہیں۔[۱۴]

---

۵ طبری ۳: ۲۵۲۴۔
۶ لسان ۲۰: ۲۵۷ س ۲۰۔
۷ منتہی الادب کلمہ وحی۔
۸ المنتہی رازی ۴: ۲۵۳۱۔
۹ ایضاً ۴: ۳۵۶۔
۱۰ اساس البلاغہ زمخشری ۲: ۴۹۶۔
۱۱ دیوان جریر ۴۹۸۔
۱۲ بیت دوم معلقہ لبید: فَمَدَافِعُ الرَّيَّانِ عُرِّيَ رَسْمُهَا　　خَلَقًا كَمَا ضَمِنَ الْوُحِيَّ سِلَامُهَا
نقش سنگ کے معنی میں کعب بن زہیر (م ۲۶) کے شعر میں ملتے ہیں:
اَتَا الْعُجْمَ وَالْاٰفَاقَ مِنْهُ قَصَائِدُ　　بَقِيْنَ بَقَاءَ الْوَحْيِ فِي الْحَجَرِ الْاَصَمِّ (دیوان ش: ۳۹)
اسی نے معلوتی میں کہا تھا "بَانَتْ سُعَادُ فَقَلْبِيَ الْيَوْمَ مَتْبُوْلُ　　مُتَيَّمٌ اِثْرَهَا لَمْ يُفْدَ مَكْبُوْلُ"
۱۳ الوحی المحمدی۔ ۴۱۔
۱۴ مختصر دائرۃ المعارف اسلام۔ لفظ وحی۔

Presented by Ziaraat.Com

وحی ماضی میں

وحی و نبوت اور تمدن انسانی دونوں ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ دنیا میں کوئی امت ایسی نہیں تھی کہ جس میں پیغمبر نہیں آیا۔

وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ (۲۴:۳۵)

کوئی امت ایسی نہیں تھی کہ اس میں ڈرانے والا اور راہنما نہیں تھا۔

تاکہ مخلوق پر خدا کی حجت پوری ہو اور اس کے سامنے کسی کی حجت نہ رہے اگر حضرت آدم مناسب استقامت اور عزم نہیں رکھتے تھے (۲۰:۱۱۵) تو حضرت نوح کے زمانے سے لے کر پیغمبر اکرمؐ تک بہت سے پیغمبر ہوئے جن پر وحی نازل ہوئی (۴:۱۶۳، ۱۶۴) یہ وحی ایسی چیز نہیں تھی جو وحی محمدیؐ کے خلاف ہو۔ بلکہ ان سب کا بنیادی خط اور جہت ایک ہی تھی۔ سارے انبیاء زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ سب ہی معاشرے کے ارتقا کی جدوجہد اور کمال کی تلاش میں رہے ہیں۔ چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ معاشرۂ انسانی خود ایک زندہ وجود ہے کہ اپنے افراد سے جدا بھی زندگی اور حرکت کا حامل ہے۔ اس کو کمال کی طرف رخ کیے رہنا چاہیے ورنہ انحطاط کی طرف حرکت فنا کا راستہ ہے۔ ارتقائی یہ حرکت لازم کرتی ہے کہ حق و باطل کے درمیان حد بالکل واضح اور روشن ہو۔ قدرتی طور پہ کمال کی طرف یہ حرکت حق کی کامیابی اور باطل کی شکست کا سبب بنے گی۔ اجتماع بشری کے راستے کو اللہ تعالیٰ نے پانی کے بہاؤ سے تشبیہ دی ہے۔ سیلاب میں جھاگ پانی کے اوپر چھا جاتا ہے اور پانی نیچے رہ جاتا ہے۔ مگر آخرکار یہ جھاگ بیٹھ جاتا ہے، نابود ہو جاتا ہے اور شفاف پانی ظاہر ہو جاتا ہے (۱۳:۱۷) اسی طرح معاشرۂ انسانی بھی اپنا رخ سارے نشیب و فراز کے ساتھ، حق کی طرف کیے ہوئے ہے۔ بیشک انسان اپنے ارادے کی آزادی اور اختیار کی بنا پر ذمہ دار اور متعہد (COMMITTED) ہے۔ اس راستے میں چاہے تو وہ معاشرے کے ارتقائی سفر کو آگے بڑھا دے یا پھر اس میں انحراف زیادہ کر دے۔

مگر اس پر حجت تمام کرنے اور ارتقا کے راستے اور نجات کے طریقے کو واضح کر دینے کے لیے پیغمبر ہر نسل میں آتے چلے گئے کہ ہدایت کریں، ڈرائیں، خوشخبری دیں اور اس کارواں کی راہنمائی کریں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن انبیاء پر ایمان کی بہت تاکید کرتا ہے اور نبوت کو دین کی اصل اور بنیاد شمار کرتا ہے۔ ایمان کا قبول کرنا اور نبوت کے راستے میں تحرک کی کوششیں ارتقائی منزلیں آسان کر دیتی ہیں۔ جب کہ اس کی مخالفت انحطاط اور سقوط کا سبب بنتی ہے۔ اسی لیے فرمایا:

وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَلَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ أُولَٰئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيهِمْ أُجُورَهُمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا (۴:۱۵۲)

وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور انہوں نے ان میں سے کسی ایک کے درمیان بھی فرق نہ کیا وہی ہیں کہ وہ (اللہ تعالیٰ) عنقریب ان کو ان کے اجر دے گا۔ اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا نہایت رحم کرنے والا ہے۔
ہم دیکھتے ہیں کہ کسی بھی پیغمبر میں کوئی فرق نہیں۔ سب ہی ایک کارواں یعنی کاروان توحید کے راہبر رہے ہیں۔ ایک دوسری جگہ فرمایا:
(اے مسلمانو!) کہو کہ ہم خدا پر ایمان لائے اور اس پر بھی جو ہم پر نازل کیا گیا اور اس پر جو ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ اور اسباط پر نازل کیا گیا تھا۔ اور اس پر بھی جو کچھ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دیا گیا تھا۔ اور اس پر بھی جو دوسرے پیغمبروں کو ان کے

Presented by Ziaraat.Com

رب کی طرف سے دیا گیا تھا۔ ہم تو ان میں سے کسی ایک کے درمیان بھی فرق نہیں کرتے۔ اور ہم تو اسی (اللہ) کے فرمانبردار ہیں۔ (۲: ۱۳۶)

اسی جہت پر گفتگو کرتے ہوئے امیرالمومنین امام علی علیہ السلام نے (پہلے خطبے میں) فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے اولادِ آدم میں سے پیغمبر منتخب کیے اور ان سے تبلیغِ رسالت کے سلسلے میں وحی اور امانت کے بارے میں میثاق اور عہد و پیمان لیا۔ جب زیادہ تر لوگوں نے پیمانِ الٰہی کو توڑ دیا اور اس کے حق کو نظر انداز کیا اور اس کے لیے شریک اور مثل قرار دیئے، شیطان نے ان کو خدا کی معرفت اور اس کی عبادت سے دور رکھا تو خداوند تعالیٰ نے ان میں اپنے پیغمبر یکے بعد دیگرے بھیجے تاکہ اس پیمانِ خدا کو جو انسان کی فطرت میں پوشیدہ تھا ظاہر کریں اور بھولی ہوئی نعمتوں کو یاد دلائیں، تبلیغ کے سلسلے میں ان سے گفتگو کریں، عقل کے چھپے ہوئے خزانے کو سامنے لائیں اور قدرتِ خداوندی کی آیات کی نشاندہی کریں۔۔۔
یہ ایسے سفیر تھے کہ دوستوں کی کمی اور دشمنوں کی زیادتی نے ان کو ان کے کام سے کبھی نہیں روکا۔"

نہج البلاغہ کے خطبہ شمارہ ۲۳۹ میں مزید فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو نیک والد اور پاک والدہ سے پیدا کیا۔ جب ایک دُنیا سے چلا جاتا تو دینِ خدا کی تبلیغ کے لیے دوسرا قیام کرتا۔"

یہ پیغمبروں کا گروہ پے در پے آیا اور اپنی امت کو اپنی رسالت کی تبلیغ کرتا رہا۔ ان میں سے بعض کے نام قرآن میں آئے ہیں اور بعضوں کے نہیں آئے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ جن پیغمبروں کا قرآن میں ذکر ہوا ہے ان میں کچھ خصوصیات تھیں۔ ان میں سے بعض یہود کے معروف ترین پیغمبر تھے۔ ان کے بارے میں روایات اہلِ کتاب کے یہاں مشہور اور زبان زد تھیں۔ جو رسولِ خدا کے قرب و جوار میں حجاز اور اس کے اطراف میں رہا کرتے تھے۔ اس زمانے کے لوگ وحی کو پہچانتے تھے اور بعض اس کے گرویدہ بھی تھے۔ اسی لیے خداوند تعالیٰ نے تاکید کی تھی کہ جو محمدؐ کے دل پر نازل ہو رہی وحیِ الٰہی ہے اور سارے پیغمبروں پر جو وحی نازل ہوتی تھی اسی جیسی ہے۔ یہ بات کہ لوگ اس پر تعجب کرتے تھے کہ ایک انسان پر وحی کیسے نازل ہو سکتی ہے، غلط ہے۔[۱] (۱۰: ۲) زمانۂ جاہلیت میں بھی لوگ کسی حد تک الہام اور غیب سے شناسا تھے۔ ان کے عقیدے کے مطابق ایک کاہن الہام کے ذریعے غیب کی باتیں معلوم کرتا تھا۔ اس کا الہام "تابع" یا "رئی" کے ذریعے ممکن ہوتا کہ جو غیب کی باتیں بتاتا تھا۔[۲] جس طرح کہ ہر شاعر اپنی نظم "شیطان الشاعر" سے حاصل کرتا تھا۔ قریش کلامِ آسمانی پر اور آسمان سے غیب کی باتوں کے سننے پر اعتقاد رکھتے تھے۔ چنانچہ جب آنحضرتؐ کی مجلس میں پہنچے تو آپس میں اشارہ کرتے کہ یہ شخص آسمان کی گفتگو کرتا ہے یکلمہ من السماء۔[۳]

---

[۱] الوحی المحمدی ۳۱/ مباحث۔ ڈاکٹر صبحی صالح۔ ۲۲۔

[۲] تاج العروس ۶: ۲۲۴۔ لسان۔ ۱۰: ۳۴۴۔ مجمع البیان۔ طبرسی ۵: ۳۴۹، ۱۳۶/ بلوغ الارب۔ ۲: ۲۹۱۔ تابع جن حرکت کا حامل تھا، بات کرتا تھا اور کاہن کو غیب سے آگاہ کرتا تھا۔ الروض۔ ۱: ۱۲۴۔ تابع جن تھا جو آسمانوں میں کان لگا کر سنتا تھا۔ ظہورِ اسلام اور نزولِ وحی کے ساتھ آسمان کے دروازے شیاطین پر بند ہو گئے۔ صحیح مسلم ۲۰۱۔ عمدۃ القاری ۲: ۲۲۷۔ لسان ۱۷۔ ۲۴۳۔ ارشاد الساری ۸: ۴۰۔ بلوغ الارب ۲: ۲۹۶۔ ابن ہشام ۱: ۲۰۷۔ مسند احمد ۱: ۲۱۸، صحیح بخاری باب المفقود ۴: ۲۱۳۔ تفسیر سورۂ سبا۔

[۳] بلاذری ۱: ۱۱۵۔

Presented by Ziaraat.Com

کاہن کے علاوہ بھی ان کے یہاں "عراف" کی اصطلاح تھی، مگر دونوں میں کیا فرق تھا اس کا پتہ نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کاہن ماضی کا حال بتاتا تھا اور عراف مستقبل کا۔ مگر ان کی جو باتیں بیان کی گئی ہیں ان سے یہ بات مطابقت نہیں رکھتی۔ زمانۂ جاہلیت کے لوگوں میں یہ مذہبی افراد شمار ہوتے تھے اور اپنے آپ کو اللہ کے نزدیک ترین اشخاص سمجھتے تھے۔ فال نکالنا، علاج معالجہ کرنا، جادو کرنا ان کا کام تھا۔ ان کے پاس ہر درد کی دوا تھی۔ ان کے پاس مختلف طریقے تھے مثلاً پرندوں کی پرواز کا مطالعہ (زجر) سنگریزوں کا دیکھنا (طرق) شگون دیکھنا اور فال نکالنا (عیافہ) وغیرہ۔ یہ ساری باتیں تیسری صدی قبل مسیح میں رومی کاہنوں کے کرتب تھے جو انہوں نے کلدہ والوں سے سیکھے تھے۔ کاہن معاشرے کے اکابرین اور اشراف میں شمار ہوتے تھے۔ بعض اوقات سلطنت کے کاموں میں بھی ان کا عمل دخل ہو جاتا تھا۔ جو بھی ان کے سامنے جاتا ان کے لیے تحائف لے کر جاتا جس کو "حلوان الکاہن" کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ مسجع اور مقفع جملے بولتے جو ذو معنی ہوا کرتے تاکہ کل کلاں کی تاویل بآسانی کی جا سکے۔ اس کو "سجع الکہان" کہتے تھے۔

اسی لیے پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ جو بھی ان کے پاس جائے اور ان کی باتوں کو وحی کے طور پر تصدیق کرے وہ کافر ہے۔ آپ نے کاہنوں کو تحفے تحائف دینے سے بھی منع کیا۔ ان میں سے بعض نے بہت شہرت پائی تھی۔ جیسے سُطیح، شق، ابن صیاد، مُسیلمہ، طلیحہ، رباح بن عجلہ، ابلق اسدی اور زبراء کاہنہ۔ جیسا کہ ذکر کیا گیا بڑے بڑے کاہن بت پرستی کے سرپرست تھے اور اپنے لیے پیغمبری کے اوصاف کے قائل تھے۔

کاہن وہ ہوتا تھا جس کے پاس لوگ جاتے کہ پچھلا یا آئندہ کا حال بتائے اور ان کے دل کی آرزو اور خواہشات معلوم کر کے ان کو بتائے۔ یا پھر اہم کام کے سلسلے میں جیسے بیماری، کاہلی، شادی بیاہ، سفر، جنگ، تجارت اور اس قبیل کے کاموں کے موقع پر حکم صادر کرے کبھی کبھی کاہن تسخیرِ روح بھی کرتا اور ریاضت بھی کرتا۔ کبھی بعض چیزوں کے ذریعے پیشگوئی بھی کرتا۔ اس نوعیت کی باتیں کرتا، ذو معنی جملے کہتا اور سننے والے اپنا اپنا مطلب نکال لیتے۔ اور جو سنتا اس کو بڑھا چڑھا کر دوسروں کو سناتا۔

چنانچہ صدرِ اسلام میں بھی بعض لوگ ایسے تھے جو پیغمبرؐ کو کاہن اور شاعر سمجھتے رہے۔ ان سے اس کی توقع کرتے کہ کاہنوں کی جیسی باتیں کریں اور بتائیں کہ ان لوگوں نے اپنے دامن میں کیا چھپایا ہوا ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ خداوند عالم نے فرمایا:

یقیناً یہ رسول کریم کا قول ہے۔ یہ کسی شاعر کا قول نہیں۔ تم لوگ جو ایمان لائے ہو وہ بہت تھوڑا ہے۔ نہ ہی یہ کسی کاہن کا قول ہے۔ تم لوگ جو نصیحت حاصل کرتے ہو وہ نہایت تھوڑی ہے۔ یہ تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔

(۶۹: ۴۰ – ۴۳)۔

یا پھر فرمایا:

تم نصیحت کرتے رہو۔ تم اپنے پروردگار کی نعمت سے نہ کاہن ہو اور نہ دیوانے (۵۲: ۲۹) [۱۱]

---

[۱۱] مزید مطالعہ کے لیے ان کتابوں کی طرف رجوع کریں:۔ مقدمہ ابن خلدون کا ترجمہ ۱: ۱۹۰، ۳۰۳، ۵۱۸، ۶۶۳۔ بلوغ الارب ۳: ۲۶۸۔ عجائب المخلوقات۔ قزوینی ۱: ۱۷۳۔ طبری ۲: ۹۹۔ ترجمہ مروج ۵۲۵۔ ۵۴۵۔ الشعر والشعراء ۲۹۲، ۲۹۶ لیدن، مجالس ثعلبہ ۲۹۲، حیوان جاحظ ۶: ۲۰۴، ثمار القلوب ثعالبی ۸۱، اغانی ۸: ۵۵ مصر، امالی قالی ۱: ۲۶ و نوادر ش ۲: ۱۵۸، روض الانف ۱: ۱۳۱، مستطرف باب ۶۰، کامل ابن اثیر ۲: ۱۱۔

Presented by Ziaraat.Com

بہرحال یہودیوں اور عیسائیوں سے شناسائی کی وجہ سے اور خود اپنے مذہبی اعتقادات کی بنا پر زمانۂ جاہلیت کے لوگ کسی حد تک وحی سے آشنا ضرور تھے۔

سارے آسمانی مذاہب میں وحیِ الٰہی پر اعتقاد تھا۔ یہاں تک کہ زرتشتی بھی سروش ایزدی اور پیام برالٰہی پر اعتقاد رکھتے تھے۔ ان کی سب سے پرانی کتاب "گاتا" میں بھی زرتشت کی پیغمبری کے آغاز کی روایت موجود ہے۔ اس میں ہے "وہ واحد شخص جس کو ہم نے یہاں پہچانا ہے اور جو میرے احکام کی تعمیل کرتا ہے وہ "زرتشت اسپنتمان" ہے۔ وہی ہے جو مزدا کی ثنا کے سرود کے ذریعے چاہتا ہے کہ سچائی کو اشتہار دے۔ اس لیے ہم اس کو کلام کا طریقہ عطا کرتے ہیں"[۵] دنیا کی فضا جو ظلم و جور، تباہی و ویرانی اور خوشامد سے تنگ ہو چکی تھی اس انتخاب سے خوش و خورسند ہو گئی۔

قرآن مجید کی تائید کے علاوہ یہود و نصاریٰ کی مذہبی کتابوں میں بھی وحیِ الٰہی انبیاءؑ کی صداقت کا سبب بنتی ہے۔ عہدِ عتیق (تورات) میں اکثر موقعوں پر نزولِ الہام اور وحیِ الٰہی کو "نزولِ روحِ خدا" سے تعبیر کیا گیا ہے[۶] اس صورت میں روحِ خداوند روح نبیؑ پر نازل ہوتی ہے جو روحِ خدا کی قوت سے بھر جاتی ہے اور وحیِ الٰہی کی تبلیغ کرتی ہے[۷] "یہوہ صبایوت" اپنی روح کے ساتھ کلام الٰہی کو انبیاء کے واسطے سے بھیجتا ہے[۸] روحِ خداوند کی حکمرانی میں سب ہی مطیع اور فرمانبردار ہیں اور جب روحِ خداوند کسی پر نازل ہوتی ہے تو اس سے متاثر ہو کر وہ شخص ایک دوسرا شخص اپنا کر پیغمبری کرنے لگتا ہے[۹]

وحی کا لفظ تورات میں بارہا آیا ہے[۱۰] کبھی براہِ راست نبی کو درمیان میں کسی فرشتے کے بغیر بلا واسطہ خود رب کی دعوت ہوتی ہے[۱۱] اور وہ کلام الٰہی سنتا ہے۔ کبھی وحی واسطے سے نازل ہوتی ہے۔ بہرصورت یہ روحِ خداوند ہے جو نبیؑ کے وسیلے سے متکلم ہوتی ہے اور اس کا کلام نبیؑ کی زبان پر جاری ہوتا ہے[۱۲] چنانچہ نبیؑ کلامِ الٰہی کی بولنے والی زبان کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا[۱۳] خداوند کا کلام جو نازل ہوا تو خداوند اپنے کلام کو خود دیکھتا ہے کہ وہ انجام کو پہنچے اور نبیؑ کی زبان پر جاری ہو[۱۴] جب وحی نازل ہو جائے تو حکم کی بجاآوری اور وحی پہنچانے سے کوئی

۵ھ ہات ۲۹، بند ۸ و بعد۔

۶ھ مثلاً دوم تواریخ ایام ۱۵: ۱ و ۲۴: ۲۰، نحمیا ۹: ۳۰۔

۷ھ حزقیال ۱۱: ۵، یوئیل ۲: ۲۸، میکاہ ۳: ۸، زکریا ۷: ۱۲۔

۸ھ زکریا ۱: ۶ و ۷: ۱۲۔

۹ھ نمونۂ آن قاصدان شائول و خود او (اول سموئیل ۱۰: ۵-۱۱ و ۱۹: ۲۰-۲۴) و مشایخ اسرائیل در حضور موسیٰ از نبوت بہرہ گرفتند (اعداد ۱۱: ۲۵-۲۹)۔

۱۰ھ از جملہ: اعداد ۲۴: ۲ و دوم سموئیل ۲۳: ۱ ۔

۱۱ھ اول سموئیل ۳: ۱-۲۱ ۔

۱۲ھ ۲ سموئیل ۲۳: ۲

۱۳ھ خروج ۴: ۱۶ و ۷: ۱، استثنا ۱۸: ۱۸، اعداد ۱۱: ۲۴ و ۱۲: ۶ ۔

۱۴ھ ارمیا ۱: ۴، ۱۱، ۱۲ و ۲ سموئیل ۲۳: ۲۔

www.ziaraat.com Sabeel-e-Sakina

Presented by Ziaraat.Com

چارہ نہیں۔ یہ شیر نے دھاڑا ہے، کون ہے جو اس سے نہ ڈرے۔ خداوند یہوہ نے تکلم کیا ہے۔ کون ہے جو نبوت کو نہ پیش کرے[15] عیسائیت میں ایک ذرا فرق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عیسائیوں کے یہاں وحی کا ایک خاص مفہوم ہے جس کا سمجھنا ہم لوگوں کے لیے مشکل ہے۔ ان کے یہاں وحی عنصرِ بشری اور الٰہی میں جمع ہو جاتی ہے۔ یعنی الٰہی الہام بشری لغت کا جامہ پہن لیتا ہے تاکہ اس کا مفہوم لوگوں پر واضح کیا جا سکے۔ ان کے عقیدے کے مطابق تورات میں الہام الٰہی پرستش سے بالا ہے[16] شریعتِ الٰہی کبھی فرشتوں کی طرف سے ابلاغ ہوتی ہے اور کبھی خود یہوہ کی طرف سے[17] شریعت صرف احکام جسمی سے قائم نہیں ہوتی بلکہ قوتِ حیات سے غیر فانی ہو جاتی ہے[18] چونکہ شریعت کسی چیز کو کامل نہیں کرتی[19] اس لیے ضعف اور کمی کی وجہ سے ممکن ہے شریعت فسخ ہو جائے[20] ساری کتابیں خداوند کے الہام سے ہیں ...[21]

مختلف زمانوں میں وحی گوناگوں افراد پر نازل ہوئی ہے اور مختلف روش، زبان اور طبع کے بہت سے لوگ تبلیغِ وحی کے ذمہ دار بنائے گئے تھے۔ جو کچھ وحی ہوا وہ روح القدس کی ہدایت کے مطابق لکھا گیا۔ ہاں انہوں نے پہلے کے طریقوں کو دیکھا اور اپنے خاص اسلوب اور خصوصی روشِ عقلانی کے مطابق پیش کیا۔ مگر مفاہیم اور معانی وحی کے سرچشمے سے ہیں۔ یعنی وحی لفظ بہ لفظ املا نہیں کی گئی۔ بلکہ معانی ذہن اور نفس میں واضح ہو جاتے ہیں اور ان معانی میں خدا کی مدد سے کلام کا مناسب قالب انتخاب کر لیا جاتا ہے۔ اس طرح وحی الہام کی شباہت اختیار کر کے دوسروں کے لیے حجت شمار ہوتی ہے۔

ان دونوں نقطۂ نظر میں فرق دراصل عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان وحی کے مفہوم کا فرق ہے۔ ایک مصنف نے اس کو اس طرح پیش کیا ہے: "وحی کے مفہوم کا تجسّم مسلمانوں کی نظر میں ایک کتاب (قرآن) ہے اور عیسائیوں کی نظر میں ایک فرد (حضرت عیسیٰ) ہیں"[22] اس مفہوم کو کسی اور نے اس طرح پیش کیا ہے: "وحیِ قرآن کے بارے میں اسلام کا دعویٰ ہے کہ پہلی نظر میں یہ ایک عقیدے کے

---

۱۵ عاموس ۳: ۸ و ۳-۷۔ ارمیا ۲۰: ۷-۸ کبھی انبیاءؑ اس کیفیت کو خود بیان کرتے ہیں۔ ارمیا نبیؑ کہتے ہیں "وحی آگ کی طرح میری جان پر لگی"۔ اس میں ایک جوہر ہے جو آگ کی طرح احوالِ نفسانی پر حکمرانی کرتا ہے کہ پیروی کے علاوہ چارہ نہیں۔ یقیناً جوہرِ حیات نبیؑ کا اپنے اختیار میں رکھتا ہے۔ حضرت ایوبؑ اس کے بارے میں ذرا نرم بات کرتے ہیں (ایوب ۳۲: ۱۸-۱۹) مگر ارمیا نبیؑ کی بات تاریخی صحت کے لحاظ سے قابلِ قبول ہے۔

۱۶ عبرانیان ۱: ۱۔

۱۷ عبرانیان ۲: ۲ مطابق غلاطیان ۳: ۱۹ و اعمال ۷: ۳۵ و تثنیہ ۳۳: ۲۔

۱۸ عبرانیان ۷: ۱۶۔

۱۹ ایضاً ۷: ۱۹۔

۲۰ ایضاً ۷: ۱۸۔

۲۱ تیموتاؤس ۳: ۱۶۔

۲۲ عقل و وحی در اسلام۔ آربری۔ ترجمہ بخاری۔ ص ۷۔

H.M. GWATKIN, THE KNOWLEDGE OF GOD AND ITS HISTORICAL DEVELOPMENT, T.P. 39, W. TEMPLE, IN REVELATION, P. 117

Presented by Ziaraat.Com

مثل ہے جو کتاب مقدس میں بیان ہوا ہے اور پیغمبر اسلام کے پیرو اس کو احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں جو یہودیوں اور عیسائیوں کے سارے پیغمبروں کے لیے احترام سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ ایک پیغمبر سے بالاتر نہیں۔ وحی ان کے پیغام میں ہے، ان کے وجود میں نہیں۔

علاوہ ازیں وحی احکام الٰہی کی مدون شکل ہے جس کا لازمہ احکام شریعت کی پابندی ہے تاکہ ایک شخص سے وفاداری اور عشق ممکن ہو[۱۲۵]

اس طرح ان دونوں کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ اسلام میں مفہوم وحی کا مجسم قرآن ہے اور عیسائیت میں حضرت عیسیٰ کی شخصیت۔

دوسری بات جو رہ گئی وہ پیغمبروں کا شمار ہے۔

سورۂ مومن آیت ۸، میں وضاحت کی گئی ہے اکچھ رسول ہیں جن کے نام قرآن میں آئے ہیں اور وہ بھی ہیں کہ جن کے نام نہیں آئے ہیں۔ بہت سوں کا ذکر قرآن میں نہیں ہے۔ سارے رسولوں اور انبیاء میں ان ۲۶ افراد کے نام کا ذکر قرآن میں موجود ہے، آدمؑ، نوحؑ، ادریسؑ، ہودؑ، صالحؑ، ابراہیمؑ، لوطؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، الیسعؑ، ذوالکفلؑ، الیاسؑ، یونسؑ، یعقوبؑ، یوسفؑ، شعیبؑ، ایوبؑ، موسیٰؑ، ہارونؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ، زکریاؑ، یحییٰؑ، اسماعیل صادق الوعدؑ، عیسیٰؑ اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ یہ وہ پیغمبر ہیں جن کا نام لے کر ذکر ہوا ہے۔ وہ بھی ہیں جن کا اشارتاً ذکر ہے اور تفاسیر میں ان پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ مثلاً اسباط (فرزندان یعقوبؑ) (۴ : ۱۶۳) یا وہ پیغمبر جس کے اشارے پر طالوت بنی اسرائیل کا بادشاہ بنا (۲ : ۲۴۷)۔ مصنف کی نگاہ میں بعض ایسے دلائل ہیں جن کی بنا پر امکان ہے کہ یہ وہی اسماعیل صادق الوعد پیغمبر ہوں۔ واللہ اعلم۔ ایسے اور بھی پیغمبر ہیں جن کا ذکر موجود ہے (۲ : ۲۵۸ و ۳۶ : ۱۴)۔

روایات میں تواتر سے کوئی روایت نہیں کہ جس سے پیغمبروں کی حقیقی تعداد کا تعین کیا جا سکے۔ مشہور ترین روایت یہ ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء پیغمبر آئے تھے[۱۲۶] کہا گیا ہے کہ ان میں سے ۳۱۲ (یا ۳۱۵) افراد یعنی ایک گروہ مرسل تھا۔ ان مرسل میں بھی ایسے ہیں جنہوں نے اپنی نبوت کے عہد و پیمان پر ثبات و استقامت دکھائی ہے (۳۳ : ۷) یا مستقل احکام اور شریعتیں ان کو وحی ہوئیں، یہی اولوالعزم (۴۶ : ۳۵) پیغمبر ہیں۔ یہ پانچ اشخاص، نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور محمدؐ جن کا (۳۳ : ۷ و ۴۲ : ۱۳) آیات میں ذکر آیا ہے۔ مگر بعض اس پایہ استقامت تک نہیں پہنچے۔ ان پانچ میں سے ہر ایک حامل شریعت و کتاب ہے (۴۲ : ۱۳ و ۵ : ۴۴ - ۴۸) داؤدؑ بھی صاحب زبور ہیں (۴ : ۱۶۳) مگر احکام اور شریعت کا انحصار اولوالعزم پیغمبروں پر ہے۔ یہ حقیقت میں تشریعی پیغمبر ہیں جب کہ دوسرے انبیاء تبلیغی پیغمبر کہے جائیں گے۔ ان کا کام صاحبان شریعت کی تعلیمات کو لوگوں تک پہنچانا اور اس کی تعلیم و تبلیغ ہے۔ اولوالعزم پیغمبروں کی تعداد پانچ سے زیادہ اور کم بھی کہی گئی ہے مگر مشہور یہی پانچ کی تعداد ہے ان کو جو "اولوالعزم" کہا گیا ہے اس کے بھی مختلف دلائل تلاش کیے ہیں، قرآن کی آیات، (خصوصاً ۳۳ : ۷) پر غور کرنے سے یہ بیان محکم و معتبر نظر آتا ہے۔

۴

---

[۱۲۵] عقل و وحی در اسلام۔ آربری۔ ترجمہ جوادی۔ ص ۷

[۱۲۶] انبیاء کی تعداد روایات میں مختلف درج ہے۔ یہ آٹھ ہزار سے لے کر تین لاکھ بیس ہزار تک کہی گئی ہے۔ مگر زیادہ مشہور یہی ایک لاکھ چوبیس ہزار کی تعداد ہے۔

Presented by Ziaraat.Com

قرآن میں وحی

قرآن مجید میں وحی اور اس کا استعمال مختلف طریقوں سے آیا ہے کہ بعض موقعوں پر لغوی معنی سے بہت فرق نظر آتا ہے۔

قرآن میں اس لغوی معنی یعنی "مخفی اشارہ" کا بھی ذکر ہے۔ جیسا کہ جب حضرت زکریاؑ کو حضرت یحییٰؑ کی پیدائش کی بشارت ہوئی اور وہ محراب سے باہر آئے تو لوگوں کو اشارے سے کہا کہ صبح اور شام خدائے واحد کی تسبیح کیا کریں۔ یہاں (۱۹: ۱۱) اَوْحٰی کے معنی "اشارہ کیا" کے ہیں۔

اس سے زیادہ واضح دلائل بھی موجود ہیں:۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ۚ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ (۴۲: ۵۱)

کسی بشر کے لیے یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام کرے سوائے وحی کے (ذریعے) یا پردے کے پیچھے سے (غیب عالم ملکوت اور حجاب ملکوتِ عالم) یا کوئی رسول (فرشتۂ وحی) بھیجتا ہے۔ وہ اس کی اجازت سے جو وہ چاہتا ہے وحی کرتا ہے۔ یقیناً وہ بلند مرتبہ بڑا حکمت والا ہے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ خدا اور انسان کے درمیان رابطہ تین طریقوں سے ہوتا ہے:

۱۔ وحی کے ذریعے۔ یعنی براہ راست ارتباط۔ خداوند تعالیٰ بغیر کسی واسطے کے اپنے پیغمبر سے رمز میں کلام کرتا ہے۔

۲۔ پردے کے پیچھے سے۔ یعنی بالواسطہ ارتباط۔ مگر واسطہ خود پیام نہیں رکھتا۔ مثال کے طور پر درخت نے حضرت موسیٰؑ سے بات کی جب کہ درخت کے پاس خود کوئی پیام نہیں تھا۔ وہ خدا تھا جو پسِ پردہ سے کلام کر رہا تھا۔

۳۔ ایک رسول واسطہ ہوتا ہے۔ یہاں بھی ارتباط براہ راست ہے مگر فرشتۂ وحی خداوند تعالیٰ کی طرف سے پیام رکھتا ہے اور وہ وحی ابلاغ کرتا ہے۔

کبھی وحی "جبلت اور فطری شعور باطنی" ہوتی ہے۔ خداوند تعالیٰ نے شہد کی مکھی کو وحی کی کہ پہاڑوں میں، درختوں میں اور مکانوں میں اپنا چھتہ بنائے (۱۶: ۶۸) یہ شہد کی مکھی کے باطن میں پیام ہے اور ہدایت ہے جو جبلت کے طور پر اس کو نشوونما اور ارتقا پر مجبور کرتی ہے۔ یہ اس کو ایسی ودیعت ہے جو اس کے کمال کی طرف اس کی رہبری کرتی ہے۔

چون کہ اَوْحَى الرَّبُّ اِلَى النَّحْلِ آمده است

خانۂ وحیش پُر از حلوا شده است

یہ پیام شہد کی مکھی کے باطن میں رکھا گیا ہے۔ یہ فطری جبلت اور شہد کی مکھی کی طبع ہے۔ کہ وہ اس تعجب خیز مگر لذیذ شہد کو محلوں میں، گوداموں میں، میدانوں میں، سڑکوں کے دورویہ درختوں میں اور تجربہ گاہوں میں مہیا کرے[۱] یہ جبلتِ وحی اور وہی لفظ ہے جو آسمانوں

---

[۱] زنبورِ عسل۔ مارس میٹرلنگ۔

Presented by Ziaraat.Com

(اور جہانِ خلقت) کے امور اور کام میں استعمال ہوا ہے۔

وَاَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَھَا (۴۱ : ۱۲)

ہر آسمان کا امر اور نظم اس کو وحی فرمایا ؛

یعنی تقدیر اور مقدر کیا۔ اس کو تسخیر بھی کہتے ہیں۔ زمین یا مادۂ خاکی جو بے جان ہے وحی الٰہی کا موضوع بنا۔ وحی کے ذریعے زبانِ حال استعمال کا حامل ہوا۔ یہاں شروع کی آیات میں کہا گیا ہے (۱۹۹ ـ ۵)۔

جب زمین سخت زلزلے سے ہلائی جائے گی۔ اور زمین اپنے بوجھ نکال دے گی۔ اور انسان کہے گا کہ اس کو کیا ہو گیا ہے اس دن وہ اپنی خبریں بیان کرے گی۔ کیونکہ تیرے پروردگار نے اس کو وحی کی ہوگی۔ اس کو بھی تسخیر کہتے ہیں۔

خدا اور فرشتوں کے رابطے کو بھی وحی کہا جاتا ہے ؛

اِذْ یُوْحِیْ رَبُّکَ اِلَی الْمَلٰٓئِکَۃِ اَنِّیْ مَعَکُمْ (۸ : ۱۲)

جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں کو وحی کی کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں شیطان کے وسوسے کو بھی بطور خاص وحی کہا گیا ہے۔

ہر نبیؐ کے لیے انس و جن میں سے شیطان ہوا کرتے تھے جو دھوکا دینے کے لیے ایک دوسرے کے کان میں بناوٹی باتیں وحی (وسوسہ) کرتے۔ تاکہ وہ نبیوں سے لڑیں۔ (۶ : ۱۱۲ و ۱۲۱)۔

شیطان جو القا کرتا ہے اس کے لیے "شر کے وسوسے" کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے جو چھپ کے مخفی طور سے انجام پاتا ہے یہاں لفظ "وحی" استعمال ہوا ہے۔ سورہ "الناس" اس کی تفسیر کرتی ہے۔

اور آگے چلیں تو برگزیدہ افراد کو بھی وحی ہوتی ہے، جیسے کہ حضرت موسیٰؑ کی والدہ کو وحی ہوئی کہ نوزائیدہ بچے کو دریا میں بہا دیں۔ (۲۸ : ۷) ایسی وحی کو الہام، قلب میں القا، یا دل میں ڈالنا، اعلان، رویا یا وہ کلام جو سنا گیا کہا گیا ہے[۱] جو بھی صورت ہو حضرت موسیٰؑ کی والدہ نے اس کا اندازہ کیا کہ بچے کو دریا میں ڈال دینا چاہیے۔ حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کو بھی حضرت عیسیٰؑ کے واسطے سے وحی کا "اعلان" ہوا کہ خدا اور اس کے رسول پر ایمان لے آئیں۔ (۵ : ۱۱۱)۔

مگر "وحی اور اسمار" کے زیادہ تر مواقع آنحضرتؐ سے پہلے کے پیغمبروں سے متعلق ہیں۔ یہ وحیِ رسالت ہے اور خدا اور پیغمبر کے درمیان ارتباطِ غیبی ہے۔ مگر کبھی براہ راست اور کبھی بالواسطہ ہوتا رہا ہے۔ الہام، رویا (خواب)، کلام کا سننا، یہاں تک کہ پیغمبر بات کیے مختلف شکلیں بھی وحی کی صورتیں رہی ہیں۔ حضرت نوحؑ کو وحی کی گئی کہ خداوند تعالیٰ (کی نگاہوں) کے سامنے اور وحی الٰہی کے ذریعے کشتی بنائیں (۱۱ : ۳۶، ۳۷ و ۲۳ : ۲۷)۔ حضرت موسیٰؑ کو وحی ہوئی کہ اپنے لوگوں کے ساتھ رات کے وقت باہر نکل جائیں (۲۰ : ۷۷، ۲۶ : ۵۲) اور سمندر پہ ضرب لگائیں (۲۶ : ۶۳) پتھر پر ضرب لگائیں (۷ : ۱۶۰)۔ حضرت یوسفؑ کو وحی آئی کہ ایک دن اپنے بھائیوں کو ان بُرے کاموں سے آگاہ کریں جن کے وہ مرتکب ہوئے ہیں (۱۲ : ۱۵) یہ انبیاء ہیں جن پر یہ وحی اتر رہی ہے۔ فرمایا ؛

نہیں بھیجا ہم نے (رسول بنا کر) تم سے پہلے مگر یہ کہ وہ آدمی ہی تھے جن کی طرف ہم وحی کیا کرتے تھے۔ (۲۱ : ۷) و (۱۲ : ۱۰۹)

---

[۱] اس آیت کی تفاسیر۔ لسان۔ عقائدی علم الکلام کی کتابیں مثلاً اوائل المقالات۔ صفحہ۔ ۳۹ یا تصحیح الاعتقاد۔ ۵۶۔

Presented by Ziaraat.Com

۱۳ و ۱۷، ۹۱ و ۳۲ و ۵۳، ۱۰۱ و ۱۴، ۱۲۳ و ۱۷، ۱۱۷ و ۱۰، ۲۱، ۸۷ و ۱۲۶، ۳۱، ۱۵، ۹۶: ۹۱ و ۰۰۰)۔

اس بحث میں بعض لوگوں کو عام طور پر ایک مشکل پیش آتی ہے اور وہ یہ کہ یہ حضرات صرف لفظ وحی اور قرآن میں اس کے مشتقات پر نظر رکھتے ہیں جب کہ وحی نازل ہونے کو قرآن مجید میں صرف لفظ وحی اور اوحیٰ سے پیش نہیں کیا گیا بلکہ اکثر انزل اور نزل سے بیان کیا گیا ہے۔ وحی کے ۷۸ دفعہ کے مقابلے میں تقریباً ۲۶۰ بار نزول سے وضاحت کی گئی ہے۔ یہ بھی اسی معنی کو پیش کرتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں وحی کے تجزیے اور تحلیل کو محض لفظ وحی، اور اس کے مشتقات تک محدود نہیں رکھنا چاہیے۔

لفظ وحی کے علاوہ اور دوسرے الفاظ اور تعبیریں بھی ہیں جن کا ذکر چلا ہے۔ مثلاً:

روح:

وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا (۴۲:۵۲)

اسی طرح ہم نے تمہاری طرف اپنے امر سے ایک روح وحی کی۔

تکلیم:

وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوسٰى تَكْلِيمًا (۴:۱۶۴)

اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ سے ایسا کلام کیا جیسا کہ کلام کرنے کا حق تھا۔

اس سے مقصود وحی ہے یعنی آسمانی غیر مادی کلام جس کا تفکرِ عقل سے ادراک ہوتا ہے۔ اسی کلامِ الٰہی کے وصف میں حضرت موسیٰؑ نے فرمایا تھا:

لا بصوت یقرع ولا باداۃ یسمع

نہ ایسی آواز سے جو کان پر گراں ہو اور نہ کسی وسیلے سے کہ سنا جا سکے۔

القاء:

إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا (۷۳:۵)

یقیناً ہم تم پر ایک گرانمایہ کلام اتاریں گے۔

ایسے بہت سے مواقع ہیں کہ وحی کو "القاء" کہا گیا ہے۔

انزال و تنزیل:

بِمَآ أُنْزِلَ إِلَيْكَ (۲:۴)

جو تم پر نازل کیا گیا۔

اور

تَنْزِيلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ (۴۱:۲)

تنزیل ہے رحمٰن اور رحیم خدا کی طرف سے۔

جیسا کہ ذکر ہوا وحی کے بہت سے موقعوں پر ان الفاظ کو ادا کیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض یہ بھی ہیں:

www.ziaraat.com
Sabeel-e-Sakina

Présented by Ziaraat.Com

حق :

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ (۵ : ۴۸)
اس کتاب کو تم پر حق کے ساتھ نازل کیا۔
(رجوع کریں؛ ۳۹ : ۲، ۴۱ و ۴۲ : ۳ و ۲۲۳ ؛ ۷ و ۱۷ : ۱۰۵...)

مُصَدِّق :

مُصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ (۶ : ۹۲)
جو کچھ ان کے پاس (آسمانی کتابیں) ہیں اس کی تصدیق کرتی ہے۔
ایسے اور بھی بہت سے مواقع ہیں جن کا یہاں مختصراً ذکر کیا جاتا ہے:
"یہ کتاب حکیم کی آیات ہیں جو نیکوکاروں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے" (۳۱ : ۲)
"یہ آیاتِ قرآن اور کتابِ مبین ہیں۔ مومنوں کے لیے ہدایت اور بشارت" (۲۷ : ۱ و ۲)
"کتاب لوگوں پر اتاری جس میں علم و دانش کی بنیاد پر ہر چیز کی تفصیل دی گئی ہے۔ ان کے لیے ہدایت و رحمت ہے جو ایمان لائیں" (۷ : ۵۲)۔

کبھی اس آسمانی وحی کو "علم" کہا گیا (۲ : ۱۵۱ و ۲ : ۱۲۰، ۱۴۵) کبھی حکمت (۱۷ : ۳۹) ہدایت (۱۴ : ۱۲ و ۷ : ۵۲) شفاء (۴۱ : ۴۴) یا نور (۴ : ۱۷۴ و ۴۲ : ۵۲)۔ دوسرے وہ مواقع ہیں جن کے بہترین راہنما "قرآن کے نام" ہیں جو کتاب کے شروع میں پیش کیے گئے تھے۔

وحی کے ان سارے مختلف مفاہیم کے باوجود ایک مشترک پہلو ہے جو ساری کائنات میں نظر آتا ہے۔ یعنی وہ نظم و ہدایت جو ہر وجود میں چھپا ہوا ہے، خواہ شہد کی مکھی میں ہو، آسمان اور زمین کے امر میں ہو یا خواہ ملائکہ اور انسان میں ہو۔ وہ طاقت جو ان کے وجود کو آگے بڑھاتی ہے اور ان کو جہت عطا کرتی ہے وہ ہدایتِ الٰہی ہے۔ اسی کو وحی کہتے ہیں۔ وہ خواہ قانونِ طبیعی کی صورت میں ہو، جبلت اور فطرت ہو یا انبیاء کے رشد و ہدایت کے وسیلے سے ہو۔ چنانچہ وحی کو دو بنیادی قسموں میں بانٹا جا سکتا ہے:

۱۔ وحی تکوینی۔ وہ قوانین اور احکام جو عالمِ ہستی کے داخل میں ودیعت کیے گئے ہیں۔ یہ خدا کا فطرت سے رابطہ واضح کرتے ہیں۔ یہی رابطہ ہے جو قوانینِ فطرت اور جبلت کو بیان کرتا ہے اور نظامِ طبیعی کو برقرار رکھتا ہے۔

۲۔ وحی تشریعی۔ وہ لازم حکم اور قانون کو وضع کرتی اور بیان کرتی ہے۔ اس رابطے میں پیغمبر گوہرِ ہستی سے متعلق ہوتا ہے۔ یہ وہ ہدایت ہے جو اس کے ذریعے ملتی ہے۔ کمال کی طرف انسانوں کے لائحہ عمل کی تنظیم ہے۔ ممکن ہے قرآن میں وحی بظاہر مختلف انداز میں پیش کی گئی ہے مگر حقیقت میں مطالب کے لحاظ سے سب ہی ایک اور مشترک معنی کے حامل ہیں۔ جمادات، نباتات، حیوان اور انسان سب ہی پر یہ معنی صادق آتے ہیں۔ یہی ہے جو ہر موجود کا باقی دوسرے عناصر اور وجود سے ارتباط اور اتصال پیدا کرتی ہے اور اس کو ایک معین جہت (یعنی کمال) کی طرف ہدایت کرتی ہے۔ (جمود سے نمو کی طرف، نمو سے جسم کی حرکت کی طرف اور جسم کی حرکت سے روحانی اور معنوی اعلیٰ حرکت کی طرف پہنچاتی ہے)۔ یہی ہے جو جہانِ ہستی میں ہر وجود کی وضع کو ایک خاص ہدف اور مقصد کی طرف لے چلتی ہیں

www.Ziaraat.com
Sabeel-e-Sakina
Presented by Ziaraat.Com

اس کا راستہ معین کرتی ہے۔ یعنی ہر موجود کو اپنی وضع میں مستحکم ہونے اور ہستی کی حرکت (کمال) کی جہت پر چلنے کے لیے وحی کے مدار اور طیف (SPECTRUM) کے اندر رہنا چاہیے۔

خلاصہ یہ کہ غیر ذی شعور موجود میں یہ ہدایت باطن میں وجود رکھتی ہے اور باشعور انسان میں اس کو خارج سے تعلیم ہوتی ہے۔

وحی محمدی پر قرآن کی گواہی

وحی محمدی کے صحیح ہونے کا سب سے بڑا گواہ خود قرآن ہے۔ بیشک قرآن کی شہادت سے وحی کی کنہ اور ماہیت تو سمجھ میں نہیں آتی مگر یہ رسولؐ کی سچائی اور وحی کے صحیح ہونے پر سب سے بڑی شہادت ہے۔

رسولؐ اللہ کی سچائی کی محکم ترین انداز میں خود خداوند تعالےٰ گواہی دیتا ہے،

"ہم نے جس طرح تم سے پہلے پیغمبروں پر وحی نازل کی، انبیاؑ جن کے قصے ہم نے بیان کیے ہیں اور وہ جن کے قصے بیان نہیں کیے ہیں، وہ رسول جو مُبَشِّر اور مُنذِر (خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے) تھے تاکہ رسولوں کے (آنے کے) بعد اللہ تعالیٰ پر آدمیوں کے لیے کوئی حجت نہ رہ جائے اسی طرح تم پر بھی وحی نازل کی۔"

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا (۴: ۱۶۶)

لیکن خدا نے جو کچھ تم پر نازل کیا ہے وہ گواہی دیتا ہے کہ اپنے علم (ازلی) سے نازل کیا۔ فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں۔ جب کہ خدا کی گواہی کافی ہے۔

اس سے بڑھ کر اور کون سی گواہی ہو سکتی ہے۔

"کہہ دیجئے اے پیغمبرؐ کہ اس (خدا کی گواہی) سے بڑھ کر اور کون سی گواہی ہے۔ کہہ دیجئے کہ میرے اور تمہارے درمیان خدا گواہ ہے۔ وہ ان آیاتِ قرآن کو ہم پر وحی کرتا ہے تاکہ ان (آیات) کے ذریعے تم کو اور جس کو بھی قرآن کی خبر پہنچے، ڈرائے۔" (۶: ۱۹)

"....قسم ہے ستارے کی جب وہ اترا تمہارا ساتھی (محمدؐ) نہ گمراہ ہوا اور نہ بہکا۔ وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتا یہ نہیں ہے مگر وحی جو اس کی طرف کی جاتی ہے...." (۵۳: ۱)

...."اور اسی طرح ہم نے تمہاری طرف اپنے امر سے ایک روح وحی کی۔" (۴۲: ۵۲)

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ "وحی" کا لفظ آیت میں نہیں آیا مگر آیت خود قلب پیغمبر اکرمؐ پر نزولِ وحی کی دلالت کر رہی ہے؛

"(اے رسولؐ ان سے) کہہ دیں کہ جو جبرئیلؑ کا دشمن ہے (وہ جان لے) کہ اس نے اس (قرآن) کو تمہارے دل پر اللہ کے اذن سے نازل کیا ہے۔" (۲: ۹۷۔ ایضاً ۱۶: ۱۰۲ و ۲۶: ۱۹۳ تا ۱۹۴ و ۱۶: ۲ و ۲۵: ۱)

حقیقت میں قرآن میں وحی کا اساسی مقام خود ذاتِ رسولؐ ہے،

"اسی طرح ہم نے تم کو ایک امت میں بھیجا ہے۔ یقیناً اس سے پہلے کئی امتیں گذر چکی ہیں، تاکہ تم ان کو وہ پڑھ

Presented by Ziaraat.Com

کہ سنا دو جو ہم نے تمہاری طرف وحی کیا ہے" (۱۳: ۳۰)
آنحضرتؐ کے ہم عصر لوگ اس بات پر تعجب کرتے تھے کہ ان ہی میں سے ایک شخص پر وحی کیسے نازل ہونے لگی تو قرآن نے ان کے اس تعجب کو رد کیا (۱۰: ۲) ان کو تعجب اس بات پر تھا کہ وہ شخص جو عام لوگوں کی طرح کوچہ و بازار میں چلتا پھرتا ہے اس پر وحیِ الٰہی کس طرح ہو گئی۔ فرمان آیا:

"... اے پیغمبر کہہ دیں کہ میں نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں اور نہ یہ کہ میں غیب کا جاننے والا ہوں۔ نہ ہی میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف اسی کی پیروی کرتا ہوں جو کچھ میری طرف وحی کیا جاتا ہے"

(۶: ۵۰ اس کے علاوہ ۳: ۴۲ و ۴۳: ۴۳)۔

وحیِ محمدی کی اس آیت سے تائید ہوتی ہے:

ان کی بات سوائے وحی الٰہی کے اور کچھ نہیں (۵۳: ۴)۔

جو بھی کلمات الٰہی آپ پر وحی ہوئے ان میں سے کسی میں بھی آپ تبدیلی نہیں لا سکتے:

"جو کچھ تمہاری طرف تمہارے پروردگار کی کتاب میں سے وحی کیا گیا ہے اسے پڑھو۔ اس کے کلمات کو کوئی بدلنے والا نہیں (۱۸: ۲۷)۔

اس کی سچائی کو کس تاکید اور اصرار سے بیان کیا گیا ہے:

"اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جس نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بہتان باندھا یا اس نے کہا کہ میری طرف وحی کی گئی ہے حالانکہ اس کی طرف کچھ بھی وحی نہیں کی گئی۔ اور کہتا ہے کہ عنقریب میں بھی ایسا ہی (کلام) نازل کروں گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے نازل کیا (۶: ۹۳)۔

کبھی قرآن کافروں کی لگائی ہوئی تہمت سے رسولؐ کا دفاع کرتا ہے اور آپ کی صداقت شعور اور امانت پر اصرار کرتا ہے (۸۱: ۱۵ تا ۲۷ و ۵۳: ۱ تا ۱۲) ان کے شیطان سے ارتباط کو رد کرتا ہے (۲۶: ۲۱۰ - ۲۱۱ و ۲۲۱ - ۲۲۳ و ۸۱: ۲۵) کافروں کی سخت مذمت کرتا ہے اور نبیؐ کے صدق و شعور پر پورا بھروسہ کرتا ہے (۶: ۱۹، ۵۰ و ۳۱: ۲۰۳ و ۱۰: ۱۵ و ۲: ۴۴ و ۲۴: ۴۶ و ۸۱: ۲۰ و ۲۰: ۱۱۴ و ۴۵: ۱۶ تا ۱۹)۔

آپ کی تسلی اور دلداری کرتا ہے:

"(جبرئیلؑ نے کہا) ہم بغیر تمہارے پروردگار کے حکم کے نہیں اترتے۔ اسی کا ہے جو کچھ ہمارے سامنے ہے اور جو کچھ ہمارے پیچھے ہے اور جو ان کے درمیان ہے۔ اور تمہارا پروردگار بھولنے والا نہیں۔ (۱۹: ۶۴)۔

یہ اس بات کی نشاندہی ہے کہ آپ پر کس حد تک پروردگار کی عنایت ہے کہ پیام نازل فرماتا ہے وہ آپکو فراموش نہیں کرتا۔ قرآن میں تسلی اور دلداری کی داستان تفصیلی ہے۔ اس کا ذکر بہت طویل ہے[۱]

دوسری اعلیٰ اور برتر گواہی قرآن میں موجود ہے جو بڑی لطافت اور گہرائی سے بیان ہوئی ہے۔ قرآن میں تین سو سے زیادہ آیات ہیں جو "قُلْ" یعنی "کہہ دیں" سے شروع ہوتی ہیں۔

---

[۱] یہ آیات بھی دیکھیں [illegible]
بقیہ حاشیہ [illegible]

Presented by Ziaraat.Com

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ (۱۸ : ۱۱۰)

کہدیں کہ ماسوا اس کے نہیں کہ میں تمہارے مثل بشر ہوں۔ میری طرف وحی کی جاتی ہے۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْۗءُ

کہدیں کہ میں اپنی ذات کے لیے نہ کسی نفع کا مالک ہوں اور نہ کسی نقصان کا سوائے اس کے جو اللہ چاہے۔ اگر میں غیب جاننے والا ہوتا تو میں ضرور بہت زیادہ خیر و خوبی حاصل کر لیتا اور مجھے تکلیف نہ پہنچتی۔ (۷ : ۱۸۸)

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَاۗىِٕنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ (۶ : ۵۰)

(اے رسولؐ) کہدیں میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ تعالےٰ کے خزانے ہیں اور نہ یہ کہ میں غیب کا جاننے والا ہوں۔

اس "قُل"، "کہو" اور "کہہ دو" میں ہزار لطیف نکتے پوشیدہ ہیں۔ یہ رسولؐ سے خطاب ہے کہ کہیں ایسا ہے اور ایسا نہیں ہے۔ کہیں کہ یہ وحی الٰہی ہے۔ کہیں کہ میں اپنی ذات سے کچھ نہیں کہتا۔ یہ پیغمبرؐ کا کہا ہوا نہیں ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے۔ پیغمبرؐ خود کچھ نہیں کہتا کہنے پر مامور کیا گیا ہے۔ اس گفتگو میں، اس ابلاغ میں خود پیغمبرؐ کا کوئی اپنا موضوع نہیں۔ موضوع صرف وحیِ الٰہی کا ابلاغ ہے اور بس۔ اس لفظ "قُل" سے پڑھنے والا اچھی طرح سمجھ جاتا ہے کہ محمدؐ کا یہاں کوئی دخل اور تصرف نہیں ہے۔ جو کچھ ہے وہ خدا کا کہا ہوا ہے۔ خود یہ "قل" "کہو" کس قدر پرشکوہ اور رعب دار ہے! بیشک لفظ "قل" تنہا اس معنی کو نہیں پہنچاتا۔ دوسرے الفاظ مثلاً "اُتْلُ" "تلاوت کرو" اور "اِقْرَاْ" "پڑھو" بھی اسی لطیف معنی کے حامل ہیں۔

اس لفظ "قل" سے ایک اور نکتہ واضح ہوتا ہے یعنی زیادہ تر وحی "سمعی" تھی، پیغمبرؐ اس کو سنتے اور اپنے پورے وجود سے اس کا ادراک کرتے اور بعد میں جس طرح کہ سنا تھا حرف بہ حرف، لفظ بہ لفظ اس کو دہراتے اور اس کا ابلاغ فرماتے۔ یہ بات سیرت اور احادیث میں بالکل واضح ہے۔ بہت کم ایسے مواقع ہیں کہ رسول اللہ (۶ : ۱۰۵، ۱۱۰ و ۲۷ : ۹۱ و ۹۲ ، ۷) یا فرشتے (۱۹ : ۶۴ و ۳۷ : ۱۶۴۔ اور آگے) اول شخص کی حیثیت سے بات کریں اور اس سے پہلے لفظ "کہا" "وہ کہتے ہیں" یا "کہو" نہ آیا ہو۔

اس طرح ابلاغِ وحی کے لیے رسولِ خدا کے لیے ایک ہی راستہ تھا اور قرآن کی گواہی کے مطابق جو بھی تھا اور ہے وہ سب وحیِ الٰہی سے ہی تھا۔ جو کچھ داستانیں اور قصے پیغمبرؐ کی اطلاع کے بارے میں بیان ہوئے ہیں وہ صحیح نہیں، اس لیے کہ آپؐ نزولِ وحی سے پہلے ان چیزوں سے بے خبر تھے۔ یہ نوحؑ کا قصہ آپؐ سے خداوند تعالیٰ خود بیان کرتا ہے اور کہتا ہے: "یہ غیب کی خبریں ہیں۔ اور ہمارے تم پر وحی کرنے سے پہلے تم اور تمہاری قوم اس سے آگاہ نہیں تھے۔" (۱۱ : ۴۹) مدین میں حضرت موسیٰؑ کا قصہ بیان کر کے کہتا ہے "جب ہم موسیٰؑ کو نبوت اور فرمانِ الٰہی عطا کر رہے تھے تم بجانب غربی (کوہِ طور) نہیں تھے اور وہاں موجود نہیں تھے۔ ہم نے نسلیں پیدا کیں جو دراز عمر والے تھے۔ اور تم اہلِ مدین کے درمیان نہیں تھے کہ میری آیات ان کو سناتے مگر ہم تھے اور وہ ہم نے نازل کی تھیں۔" (۲۸ : ۴۴-۴۵) آلِ عمران کا قصہ آپؐ پر وحی ہوا۔ حضرت یوسفؑ کی داستان میں آپؐ سے کہا گیا "ہم اس قرآن میں وحی کے ذریعے تمہارے لیے

بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ:۔ ۲۰ : ۹۱-۱۰۲ : ۱۳۰ : ۱۱۲ (۱۱۰ و ۱۰۹ : ۲۲ : ۲-۴۴ - ۴۴ و ۱۲۵ : ۲۱ و ۲۲ : ۳۱ و ۱۷۲ : ۱۰ و ۱۸۵ و ۱۵۸ : ۳ و ۱۰۲۶ ، ۳۱ : ۲۳ و ۳۲ : ۳۴ - ۵۰ و ۵۵ :

۸۴ : ۲۵ و ۲۶ و ۱۳۶ - ۱۱۱ و ۴۹ و ۱۲۷ : ۱۶۱ - ۱۶۵ : ۱۶۸ - ۱۶۹ و ۱۳۸ : ۱۷۱ و ۱۴۹ و ۱۶۳ و ۵۰ : ۵۵ ، ۶۸ و ۱۴۱ و ۴۳ و ۴۳ ، ۱۶۱ ، ۴۳ ، ۵۱ ، ۸۴ ...

Presented by Ziaraat.Com

بہترین قصہ بیان کرتے ہیں جب کہ اس وحی سے پہلے تم اس سے واقف نہیں تھے (۱۲: ۳) اور "برادرانِ یوسف جہاں مکر اور حیلے کی بات کر رہے تھے وہاں تم موجود نہیں تھے" (۱۲: ۱۰۲)۔

○ ملتِ ابراہیم حنیف" کی پیروی کا آپ کو حکم دیا گیا۔ (۱۶: ۱۲۳)۔ اسی طرح آپ وحی کے ذریعے واقف ہوئے کہ جن قرائتِ قرآن سنتے ہیں (۷۲: ۱) اور یہ کہ آپ عالمِ بالا کے فرشتوں کے بارے میں نہیں جانتے تھے کہ (خلقتِ آدم یا اور دوسرے قصوں میں) وہ آپس میں جھگڑتے تھے اور بحث کرتے تھے جب تک کہ آپ پر یہ قصہ وحی کے ذریعے اتارا گیا (۳۸: ۶۷۔۔۔) اور آپ حضرت مریمؑ کی کفالت اور سرپرستی کے لیے جب قرعہ اندازی ہوئی تو موجود نہ تھے۔ یہ غیب کی بات تھی جو آپ پر وحی کی گئی (۳: ۴۴)

اس شہادت سے قرآن میں محمدؐ کی تصویر یہ ابھرتی ہے کہ آپ اپنے عظیم خالق کے سامنے ایک مطیع بندے ہیں جو اپنے پروردگار کے عذاب سے ڈرتے ہیں اور رحمتِ خداوندی کے امیدوار ہیں، آپ اپنے حدود کو پہچانتے ہیں اور قرآن کے حروف میں سے ایک حرف کو بھی تبدیل کرنے سے عاجز اور اس کے معترف ہیں (۱۰: ۱۵۔۱۶) دوسرے بندوں کی طرح ایک بندہ ہیں (۱۸: ۱۱۰) جو اپنے نفع اور نقصان کا مالک نہیں (۷: ۱۸۸) نہ غیب کی بات جانتا ہے اور نہ خدا کے خزانوں کا مالک ہے۔

یہ گفتگو طویل سے طویل تر ہوتی چلی جائے گی۔ یہی بہتر ہے کہ مندرجہ ذیل آیات پر نگاہ ڈالیں تاکہ جو کچھ ابھی کہا گیا وہ مزید واضح ہو:

(۷: ۱۰۱ و ۱۱: ۱۰۰، ۱۲۰ و ۱۲: ۱۰۲، ۱۱۰ و ۱۳: ۳۶، ۴۳ و ۱۷: ۸۵ و ۱۸: ۱۳، ۸۳ و ۱۹: ۴۱ و ۲۰: ۹۹ و ۲۳: ۴۸، ۴۹ و ۲۶: ۱۹۲، ۱۹۷ و ۲۷: ۶ و ۲۸: ۸۶ و ۲۹: ۴۸ و ۴۲: ۵۲ و ۴۶: ۱۰)۔

قرآن خود واضح الفاظ میں ہر بشر سے اپنے کلام کی کسی بھی نسبت کو رد کرتا ہے اور کہتا ہے "اگر یہ انسان کا کلام ہے تو اس کے جیسا لے آؤ اور ہر جگہ سے اور جس کو چاہو اپنی مدد کے لیے لوگوں کو بلا لو۔ اگر تم لوگ گمان ہے کہ یہ خدا کا کلام نہیں (۱۰: ۳۸ و ۱۱: ۱۳) اگر جن اور انس ہاتھ سے ہاتھ ملا کر اس کلام کے لیے مستعد ہو جائیں تو قرآن کی نظیر ہرگز نہیں لا سکتے (۱۷: ۸۸۔ ۲: ۲۳ بھی دیکھیں) اس بات میں کیوں تدبر اور تفکر نہیں کرتے کہ ۲۳ سال میں جو قرآن نازل ہوا اس کے کسی لفظ اور معنی میں کوئی اختلاف نظر نہیں آتا۔ اگر یہ کلام خدا نہ ہوتا بلکہ انسان کا کلام ہوتا تو اس میں کچھ نہ کچھ اختلاف ضرور نظر آتا (۴: ۸۲)۔

چنانچہ قرآن میں اور احادیثِ نبویؐ، یہاں تک کہ احادیثِ قدسی میں فرق صاف نظر آتا ہے۔ یہاں سنت اور حدیث کے بارے میں گفتگو کی جائے گی۔

سنّت و حدیث

علومِ اسلامی کا رکنِ دوم اور مصدرِ دوم اور احکامِ شرعی کی دوسری دلیل سنّتِ رسولؐ خدا ہے۔ لغت میں سنّت، راہ و روش کو کہتے ہیں۔ اصطلاح میں گفتار، کردار، تقریر یا حالت و صفت کو کہتے ہیں جو پیغمبرؐ (اور شیعوں کی نگاہ میں معصومؑ) سے نقل ہوئی ہو۔ حدیث بھی درحقیقت خبر دینے اور آگاہ کرنے کے معنی میں ہے اور اصطلاح میں وہ کلمات ہیں جو رسول اکرمؐ کی سنّت کو بیان کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ سنّت اور حدیث دونوں ایک ہیں۔ قرونِ اولیٰ میں جب کلامِ خدا کو قدیم کہتے تھے تو مقابلۃً سنّتِ رسولؐ کو حدیث کہتے تھے اور اس کے معنی "علم" کے ہوا کرتے تھے۔ فتاویٰ اور صحابہ کے اقوال کہ جن سے سند لی جاتی ان کو "اثر" کہتے تھے۔ شروع میں حدیث قرآن کی طرح

Presented by Ziaraat.Com

اور تفصیل کو کہا کرتے تھے جو سارے علوم اسلامی اور احکام شرعی کو شامل ہوتی تھی۔

رسول اللہ کے زمانے میں شروع شروع میں حدیث لکھنی منع تھی۔ ابو سعید خدری (م ۷۴ھ) کہتے ہیں، پیغمبرؐ نے فرمایا تھا کہ مجھ سے کوئی چیز نہ لکھواور اگر لکھ لیا ہے تو اس کو مٹا دو۔ صرف قرآن کو لکھا کرو۔[۱] اس حکم کے مطابق کسی کو حق نہیں تھا کہ رسول خدا سے سن کر کچھ لکھتا بیشک یہ حکم نزولِ وحی کے آغاز میں دیا گیا تھا تاکہ وحیِ الٰہی سے اقوال و احادیث رسولؐ غلط ملط نہ ہو جائیں۔ اور اسی خیال سے آپؐ نے حدیث کی کتابت کو منع کیا تھا۔[۲] مگر جب وحی کے حفظ کرنے والے زیادہ ہو گئے اور حدیث اور قرآن کے خلط ملط ہونے کا خدشہ نہیں رہا تو حدیث کو لکھنے کی بھی اجازت دے دی گئی۔ آپؐ نے حکم فرمایا:

قیدوا العلم بالکتاب[۳]

علم و دانش کو جکڑ لو، قید کر لو، اس کو لکھ کر۔

یہ وہ موقع تھا جب قرآن کی آیات مروج ہو چکی تھیں اور لوگ ان سے مانوس ہو چکے تھے اور اب دوسری تحریروں سے گڈمڈ ہونے کا خطرہ باقی نہیں رہا تھا۔

ہجرت کے بعد رسول اللہ کے حکم پر مہاجروانصار اور یہودیوں اور عربوں کے حقوق کا ایک منشور تیار ہوا تھا۔ شروع میں اس صحیفے کو کتاب، کہا جاتا رہا۔ اس کے ضمن میں پانچ بار "اہل ھذہ الصحیفۃ" کی عبارت آئی ہے۔[۴] بخاری نے ابو ہریرہ سے نقل کیا ہے کہ فتح مکہ کے سال بنی لیث کا ایک شخص قبیلۂ خزاعہ کے ہاتھوں شہر مکہ میں قصاص کے لیے مارا گیا۔ پیغمبرؐ کو اس واقعہ کا علم ہوا تو اونٹ پر سوار ہو کر اس جگہ پہنچے اور فرمایا: خداوند عالم نے مکہ میں قتل کو حرام کیا ہے۔ پیغمبرؐ اور مومنوں کو لوگوں پر اس حکم کو نافذ کرنے کو کہا ہے۔ مقتول کے وارث دو میں سے ایک چیز انتخاب کر سکتے ہیں، یا درگذر کریں اور معاف کر دیں یا خونبہا لے لیں۔

یمن کا ایک شخص (جس کا نام ابو شاۃ تھا) آگے بڑھا اور پیغمبرؐ سے کہنے لگا کہ جو آپؐ نے فرمایا ہے وہ میرے لیے لکھ دیں۔ پیغمبرؐ نے حکم دیا کہ فیصلہ لکھ کر اس شخص کو دے دیا جائے۔[۵]

مرض الموت میں رسول اللہ کا ارادہ کہ مسلمانوں کو وصیت لکھ کر دی جائے تاکہ آپؐ کے بعد وہ گمراہ نہ ہونے پائیں، اپنی جگہ خود ایک بہترین دلیل ہے کہ آپؐ کے زمانے میں حدیث لکھنے کا رواج ہو گیا تھا۔ بیشک حدیث لکھنے اور جمع کرنے میں فرق کرنا چاہیے۔ اس کے باوجود حدیث کی تدوین بھی صدرِ اسلام میں ملتی ہے۔ دوسروں کے علاوہ سعد بن عبادۃ انصاری (م ۱۵ھ، نجران) کے

ا؎ مسلم، زہد۔ ۷۲، الدارمی: مقدمہ ۴۲، احمد ۳: ۱۲، ۲۱، ۳۹، ۵۶۔

۲؎ تقیید العلم۔ ابن خطیب۔ ۲۹۔ ۳۲۔

۳؎ الدارمی: مقدمہ ۴۳، تقیید العلم ۶۹، بحار الانوار ۲: ۱۵۱۔ ۱۵۲ ج ۳۵ و ۱۴۷ ج ۱۸ طبع آخوندی۔

۴؎ الوثائق السیاسیۃ۔ ڈاکٹر حمید اللہ۔ وثیقہ ۱۔ ص۔ ۱۵۔

۵؎ صحیح بخاری، کتاب العلم ب ۳۹۔ ترمذی ج ۷، ۲۶۶، اسد الغابہ۔ ترجمہ ۵۹۸۹، اصابہ ۲: ۱۳۵ و ج ۴۔ ترجمہ ابو شاۃ یمانی، استیعاب ۴: ۱۰۶، سنن بیہقی ۸: ۵۲، احمد ۲: ۲۳۸۔

Presented by Ziaraat.Com

پاس ایک صحیفہ تھا جس میں رسولِ خدا کی احادیث اور سنن جمع کی تھیں۔ عبداللہ بن ابی اوفیٰ، سمرۃ بن جندب اور جابر بن عبداللہ انصاری نے بھی اپنے اپنے لیے مجموعہ تیار کیا ہوا تھا[56]۔ ان میں سب سے مشہور "صحیفۂ صادقہ" ہے جو عبداللہ بن عمرو بن عاص (م ۶۵ ھ) کا تھا جس کے لکھنے کے لیے پیغمبرِ گرامی سے واضح فتویٰ لیا گیا تھا[57]۔ حضرت علیؑ نے حکم دیا تھا کہ حدیث کو ایک دوسرے سے بیان کیا کرو تاکہ فراموش نہ ہو سکے[58]۔

بہرحال حدیث کی خصوصی تدوین کا رواج تھا۔ ذہبی ۱۴۳ھ کے واقعات کے ذکر میں لکھتا ہے مکہ اور مدینہ کے علماء نے حدیث کی تدوین شروع کی[59]۔ اس سے پہلے ابن شہاب زہری نے عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے سرکاری طور سے حدیث جمع کی تھی (تقریباً ۹۹ھ میں)[60]۔

حدیثِ قدسی

قُدس یعنی پاک، ارضِ مقدس یعنی پاک سرزمین اور حدیثِ قدسی اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی نسبت خدا سے دی جائے۔ چنانچہ ان کو "حدیثِ ربانی و الٰہی" اور "اسرار الوحی" بھی کہا گیا ہے۔ یہ احادیث زیادہ تر وہ نصیحتیں اور مطالب ہیں جن میں رسول اللہؐ نے صحابہ سے اللہ تعالیٰ کا قول بیان کیا تھا۔ بیشک یہ "وحیِ مُنزَل" نہیں ہے کہ اس کو قرآن کہا جا سکے۔ ایسا قول بھی نہیں جو پیغمبرؐ سے منسوب ہو اور اس کو حدیث کہا جائے۔ بلکہ وہ حدیث ہے جو پیغمبرؐ خدائے تعالیٰ سے نقل کرتے ہیں جو جبرئیلؑ کے ذریعے سے وحی یا الہام یا خواب میں یا ذہن میں القاء کے ذریعے حاصل کی ہو۔ اس کا اسلوب قرآن سے جدا ہے۔ اس کے باوجود عالمِ قدس کی ایک جھلک اور ربوبیتِ الٰہی کا ایک نور اس میں نظر آتا ہے۔ مگر بہرصورت قرآن میں اور اس میں فرق ہے۔

قرآن کو جبرئیلؑ لفظ و معنی کے ساتھ لوحِ محفوظ سے حاصل کر کے پیغمبر کو وحی کرتے تھے یہ وحی ہر زمانے اور طبقے میں نسل بعد نسل متواتر قطعی رہی ہے۔ مگر حدیثِ قدسی میں ایسا نہیں۔ حدیثِ قدسی کو مختلفاً نقل کیا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس میں معنی خدائے تعالیٰ کے ہوتے ہیں اور الفاظ رسولِ خدا کے۔ قرآن معجزہ ہے، جب کہ حدیثِ قدسی ایسی نہیں۔

قرآن ہر تغیر و تبدیلی اور تحریف سے مبرا ہے۔ مگر حدیثِ قدسی کے ساتھ یہ خصوصیت نہیں۔

قرآن کے ہر جملے کو آیت کہتے ہیں اور کچھ آیات کو ملا کر سورہ کہا جاتا ہے۔ مگر حدیثِ قدسی کی یہ صورت نہیں۔

احادیث قدسی کی قرائت کے ساتھ نماز صحیح نہیں۔

---

۵۶ صحیفۂ ہمام - ۱۴ - ۱۷ -

۵۷ مصطلح علوم الحدیث - ڈاکٹر صبحی صالح ۲۷ - ۲۹ ابن سعد ۴ : ۸/۲ -

۵۸ کنز العمال ۵ : ۲۴۲ - مستدرک - حاکم - ۹۵۱ ا

۵۹ مقدمہ تقیید العلم - ۶ و ۵

۶۰ فتح الباری - ۱ : ۲۱۸ اور ۴ : ۲۰ - ارشاد الساری ۱ : ۷، وتدریب سیوطی : ۴۰ -

Presented by Ziaraat.Com

قرآن کا منکر کافر شمار ہوتا ہے جب کہ حدیث قدسی کا انکار کرنے والے کو ایسا نہیں کہتے۔

حدیث قدسی کا مس کرنا کسی پر حرام نہیں۔

اس کا پڑھنا جنب، حائض اور نفسار کو منع نہیں۔

معنی کے ساتھ اس کی روایت کرنا صحیح ہے۔

اس کی خرید و فروخت منع نہیں ہے۔

قرآن کی آیات بیان کرتے وقت "قال الله تبارك و تعالى" کہتے ہیں یعنی خدائے تبارک و تعالیٰ نے فرمایا۔ حدیث قدسی کے بارے میں قدما کہتے تھے: "قال رسول الله فیما یروی عن ربه" (یعنی پیغمبرؐ خدا نے خدا سے روایت کی ہے کہ...) بعد میں لوگوں نے کہا: "قال الله تعالیٰ فیما رواه عنه رسول الله" (خدا نے فرمایا جیسا کہ رسولؐ اللہ نے روایت کی)۔

حدیثِ قدسی اور عام حدیث میں فرق یہ ہے کہ حدیث قدسی کو اللہ تعالیٰ سے نسبت دی جاتی ہے جب کہ عام حدیث قول و فعل یا خطابِ رسولؐ (یا معصومؑ) ہوتی ہے جو احکام الٰہی کی مزید وضاحت کے لیے سند ہوتی ہے۔

دوسرے الفاظ میں وحی کی دو قسمیں ہیں، "وحی مَتلو" (وحی جس کی تلاوت ہوئی) یا "وحی جلی" یعنی قرآن اور "وحی مَروِی" (وحی جس کی روایت ہوئی) یعنی "حدیث قدسی"۔[۱]

وحی کی خصوصیات

وحی کی خصوصیات اور اس کی مختلف صورتوں کے بارے میں قرآن شریف میں بہت وضاحتیں ملتی ہیں۔ پیغمبر اکرمؐ کے سلسلے میں وحی کی ان مختلف صورتوں کو رسولؐ اللہ کی احادیث اور سیرت میں مفصل دیکھا جا سکتا ہے، خواہ وہ خود آنحضرتؐ کی زبانِ مبارک سے نقل ہوئی ہو یا آپؐ کے صحابہ نے اس کا مشاہدہ کیا اور اگلی نسلوں کے لیے اس کو بیان کر گئے۔ ہم بھی اسی ترتیب سے جیسا کہ کہا گیا ہے اور ہم

---

[۱] المجلس الاعلیٰ للشئون الاسلامیہ لجنۃ القرآن والسنہ مصر میں ۴۰۰ حدیث قدسی "موطا" اور کتب ستہ سے دو جلدوں میں بنام "الاحادیث القدسیہ" جمع کیں، ایک جلد سال ۱۳۸۹ اور سال ۱۳۹۴ میں دوسری جلد شائع کی۔ شیعہ دانشور شیخ حر عاملی (م ۱۱۰۴ ھ) نے بھی کتاب بنام: "الجواہر السنیہ فی الاحادیث القدسیہ" میں احادیث قدسیہ (جو بیشتر از طریق امامیہ نقل ہوئی ہیں) جمع کیں جو ۱۳۰۲ ھ میں بمبئی اور پھر ۱۳۸۴ ق میں نجف سے طبع ہوئی (درایۃ الحدیث آقای کاظم مدیر شانہ چی استاد دانشگاہ مشہد)۔ علاوہ ازیں حدیث قدسی مشتمل بر تورات و زبور و صحف ادریس مع ترجمہ فارسی ۱۳۲۲ ق میں تہران میں طبع ہوئی۔ کتاب الاتحافات السنیہ فی الاحادیث القدسیہ طبع حیدرآباد دکن ۱۳۵۸۔ حدیث قدسی کے بارے میں رجوع کریں: مجلہ لواء الاسلام شمارہ ۲ و ۷ صفر ۱۳۹۲۔ اپریل ۱۹۷۲، سفینۃ البحار ۲: ۲۱۳، علوم الحدیث و مصطلحہ ڈاکٹر صبحی صالح: ۱۱-۱۲، رسالہ شرح حدیث کنت کنزاً مخفیاً لمحی الدین عربی (ضمیمہ مجموعہ۔ اکتب فرخ دانشکدہ ادبیات مشہد) منہج الحدیث ڈاکٹر محمد السماحی الازہر قاہرہ ۱۹۵۸ ص ۲۱۔ السنۃ قبل التدوین: ۲۲۔ مع الفکر الاسلامی محمد شاہین حمزہ، مصر ۱۹۷۰ ص ۹۲۔ کشاف اصطلاحات الفنون، کلمہ۔ قواعد التحدیث قاسمی طبع قاہرہ ص ۶۵۔ الحدیث النبوی محمد الصباغ ۱۳۱۔ تاریخ قرآن از نولڈکے ۱: ۴۳، ۲۳ و ۲۵۶ تا ۲۶۱۔

Presented by Ziaraat.Com

نے سُنا اور پڑھا ہے اس کو زیرِ مطالعہ لاتے ہیں :

۱۔ قرآن کی زبانی

اس بارے میں سب سے واضح بیان یہ ہے :

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ
مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ
وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۴۲ : ۵۱ - ۵۲)

کسی بشر کے لیے یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالے اس سے کلام کرے سوائے وحی کے۔ یا پردے کے پیچھے سے، یا کوئی رسول بھیج کر جو اس کی اجازت سے جو وہ چاہتا ہے وحی کرتا ہے۔ یقیناً وہ بلند مرتبہ بڑا حکمت والا ہے اور اسی طرح ہم نے تمہاری طرف اپنے امر سے ایک روح وحی کی۔ تم نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا چیز ہے اور نہ ہی ایمان۔ لیکن ہم نے اس کو نور قرار دیا۔ اس کے ذریعے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں۔ یقیناً تم سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرتے ہو۔

اس آیت میں خدا اور نبی کے درمیان رابطہ کی تین صورتیں بیان ہوئی ہیں ایک وحی کے ذریعے اور "قلب میں القاء" یا جیسے کہ احادیث میں اس کی تعبیر نظر آتی ہے یعنی "نفث فی الروع" "ذہن و نفس میں سما جانا۔ دوسرا طریقہ آواز اور صدا ہے جو پیغمبر اکرم سنتے تھے مگر کہنے والا سامنے نہیں ہوتا تھا تیسرا ذریعہ فرشتہ وحی تھا جو حاملِ پیامِ الٰہی ہوتا۔ خواہ وہ نظر آئے یا نہیں اس کا پیام سناتا تھا۔ پیغمبر گرامی کو جو پیام آتا تھا اس کی بھی یہ تین صورتیں تھیں۔ وحی کی مختلف صورتیں دوسری آیات میں بھی بیان ہوئی ہیں :

کبھی وحی کلام کے ذریعے نازل ہوتی تھی کہ سنی جاتی تھی مگر بولنے والا نظر نہیں آتا تھا۔ کلام کرنے والا پروردگار تھا جو اپنے بندے سے بغیر واسطے کے براہِ راست کلام کرتا۔ جیسا حضرت موسیٰ کے معاملے میں فرمایا :

وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا (۴ : ۱۶۴)

موسیٰ سے اللہ تعالے نے خاص طور پر کلام فرمایا۔ یا پھر :

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ۝ اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝
وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى (۲۰ : ۱۱-۱۳)

(ان کو جانب اللہ) "ندا دی گئی کہ اے موسیٰ میں تمہارا رب ہوں۔ تم اپنی جوتیاں اتار ڈالو (کیونکہ) تم ایک پاک میدان یعنی طویٰ میں ہو میں نے تم کو (نبی بنانے کے لیے) منتخب فرمایا ہے۔ چنانچہ (اس وقت) جو کچھ وحی کی جا رہی ہے اس کو سن لو۔

ایک درخت میں ایک روشن آگ دکھائی دے رہی تھی اور خدا حضرت موسیٰ سے کلام کر رہا تھا۔ خدائے واحد کی عبادت اور نماز قائم کرنے کا حکم ملا۔ جس طرح شبِ معراج پیغمبر گرامی کو ارشاد ہوا :

ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝ فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى (۵۳ : ۸-۱۰)

پھر وہ فرشتہ (آپ کے) نزدیک آیا پھر اور نزدیک آیا، اور دو کمانوں کے برابر فاصلہ رہ گیا، بلکہ اور بھی کم۔ پھر اللہ تعالیٰ

Presented by Ziaraat.Com

نے اپنے بندے پر وحی نازل فرمائی جو بھی نازل فرمائی۔

بیک جذبہ زحق چون تیر بشتافت | چو موئی، میم احمد از دو بشکافت
برون شد میم احمد از میانہ | احد گشت و یکی شد ہر دوانہ
زرشک قاب قوسین پیمبر | فلک دو قوس دارد گرد محور[1]

قیامت کے دن خداوند عالم اپنے بندوں سے گفتگو کرے گا مگر ان سے نہیں جو گنہگار ہوں گے۔

لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (۳: ۱۷۴)

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان سے گفتگو نہیں کرے گا۔

وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ (۳: ۷۷)

ان کی طرف دیکھے گا بھی نہیں۔

بعض مواقع پر وحی الہام کی صورت میں ہوتی ہے جیسا کہ ذکر آچکا ہے کہ یہ بندے کے دل پر ایک اہم علم کی صورت میں اترتا ہے جسے فراموش کرنا ممکن نہیں ہوتا اور اس میں کوئی شک بھی باقی نہیں رہتا۔ جیسے حضرت موسیٰؑ کی والدہ کے واقعے میں (۲۸: ۷) اور حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں (۵: ۱۱۱) کے بارے میں ہم نے دیکھا۔

کبھی لوح پر نوشتہ کی صورت میں، جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کے لیے فرمایا:

وَكَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ (۷: ۱۴۵)

یہ وحی کی مختلف صورتیں تھیں جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں۔ پیغمبر اکرمؐ پر وحی کی کیفیات کی تفصیل احادیث اور سیرت کی کتابوں میں بھی ملتی ہیں۔ نزول وحی کے آغاز کے بارے میں جیسا کہ پچھلے صفحات میں ہم نے دیکھا، آپؐ نے فرمایا "جیسے کہ میرے دل پر ایک کتاب لکھ دی گئی ہو"۔ رویائے صادقہ (سچے خواب) پر بھی گفتگو ہو چکی ہے۔

اب ہم خود آنحضرتؐ کی زبان مبارک سے وحی کی مختلف صورتوں کو سنیں گے اور پھر عینی گواہوں کی روایت پر نظر کریں گے۔

۲۔ قول پیغمبر اکرمؐ

الف۔ حارث بن ہشامؓ (م ۱۸ ھ) جو فتح مکہ کے دن ایمان لایا اور ظاہراً وہ وحی نازل ہونے کا آخری زمانہ ہے جب اس نے رسول اللہؐ سے پوچھا کہ وحی کس طرح آتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: "کبھی آواز جرس "صَلْصَلَةِ الْجَرَسِ" کے جیسی ہوتی ہے۔ یہ آواز مجھ پر بہت سخت ہوتی ہے ـــ پھر مجھ سے دور ہو جاتی ہے اور میں وحی کو حفظ کر چکا ہوتا ہوں[3]"

---

[1] الٰہی نامہ۔ عطار۔ طبع فواد روحانی۔ ص ۱۴ و ۱۵۔

[2] بنی مخزوم قریش کے بزرگوں میں سے تھا۔ اس کو صحابیوں میں سمجھا جاتا ہے۔ شام میں طاعون میں فوت ہوا۔ اصابہ ۱: ۲۹۳، استیعاب ۱: ۳۰۷، اعلام ۲: ۱۶۲۔

[3] یہ حدیث اس سے حضرت عائشہ نے نقل کی ہے۔ بخاری: بدء الوحی ۲۔ بدء الخلق ۶۔ مسلم: فضائل ۸۷، موطا مالک فصل الوضوء لمس القرآن ۷، احمد ۱: ۱۵۸، ۱۶۳، طبقات ابن سعد ۱/۱/۱۳۱ و ۱۳۲، التاج ۳: ۲۵۱۔ ترمذی: مناقب ۷۔

ب : "کبھی فرشتہ آدمی (یا نوجوان) کی شکل میں آتا ہے۔ وہ جو کچھ کہتا ہے میں سنتا ہوں اور سمجھ لیتا ہوں [۳] یہ میرے لیے آسان ہوتا ہے۔" [۴]

ج : رسول اللہ نے زنبور (مدھ مکھی یا بھڑ) کی جیسی آواز اپنے چہرے کے قریب سنی اور سورۂ ۲۳ مومنون آیت (۱) سے آگے تک نازل ہوئی۔ [۵]

د : رسول اللہ کی عادت تھی کہ وحی کی شدت کے نتیجے میں اپنے لبوں کو حرکت دیتے یا آیات قرآنی کو جلد جلد حاصل کرنے اور دل میں یاد کر لینے کے لیے ان کو آپ زبان پر لاتے، یہاں تک کہ آیت نازل ہوئی:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ (۷۵ : ۱۶)

آپ (قبل وحی کے ختم ہو چکنے کے) قرآن پر اپنی زبان نہ ہلایا کیجیے کہ آپ اس کو جلد جلد لیں۔

اس کے بعد سے آپ اس وقت تک سنتے رہتے جب تک جبرئیل وحی تمام نہ کرتے۔ اور پھر جو کچھ وحی نازل ہوئی ہوتی اس کو دہراتے۔ [۶]

ہ : عبداللہ بن عمر کہتے ہیں: میں نے پیغمبر اکرمؐ سے پوچھا کہ کیا آپ کو وحی کا احساس ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں میں آوازیں (صلاصل یعنی دھات کی رگڑ جیسی) سنتا ہوں۔ کچھ دیر توقف کے بعد فرمایا کہ جب بھی مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میری روح محصور ہو گئی ہے۔ [۷]

و : پیغمبرؐ نے فرمایا جیسے روح القدس نے میرے ذہن اور عقل میں دم پھونکا ہو (نَفَثَ فِیْ رُوْعِیْ) [۸] یہاں قلب نبیؐ میں القا معنی مقصود ہے۔ اور بھی بہت کچھ ہے احادیث قدسی اسی نوعیت کی ہیں۔

ز : وحی کی فترت اور وقفے کے بعد جو وحی نازل ہوئی تو گذشتہ باب میں ہم نے دیکھا تھا کہ جب پیغمبر اکرمؐ گھر واپس تشریف لائے تو فرمایا، "دَثِّرُوْنِیْ" اور ایک دوسری روایت کے مطابق "مجھے اڑھا دو اور مجھ پر ٹھنڈا پانی ڈالو" [۹] اور ایسا ہی کیا گیا۔

---

[۴] وہی حوالے اور بحار الانوار۔ ۱۸ : ۲۶۰۔

[۵] اس اضافے کو "ابی عوانہ" (م ۳۱۶ھ) الصحیح المسند میں نقل کرتا ہے۔ (اتقان ۱ : ۱۲۲ نوع ۱۶ فصل۔ فتح الباری ۱ : ۳۰)۔

[۶] ترمذی: تفسیر سورۂ ۲۳ ح ۱۔ مقارنہ کریں: احمد حنبل ۱ : ۳۴ و ۳۴ : ۲۶۸، ۱ : ۲۷ و الدارمی: مقدمہ ۲۔ اس حدیث کی سند میں اختلاف ہے، کیونکہ اس کا مدار یونس بن سلیم پر ہے جو مجہول ہے۔ مگر حاکم نے اس کو صحیح الاسناد کہا ہے ۱ : ۵۳۵ و ۲ : ۳۹۲۔

[۷] بخاری: توحید ۳۴، نسائی افتتاح۔ باب ۳۷، طیالسی شمارہ ۲۶۲۸، طبقات ۱/۱/۱۳۲۔

[۸] احمد بن حنبل۔ ۲ : ۲۲۲، اتقان۔ ۱ : ۱۶۲ نوع ۱۶ فصل۔

[۹] حاکم اس کو ابن مسعود سے نقل کرتا ہے ۲ : ۴، طبرانی نے کبیر میں ابو امامہ سے نقل کیا ہے (حلیۃ الاولیاء۔ ابو نعیم ۷، ۱۰/ ۲۷)، بخاری نے حذیفہ کی حدیث سے اخراج کیا ہے (الترغیب ۳ : ۷)، مجمع الزوائد ہیثمی۔ ۴ : ۷۱۔

[۱۰] بخاری: تفسیر سورۂ ۷۴، مدثر ۱، ۲، ۴ و سورۂ ۹۶ العلق : ۱، صحیح مسلم: ایمان ۲۵۵، ۲۵۷، ترمذی: تفسیر سورۂ ۷۴ : ۱، احمد ۳ : ۳۰۶، تاج العروس ذیل دثر

Presented by Ziaraat.Com

۳۔ مشاہدہ کرنے والوں کی روایت

خود آنحضرتؐ کے اقوال نقل کرنے کے بعد اب ہم مشاہدہ کرنے والوں کی روایت پر توجہ دیں گے۔ ان میں سے رویائے صادقہ (سچے خواب) کی روایت تھی جو پچھلے صفحات میں گذر چکی۔ باقی یہ ہیں :

ا : حضرت عائشہ کہتی ہیں، "میں نے دیکھا کہ سخت سردیوں میں جب رسولؐ پر جبرئیلؑ نے وحی نازل کی تو آپ کا پسینہ نکل رہا تھا۔"[111]

ب : پیغمبرؐ کے سر پر ایک کپڑے کا سایہ ہے، آپؐ کے چہرے کا رنگ سرخ ہو جاتا ہے، کچھ وقت جیسے کوئی سو رہا ہو خراٹے کی آواز آتی ہے۔ کچھ دیر بعد آرام آجاتا ہے[112]

ج : پیغمبرؐ کا رنگ نیلا ہو جاتا ہے (تَرَبَّدَ لَهُ وَجْهُهُ)[113]

د : معلوم ہوتا تھا جیسے سو رہے ہوں[114]

ہ : ابن طاؤس نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ عثمان بن مظعون[115] (م ۲ھ) نے کہا کہ میں مکہ میں ایک دن حضرت رسالتؐ پناہ کے گھر گیا۔ دیکھا کہ آنحضرتؐ گھر میں بیٹھے ہیں۔ میں بھی ان کے پاس بیٹھ گیا اور گفتگو کرنے لگا۔ یکایک دیکھا کہ آپ کی آنکھیں کچھ دیر کے لیے آسمان کی طرف اٹھیں۔ پھر اپنی آنکھیں داہنے طرف کیں اور اپنے سر کو اس طرح حرکت دی جیسے کسی سے بات کر رہے ہوں اور اس کی بات سن رہے ہوں کچھ دیر کے بعد آسمان کی طرف دیکھا۔ پھر اپنے بائیں طرف نظر کی اور مجھے دیکھا۔ آپؐ کے

---

[111] تفسیر ابوالفتوح رازی ۱۰:۱۵۱۔ یہ بھی دیکھیں: مجمع البیان ۵ : ۲،۸ ؛ تبیان طوسی ۲ : ۲،۲۰ ؛ صافی : ۵۴۸ ؛ تفسیر البرہان ۲ : ۱۱۵۵ ؛ منہج الصادقین ۳ : ۳۱۵ ؛ امام فخر رازی ۸ : ۳۳۵ ؛ بیضاوی ۲ : ۵۵۸ ؛ کشف الاسرار ۱۰ : ۲۶۶ ؛ التجرید الصریح ۱ : ۴ ؛ سیرہ حلبیہ ۱/۱/۱۳۲ ؛ بخاری : بدء الوحی ۲ ؛ تفسیر ۲۴ : ۹، مسلم : فضائل ۸۶ ؛ احمد ۶ : ۵۸، ۱۰۳، ۱۹۷، ۲۰۲، ۲۵۶ اور آگے۔

[112] بخاری : حج ۱۷، عمرہ ۱۰، فضائل القرآن ۲ ؛ مسلم : حج ۶ ؛ احمد ۴ : ۲۲۲ و ۲۲۴ ؛ فضائل القرآن۔ ابن کثیر ۱۲ - ۱۳۔ صفوان بن یعلی کی آرزو تھی کہ آنحضرتؐ کا وحی کی حالت میں مشاہدہ کرے۔ ایک دن ایک شخص نے جو معطر جبہ پہنے تھا آنحضرتؐ سے سوال کیا کہ اس جبہ سے احرام حج و عمرہ بنا سکتا ہے۔ آنحضرتؐ چادر اوڑھے ہوئے تھے کہ وحی آئی۔ عمر نے یعلی کو اشارہ کیا اور وہ اندر گیا اور دیکھا کہ آنحضرتؐ جیسے کوئی سو رہا ہو خرخر کر رہے ہیں۔ آپؐ کا رنگ مبارک سرخ ہو گیا ہے۔ کچھ دیر بعد یہ حالت ختم ہوئی تو سوال کرنے والے کو بلایا اور اس سے فرمایا: تین بار اپنے جبہ کو عطر سے دھو ڈال اور عمرہ کے احرام کو بھی جب احرام حج پورا کرے۔ حدیث میں یہ بھی آیا ہے: "و کان عمر یسترہ اذا انزل علیہ الوحی" (مسلم : حج ۱۰) یا "قد احرم فی جبة اذا انزل علیہ الوحی (نسائی : مناسک ۲۹)۔

[113] طبقات ۱/۱/۱۳۱۔ "کرب لہ" کا اضافہ ہے یعنی سانس پھول رہی تھی۔ التاج الجامع ۳ : ۲۵۱ ؛ مسلم : حدود ۱۳، الفضائل ۸۸ ؛ سیرۃ ابن کثیر ۱ : ۴۲۳ ؛ احمد ۵ : ۳۱۷ اور آگے۔ تفسیر طبری ۱۸ : ۴ ؛ طیالسی ۱ : ۲۶۷ ؛ سبل الہدی ۲ : ۳۴۴ و ۳۴۶۔

[114] احمد بن حنبل ۶ : ۱۰۳ ۔" اذا اوحی الیہ یاخذہ شبہ السبات

[115] چودھواں آدمی ہے جو اسلام لایا۔ دو مرتبہ حبشہ ہجرت کی۔ پہلا مہاجر ہے جو مدینے میں فوت ہوا۔ ابن سعد ۳ : ۱۸۶ ؛ اصابہ ۵۵۴۵، اعلام ۴ : ۳۸۱۔

Presented by Ziaraat.Com

چہرۂ مبارک سے پسینہ ٹپک رہا تھا۔ میں نے کہا یا رسول اللہ اس سے پہلے میں نے آپ کو اس حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ فرمایا تم نے میری کیفیت مشاہدہ کی۔ عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا، جبرئیل تھے جو نازل ہوئے اور یہ آیت لائے تھے:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْہٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ (۱۶ : ۹۰)

بیشک اللہ تعالےٰ عدل و احسان کا اور اہل قرابت کو دینے کا حکم فرماتا ہے۔ اور کھلی برائی اور مطلق برائی اور ظلم کرنے سے منع فرماتا ہے۔ اللہ تعالےٰ تم کو اس لیے نصیحت فرماتا ہے کہ تم نصیحت قبول کرو[۱۶]

و : جب محمدؐ پر وحی نازل ہوتی تو آپؐ بہت سختی برداشت کرتے۔ اس سے ہم لوگ سمجھ جاتے۔ اس وقت آپؐ اپنے صحابہ سے جدا ہو جاتے اور ان سے پیچھے رہ جاتے۔ تکلیف کی شدت سے کوشش کرتے کہ اپنے سر کو اپنے لباس سے ڈھانپ لیں[۱۷] نیز یہ بھی ہوتا "جب رسول اللہ پر وحی نازل ہونا شروع ہوتی تو اپنے چہرے کو اپنی چادر میں چھپا لیتے۔ جب غشی کی سی کیفیت طاری ہوتی تو چہرہ (چادر سے) باہر نکال دیتے[۱۸]

ز : مفسرین کہتے ہیں کہ جب آیتِ مجاہدین (سورہ ۴ النساء آیت ۹۵) نازل ہوئی اور خداوند تعالیٰ نے مجاہدین کو جہاد سے پیچھے رہ جانے والوں پر برتری اور فضیلت بخشی تو عبداللہ بن ام مکتوم اور عبداللہ بن جحش جو دونوں نابینا تھے اور جہاد میں شرکت سے محروم رہ گئے تھے، رسول اللہ کے پاس گئے اور کہا کہ آپ ہماری نابینائی کا خیال جانتے ہیں اور جہاد کرنے والوں کو دوسروں پر برتری حاصل ہے، چنانچہ اجازت فرمائیے کہ ہم بھی جہاد کریں۔ جبرئیلؑ نازل ہوئے اور ان دونوں کے لیے یہ الفاظ لائے کہ "غیر اولی الضرر" وہ نہیں جو نابینا ہیں۔

رسول اللہ نے فرمایا "شانے کی ہڈی اور دوات لے آؤ" یہ آیت زید بن ثابت انصاری کو املا فرمائی تا کہ وہ لکھ لیں[۱۹] زید بن ثابت

---

[۱۶] حیاۃ القلوب مجلسی ۲ : ۲۵۸ سے نقل کیا گیا۔ اسی کے مثل احمد بن حنبل ۱ : ۳۱۸، ترجمہ تفسیر طبری۔ ۴ : ۸۸۴۔ تفسیر ابوالفتوح۔ ۳ : ۲۵۵۔

[۱۷] احمد بن حنبل۔ ۱ : ۴۶۴۔

[۱۸] احمد بن حنبل۔ ۶ : ۳۴۔ شعار عرب، کی طرح کہ سر پر کپڑا رکھتے تھے یا نقاب ڈالے تھے۔ وحی نازل ہوتے وقت گذشتہ انبیاء کے ساتھ بھی یہی ہوتا تھا۔ چنانچہ کتاب مقدس کے مطابق جب حضرت موسیٰ طور سینا پر مناجات کرنے جاتے تو اپنے چہرے پر نقاب ڈال لیتے تھے (سفر خروج۔ ۳۴ : ۳۳ و ۳۵) کہتے ہیں کہ طلیحہ اسدی جو وحی کے حاصل کرنے کا دعویٰ کرتا تھا، انبیاء کی تقلید میں اپنے کو کپڑے میں لپیٹ لیتا اور وحی کا انتظار کرتا۔ طبری۔ ۱ : ۱۸۹۰ محاسن بیہقی ۳۳، طبع شوالی، عوف بن الربیع جو عرب کے شجاع لوگوں میں تھا ذی الخمار مشہور ہوا۔ (قاموس و تاج العروس۔ لفظ خمار)۔ اسود عنسی کو بھی، جو اسلام میں پہلا مرتد تھا جو فیروز دیلمی کے ہاتھوں مارا گیا، ذوالخمار کہتے تھے۔ طبری ۱ : ۸ ۔ ۱۷۹۵ و ۱۷۹۸ ۔ ۱۸۵۳۔

[۱۹] کشف الاسرار۔ میبدی ۲ : ۶۴۶، عبداللہ بن ام مکتوم بعد میں طلیعہ رہا اور جنگ قادسیہ میں مارا گیا۔ عبداللہ بن جحش (زینب کا بھائی) اُحد کے دن شہید ہوا۔

Presented by Ziaraat.Com

خود بیان کرتے ہیں "جب آپ پر سکینہ نازل ہوا میں حضور کے پاس بیٹھا تھا۔ (اس اجتماع میں اس قدر بھیڑ تھی کہ) آپ کی ران میری ران پر آگئی تھی۔ (سب آلتی پالتی مارے زمین پر بیٹھے تھے)۔ آپ کے پیر کا بوجھ اس قدر زیادہ تھا کہ میں سمجھا میرے پیر کی ہڈی ٹوٹ جائے گی جب آپ کو سکون ملا تو مجھ سے فرمایا کہ لکھو اور میں نے سورہ ۴ النساء کی آیت ۹۵ لکھی"[20]

ح: عیاشی نے حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ جب حضرت رسول خدا پر سورہ مائدہ نازل ہوئی تو آنحضرت شہبا نام کے خچر پر سوار تھے۔ نزول وحی کے سبب اس قدر بوجھ ہوا کہ خچر کی رفتار دھیمی ہو گئی، اس کی پیٹھ خم ہو گئی اور پیٹ جھکنے لگا حتیٰ کہ اس کی ناف زمین سے لگنے والی تھی۔ آنحضرت بے ہوش ہو گئے اور اپنا ہاتھ شیبہ بن وہب کے سر پر رکھ دیا۔ جب یہ کیفیت دور ہوئی تو سورۂ مائدہ ہم لوگوں کو پڑھ کر سنائی[21] یہ وحی بوجھل اور سخت کیفیت تھی کہ خداوند تعالےٰ نے فرمایا:

إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا

ہم تم پر گراں مایہ کلام نازل کرتے ہیں۔

ط: عبادہ بن صامت کہتے ہیں: جب آپ پر وحی نازل ہوتی تو سر نیچے جھکا لیتے[22] صحابہ بھی سروں کو جھکا لیتے۔ جب کیفیت دور ہوتی تو پھر سر اٹھاتے۔

ی: انس بن مالک کہتا ہے کہ ایک دن ہم لوگوں کے درمیان (پیغمبر کو) نیند آگئی۔ کچھ دیر بعد سر اٹھا کر ہنستے ہوئے فرمایا کہ مجھ پر سورۂ کوثر نازل ہوئی ہے[23]

ک: عکرمہ کہتا ہے: جب وحی نازل ہوتی تو غشی کی سی حالت طاری ہو جاتی[24]

ل: حضرت عائشہ کہتی ہیں: پیغمبر ایک چار پائے (گھوڑا یا اونٹ) پر سوار تھے کہ وحی آئی اور آپ اس کی گردن پر جا گرے[25]

---

[20] بخاری: صلاۃ ۱۲، جہاد ۳۱، ترمذی تفسیر سورۂ ۴، ۱۸، نسائی، جہاد ۴، طبقات ابن سعد ۴/۱/۱۵۵، احمد بن حنبل ۵: ۱۸۴ و ۱۹۰۔ ابوداؤد جہاد ۱۹، زاد المعاد ابن قیم ۱: ۱۸ (یا ۲۵)، اس روایت کو عثمان بن مظعون سے بھی نقل کیا ہے: بحار الانوار ۱۸: ۲۶۴، ۲۶۹۔ سعد السعود ۱۲۲۔

[21] تفسیر عیاشی ۱: ۲۸۸، حیات القلوب مجلسی ۲: ۲۵۸، اسی جیسی روایت عبداللہ بن عمر سے بھی نقل کی ہے۔ مختصر یہ کہ اس روایت میں ہے ایک حیوان بوجھ برداشت نہیں کر سکا اور آنحضرت پیادہ ہو گئے۔ احمد بن حنبل ۲: ۱۷۶، سیرۂ ابن کثیر ۱: ۴۲۴، حاکم ۲: ۵۰۵، اسی جیسی روایت اسماء بنت یزید سے بھی نقل کی ہے۔ احمد ۶: ۴۵۵، ۴۵۸۔ سبل الہدیٰ ۲: ۳۴۵۔ ایک دوسری روایت اسی قسم کی خبر اروی الدوسی سے ہے کہ کہتا ہے کہ اس چار پایہ نے اپنے پیر اس قدر پھیلا دیئے کہ میں ڈرا کہ وہ بیٹھ جائے گا۔ ابن سعد ۱/۱/ ۱۳۱، سفینۃ البحار ۲: ۶۲۸۱، سبل الہدیٰ ۔ ۲: ۳۴۴۔

[22] بحار ۱۸: ۲۶۱ از مناقب ۱: ۴۱ مسلم: فضائل ۸۹، تاج ۳: ۲۵۲۔

[23] سنن نسائی: باب قرأۃ بسملہ ۲: ۱۳۳۔

[24] طبقات ابن سعد ۱/۱/۱۳۱۔

[25] مجمع البیان طبرسی ۱۰: ۳۷۸، بحار الانوار ۱۸: ۲۶۳۔

Presented by Ziaraat.Com

م ۔ ابن عباس کہتے ہیں، وحی کے نازل ہونے کے وقت شدید درد محسوس کرتے۔ آپؐ کو دردِ سر بھی ہو جاتا[26]

وحی کن موقعوں پر نازل ہوتی

ا ۔ کبھی حضرت رسولِ خدا سے حوادث یا مسائل کے بارے میں براہِ راست یا بالواسطہ سوال ہوتا کہ جس کا جواب وحی کے ذریعے ملتا۔ مثلاً عمرہ کے موقع پر عطر کے استعمال کا مسئلہ[27] گھر میں رہ جانا اور جہاد میں شرکت سے معاف کیا جانا[28] اس بارے میں سوال کہ کیا بدی خوبی سے پیدا ہو سکتی ہے[29] حضرت عائشہ کے بارے میں کہ وہ قصوروار تھیں یا نہیں[30] ظہار[31] یا طلاق کے بارے میں محصنہ سے زنا کے متعلق جب ایک شخص نے گواہی دی ہو۔۔[32] بعض اوقات جس موقع پر سوال ہوتا وہاں ہی وحی سے جواب مل جاتا (مثلاً ١١٥٨...) بعض اوقات جیسے افک کے واقعہ یا قریش کے سوالوں کے جواب میں ایک ماہ یا اس سے بھی زیادہ عرصے کے بعد سوال کا جواب وحی کے ذریعے نازل ہوتا۔

٢ ۔ وحی مختلف حالات میں نازل ہوتی۔ کبھی آپؐ سوار ہوتے[33] یا سر دھونے میں مشغول ہوتے اور کوئی عورت اپنے خاوند کی شکایت کر رہی ہوتی[34] کھانا کھانے میں مشغول ہوتے اور ہاتھ میں بوٹی ہوتی[35] یا منبر پر ہوتے[36]

ایسا نہیں تھا کہ جب پیغمبرؐ انتظار میں ہوتے تو اسی وقت وحی نازل ہوتی۔ اکثر اوقات آپؐ کے انتظار کے برخلاف وحی اترتی۔ بعض اوقات آپؐ کی خواہش کے برعکس ہوتی اور کبھی آپؐ کی رائے کے برعکس ہوتی۔ یہاں تک کہ کبھی کسی چیز کو اپنی ذاتی نظر سے اپنے لیے ناجائز جانتے تو وحی اس کو صحیح سمجھتی۔ مثلاً

لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ (٦٦ : ١)۔

جس کو اللہ تعالےٰ نے حلال کیا ہے اس کو اپنے اوپر کیوں حرام کیا؟

---

[26] بحار ١٨ : ٢٦١ ، مناقب ١ : ٤١ ۔

[27] بخاری : عمرہ ١٠ ۔

[28] ابوداؤد : جہاد ١٩ ، احمد ٥ : ١٨٤ ۔

[29] احمد ٣ : ٢١ ، طیالسی شمارہ ٢١٨٠ ۔

[30] بخاری تفسیر سورۂ ٢٤ نور باب ٦/١ ، احمد ٦ : ٢٣ ۔

[31] تفسیر طبری ١٨ : ٢ ، مجمع البیان ٥ : ٢٤٥ صیدا ، ابوالفتوح ٩ : ٢٥٧ ، سفینۃ البحار ٢ : ٢٣٨١ ۔

[32] طیالسی شمارہ ٢٦٦٧ ۔

[33] تفسیر طبری ٢٦ : ٣٩

[34] تفسیر طبری ١٨ : ٢ تبیان ٢ : ٩٥٩ ، صافی ٥٢٤ ، فخر رازی ٨ : ٤٨٠ ، بیضاوی ٢ : ٥٠٢ ۔

[35] احمد ٦ : ٥٦ ۔

[36] ایضاً ٣ : ٢١ ۔

Presented by Ziaraat.Com

مثلاً پیغمبرؐ نے عہد کیا تھا کہ اپنی زوجہ ماریہ کے پاس نہیں جائیں گے یا یہ کہ آئندہ شہد نہیں کھائیں گے۔ تو سوال ہوا کہ حلال کو اپنے اوپر کیوں حرام کرتے ہیں۔؟

اگر کبھی دھوکے کا امکان ہوتا یا کوئی سازش ہو رہی ہوتی تو فوراً آیتِ قرآنی آپؐ کو خبر دیتی اور آپؐ کو سازش سے بچا لیتی۔ مثلاً بنی اُبیرق کا قصہ جن کا زرہ کی چوری میں ہاتھ تھا مگر شور شرابا کر کے چاہتے تھے کہ اس گناہ کو دوسرے کی گردن پر ڈال دیں۔ جب پیغمبرؐ نے قتادہ بن نعمان کو، جو عزیز بھی تھا اور بدری بھی اور چوری کی شکایت لے کر آیا تھا، سرزنش کی تو آیت نازل ہوئی:

وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا (۴ : ۱۰۵)

تم خیانت کرنے والوں کے لیے جھگڑا کرنے والے نہ بنو۔

وحی ہر لحظہ اور ہر جگہ آسکتی تھی۔ ایک پہر رات باقی رہ گئی تھی کہ تین آدمیوں (مرار، ہلال اور کعب) کے بارے میں جنہوں نے (توبہ سے یا جنگ تبوک سے) پشت پھیری ہوئی تھی سورۂ توبہ کی آیت ۱۱۸ نازل ہوئی[۳۷] اپنے اصحاب کے درمیان تھے کہ غشی اور نیند کی سی کیفیت طاری ہوئی اور سورۂ کوثر نازل ہوئی[۳۸] یہ وہ مثالیں ہیں جن کی تفصیل تفسیر اور اسبابِ نزول کی کتابوں میں مل سکے گی۔ وحی رات اور دن، صلح و جنگ کے دوران، شہر و بیابان میں، گھر میں یا مسجد میں، حضر و سفر میں، گرمی میں سردی میں، بستر پہ یا فرش پر، ہر جگہ ہر وقت ممکن تھی کہ نازل ہو جائے۔ علوم قرآن کی کتابوں منجملہ سیوطی کی «الاتقان» اور زرکشی کی «البرہان» میں اس سلسلے کے مفصل ابواب ہیں۔

خلاصہ یہ ہے:

لوگ پیغمبروں پر تین قسم کے نزولِ وحی سے واقف ہیں:

۱۔ کلام الٰہی کا سننا۔

۲۔ قلب میں القاء

۳۔ فرشتے کے وسیلے سے رسالتِ وحی۔

اس کی سات مختلف صورتیں ہیں:

ا۔ لوح پر نوشتے کی صورت میں۔

ب۔ اصلی صورت میں فرشتے کا آنا۔

ج۔ فرشتے کو انسان کی شکل میں دیکھنا۔

د۔ فرشتے کو دیکھے بغیر آواز سننا۔ یہ صدا یا آواز جرس ہے یا دو دھاتوں کے باہم رگڑ کھانے جیسی ہے جس کی آواز کانوں میں آئے یا شہد کی مکھی کی آواز جہرے کے نزدیک سنائی دے[۳۹]

---

[۳۷] مجمع البیان ۳ ، ۸۱۷ ، تبیان طوسی ۱ : ۴۸۹ ، امام فخر رازی ۴ : ۵۸۷ ، بیضاوی ۱ : ۵۲۴ ۔

[۳۸] مسلم؛ صلاۃ ۵۳ ، ابوداؤد؛ سنہ ۲۴ ، احمد ۳ : ۲۲ ۔

[۳۹] ترمذی، تفسیر سورہ ۲۴/۱ ۔

Presented by Ziaraat.Com

س ۔ ذہن وعقل میں فرشتے کا دم کرنا یا قلب میں القا ہونا ۔

ص ۔ رویائے صادقہ، خواب میں وحی ۔

ف ۔ پروردگار کا پردے کے پیچھے سے کلام کرنا ۔

وحی کی کیفیات

— ایک عام گفتگو میں وحی کا حصول، جیسے دو شخص آپس میں گفتگو کر رہے ہوں ۔

— بانگ جرس کا سننا یا دو دھاتوں کی رگڑ کی آواز سننا یا شہد کی مکھی کی بھنبھناہٹ سننا ۔

— شروع میں پیغمبر وحی نازل ہونے کے وقت انکا زبان مبارک کو تیزی سے وحی ہونے والی آیات کے ساتھ ہلاتے ۔ حکم آیا کہ اس کام میں جلدی نہ کیا کریں ۔

— ذہن وعقل میں دم پھونکنے کی صورت میں وحی کا حصول ۔

— کبھی اضطراب اور پریشانی کی کیفیت ہوتی ۔ اور سکون حاصل کرنے کے لیے آپ کا سر مبارک ٹھنڈے پانی سے دھویا جاتا اور آپکو کپڑا اڑھایا جاتا ۔

— یا ایسی گرمی کی کیفیت ہوتی کہ سردیوں کے زمانے میں آپ کی پیشانی سے پسینہ ٹپکنے لگتا ۔

— کبھی کپڑے سے اپنا سر اور جسم ڈھانپ لیتے ۔

— کبھی آپ کا چہرہ سرخ یا نیلا ہو جاتا ۔

— کبھی نیند میں دکھائی دیتے ۔ یا غشی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ۔

— کبھی آسمان کی طرف نگاہ کرتے اور پھر اپنے اطراف میں دیکھتے اور اپنے سر کو ہلاتے (جیسے کسی سے باتیں کر رہے ہوں)۔ یا آپ سر کو جھکا لیتے ۔

— کبھی بہت سختی برداشت کرتے ۔ کبھی یہ مرحلہ آسان بھی ہوتا ۔

— کبھی ایسا بوجھ اور وزن ہو جاتا کہ جس سواری پر آپ سوار ہوتے اس کی رفتار سست پڑ جاتی ۔ یا سواری کی گردن پر جا گرتے۔ یا سواری کے پیر پھیلنے لگتے ۔

— کبھی سر میں درد ہو جاتا ۔

غرض کہ یہ وہ کیفیات تھیں جن سے وحی نازل ہوتے وقت آپ دوچار ہوتے اور وحی کے مختلف احوال تھے جو روایات کے ذریعے ہم تک پہنچے ہیں ۔

یہ بھی ہم نے دیکھا کہ وحی کا فرشتہ مختلف طریقوں سے نازل ہوتا، دو تین دفعہ فرشتہ اپنی اصل شکل میں رسول اللہ کے سامنے ظاہر ہوا اور آسمان سے آپ سے کلام کیا ۔ کبھی انسانی پیکر میں آیا کہ جو لوگ وہاں موجود تھے انہوں نے بھی اس کو دیکھا اور اس کی بات کو سنا ہے کبھی پیغمبر اکرم پر (فرشتہ) مخفی ہو کر نازل ہوتا کہ دکھائی نہ دیتا ۔ مگر آنحضرت پر اس کے آثار ظاہر ہوتے، جیسے

Presented by Ziaraat.Com

کوئی شخص سوتے میں خراٹے لے رہا ہو، یا غشی کی سی حالت طاری ہو جاتی حالانکہ وہ غشی نہ ہوتی۔ دراصل فرشتہ روحانی کے دیدار میں استغراق کی کیفیت ہوتی اور آپؐ عام انسانی کیفیت سے بالا ہو جاتے۔ یہ حالت قدرتی بات تھی۔ روحانی بالیدگی اور شدت کی بنا پر سوئے ہوئے آدمی کی طرح خراٹے لینا، تیز تیز سانس لینا اور کبھی سخت سردیوں میں پیشانی سے پسینہ ٹپکنا فطری عمل ہے۔

کبھی فرشتے کو خواب میں دیکھتے کہ کچھ لوگ سورۂ کوثر کا نزول اسی حالت میں سمجھتے ہیں، جب کہ بعض لوگوں نے یہ بات قبول نہیں کی۔ کبھی فرشتے نے کلام ترکم کیا ہے کبھی رسول اللہ پر وحی آوازِ جرس کی مانند ہوتی جو آپؐ کے کانوں میں گونجتی، جیسے کبھی آپؐ کے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں نے بھی شاید سنا ہو اور اس کو گویا شہد کی مکھی کی بھنبھناہٹ سمجھا ہو۔ مگر انہوں نے کلام کو نہیں سمجھا اور بات کا ادراک نہیں کر پائے۔ مگر آپؐ نے واضح طور سے سنا اور جو کچھ آپؐ پر وحی نازل ہوئی وہ بے کم و کاست دل میں محفوظ کر لی۔ آپؐ علم لدنی سے جانتے تھے کہ وہ خدائی وحی ہے بغیر کسی ابہام یا پیچیدگی کے اور بغیر کسی شک اور تردید کے۔ جب وحی آپؐ پر پوری ہوتی تو ساری چیز دل کو دل میں نقش کیا اور حافظے میں پختہ کر لیا۔ گویا آپؐ کے قلب پر کتاب لکھ دی گئی ہو۔ یہ وحی کی بہت سخت اور سنگین قسم تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کیفیت اس وقت ہوتی جب کوئی وعید، تہدید اور انذار اور ڈرانے کی آیت نازل ہوا کرتی۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے کہ غشی کی سی کیفیت اس وقت طاری ہوتی جب وحی براہ راست اور بغیر جبرئیلؑ کے توسط کے نازل ہوتی اور عام حالت اس وقت ہوتی جب خود جبرئیلؑ پیغام لاتے۔ بعض محققین کا کہنا ہے کہ بجلی کی سی کڑک کا سننا پیغمبرانِ نامُرسل کا رتبہ ہے اور فرشتے کا انسان کی صورت میں آنا اور بات کرنا پیغمبرانِ مُرسل کا مقام و منزلت ہے۔ بیشک اگر تفصیل میں جانا ہو اور عقلی نتائج اور ادبی چھان بین کرنی ہو تو میدان بہت وسیع ہے اور تخیل و تصور کی انتہا نہیں۔

بہر صورت وحی کے نازل ہوتے وقت وہ بوجھ اور سنگینی اور غشی کی سی کیفیات تھیں جن کی بنا پر مشرکین انبیاءؑ پر جنون کی تہمت رکھتے اور کہتے کہ وہ جن کے تابع ہیں اور ان سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ یہ تہمت صرف زمانہ جاہلیت کے عربوں ہی نے نہیں باندھی بلکہ بعض مستشرقین نے بھی یہ بات دہرائی ہے اور پیغمبرِ اسلام پر جنون کی تہمت لگائی ہے۔ حالانکہ مرگی وغیرہ کے آثار ڈاکٹری اور طب کی نظر میں اس سے قطعی مختلف ہوتے ہیں۔ اس دورے میں عجیب و غریب کیفیت ہوتی ہے اور اس حالت کے ختم ہونے کے بعد مریض کو خبر نہیں ہوتی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ آنحضرتؐ پر وحی نازل ہوتے وقت کیفیت دوسری ہوتی تھی۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ وحی کی اس شدت کے تمام ہونے کے بعد جو کچھ کہ وحی نازل ہوئی تھی اس کو من و عن اپنے حاضر ذہن کے ساتھ املا کروا دیتے اور آخر عمر تک بہترین جسمانی صحت کے مالک رہے۔ ان کا حافظہ ایسا قوی تھا کہ قرآن کا ایک لفظ بھی آپ نہیں بھولے تھے۔ کہتے ہیں کہ آپؐ نے اپنی زندگی کے آخری سال دو مرتبہ جبرئیلؑ کے سامنے قرآن پڑھا اور ایک دوسرے سے موازنہ کیا۔ بیشک سارے مستشرقین

حاشیہ از صفحہ سابقہ۔ ابوحیان نے اپنی بحر میں کہا ہے کہ یہ آسان ترین کیفیت ہوتی (اتقان ۱: ۱۴۱)، بخاری: فضائل القرآن ۱/۱، ابن ہشام (گوٹنگن) ۱۵۲/۱۵۶۔ ۱۵۲، حلیہ ابونعیم ۴۹

محاسن۔ برقی۔ ۳۳۸، بحار الانوار ۱۱۲/۱۰، بہ کیپانی ص ۱۸۵، ۲۶۰، ۲۶۸/۲۶۶، ۲ آخوندی، کمال الدین صدوق ۸۵۔ سفینۃ البحار ۲: ۶۳۸۔

ترجمہ مقدمہ ابن خلدون ۱: ۱۸۶۔

ترجمہ مقدمہ ابن خلدون ۱: ۱۶۴۔

قبیل کی باتیں نہیں کہتے۔ مثلاً ٌ باڈلے، رسولؐ اللہ کی سیرت میں آپؐ کے قوائے عقلانی اور جسمانی اور معجزاتِ رسولؐ کی تصریح کرتا ہے[۱۳۳]

بقول آقای مہندس مہدی بازرگان جو بات قطعی ہے وہ یہ کہ "آپؐ میں خود پرستی اور مال اور منصب کی خواہش کا موجود نہ ہونا مسلّم ہے۔ آپؐ کے کام میں احساسات اور داخلی جذبات کا عمل دخل نہیں ہوتا تھا۔ پیغمبرؐ اس آیت کے مصداق تھے۔

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (۶۸ : ۴)

بیشک آپؐ اخلاق (حسنہ) کے اعلیٰ درجے پر فائز ہیں۔"

تاریخ اس کی شاہد ہے اور بے شمار مثالیں ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ آپؐ کے مزاج میں نہ عصبیت تھی اور نہ آپؐ زود رنج تھے، نہ رشتہ داروں اور دوستوں کے لیے جذباتی بن کر کبھی آپؐ نے اپنے افعال یا فیصلوں میں کسی قسم کی تبدیلی کی نہ کبھی قرآن کے احکام سے انحراف کا کوئی سبب بن سکا۔ اس کے برعکس مصیبتوں کے دنوں اور جنگ کی شدت کے دوران اور فتح و کامرانی اور نعمت کی فراوانی کے زمانے میں بھی آپؐ نہایت ٹھنڈے دل سے اپنے نفس پر پورا پورا قابو رکھتے تھے"[۱۳۴]

فرانسیسی مصنف اور محقق ڈرمنگھم اپنی کتاب "محمدؐ اور سنتِ اسلامی" میں لکھتا ہے:

"بعثت کے زمانے تک آپؐ کی زندگی معمول کی اور اعتدال پسندانہ تھی۔ اس کے بعد بھی وحی نازل ہونے کے لمحات کے علاوہ یہی کیفیت رہی۔ جیسا کہ انبیائے بنی اسرائیل میں دیکھا گیا ہے، ایسا نہیں کہ جب مریض ہوتے تو مکاشفہ یا الہام ہوتا۔ اس کے برعکس جب مکاشفہ یا وحی نازل ہوتی تو غیر معمولی آثار ظاہر ہوتے۔ ہاں ایک اعصاب کے مریض اور ایک حقیقی اہلِ مکاشفہ میں امکان ہے کہ کچھ مشترک حالات پائے جائیں۔ مگر اعصابی مریض جلد اثر کھو دیتا ہے جب کہ ایک روشن خیال اہلِ مکاشفہ فعال اور مستعد ہو جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک کمزور مزاج عرفانی حالات کو کسی حد تک آسان بناتا ہے۔ تو کبھی خود اس کے بیمار ہونے کا سبب بن جاتا ہے مگر کسی بھی صورت میں محمدؐ میں مرض یا بیماری کی ایسی حالت نہیں ملتی۔"[۱۳۵]

یہ تو ایک غیر کا نظریہ تھا۔ علمائے کلام نے بھی اسی انداز کی بات کی ہے: نبیؐ کو وحی حاصل کرنے اور احکامِ دینی کی حفاظت اور ان کو لوگوں تک پہنچانے میں خطا سے قطعی بری (اور معصوم) ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ جس طرح نبیؐ کا قول تبلیغ ہے اس کا فعل اور عمل بھی تبلیغی پہلو رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں نبیؐ وہ انسان ہے جو وحی کی حفاظت اور اس کو حاصل کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کرتا۔ اس کی زبان لوگوں میں تبلیغ کرتے وقت خطا نہیں کرتی۔ اس کا کردار و گفتار ایک ہوتا ہے۔ مگر ساتھ ساتھ زندگی کے باقی تمام مرحلوں میں وہ عام انسانوں جیسا ہوتا ہے۔

تو یہ وحی کی مختلف کیفیات تھیں۔ جو کچھ پیش کیا گیا کتاب و سنت میں اس کے شرعی دلائل بہت ہیں اور اسی لیے قرآن مجید

۱۳۳

۱۳۴ مسئلۂ وحی۔ مہندس مہدی بازرگان۔ ۱۳۴۲۔ ص ۱۰۵ و ۱۰۶۔

۱۳۵ DERMENGHEM; EMILE, MAHOMET ET LA TRADITION ISLAMIQUE, 1955.

Presented by Ziaraat.Com

نے فرمایا:

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (۵۳: ۳، ۴)

وہ اپنی ہوائے نفس سے بات نہیں کرتے۔ وہ وحی ہوتی ہے جس کو پیش کرتے ہیں۔

وحی کے مراحل

ہم نزولِ وحی کی قسمیں، ان کی گوناگوں صورتیں اور ان کے مختلف حالات دیکھ آئے۔ اب ان میں وحی کے مختلف مرحلے تلاش کیے جائیں اگر ان مختلف حالات کو ترتیب دیا جائے تو وحی کے سات مرحلے شمار کیے جا سکتے ہیں:۔

۱۔ رویائے صادقہ جن میں پیغمبر ہر چیز کو اس طرح دیکھتے ہیں جیسے صبح کی روشنی میں دیکھ رہے ہوں۔

۲۔ پیغمبر اپنے دل میں فرشتے کا دیدار کر رہے ہوں، اس کو آنکھ سے دیکھے بغیر اور علم لدنی سے جانتے ہوں اور یقین رکھتے ہوں کہ یہ وحی الٰہی ہے، الہام نہیں۔

۳۔ فرشتہ انسانی شکل میں ظاہر ہو اور اپنا پیغام دے۔ پیغمبر بھی اس پیغام کو حاصل کریں۔

۴۔ پیغام آوازِ جرس کی طرح کانوں میں گونجے۔ یہ سخت ترین حالت ہے۔

۵۔ جبرئیل امین جس شکل میں خلق ہوئے ہیں اسی طرح باشکوہ اور رعب داب سے ظاہر ہوں اور پیام کا ابلاغ کریں۔

۶۔ پیغمبر آسمان میں ہوں اور خدا کے پیغام کو، بغیر حرف اور آواز کے، بغیر واسطے اور کسی دوسرے پیغام پہنچانے والے کے حاصل کریں۔ جیسے نماز۔۔۔۔

۷۔ حضرت موسیٰ کی طرح وحی الٰہی کو براہِ راست اور بغیر کسی واسطے کے سنیں مگر کوئی چیز نظر نہ آئے۔

صادق امین

ایک وہ چیز جس سے وحی کی اصلیت اور صحیح ہونے کی بہت زیادہ تائید ہوتی ہے وہ محمد کی اپنی رفتار و کردار ہے۔ قرآن کی گواہی کے بعد وحی کی صحت اور اس کے حقیقی ہونے کے دعوے کی سب سے بڑی دلیل اور سب سے بڑی گواہ صداقتِ محمدی ہے۔ وہ صادق امین جنہوں نے پوری زندگی میں اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد بھی، کبھی غلط اور فضول بات نہیں کی۔ خواہ چھوٹی سے چھوٹی بات ہو یا بڑے سلسلے ہوں۔ خداوند تعالیٰ نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ اس کی مثالیں گذشتہ صفحات میں ہم دیکھ چکے ہیں۔ خود آپ کی زندگی میں دشمنوں کی صفوں اور گروہوں کے باوجود جو مکہ اور مدینہ اور اطراف میں پھیلے ہوئے تھے کوئی شخص بھی آپ کی گفتگو اور زبان پر کوئی تہمت نہیں لگا سکا، اور شکایت نہیں کر پایا۔

نشست و برخاست میں، جنگ و جدال میں، احکام اور فیصلوں میں، عبادت اور ذکر میں اور گفتگو میں کسی نے کبھی آپ سے کوئی ناروا اور فضول بات منسوب نہیں کی حالانکہ آپ کے بدترین دشمن مثل ابوجہل، ابولہب، ابوسفیان، خیبر اور فدک کے یہودی، مدینہ کے منافق اور مکہ کے کافر ہر وقت آپ کے درپے آزار رہتے تھے۔ انہوں نے آپ پر ہر قسم کی تہمت لگائی۔ آپ کو کاہن کہا،

حاشیہ بر صفحہ آئندہ

Presented by Ziaraat.Com

مجنون کہا، شاعر کہا، جادوگر کہا مگر آپ سے جھوٹ کی نسبت کبھی نہ دے سکے۔ ساری زندگی شروع سے آخر تک جو بھی تھا سچ اور صحیح تھا۔ وہ محمدؐ امین تھے۔ جوانی ہی میں اس صفت کی شہرت ہو گئی تھی۔ یہی امانت کا وصف تھا کہ حضرت خدیجہؓ نے آپ کو اپنے تجارتی کاروان کے لیے منتخب کیا اور قیس بن زید آپ کے تجارت ترک کرنے پر پریشان ہو گیا[۲] یا آپ کے لوگوں نے کعبہ کی بنیاد رکھنے میں پورے اعتماد سے آپ کو حَکَم بنایا۔ اسی واقعے میں جب آپ مسجد الحرام میں داخل ہوئے تو قریش نے ایک زبان ہو کر پکارا کہ آ گئے امین آ گئے۔[۳] یہاں تک کہ بعثت کے بعد بھی قریش اپنی ساری دشمنی اور مخاصمت کے باوجود اپنی امانتیں آپ ہی کے پاس رکھواتے رہے۔ جب ہی مدینہ ہجرت کے بعد حضرت علیؑ کچھ دن مکہ میں رہے تاکہ لوگوں کو ان کی امانتیں واپس پہنچا دیں اور پھر مدینہ ہجرت کریں۔[۴]

مگر لطف کی بات یہ ہے کہ چونکہ "امین" اور "آمنہ" انگریزی حروف میں تقریباً یکساں لکھا جاتا ہے، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ترجمہ رسول خدا کے سلسلے میں لکھا ہے کہ پیغمبر کو جو لقب 'امین' ملا وہ آپ کی والدہ 'آمنہ' کے نام سے لیا گیا تھا! یعنی یہ شہرت امانت کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ والدہ کا نام 'آمنہ' ہونے کی وجہ سے تھی۔ اس لیے اس لقب میں کوئی فخر یا فضیلت کی وجہ نہیں تھی۔ جب کہ تاریخ گواہ ہے کہ یہ شہرت آپ کے امانت دار ہونے ہی کی وجہ سے تھی۔ بے شمار شواہد ہیں جن میں سے بعض کا پچھلے صفحات میں ذکر بھی ہوا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ سارے غیر مسلم ایسے نہیں۔ سدیو (SEDILLOT) لکھتا ہے کہ محمدؐ ۲۵ سال کی عمر میں اپنے حسنِ سیرت اور حسنِ سلوک کی وجہ سے لوگوں میں "امین" کے لقب کے مستحق شمار ہونے لگے۔[۵] سر ولیم موئر کہتا ہے کہ آپ کے شہر کے لوگوں نے باتفاق رائے آپ کے اعلیٰ اخلاق کی بنا پر آپ کو "امین" کے لقب سے نوازا۔[۶] آپ مکے کے لوگوں کے امانت دار تھے، یہاں تک کہ قریش سے سخت دشمنی اور مخاصمت کے دوران بھی لوگ اپنی امانت آپ ہی کے پاس رکھواتے تھے۔[۷] آپ لوگوں کے امین تھے۔

آپؐ نے آغازِ رسالت میں ہی اعلان کر دیا تھا کہ آپ وحیِ الٰہی کے سوا اور کوئی بات نہیں کہتے۔ جہاں وحی نہ ہوتی کام کو سادہ طریقے سے اپنے صحابہ کے درمیان رکھتے اور ان سے مشورہ کرتے تاکہ سب مل کر کسی صحیح نتیجے تک پہنچیں۔ آپ کی حیاتِ پاک سے چند

حاشیہ از صفحہ سابقہ: [۱] استہزا کرنے والوں اور پیغمبر کے دشمنانِ قریش کے لیے دیکھیں: ابن ہشام ۱: ۳۸۰، ابن سعد ۱/۱/۱۳۳، المحبر ۱۵۷۔ انساب الاشراف ۱: ۱۳۵-۰۷ و ۱۳۱۔ دلائل النبوۃ ۱: ۹۱ و ابن سید الناس ۱: ۱۰۱، والامتاع: ۲۲، از جوامع السیرہ۔ ابن حزم: ۵۲ ج ۱۔ روض الانف ۱: ۲۲۵ و سیرہ۔ شامی ۲: ۵۱۲-۶۰۵-۶۱۹۔

[۲] مسند احمد ۳: ۴۲۵۔ قاہرہ ۱۳۶۸۔

[۳] ابن ہشام ۱: ۲۰۹، ابن سعد ۱/۱/۹۴، سیرۂ شامی ۲: ۲۳۱، مسند طیالسی ۲: ۲۲۱۔

[۴] ابن سعد ۳/۱/۱۲۔

[۵] تاریخ عرب ۱: ۵۸۔ طبع دوم ۱۸۷۷، از محمدؐ۔ محمد رشید رضا ۴۲۔

[۶] تاریخ زندگانی محمد ۱: ۲۰ طبع ۱۹۱۲، از محمدؐ۔ محمد رشید رضا ۴۲

[۷] محمدؐ از محمد رشید رضا ۴۲۔ رسول اللہ کی صداقت پر غیروں کے شواہد کے لیے پروفیسر منٹگمری واٹ، کارلائل اور دوسرے مستشرقین کے بارے میں آقای مہندس مہدی بازرگان کی کتاب "سیر وحی" (ص ۴۴) طبع انتشار ۱۳۴۴ ملاحظہ کریں۔

Presented by Ziaraat.Com

مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں ۔

جنگ بدر میں جب مسلمان ابوسفیان کے قافلے کے تعاقب میں گئے ہوئے تھے تو پیغمبر نے چاہ بدر کے پاس مسلمانوں کے لیے جگہ منتخب کی ہوئی تھی ۔ حباب بن منذر انصاری (م ۲۰ھ تقریباً) نے دریافت کیا کہ یہ انتخاب وحی الٰہی کی بنا پر کیا گیا ہے یا خود پیغمبر کی ذاتی رائے ہے ؟ پیغمبر نے سادگی سے اور برملا جواب دیا کہ یہ خود آپ کی رائے ہے ۔ حباب نے ایک دوسری تجویز پیش کی ، جو لوگوں نے پسند کی اور اسی پر عملدرآمد کیا گیا[۸] اسی بنا پر حباب "ذوالرائی" مشہور ہوئے ۔

غزوہ احد کے موقع پر رسول اللہ کے گھر پر جنگی کانفرنس میں مشورے ہو رہے تھے ۔ قوم کے بزرگوں کا کہنا تھا کہ شہر ہی میں رہ کر دفاع کیا جائے اور قلعہ بند ہو کر بیٹھا جائے کیونکہ قریش مسلمانوں سے چوگنی بڑی فوج لے کر آ پہنچے تھے ۔ مگر نوجوان لوگ لڑنا چاہتے تھے اور دشمن سے آمنے سامنے مقابلہ کرنا چاہتے تھے ۔ اس جلسے میں ان لوگوں کی تعداد زیادہ تھی اور باوجودیکہ آنحضرتؐ خود شہر میں رہنے کے طرفدار تھے آپ نے اکثریت کی رائے مانی اور میدان جنگ میں مقابلہ کرنے کو قبول فرمایا ۔ حالانکہ ڈر یہ تھا کہ مسلمان کہیں شکست نہ کھا جائیں[۹] پیغمبر نے یہ نہیں فرمایا اس سلسلے میں یہ وحی نازل ہوئی ہے اور یہ حکم ملا ہے ۔

صداقت محمدی کی سب سے روشن مثال وہ واقعہ ہے جو آپ کے صاحبزادے (ابراہیم) کے دفن کے روز ہوا (ربیع الاول ۱۰ھ) اسی روز کامل سورج گرہن ہوا اور لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ فطرت بھی آپ کے اس غم میں شریک ہے ۔ مگر آپ نے فرمایا سورج اور چاند خدا کی دو آیات ہیں اور کسی کے مرنے جینے پر ان کا گرہن نہیں ہوتا[۱۰]

یہ واقعہ سب ہی سیرت نگاروں اور راویوں نے بیان کیا ہے جو اخلاص و صداقت محمدی کی اعلیٰ مثال ہے ۔ فرانسیسی مصنف امیل درمنگم لکھتا ہے "محمد تو بلند نظر اور فکر عالی کے حامل تھے ۔ اس جملے کے فرمانے سے کہ

ان الشمس والقمر لاینکسفان لموت احد

آپ نے اس خوبصورت قیاس آرائی کو رد کر دیا ۔ یہ کسی فریب دینے والے کا سخن نہیں ہو سکتا"[۱۱]

یہاں ایک اور واقعہ یاد آتا ہے جو خدا اور اس کے احکام پر محمد کے گہرے ایمان کا مظہر ہے اور آپ کی صداقت اور اس اعتماد کو ظاہر کرتا ہے جو آپ کو اس بات پر تھا جسے آپ نے خود ہی پیش فرمایا ۔ یہ واقعہ ذات الرقاع میں پیش آیا ۔ پیغمبر ایک درخت کے نیچے آرام فرما رہے تھے ۔ آپ نے اپنی تلوار درخت کی شاخ پر لٹکا دی تھی ۔ ایک مشرک نے جو تاک میں تھا جب یہ دیکھا تو خاموشی سے آیا اور تلوار شاخ سے اتار کر للکارا کہ کیا مجھ سے نہیں ڈرتے ؟ پیغمبر نے نہایت سکون سے جواب دیا ، نہیں ۔ اعرابی نے پھر آواز دی کہ دوکان

---

[۸] ابن ہشام ۲ : ۲۷۲ ۔ ملاحظہ کریں ۔ بدر ثانی ، واقدی ۱ / ۱۱ ، ابن سعد ۲ / ۱ / ۱۵ ، طبری ۱۳۰۸ ، حاکم ۳ : ۱۲۶ ، ۱۲۷ ۔

[۹] ابن ہشام ۳ : ۲۳ ، واقدی ۱۵۲ ، ابن سعد ۲ / ۱ / ۲۵ ، طبری ۳ : ۹ ۔ زاد المعاد ۲ : ۱۳۱ ۔ احمد ۳ : ۳۵۱ ، البدایہ والنہایہ بیہقی ۴ : ۱۱۱ ، حاکم ۲ : ۱۲۸ ، ۱۲۹ ، ۲۹۶ ، ۲۹۷ ۔

[۱۰] جامع السیرۃ ابن حزم ۳۹ ، ابن سعد ۱ / ۹۰ ، ۱۵۵ ، بخاری ، کسوف ۱۵ ، مسلم ، کسوف ۱۰ ، ۲۳ ۔

[۱۱] حیاۃ محمد ۔ امیل درمنگم ۔ ترجمہ عادل زعیتر ص ۳۱۸ ۔

Presented by Ziaraat.Com

ہے جو آج تم کو مجھ سے بچا سکتا ہے۔ پیغمبرؐ نے جواب میں کہا: خدا! وہ خدا ہے جو مجھ سے میری حفاظت کرے گا۔۔۔ تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی اس شخص نے چپکے سے وہ تلوار آپؐ کے سامنے رکھ دی اور اپنی شکست مان لی[۱۲] بعضوں نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ شخص وہیں مسلمان ہو گیا۔ مگر اس کا اسلام لانا واضح نہیں۔ اس واقعے سے پیغمبرؐ کا ایمان اور بہادری ظاہر ہوتا ہے۔

رسول اللہؐ کی صداقت کی بہترین دلیلوں میں سے ایک خود آیات کی ترتیب یا اصطلاح کے مطابق ان کی شان نزول ہے جس سے اس سرزمین کی صداقت کی بے شمار مثالیں فراہم ہوتی ہیں۔

پیغمبرؐ کی صداقت کے لیے یہی کافی ہے کہ اگر کبھی آپؐ امور دنیا کے بارے میں خود اپنے خیال سے کچھ فرماتے تو ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے کہ میرے خیال میں ایسا ہونا چاہیے یا ویسا۔ کیونکہ دنیا کے کاموں کا دارومدار تجربہ اور آزمائش پر ہے۔[۱۳]

جو بھی قرآن میں سے تھا آپؐ پورے کا پورا ابلاغ کرتے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آیات الٰہی میں سے کسی چیز کو چھپایا ہو۔ جو شخص یہ کہے کہ محمدؐ نے وحی میں سے کوئی چیز چھپائی اور نہیں بتائی وہ جھوٹا ہے۔[۱۴] حضرت عائشہ زوجہ رسولؐ کا کہنا ہے کہ اگر رسول اللہؐ قرآن سے کسی چیز کو چھپاتے تو وہ یقیناً یہ آیت ہوتی[۱۵]

وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ (۳۳ : ۳۷)

اور تم اپنے جی میں اس چیز کو چھپاتے تھے جس کو اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا تھا اور تم لوگوں سے ڈرتے تھے (کہ طعنہ نہ دیں)

زید بن حارثہ کو اپنی بیوی زینب کی بد اخلاقی کی شکایت تھی پیغمبرؐ نے اس سے فرمایا: اِتَّقِ اللّٰهَ ۔ خدا سے ڈرو اور اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ۔ اپنی بیوی کے ساتھ رہو اور اس کا خیال کرو۔۔۔ زید آپؐ کا منہ بولا بیٹا (متبنیٰ) اور آزاد کردہ غلام تھا۔ خداوند عالم نے اس راز کو آشکار فرمایا۔

یہ جو کچھ کہا گیا وہ آپؐ کی صداقت کی چند مثالیں ہیں۔ مگر در حقیقت صداقت محمدیؐ کی محکم ترین دلیل قرآن کے وہ خطاب اور عتاب ہیں جو آج بھی موجود ہیں۔ اگر قرآن آپؐ کے ہاتھوں کا گھڑا ہوا ہوتا تو اپنے آپ کو کبھی بھی ان اعتراضات کا نشانہ نہ بننے دیتے۔ کبھی ایسا نہ ہوتا کہ دل میں ایک لمحے کے لیے آیا ہوا کوئی خیال قرآن میں وحی کے طور پر بعد کی نسلوں تک پہنچا دیا جاتا۔ خصوصاً اپنے آپ پر یہ تنقید اور اعتراض اس زمانے میں جب کہ مخالفین اور پیروکار دونوں زیادہ اور منفی اور خود سر طبیعت کے تھے۔ دور اندیشی اور مصلحت کا دور تھا۔ دشمن جو ہمیشہ آپؐ کے درپے آزار تھے ایسے عتاب اور تنقید سے غلط فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ اپنی کمزوری کا اظہار کرکے اور اس کو خدا کی زبان سے کہلوا کے اپنے زمانے اور بعد کے آنے والے مخالفین کے لیے اپنے خلاف مواد مہیا کرنا تھا۔

---

[۱۲] اس شخص کا نام غورث بن حارث تھا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ آیت ۵: ۱۱ اس نعمت کے بارے میں نازل ہوئی۔

[۱۳] جوامع السیرۃ ابن حزم۔ ۱۴۰، بخاری: مغازی ۳۱۔ مسلم: جہاد ۱۳۹، ابن سعد ۲/۱/۴۳، واقدی ۱۹۷/۱، احمد ۳: ۳۶۴ مسلم فضائل ۱۳۹-۱۴۱، شرح نووی ۱۳: ۱۱۶، ۱۱۸، الناسخ و المنسوخ ۳: ۲۷۶، احمد ۱: ۱۶۲ و ۳: ۱۵۲، شفا قاضی عیاض ۲: ۱۷۸، ۱۷۹۔ اس میں بحث کی گنجائش ہے۔

[۱۴] بخاری: تفسیر سورۃ ۵ و ۵۳ توحید ۴۶۔ مسلم: ایمان ۲۸۷ ترمذی تفسیر سورۃ ۶ و ۵۳ احمد ۶: ۵۰

[۱۵] بخاری: توحید ۲۲ مسلم: ایمان ۲۸۸، ترمذی تفسیر سورۃ ۳۳- ۹، ۱۱ احمد ۶: ۲۴۱، ۲۶۶۔

Presented by Ziaraat.Com

اس کی مثالیں جابجا ملتی ہیں۔ ان میں سے بعض تو ملامت آمیز ہیں اور بعض کچھ خفیف ہیں۔ مگر بہرصورت اپنے رسولؐ پر عنایت و توجہ اور ندگی اپنے کمال اور عروج پر ہے۔

جنگِ تبوک کے لیے عام بسیج کا حکم دیا جا چکا تھا۔ گرمی سخت پڑ رہی تھی۔ علاقائی پیداوار تین سال کی قحط زدگی کی کیفیت کے بعد نخلستان پھلوں سے لد گئے تھے۔ گھر اور شہر سے دوری دنیادار افراد کے لیے گراں گذر رہی تھی۔ ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی بہانے سے جنگ میں شرکت سے معذرت کر رہا تھا کہ شہر تنہا نہ رہ جائے اور تبوک کا سفر اختیار نہ کرنا پڑے۔ آپ نے شرمِ حضوری اور نرم طبیعت کی وجہ سے اجازت دے دی یہاں تک کہ قرآن کا سخت عتاب بھی کا آغاز لطیف اور ہمدردانہ تھا۔

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ (۹ : ۴۳)

خدا تم سے درگذر کرے۔ تم نے ان کو کیوں اجازت دے دی (اور انتظار نہ کیا) یہاں تک کہ جن لوگوں نے سچ کہا تھا وہ تم پر ظاہر ہو جاتے۔ اور تم جھوٹوں کو بھی جان لیتے۔

کیا اچھا نہ ہوتا کہ جہاد سے باز رہنے کی اجازت دینے سے پہلے ان کو آزما لیا جاتا؟ اس خطاب میں آغاز جو شفقت اور لطف سے کیا گیا ہے ویسا ہی ایک دوسرے موقع پر بھی نرمی اور ملامت کا انداز نظر آتا ہے۔ وہ عبداللہ بن ابی بن سلول سے متعلق واقعہ ہے۔ یہ شخص ساری عمر اسلام سے دشمنی اور عناد کرتا رہا اور مکہ میں جس طرح ابوجہل تھا مدینے میں یہ منافقین در منافقین کا سرغنہ تھا۔ اسلام کو نقصان پہنچانے کے لیے کسی حیلے فریب سے باز نہیں آتا تھا۔ ساری زندگی دنیا سمیٹنے اور اسلام کی بربادی کی سعی میں گذار دی۔ اس کا لڑکا بیشک پاک طینت اور مومن تھا۔ یہ شخص ۹ ہجری میں مر گیا۔ اس کے بیٹے نے پیغمبرؐ سے درخواست کی کہ اپنے جسم کا لباس عطا فرمائیں تا کہ اس سے اپنے باپ کو کفن دے۔ یہ بھی درخواست کی کہ آپ اس کی نماز جنازہ پڑھائیں اور اس کے لیے مغفرت کی دعا کریں۔ پیغمبرؐ نے اس کی درخواست صدق و صفا کی بنا پر قبول کر لی۔ اور اس کے لیے طلبِ رحمت کی تو ہلکا اور خفیف عتاب آ گیا!

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ (۹ : ۸۴)

(اے رسولؐ) ان میں سے کوئی مر جائے تو تم اس پر کبھی بھی نماز (جنازہ) نہ پڑھو، نہ اس کی قبر پر کھڑے ہو۔

ہاں عتاب ہمیشہ ایسا خفیف نہ ہوتا کبھی اس میں ایسی شدت ہوتی کہ آدمی لرزہ براندام ہو جاتا۔

ایک مثال عبداللہ بن ام مکتوم کے واقعے کی ہے۔ یہ ایک نابینا اور غریب آدمی تھے۔ ایک مرتبہ لاٹھی ٹیکتے مسجد میں پہنچے اور حسبِ عادت تیز آواز میں مخاطب ہوئے کہ اے پیغمبرؐ جو کچھ (اس وقت) وحی ہوتا ہے مجھے بھی سنائیے۔ جواب نہیں سنا تو یہ نہ جانتے ہوئے کہ پیغمبرؐ اس وقت قریش کے چند اکابرین کے ساتھ گفتگو میں مشغول ہیں (جیسے عتبہ بن ربیعہ، عمرو بن ہشام، عباس بن عبدالمطلب، امیہ اور ابی خلف کے بیٹے) اور آپس میں کچھ رازدارانہ باتیں ہو رہی ہیں، ابن ام مکتوم کی دوبارہ آواز بلند ہوئی اے محمدؐ! جو خدا نے آپ کو سکھایا ہے وہ مجھے بھی سکھائیں۔ اس نابینا شخص کا یہ تیور پیغمبرؐ کو گراں گذری اور برا لگا کہ یہ اس بات کا کیا موقع ہے۔ اسی وقت وحی نازل ہوئی۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى . وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى
اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى . فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ، وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى . وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى . وَهُوَ يَخْشٰى
فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى . كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ . (۸۰ : ۱ – ۱۲)

Presented by Ziaraat.Com

اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا کہ اس کے پاس نابینا آیا۔ تم کو کیا معلوم کہ شاید وہ پاکیزہ ہو جاتا یا نصیحت حاصل کرے جو اس کو فائدہ دے۔ سو وہ جس نے بے پروائی کی اس کے تم درپے رہتے ہو۔ حالانکہ تم پر کوئی الزام نہیں کہ وہ پاکیزہ کیوں نہیں ہوتا۔ رہا وہ جو تمہاری طرف دوڑتا ہوا آیا ہے اور وہ ڈرتا (بھی) ہے تم اس سے تغافل کرتے ہو۔ ایسا ہرگز نہ کرنا چاہیئے یہ ایک نصیحت ہے جو کوئی چاہے اس کو قبول کرے۔

ممکن ہے اس سے مراد پیغمبر نہیں کسی اور کی طرف ہو۔ بہر صورت خطاب[۱] اس واقعہ کی وجہ سے کیا ہے۔ بلاواسطہ خطاب نہیں ہے۔ عَبَسَ وَتَوَلّٰی تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا۔ پیغمبر پر عنایت اور توجہ کا یہ عالم ہے کہ خطاب کے باوجود آپ کی حرمت عنایات کے اوج میں محفوظ ہے۔

یہ شدید عتاب کبھی کل صحابہ اور پیغمبر کو متوجہ کرتا ہے۔ جیسے سورۂ انفال میں آیات غزوہ۔ صحابہ کا اصرار تھا کہ بدر کے قیدیوں سے فدیے کر ان کو چھوڑ دیا جائے اور وہ جہاں چاہیں جائیں۔ وہ دین کی نصرت پر وقتی فائدے کو ترجیح دے رہے تھے[۲]۔ یہ عتاب کلی ہے اور نہ صرف اس وقت مدینے میں بلکہ یہ آیت سارے انبیاء کے لئے بھی قیدی بنانے کی نفی کرتی ہے۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ ۚ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ (۸: ۶۷)

نبی کی شان کے لائق نہیں کہ ان کے قیدی باقی رہیں (بلکہ قتل کر دیئے جائیں) جب تک کہ روئے زمین میں اچھی طرح (کفار کی) خونریزی نہ کر لیں۔ تم تو دنیا کا مال اسباب چاہتے ہو اور اللہ تعالیٰ آخرت (کی مصلحت) کو چاہتا ہے۔

اس کے بعد کلام اور شدید ہو جاتا ہے اور انذار، ڈرانے اور وعید کی باتیں ہونے لگتی ہیں (۱۷: ۷۴-۷۵) یہاں تک کہ فرماتا ہے،

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۔ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۔ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۔ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِيْنَ ۔ (۶۹: ۴۴-۴۷)

اگر یہ (پیغمبر) ہمارے ذمے کچھ (جھوٹی) باتیں لگا دیتے تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑتے پھر ہم ان کی رگ دل کاٹ ڈالتے پھر تم میں کوئی ان کا اس سزا سے بچانے والا بھی نہ ہوتا۔

اس سے زیادہ محمد کی صداقت اور سچائی اور وحی الٰہی پر ان کے ایمان کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اتنے زیادہ شواہد ہیں جو جمع کیے جائیں تو ایک کتاب مرتب ہو جائے۔ یہاں چند مثالیں پیش کی جا رہی ہیں۔

ایسے بہت سے خطاب ہیں جن میں پیغمبر کی دلجوئی ہوتی ہے، ابلاغ رسالت پر حوصلہ افزائی کی جاتی ہے، سستی اور کاہلی سے خبردار کیا جاتا ہے اور مستضعفین کے ایمان لانے کی ترغیب دی جاتی ہے اور مستکبروں سے درگذر کرنے کی تاکید کی جاتی ہے۔

---

[۱] تفسیر صافی ۲: ۷۸۴ بحوالہ تفسیر مجمع البیان امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ یہ آیت بنی امیہ کے ایک شخص کے بارے میں نازل ہوئی جو آنحضرت کی خدمت میں موجود تھا کہ عبداللہ ابن مکتوم (جو آنحضرت کے مخلص تھے اور نابینا تھے) آگئے۔ پس جب اس شخص نے ان کو دیکھا کہ آنحضرت نے ان کی قدر و منزلت کی ہے تو اس نے اپنے آپ کو سمیٹا اور تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ واقعہ کا بیان فرمایا اور اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ (مترجم)

[۲] بدر کے قیدیوں کے بارے میں مزید دیکھیں: احمد ۱: ۳۸۳ و ۲۴۳ و ۲: ۲۴۳ و مغازی واقدی ۱: ۹۸ ۔

Presented by Ziaraat.Com

• آپ ہرگز ان چیزوں کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھیے جن سے ہم نے کفار کے مختلف گروہوں کو ان کی آزمائش کے لیے متمتع کر رکھا ہے کہ وہ (محض) دنیوی زندگی کی رونق ہے اور آپ کے رب کا عطیہ بدرجہا بہتر اور دیرپا ہے۔ ۲۰:۱۳۱

سورۂ حجر آیت ۸۸ میں اسی بات کو دوہرایا گیا:

• آپ اپنی آنکھ اٹھا کر بھی اس چیز کو نہ دیکھیے جو ہم نے مختلف قسم کے کافروں کو برتنے کے لیے دے رکھی ہے اور ان پر غم نہ کیجیے۔ مسلمانوں پر شفقت کیجیے۔

معاشرے کے کم مایہ افراد جن کو دنیا حقارت سے دیکھتی ہے وہ بھی تبلیغ میں توجہ کے برابر کے مستحق ہیں۔ اس سلسلے میں بھی خطاب ہوتا ہے۔

مشرکین کہتے ہیں کہ آپ اپنے قریب سے ان غریب اور نادار لوگوں کو ہٹائیں پھر ہم آپ کے پاس آئیں گے۔ یعنی غرباء کے ایمان لانے کے لیے غریب اور مخلص مومنین کو دور ہو جانا چاہیے۔ خطاب آیا:

• ان لوگوں کو نہ نکالیے جو صبح و شام اپنے پروردگار کی عبادت کرتے ہیں کہ جس سے خاص اس کی رضا منظور ہوتی ہے۔ ان کا حساب ذرا بھی آپ سے متعلق نہیں۔ اور آپ کا حساب ذرا بھی ان سے متعلق نہیں کہ آپ ان کو نکال دیں ورنہ آپ ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔ (۶:۵۲)

اور پھر فرمایا:

• آپ ان ہی لوگوں کے ساتھ رہا کیجیے جو صبح و شام اپنے رب کی عبادت محض اس کی رضا حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ دنیوی زندگانی کی رونق کے خیال سے آپ کی آنکھیں (یعنی توجہ) ان سے ہٹنے نہ پائیں۔ ایسے شخص کا کہنا نہ مانیے جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے۔ اور وہ اپنی نفسانی خواہش پر چلتا ہے اور اس کا (یہ) حال حد سے گزر گیا ہے۔ آپ کہہ دیں کہ (یہ دین) حق تمہارے رب کی طرف سے (آیا) ہے۔ جس کا جی چاہے ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کافر رہے۔ بیشک ہم نے ایسے ظالموں کے لیے آگ تیار کر رکھی ہے۔ (۱۸:۲۸و۲۹)

یہ سارے خطاب، یہ ساری تحریص و تحذیر، یہ ساری حوصلہ افزائی اور ولدہی، یہ سب تاکید اور تنبیہ کسی کی خواہش اور فرمائش پر نہ ملیں، سب کی سب نزولِ وحی کے بارے میں محمدؐ کی صداقت اور سچائی کی نشاندہی کرتی ہیں۔

اگر ان صفات میں محمدؐ ہوتے تو ان ساری آسمانی آیات کو جو انسانی فکر سے کہیں بلند ہیں لکھا کر دیا جاتا۔ خصوصاً اس مخلوق کے سے جو صحرا کے بیچ سے اٹھا اور پھر زمانے کے لیے انسانیت کی اصلاح کی صدا بلند کر گیا۔

موہوم معلم

کیسی عجیب و غریب بات ہے کہ اس طرح کی واضح اور روشن دلیل و برہان کے باوجود لوگ شک و شبہ کرتے ہیں اور بحثیں نکالتے ہیں جبکہ تاریخ ہم کو بتاتی ہے۔ یہ کوئی نئی بات تو نہیں کہ اسلام یہود و نصاریٰ کے ہی راستے کو محفوظ کرنے آیا تھا اور اسی راہ کو آگے بڑھایا گیا ہے اسلام ان کے دین (دینِ حنیف) کی تصدیق کرتا ہے۔ مگر وہ جھگڑا ہوا اور مسخ شدہ نہیں کہ جس کو خود شارع دیکھتا تو پہچان نہ پاتا۔ بلکہ وہ حقیقی

اور اصل وجہ یہ ہے جو آسمان سے نازل ہوا ہے۔

وحی نازل ہونے کے پہلے دن سے بعض لوگ مسلسل اس بات کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ پیغمبرؐ کی تعلیم اور معلومات کا مصنوعی منبع اور سرچشمہ تلاش کیا جائے۔ ان میں سے ایک نضر بن حارث تھا جو اتفاق سے رسول اللہؐ کا خالہ زاد بھائی بھی تھا۔ یہ شخص ایران اور اس کے قریب حیرہ[۱] (موجودہ عراق) وغیرہ کا سفر کر چکا تھا۔ ایرانیوں کی کتابوں سے بھی واقف تھا اور ان کے بادشاہوں کے قصے جانتا تھا۔ یہ ان لوگوں میں تھا جو چند افسانوں اور دیو مالا سے واقفیت اپنے لیے باعث افتخار سمجھتے اور ان کے ذریعے دوسروں پر اپنی علمیت کا رعب جماتے۔ یہ شخص آنحضرتؐ کی دعوت و تبلیغ کو اپنی علمی دکان اور اپنی خواہشات نفسانی سے سازگار نہیں پاتا تھا۔

مکہ میں جب بھی رسول اللہؐ لوگوں کے مجمع میں ان کو خداوند تعالیٰ، حساب کتاب اور قیامت کی باتیں بتاتے تو آپؐ کے بعد یہ نضر بن حارث لوگوں کو اپنے چاروں طرف جمع کر کے جو کچھ داستانیں اس نے یاد رکھی تھیں وہ ان کو سناتا۔ بادشاہوں کے قصے، رستم اور اسفندیار کی داستانیں اور ان دیو اور ہفت خوان، غرض طرح طرح کے خیالی اور فرضی قصے سنا کر لوگوں کو ہنساتا اور ثابت کرتا کہ میں زیادہ دلفریب داستانیں سناتا ہوں اور محمدؐ بھی میری ہی طرح اساطیر الاولین سنایا کرتے ہیں۔

یَقُوْلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ (۶ : ۲۵)

یہ لوگ جو کافر ہیں یوں کہتے ہیں کہ یہ تو کچھ بھی نہیں صرف بے سند باتیں ہیں جو پہلوں سے چلی آ رہی ہیں۔

نضر کی کوشش تھی کہ لوگوں کو آنحضرتؐ کے پاس سے بھگا دے کہ لوگ آپؐ کی طرف نہ جایا کریں۔ مگر یہ شخص بہت بدنصیب تھا اور پیغمبرؐ کا اقبال روز بروز بلند ہو رہا تھا۔ زیادہ سے زیادہ لوگ آپؐ کے قریب آ رہے تھے۔ چنانچہ اس شخص نے کوئی دوسرا راستہ تلاش کرنا چاہا۔ مکے میں کوئی شخص اس کے دوستوں میں ایسا باقی نہ رہا جس سے اس نے مدد نہ مانگی ہو تو وہ ایک دوست کو لے کر مدینہ روانہ ہوا۔ وہاں جا کر مشہور و معروف یہودی دانشوروں سے ایسی باتیں معلوم کیں جن کا جواب ان کی دانست میں پیغمبرؐ نہیں دے سکیں گے اور اس طرح سے آپؐ کی کم علمی (معاذ اللہ) لوگوں پر ظاہر ہو جائے گی۔ پچھلے صفحات (نزول وحی کے باب) میں یہودیوں کے بتائے ہوئے تین سوالوں کے جواب کا تذکرہ ہم پڑھ چکے ہیں۔ جب یہ طریقہ بھی کارگر نہ ہوا تو ایک دوسری تدبیر اختیار کی یعنی افواہیں پھیلانا شروع کیں تاکہ لوگوں کی نظروں سے اسلام کی اہمیت کو گھٹا دیں بلکہ اس سے متنفر کر دیں۔ یہ قسم قسم کی افواہیں تھیں۔ کبھی کہا جاتا یہ سب جادوگری ہے، شاعری ہے۔ کبھی کہا جاتا یہ شخص ایک کاہن ہے۔ ایک نیا سلسلہ یہ شروع کیا گیا کہ روزانہ کسی نہ کسی کو پیغمبرؐ کا معلم بتایا جاتا۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ِۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَیْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ (۲۵:۴)

کافر لوگ (یعنی مشرکین قرآن کے بارے میں) یوں کہتے ہیں کہ یہ تو کچھ بھی نہیں، نرا جھوٹ ہے جس کو ایک شخص (یعنی پیغمبرؐ) نے گھڑ لیا ہے اور دوسرے لوگوں نے اس میں اس کی مدد کی ہے۔

اگر راستہ چلتے کسی لوہار کے کام کی طرف پیغمبرؐ متوجہ ہوتے یا کسی گلی یا کسی محلے میں کوئی شخص آپؐ کو مل جاتا جس سے آپؐ گفتگو فرماتے اور اس شخص میں علمیت کا ذرا سا شبہ بھی ہوتا تو دوسرے دن یہ بات پھیلا دی جاتی کہ فلاں فلاں شخص آپؐ کی (آیات گھڑنے میں)

---

[۱] یہ شہر [illegible] کوفہ کے قریب [illegible] (مترجم)

مدد کرتے ہیں یا آپ کو سکھاتے ہیں۔

روایات تراشنے والوں نے بھی ان کاہنوں کے گنوانے میں مقاصد نظر میں رکھے ہیں۔ وہ لوگ ان بے سروپا باتوں اور تہمتوں کو اہلِ کتاب اور یہود و نصاریٰ کی بدولت قرآن میں جگہ دی ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج بھی ایسے حقیقی اور جعلی نام ہیں جو زبانوں پر جاری ہیں۔ خاص بات یہ کہ ان میں سب لوگ رومی اور عجمی قسم کے ہیں۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّهُمْ يَقُولُونَ إِنَّمَا يُعَلِّمُهُ بَشَرٌ ۗ لِّسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ أَعْجَمِيٌّ وَهَٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ (۱۶: ۱۰۳)

ہم کو معلوم ہے کہ یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کو تو آدمی سکھا جاتا ہے۔ جس شخص کی طرف اس کی نسبت کرتے ہیں اس کی زبان تو عجمی ہے اور یہ قرآن صاف عربی زبان میں ہے۔

تفاسیر پر ایک نگاہ ڈالی جائے تو بہت سے نام سامنے آتے ہیں:[۲]

بلعام او یار جو عیسائی تھا اور اس کی زبان عربی نہیں تھی۔ ولید مغیرہ کا غلام نفیس یا ابو فکیہ جو پڑھنا جانتا تھا، حویطب کا غلام عائش، علاء حضرمی کا غلام یسار اور عامر حضرمی کا غلام جبیر (جبر، خیر اور جبار بھی اس کو کہا گیا ہے)۔ بعضوں نے ان دونوں کو اہلِ عین التمر شمشیر بنانے والے کہا ہے جو کتاب پڑھ سکتے تھے۔ ابو میسرہ عیسائی غلام جس کی زبان رومی تھی، عبید بن النضر کا ابن، بلعاس اور شماس رومی، مجاہد قبطی، صہیب اور حویطب بن عبدالعزیٰ کا غلام عداس وغیرہ۔

یہاں تک کہ سلمان فارسی کو پیغمبر کا معلم کہا گیا ہے جب کہ وہ مدینہ میں اسلام لائے تھے! اس کو صحیح ثابت کرنے کے لیے دو سلمان گھڑ لئے گئے ہیں۔ ایک سلمان جہنی اصفہانی اور دوسرے سلمان قرظی اصفہانی۔[۳]

عداس بھی کئی ایک ہیں۔ ایک عداس، حویطب کا غلام ہے۔ دوسرا وہ عداس ہے جو عتبہ اور شیبہ کا غلام تھا اور طائف کے سفر میں ثقیف کے قریب اس نے آپ سے بات کی تھی[۴] یا پھر وہ عداس تھا جس نے ورقہ بن نوفل کے بجائے حضرت خدیجہ سے سب سے پہلی وحی کے بعد اس کے بارے میں گفتگو کی تھی۔

ایک ورقہ بن نوفل ہیں جنہوں نے ساری عمر میں چند بار رسول اللہ سے ملاقات کی ہے اور خانۂ خدا میں سب کے سامنے بات چیت کی ہے۔ یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ انہوں نے وہ کتاب "جو عبری میں تھی" اس کو عربی زبان میں منتقل کیا اور ان چند لمحوں میں انہوں نے پیغمبر کو سارے علوم سکھا دیے!! اس سے زیادہ مہمل بات اور کوئی ہو سکتی ہے؟

ان سب میں زیادہ مشہور راہب بحیرا نصرانی کا ہے جو صدیوں تک چھایا رہا ہے۔ یہ شخص ان تمام گمنام اور موہوم استادوں میں سب سے مستند

۲ے مثلاً تفسیر آیہ ۲۵: ۱۰۳: ۱۰۳ ملاحظہ کریں: طبری ۱۴: ۱۱۹، ۱۲۰ - ۱۸۰: ۱۳۷ روح المعانی ۱۴: ۲۱۲، ۲۱۸، ۲۳۳، مجمع البیان ۶: ۳۸۶، ۱۹۱۱، ابن جوزی ۴: ۴۹۱، ۳۸۲، بیضاوی ۲: ۳۸۲، کشاف ۲: ۱۵۵، فتح القدیر ۳: ۱۹۱ ابن ہشام ۱: ۳۹۳، ۲۰۵ - ۲۱۰، ۲۱۳، اسد الغابہ وغیرہ جنیوں کے بہت سے نام اس کتاب میں ہیں۔

۳ے سلمان پاک از لوئی ماسینیوں ترجمہ ڈاکٹر شوقی ۸۲۔ تحقیقات فلسفی عبدالہادی ص ۹ MASSIGNON, LOUIS: SALMAN PAK ET. P. 8.

۴ے ابن ہشام ۲: ۳۰، اسد الغابہ ۳: ۲۸۹، اصابہ ۲: ۴۵۹، ترجمہ ۵۴۷۰۔

Presented by Ziaraat.Com

کی جاتی ہے اس لیے اس کے بارے میں ذرا تفصیل سے گفتگو کی جائے گی۔

اس راہب کی داستان اس زمانے سے متعلق ہے جب محمد ۱۲ سال کی عمر کے تھے۔ تقریباً قریش کے گرمیوں کے ایک تجارتی سفر میں آپ بھی اپنے چچا حضرت ابوطالب کے قافلے کے ہمراہ تھے یہ کاروان تجارتی تھا جو شام جا رہا تھا۔ جب یہ کاروان بصریٰ یا اس کے قریب پہنچا تو ایک راہب نے جو وہاں اپنی خانقاہ میں رہا کرتا تھا، غور کیا کہ ابر کا ایک ٹکڑا ہمیشہ اس کاروان کے کسی ایک فرد پر سایہ کیے ہوئے ہے یا درخت کی شاخ اس پر اپنا سایہ ڈالتی ہے۔ اس عیسائی راہب نے جس کا نام بحیرا تھا سب کاروان والوں کو دعوت دی کہ اس کے مہمان ہوں۔ سب لوگ اس کے یہاں گئے مگر محمد جو بہت ہی کم عمر تھے ان کو وہیں چھوڑ گئے۔ بحیرا نے اپنے مہمانوں میں اس چہرے کو تلاش کیا جو اس نے اپنی کتابوں میں آخری پیغمبر کے طور پر پڑھا تھا اور جن کا حلیہ وہاں درج تھا۔ جب وہ چہرہ اس کو نہیں ملا تو اس نے دریافت کیا کہ کیا کاروان کے سب لوگ آگئے ہیں۔ جب پتہ چلا کہ ایک بچہ نہیں آیا ہے تو اس نے اصرار کیا کہ ان کو بھی بلایا جائے۔ جب یہ داخل ہوئے تو وہ راہب دیر تک آپ کو دیکھتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ عرب ہمیشہ لات اور عزّیٰ (بتوں) کی قسم کھاتے ہیں تو وہ جب محمد سے مخاطب ہوا تو کہنے لگا کہ تم کو لات اور عزّیٰ کی قسم کہ جو میں پوچھوں اس کا تم صحیح جواب دینا۔ آپ نے جواب دیا کہ میں کسی بھی صورت میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ دوسری بات یہ کہ مجھے بتوں کی پرستش سے نفرت ہے۔ اس دفعہ راہب نے آپ کو قسم دی کہ اس کی باتوں کا جواب دیں۔ چنانچہ ان کے احوال پوچھے، ان کے خواب اور ان کے روزمرہ کے بارے میں دریافت کیا۔ آپ کی طرف سے ان باتوں کے جواب پانے کے بعد اس کو مہرِ نبوت کی جستجو ہوئی۔ چنانچہ نقشِ نبوت دیکھ کر اس نے اس کو اپنے ہاتھ سے مس کیا۔

بحار الانوار ۱۵: ۱۶۸، ۱: ۳، الکامل ۲: ۶۰، ... سوری ۱۴۶، حلبیہ ۱: ۱۴۴، البحر ...

بصریٰ شہر کا حوران ہے ... ربیع الاول سال ۱۳ ہجری پہلا شہر تھا کہ شام میں ... کے جس کے فتح ... فتوح البلدان ۱۹۱ ... (۱۲۹)

منابع برای مطالعہ ... ابن ہشام ۱۵، ... سیرۃ حلبیہ ... تاریخ ... ۲۸۷، ... فہرست ابن الندیم ۲۳، ... مفصل تاریخ العرب قبل الاسلام ۶: ۳۱۲، محمد (ص) محمد رضا ۳۲ - ۳۵، ... زندگانی محمد (ص) ہیکل ۱۹۵۱، مروج الذہب ۲۱۴، ... ۳۴۱ و ۳۵۰، سیرۃ ابن کثیر ۱: ۲۰۱، ... میزان الاعتدال ۱۱۸، لسان المیزان ۲: ۳۹، دلائل النبوۃ ابو نعیم ۱۳۵، ... دلائل النبوۃ بیہقی ۱: ۳۱۱، مجلہ فرہنگ ایران زمین، سال اول ص ۱۲۸، ... ص ۳۶ ... ۲۲۴، دائرۃ المعارف اسلام ... مقالہ بحیرا ... (ZDMO) ۱۲: ۶۹۹ -

اسماعیلیہ معتقد ہیں کہ بحیرا (ع) ناطق ... جو حضرت موسیٰ کے زمانے میں تھے بحیرا راہب کے توسط سے ناطق ششم (پیامبر گرامی) کو دیے گئے۔ اساس التاویل نعمان ... طبع عارف تامر ص ۳۱۴ ج ۲ اور ۳۲۵ -

مہرِ نبوت کی شکل اور حلیہ کے بارے میں ... رسالہ مہر نبوت حضرت خاتم الانبیاء ... ڈاکٹر ... نفیسی ... دانشکدہ الہیات مشہد ۱۵ : ۲۱ - ایضاً ... ۹۱۲ -

Presented by Ziaraat.Com

آپؐ کے حالات اور اس مہرِ نبوت نے بحیرا کو قائل کر دیا کہ یہ وہی موعود ہے چنانچہ اس نے حضرت ابوطالبؑ کو خبردار کیا کہ یہودیوں کے مقابلے میں اس بچے کی حمایت اور حفاظت کرنا اور اس وقت کہ شام کی طرف جا رہے ہیں ان کو آگے روم جانے سے منع کیا کہ کہیں رومی اس بچے کے وجود سے آگاہ نہ ہو جائیں کیونکہ یہودیوں اور رومیوں (عیسائیوں) دونوں نے اپنی کتابوں میں آخری پیغمبر کے ظہور کے بارے میں پڑھا ہوا ہے۔ اور اس کا ڈر ہے کہ کہیں یہ لوگ اس بچے کی جان کے درپے نہ ہو جائیں۔

یہ قدیم ترین اسناد سے روایت تھی جس کو ابن اسحاق (م ۱۵۰ھ) نے نقل کیا ہے مگر ایک علیحدہ روایت ابو موسیٰ اشعری سے بھی ہے کہ اتفاقاً ان دونوں راویوں پر علمائے اسلام میں ہمیشہ بحث ہوتی رہی ہے۔ کیونکہ اس روایت کے آخر میں آیا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور ان کا غلام بلال بھی وہاں موجود تھے۔ اور حضرت ابوبکرؓ نے بلال کو رسول اللہ کی خدمت کے لیے مامور کیا۔ ترمذی نے اس حدیث کو حسن، شمار کیا اور نقل کیا ہے[۹] حاکم اس کو صحیح کہتا ہے۔ بیہقی، ابونعیم، خرائطی، ابن عساکر اور ابن ابی شیبہ نے اس کو نقل کیا ہے بیہقی اس قصے کو اہل مغازی میں مشہور جانتا ہے۔ جزری اس میں صرف حضرت ابوبکرؓ اور بلالؓ کے ذکر کو غیر محفوظ سمجھتا ہے مگر اس کی اسناد کو صحیح سمجھتا ہے۔ ذہبی بھی اس دلیل سے حدیث کو ضعیف کہتا ہے۔ ابن حجر کہتا ہے کہ رجال حدیث ثقہ ہیں۔ مگر ابن کثیر اس حدیث کو مرسل سمجھتا ہے۔

اس علمی بحث کی وجہ کیا ہے؟ بات یہ ہے کہ ابو موسیٰ اشعری اس کا راوی ہے جو خود سنہ ۸ھ میں اس واقعے کے تقریباً ۵۰ سال بعد اسلام لایا، اور یہ نہیں بتایا کہ یہ بات اس نے کس سے سنی ہے۔ علاوہ ازیں جب آنحضرتؐ بارہ سال کے تھے تو اس وقت حضرت ابوبکرؓ بھی آٹھ یا نو سال کے لڑکے ہوں گے، کیونکہ وہ پیغمبرؐ سے دو تین سال عمر میں کم تھے اور بلال اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ اس واقعے کو تیس برس سے زیادہ عرصہ گذر چکا تھا جب حضرت ابوبکرؓ نے بلال کو بنی خلف سے خریدا اور اسلام کی وجہ سے مشرکوں کے ہاتھوں جن مصیبتوں میں گرفتار تھے انہوں نے ان سے رہائی پائی اور غلامی سے بھی آزاد ہو گئے تھے[۱۰]

یہ واقعہ ایک دوسرے طریقے سے بھی بیان کیا گیا ہے۔ تقریباً بارہ سال بعد (۵۹۵ء) محمدؐ حضرت خدیجہؓ کی طرف سے ان کے غلام میسرہ کے ساتھ شام کے تجارتی سفر پر تھے۔ اسی شہر بصریٰ میں ایک پادری نسطوری (یا نسطور) سے ملاقات ہوئی۔ یہ پادری بعض علامات کو دیکھ کر مستقبل کے پیغمبر کو پہچان گیا[۱۱] اسی طرح اسی زمانے میں کچھ لوگ (۷، ۸ یا ۹ افراد) روم سے پیغمبر موعود کی جستجو میں بحیرا کے پاس آئے۔ اس نے ان کو واپس کر دیا[۱۲] طلحہ بن عبیداللہ بھی گواہی دیتا ہے کہ چند سال بعد بصریٰ کے راہب نے پیغمبر موعود کے ظہور کے بارے میں استفسار کیا تھا[۱۳]

---

[۹] ترمذی ۴، ۳۱۴ (مناقب ۴)

[۱۰] عیون الاثر ۱: ۴۳، ابن سعد ۱/۱/۱۲۵، ابن ہشام ۲۰۵، ۴۴۹ گوتنگن۔ یا ۱: ۲۳۹، ۲۴۰ [illegible] ۔

[۱۱] ابن ہشام ۱: ۱۹۹۔

[۱۲] خصائص سیوطی ۱: ۸۴، حلبیہ ۱: ۱۴۲، البدایہ ۲: ۲۸۵، تلخیص ابن الاثیر ۱: ۳۵، ابن ہشام ۱: ۱۹۶۔

[۱۳] ابن سعد ۱/۱/۱۰۳ ... ۲: ۲۶۲۔

Presented by Ziaraat.Com

مختلف اسلامی بعض غالباً عیسائی) منابع میں بحیرا کو لقب کہا گیا ہے (آرامی زبان میں BEHIRA کے معنی منتخب شدہ کے ہیں اور سریانی زبان میں بحیرا یا بحرا کا مطلب آگاہ آدمی کو کہتے ہیں) اس کا اصل نام مسعودی کے قول کے مطابق سرجیوس (SERGIUS) اور علی کے مطابق (GEORGIUS) تھا۔ دوسروں نے جرجیس، بحرجس اور کنیت ابو عداس اور باپ کی کنیت البر دیعہ بیان کی ہے[۱۴]۔

وہ عبد القیس کا عیسائی راہب تھا یا تیما کے یہودیوں کے احبار میں سے ایک حبر تھا جس کو روایت کرنے والوں نے اچھے اور نیک لوگوں میں شمار کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ بعثت سے پہلے حلال اس نے بچے کا انداز دیتا تھا کہ اس زمانے میں تین بہترین اشخاص ہیں: رئاب الشنی، بحیرا راہب اور وہ جو ابھی نہیں آیا یعنی منتظر یعنی پیغمبر[۱۵] اس صورت سے وہ نسطوری راہب تھا جو ارویس کے مذہب پر تھا اور جو الوہیت مسیح کے منکر تھے، حضرت مریم کو حضرت عیسیٰ کی ماں یا صرف ماں مانتے تھے اور حضرت عیسیٰ کو خدا نہیں۔ کلمہ مظہر جانتے تھے۔ کہتے ہیں کہ اس کے شاگرد تھے جن میں سے ایک کا نام "مذہب" تھا اور دوسرے خود مسلمان فارسی تھے[۱۶] یہ شخص بعض یہودی شر پسندوں کی سازش کے نتیجے میں قتل ہوا[۱۷]۔

سرجیوس کے نام سے اس بحیرا کا چہرہ مشرقی روم کی کتابوں میں بھی ملتا ہے اور اتفاقاً اس چہرے کا رنگ روپ بعض ضعیف احادیث اسلامی سے بھی مشابہت رکھتا ہے۔ مثلاً بازنطینی مورخ تیوفنس THEOPHANES (۷۵۲-۸۱۷ یا ۸۱۸ء) جو آرتھوڈوکس چرچ سے تعلق رکھتا ہے اپنی تاریخ عمومی کے جداول تاریخ میں (جو ایران، روم اور عرب کے بارے میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے) لکھتا ہے جبرئیل کے پہلی بار ظہور کے بعد حضرت خدیجہ نے بہت بیمانی کیفیت میں ایک راہب گوشہ نشین بنام سرجیوس سے رجوع کیا۔ اس نے حضرت خدیجہ کو تسلی و تشفی دی[۲۰]۔ یہاں ایک ضعیف حدیث سے فائدہ اٹھایا گیا ہے اور ورقہ اور بحیرا کے متعلق قصوں کو خلط ملط کر کے مشتبہ کر دیا گیا ہے۔ اس کا ذکر آگے بھی آئے گا کیونکہ بات یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ یہ سلسلہ کافی دراز ہے۔ عیسائی مصنف اسلام پر حملے کرنے کے لیے کبھی جعل اور

۱۴۔ مروج، ۱۴۶:۱ - سیرۃ حلبیہ ۱۵۷:۱ -

۱۵۔ یہ نام اس زمانے میں عام تھا۔ چنانچہ چار صحابہ کا یہی نام تھا جن میں سے دو زیادہ مشہور ہیں۔ بحیر بن ضبعا و بحیرا لانماری (تاج العروس ۲: ۲۹) ابن الاثیر بھی شام کے ایک اسی نام کے آدمی کا ذکر کرتا ہے جو عادت دوسرے آٹھ آدمیوں کے ساتھ رسول اللہ کے پاس آیا تھا۔ وہ وضاحت بھی کرتا ہے کہ یہ بحیرا راہب سے مختلف آدمی ہے۔

۱۶۔ روض ۲: ۲۲۰، ابن کثیر سیرۃ ۱: ۲۴۹ میں سیرۃ زہری سے نقل کر کے اس کو رد کرتا ہے۔

۱۷۔ ترجمہ مروج ۱: ۶۱، معارف ابن قتیبہ ۵۸۔

۱۸۔ میزان الاعتدال ۲: ۱۵۳، لسان المیزان ۳: ۳۹۔

۱۹۔ مسند۔ محمد رشید رضا ۹۸۔

۲۰۔
20: THEOPHANES; CHRONOGRAPHIA; P. 333, ED. CLASSEN, 1, 513.

ونسنک منضمرہ دائرۃ المعارف اسلام میں مقالہ بحیرا میں اس پر اضافہ کرتا ہے۔
GEORGIUS PHRANTZES (ED. BEKKER, P. 295 SQ.) GOTTHEIL, A. CHRISTIAN BAHIRA LEGEND, IN ZA, VOL. XIII, SQ.

Presented by Ziaraat.Com

تہمت سے نہیں بچ سکتے۔ یہ ایک جعلی رسالہ جو یقیناً گیارہویں صدی عیسوی میں لکھا گیا اور چند عربی اور سریانی روایات میں اب بھی موجود ہے[۱۲۱] "بحیرا کے مکاشفہ" کا ذکر کرتا ہے۔ اس کتاب کی یشوع یابہ (ISHO'YABH) سے نسبت دی گئی ہے۔ بظاہر اس نام کے دو آدمی مشہور ہیں۔ ایک ان دونوں کا اسقف تھا جس نے رومیوں کے سامنے ہرقل جو بین کے مقابلے میں خسرو پرویز کی طرفداری کی تھی اور ہرمز چہارم نے اس کو جاثلیق (CATHOLICOS) منتخب کیا یعنی اس کو نسطوریان کا بطریق بنا دیا گیا۔ اس نے ایرانیوں کی بہت خدمت کی۔ دوسرا جس کی طرف اس رسالے کی نسبت دی جاتی ہے وہ یہی شخص ہے جس نے ۶۲۳ء میں تاریخ شہادت "مقتل" یشوع سبران (ISHO SABHRAN) سے لکھی تھی۔

یہ رسالہ "بحیرا کا مکاشفہ" یقیناً گیارہویں یا بارہویں صدی میں بعض روایات اسلامی کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے مگر صدیوں پہلے مصنف کی نسبت دی گئی ہے۔ اس رسالے کے تین حصے ہیں:

۱۔ سرجیوس بحیرا نے طور سینا میں جو نسل محمدی دیکھی تھی اس کے قصے۔

۲۔ صحرائے یثرب میں جوانی کی عمر میں محمد سے مکالمے۔ اور

۳۔ سرجیوس کی پیشنگوئیاں۔ پھر پہلے دوسرے باب کی تکرار ہے اور سرجیوس کے درس ہیں۔

اس رسالے کے نتیجے میں یہ سرجیوس صاحب قرون وسطیٰ کے ادبیات میں اپنا مقام پیدا کر لیتے ہیں۔

اس قسم کی جعلی تصانیف عام طور سے گھڑی ہوئی احادیث پر مبنی ہوتی ہیں یا پھر احادیث میں اختلافات کی وجہ سے ایجاد کر لی جاتی ہیں۔ پیغمبر سے شام میں جب دوسری بار ملاقات ہوئی تو روایت میں راہب کا نام نہیں آیا۔ پہلی بار کی ملاقات میں بھی راہب کبھی یہودی ہوتا ہے کبھی عیسائی۔ کبھی بحیرا کبھی سرجیس اور کبھی جرجیس نام لیا جاتا ہے۔ وہ حضرت ابوطالب کو کبھی یہودیوں کی ریشہ دوانیوں سے متنبہ کرتا ہے اور کبھی رومیوں سے ڈراتا ہے۔ حقیقت میں ان اختلافات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اصل چیز وہ واقعہ ہے جو قطعی اور ثابت ہے۔ دشمن رائی کا پہاڑ بنانا چاہتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ اس بارے میں عیسائیوں کی بحث ۸۰ھ اور ۱۰۰ھ میں شروع ہوئی کیونکہ اس دوران (اور کچھ دنوں بعد تک) عیسائی حکومت اسلامی میں نفوذ حاصل کر چکے تھے۔ سرجون یا سرجیوس عیسائی اموی خلیفہ اول معاویہ کا منشی اور صاحب اسرار (پرائیوٹ سکرٹری) تھا۔ معاویہ کے بعد یزید نے بھی اس کو اس منصب پر رہنے دیا اور وہ حکومت کے کاموں میں اس سے مشورہ کرتا تھا[۱۲۲] یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ یا اس کا بیٹا خلیفہ عبدالملک کے زمانے میں حکومت کے مالی امور کا ذمہ دار تھا یعنی سلطنت کا خزانچی تھا جبکہ عرب کی حکومتوں میں فوج کی سربراہی کے بعد خزانے کا مہتمم ہونا باقی سارے عہدوں سے افضل تھا۔ اس ساری مدت میں وہ خود عیسائیوں کا سب سے بزرگ فرد شمار ہوتا تھا اور عیسائیوں سے جزیہ وصول کرنا اسی کے ذمے تھا[۱۲۳]

۱۲۱ ایضاً

۱۲۲ کوسٹنیو ۲۴۳۔

۱۲۳ ابن اثیر ۴، ۷، ۱۸، طبری ۲، ۲۰۵، ۲۲۸، ۲۲۹، ۸۳۴۔

۱۲۴ ایران۔ ہنری لامنس ۲۴۳۔

Presented by Ziaraat.Com

ان کے بعد اس کا لڑکا یوحنا دمشقی (JOHANNES DAMACENUS) تھا جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ اموی خلیفہ کا وزیر اعظم رہا[۳۳]۔

یہ شخص یونانی کلیسا کے آخری بڑے مفکرین میں سے تھا جو تثلیث یا تثلیثِ واحد کے معتقد تھے[۳۴]۔ ان کی تصانیف بطرز جرح کی فلسفیانہ تعلیمات شمار ہوتی ہیں۔ اس کی مناجات اور مذہبی اشعار اس قدر گہرائی کے حامل ہیں کہ آج بھی یونانی کلیسا میں پڑھے جاتے ہیں[۳۵]۔ اس کا رسالہ مباحثہ مابین مسیحی و مسلمان[۳۶] اس کے ان مباحث کی نشاندہی ہے جو وہ علمائے اسلام سے اسلام کے بارے میں کیا کرتا تھا۔ اس کے ذریعے اس کے طرز استدلال اور نظریات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ یہی شخص ہے جو کہتا ہے کہ رسول اللہ نے اپنا علم کسی ایک کا یا ایک بدعت والے آریان (ARIAN) سے اخذ کیا تھا[۳۷]۔ غور طلب امر ہے کہ یہی وہ عقیدہ ہے جس کی تکرار تھیوفنیس نے بھی کی ہے اور اس موہوم معلم کا اصل بنانے کے لیے بحیرا کی خانقاہ کے راہب کا وجود مستند بنایا جاتا ہے۔ درحقیقت تھیوفنیس اس بات کو آگے بڑھا رہا ہے جو یوحنا نے اختراع کی تھی اور اسی کی لگائی ہوئی تہمتوں کو زیادہ خوبصورت پیرائے میں پیش کر رہا ہے۔

اس طرح اسلام اور عیسائیت پر مباحث کی حقیقت اور اسلام کے خلاف رسالے اور خطوط لکھنے کا پس منظر روشن ہو جاتا ہے۔ اور یہ مباحث اسی طرح آگے بڑھائے گئے۔

پھر صلیبی جنگیں چھڑ گئیں (۴۸۸ھ — ۱۰۹۵ء) اور دستہ در دستہ کے صلیبی سپاہی یورپ سے مشرق وسطیٰ کے لیے روانہ ہوئے۔ اس معرکے میں گرماگرم مذہبی بحثوں کا دروازہ پڑ گیا۔ اس زمانے کا ماحصل بے شمار جعلی کتابیں ہیں۔

عیسائیوں میں ایک فرقے کا دوسرے پر حملہ کرنے یا اپنا دفاع کرنے میں جعلی کتابیں اور رسالے لکھنا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ابتدا ہی سے یہ سلسلہ بارہویں صدی عیسوی میں اپنے عروج پر تھا۔ یورپ میں اس زمانے میں افسانے، دیومالا اور مذہبی خرافات کا سیلاب پھیلا تھا۔ بازنطینی مصنفین کی کتابیں جو انہوں نے پیغمبر اسلام کے بارے میں لکھی تھیں وہ بھی خوب پھیلائی جا رہی تھیں۔ ان ہی زمانے میں یوحنا دمشقی اور تھیوفنیس بازنطینی کی تصنیفات کو بنیاد بنا کر "مکاشفہ بحیرا" لکھی گئی۔ گو کہا گیا کہ یہ کتاب چھٹی یا ساتویں صدی عیسوی

---

۳۳ ان کے علاوہ اور بہت سے ہیں: فرہنگ دینی کاتولیک مقالہ یوحنا دمشقی بالاب۔ جرمن

DICTIONNAIRE DE THEOLAGIC CATHOLIQUE

۳۴ فلسفۃ الفکر الدینی - ۱ / ۳۲۲ ج ۲ -

۳۵ J.C. AYER; A SOURCE BOOK FOR ANCIENT CHURCH HISTORY, P. 691.

۳۶ طبع جینی جدید کتب آبار یونانی، جلد نہم۔

۳۷ THE MUSLIM WORLD, VOL. XLL, N. 2. APRIL 1934. P. 392

ان کی مشہور کتاب: در سبیل رشاد یا ایمان صحیح DETIDE ORTODOXA توسط — SALMOND انگریزی ترجمہ EXPOSITION OF THE ORTHODOX. توسط بار — NICENE اولی تصانیف کے سلسلے میں جلد نہم حصہ دوم بنام CONCERNING THE ORTHODOX FAITH نیویارک ۱۸۹۹ء۔

Presented by Ziaraat.Com

کہ فلاں مصنف نے کیسی تحقیق کی تاکہ ثابت کیا جا سکے کہ عیسائیت اسلام پر اثرانداز ہوئی تھی یا اسلام آج بھی عیسائی ہے اور اس پر حملہ آور ہوتا ہے۔ وہ حضرات جو دانشوری اور علمیت کا دعویٰ رکھتے ہیں اور ساتھ ہی غیر جانبداری کا دعویٰ کرتے ہیں وہ بھی مکر اور عیاری، فریب، جعل اور تزویر سے باز نہیں آتے۔ کم از کم افسانہ گھڑ کے پھیلاتے پھرتے ہیں یا کسی روایت کو نئے رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر رسول اللہ کی بحیرا سے ملاقات کے سلسلے میں ڈاکٹر سپرنگر نے لکھا ہے کہ ایک مؤرخ بتاتا ہے کہ حضرت ابوطالب نے محمدؐ کو بحیرا کے ساتھ کر واپس بھیج دیا تھا۔ یہ اس بات کی کوشش ہے کہ اس واقعے کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال دیا جائے، حالانکہ ایسی کوئی بات روایت میں موجود نہیں۔

اس روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرتؐ شام کے پہلے سفر کے دوران ملاقات کے وقت دس بارہ سال کے لڑکے تھے۔ آپ نے حضرت ابوطالب اور دوسرے مسافر لوگوں کے ساتھ اس راہب سے چند کلمے کہے تھے اور بس۔ شام کے دوسرے سفر میں ایک دوسرے راہب سے ملاقات ہوئی۔ اس وقت بھی آپ تنہا نہیں تھے بلکہ حضرت خدیجہؑ کا غلام میسرہ وہاں موجود تھا اور وہ دونوں کی ملاقات کا شاہد تھا۔ اب ایک عام گفتگو میں کتنی گنجائش ہو سکتی ہے کہ بصریٰ کی خانقاہ کا راہب اتنی باتیں کہے کہ اس کو پیغمبرؐ کا معلم اور استاد مان لیا جائے۔

اس واقعے کے علاوہ پیغمبرؐ کے لیے ایسی آیات موجود تھیں جو ان کی نورانی حقیقت پر دلالت کرتی تھیں۔ عہد نامہ عتیق اور جدید کے مطابق آپ نبی امی تھے جن کا نام "احمد" تھا اور جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے، طیب کو حلال اور خبائث کو حرام کرتے، انسانیت کے کندھے سے گمراہی، تباہی، ذلت اور بار گراں ہٹانے آئے تھے اور انسان کی تعمیر اور نشوونما اور مکارم اخلاق کے اتمام کے لیے آئے تھے۔

یہ صاف صاف آیات کسی بھی صاحب نظر سے اوجھل نہیں رہ سکتیں، خواہ بحیرا کی تاریخی شخصیت نگاہ میں ابھر پاتی ہو۔

افسانے اور داستانیں گھڑنے والوں نے دو یا دو معلموں کا ذکر کیا ہے۔ ایک جابر ہیں اور دوسرے یاسر!

مارگلیوث اپنی کتاب میں کہتا ہے؎: "جابر بن عبداللہ اپنے دوست یاسر (یہ دونوں یہودی تھے) کے ساتھ مل کر مکے میں تجارت کیا کرتا تھا۔ دونوں وہاں اس دوران اپنی کتاب مقدس کو پڑھا کرتے۔ پیغمبرؐ جب ادھر سے گزرتے تو دونوں کو بغور (کتاب مقدس پڑھتے ہوئے) سنتے۔"

وہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ محمدؐ تورات سے متاثر ہو گئے تھے۔ آگے چل کر یہی شخص لکھتا ہے: "جب پیغمبرؐ نے (قرآن سے) سورۂ یوسفؑ تلاوت کی تو جابر مسلمان ہو گیا۔"

؎ DER ISLAM, BD. 23, 1936, S. 134 CHRONOGRAPHIA, BD. 1, S. 333 FF (DEBOOR) LEIPZIG, 1883.

حضارۃ الاسلام۔ گستاو فون گرونباوم۔ ترجمہ توفیق جاوید۔ ص ۶۶۔

؎ DR. SPRENGER; LIFE, P. 79.

؎ مسند [illegible]

Presented by Ziaraat.Com

یہودی عالم جو غیر تورات پڑھا کرتا تھا اور بقول ان مصنف کے حضرت یوسف کا قصہ اس سے پیغمبر نے سنا تھا اور خود
یوسف کس طرح قبل اسلام ہی ایمان لے آتا ہے یہ کیسا استعجاب ہے کہ کیا ایک فرد اپنے شاگرد پر والہ و شیدا ہو جاتا ہے اور ایمان لے آتا ہے
جو خود سب کچھ اسلام کا وسیلہ تھا وہ خود ایک لمحے میں اس کا معتقد اور گرویدہ ہو جاتا ہے !
یہ بحث یہاں کی ادبیات میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان کے اسلام کی دلیل صرف اعجاز قرآن کریم ہو سکتا ہے اور اس بات پر ایمان
کہ یہ قرآن اور رسول اللہ پر نازل ہوا۔

یاسر کا قصہ کچھ اور ہی ہے۔ وہ اسلام لائے اور اسلام ہی پر مصیبتیں سہتے ہوئے جان دے دی۔

یہ حضرت مارگولیوث ابھی بھی خاموش نہیں بیٹھے۔ ایک دوسرے معلم کو گھڑ لائے کہ اگر ان دونوں کو نہیں مانتے تو تیسرا موجود ہے
عیسائیت کے بارے میں جو کچھ قرآن میں ہے وہ پیغمبر نے صہیب رومی (جو موصل شہر سے آیا تھا) سے حاصل کیا تھا !!

یہ صہیب رومی اس وقت اسلام لایا جب پیغمبر اسلام کے گھر میں تھے مستضعفین کو سخت اذیت دی جا رہی تھی اور مسلمانوں کو
لا الہ الا اللہ کہنے کا پاداش تھا۔ رسول اللہ کے ساتھ مدینے ہجرت کی اور ہر حالت کا شاہد تھا۔ اس کی ہجرت کی داستان بہت پرشکوہ
ہے جب مکہ سے جانے لگا تو قریش نے اس سے کہا کہ جب تم مکہ آئے تو تمہارے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ اب جب کہ سب کچھ تمہارے
پاس آ گیا ہے تو ہم کو چھوڑ کر جا رہے ہو ؟

صہیب نے کہا: تمہاری ساری گفتگو میرے مال و متاع کے بارے میں ہے۔ اگر میں اپنا مال تمہیں دے دوں تو میں آزاد ہوں ؟
لوگوں نے کہا ہاں۔ کہنے لگا کہ جو کچھ میرے پاس ہے میں نے تم کو دے دیا[illegible]
یہ کہا اور مکہ روانہ ہو گیا۔

ایسا پرشکوہ اسلام کیا ایسے شخص کا تصور ہو گا جو پیغمبر کو کچھ سکھاتا ہے ؟...

یہ اور ایسی بے شمار مثالیں ہیں کہ اسلام کے دشمن مغرضین گھڑت قصے اور داستانیں دنیا کو سناتے رہتے ہیں۔

کہاں تو قرآن کے معارف عالیہ اور کہاں یہ چند گمنام افراد۔ یہ لغات جو دور افتادہ شہر بصری کے راہب ، مکہ کے گوشہ نشین زاہد ،
سڑک کے کنارے بیٹھا لوہار یا ابرہہ کی فوج کے بچے کھچے چند حبشی سپاہیوں کے گرد گھوم رہے ہیں اس آسمانی کتاب سے کیا ربط رکھ سکتے ہیں
قرآن قطعی طور سے ان سفاہت اور بیہودہ دلیری کی تردید کرتا اور اعلان کرتا ہے :

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ
الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ (۱۰ : ۳۷)

اور یہ قرآن افترا کیا ہوا نہیں ہے کہ غیر اللہ سے صادر ہوا ہو۔ بلکہ یہ تو ان کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے جو اس سے قبل
(نازل) ہو چکی ہیں۔ احکام ضروریہ (الٰہیہ) کی تفصیل بیان کرنے والا ہے۔ اس میں کوئی بات شک (شبہ) کی نہیں اور
وہ رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے۔

[illegible] ابن ہشام ۱ : ۸۹۱ ، اصابہ ۲ : ۱۸۸ شمارہ ۴۱۰۲ ۔

(۶)

رازِ وحی

وحی کیا ہے؟

یہ تو اس کا آغاز تھا اور وحی الٰہی کے نزول کی کیفیتیں تھیں۔ وحی کیا تھی اور کس طرح کی تھی اس پر بہت کچھ کہا جا چکا ہے اور اس بارے میں علماء نے بے شمار کتابیں لکھی ہیں[1] اور علمی، فلسفیانہ اور دینی نقطۂ نگاہ سے اس کی تفصیلی تحقیق اور چھان بین کی ہے کہ وحی کی حقیقت کیا ہے؟ وحی کی حقیقت اور ماہیت کی جستجو نے انسانی فکر کو گزشتہ صدیوں میں مشغول رکھا ہے اور اس کے نتائج بھی بیان کیے گئے ہیں۔ چنانچہ اس کی مختلف توجیہ اور تعبیر کی گئی ہے جن کا ذکر ہم پچھلے صفحات میں پڑھ چکے۔ مگر اس کا مطالعہ ابھی باقی ہے۔ یہ موضوع اس قدر وسیع ہے کہ پچھلی باتوں پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا۔

"انبیاء پر وحی" تو ایک حقیقت اور مسلّم واقعہ ہے۔ جو تاریخی تواتر سے ہم تک پہنچا ہے۔ سارے صحابہ اور پیروؤں کا حتّی کہ پیغمبر کے دشمنوں کا بھی اس پر اتفاق رہا ہے اور اس بات میں کسی کو کلام نہیں۔ کسی نے بھی اس آشکار اور روشن حقیقت کا انکار نہیں کیا ہے کہ وحی نازل ہوتی تھی۔ مگر اس کی توجیہ اور تجزیئے میں بہت اختلافِ رائے نظر آتا ہے۔

یہاں مختصراً اس کو پیش کیا جاتا ہے۔

قدیم فلسفیوں نے بھی اپنے اصولوں کی روشنی میں اس بارے میں نظریہ پیش کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ پہلی چیز جو ذاتِ پروردگار سے صادر ہوئی وہ "عقلِ اول" (یا نورِ اول) ہے کہ اسی سے فلک الافلاک خلق ہوا۔ عقل بطورِ کلی ایک مجرّد قوت ہے جو کلیات کا ادراک کرتی ہے اور صرف انسان کے ساتھ مخصوص ہے۔ مجرّد اور قائم بالذات گوہر ہے جو فعل یا وجود میں کسی چیز یعنی مادہ کی محتاج نہیں۔ غیب کو واسطے سے اور محسوس کو مشاہدے سے پہچانتی ہے۔ وہ عقل وہم کو "عقلِ فعّال" کہتے ہیں جو شرع کی زبان میں روح القدس اور جبرئیل[2] کہلاتے ہیں۔

انسانی روح پیدائشی ہوتی ہیں، ہوئی استعداد کے ظہور کے لیے ضروری ہے کہ "عقلِ فعّال" سے الہام حاصل کرے۔ عقلِ فعّال امور کی ساری حقیقتوں کا منبع ہے۔ یہ عقلِ فعّال سرچشمۂ علم ہے۔ پیغمبر جو دوسروں کے مقابلے میں قوی تر روح رکھتے ہیں اس عقلِ فعّال سے زیادہ قریبی تعلق رکھتے ہیں اور اس سے حقائق حاصل کرتے ہیں کہ جو آپؐ کے ذہن میں نقش ہو جاتے ہیں۔ آپؐ محسوس کرتے ہیں کہ اس واسطے کو آپؐ

---

[1] مثال کے طور پر وحی یا شعور مرموز۔ آیت اللہ طباطبائی تہران ۱۳۳۷ ۔ مسئلہ وحی ۔ مہدی بازرگان ۱۳۴۴ وحی محمدی ۔ محمد رشید رضا صاحب المنار ترجمہ فارسی آقای خلیلی ۔ تہران ۔ وحی و نبوت ۔ استاد مرتضیٰ مطہری ۔ تہران ۱۳۵۷ ۔ وحی و نبوت آقای علی مشکینی مرزبانی مشہد ۱۳۴۹ تفسیر المیزان (سورۂ شوریٰ)۔ فلسفہ وحی ۔ آقای محمد باقر ظہیری ۔ قم ۔

Presented by Ziaraat.Com

نے دیکھا یا ماورائے فطرت سے آواز سنی ہے۔ یہ چیز اس عقل فعال سے ارتباط اور اتصال کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتی۔

یہ نظریہ اس "عقول عشرہ" (دس عقلوں) اور ۹ افلاک تہہ در تہہ (پیاز کے چھلکوں کی تہوں کی طرح) کی قیاس آرائی کو قبول کرنے سے وابستہ ہے جو بطلیموس سے منسوب ہے۔ آج کے زمانے میں ان کو کوئی تسلیم نہیں کرتا۔ علاوہ ازیں اس نظریئے کے مطالب پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ اصولی طور سے انبیاء کا وحی سے واسطہ، خالق ہستی سے ایک ارتباط ہے جو اس نظریئے سے مطابقت نہیں رکھتا۔

متکلمین نے زیادہ اطمینان بخش بنیاد تلاش کی ہے:

جہانِ فطرت میں عمومی ارتقاء کا قانون کارفرما ہے اور آفرینش کا فلسفہ ہے ہی عالم کا کمال اور ارتقاء یعنی ہر وجود اپنے کمال کی سمت رواں ہے۔۔ جیسے تو ہم بھی اپنے کمال کے خواہاں ہیں نشوونما اپنے وجود کی فعالیت سے جو بھی ممکن ہوتا ہے اس کمال کو زیرِ عمل لاتی ہے۔ وہ فعالیت اسی سے متعلق ہے اور اسی کمال کے راستے میں اسی سے استفادہ ہوتا ہے۔ یوں ہم اپنے کمال کو حاصل کرتے ہیں ۳۲

یہ سارے کام جو جہانِ ہستی اور گہوارۂ فطرت میں انجام پاتے ہیں، اس کے باوجود کہ ان میں ذرا سا بھی شعور نہیں پایا جاتا لیکن کا ایک مقصد اور غایت ہے۔ ہر وجود کی نہایت، انتہا اور اس کا ہدف اوجِ کمال تک پہنچنا اور پوشیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانا اور ارتقاء کی تکمیل ہے۔ چنانچہ فطرت میں کمال کی طرف ایک دائمی اور مسلسل تبدیلی اور حرکت جاری ہے۔ خلقت میں حیات اور کمال کا ایک مستقل نظام ہے۔

اب عالمِ خلقت میں یہ نظام (یا بہتر طور پر کہا جائے کہ یہ ارتقاء کی ہدایت اور پیام) یا تو خود وجود کے اندر موجود ہے، یعنی ایک وجود اس پیام کی رہبری میں اور اس چھپی ہوئی قوت اور عام ہدایت کے تحت جو اس کے اندر چھپی ہوئی ہے کمال کی طرف رواں ہے۔۔۔ یا یہ پیام اور ارتقاء کا نظام (ہدایت) خود وجود میں نہیں بلکہ وجود کے خارج میں ہے مگر پیام دینے والے سے اس کا رابطہ ہے۔

یہ داخلی پیام نظامِ کل سے ہم آہنگ ہے اور ہر ذرے میں پوشیدہ ہے۔ ہر جمادات، نباتات اور حیوان اس پیام کے حکم کے تحت جو خود اس کے اندر موجود ہے اپنے کمال کے راستے پر حرکت میں ہے۔ ہر ایٹم میں جس طرح چھوٹے چھوٹے الیکٹرون اپنے پروٹون کے گرد گھومتے ہیں ۳۳ اور کہکشاں خلاء میں اپنے مدار کو طے کر رہی ہے۔۔۔۔ یہ سب اس پیام کی پیروی کر رہے ہیں جو ان کے اندر موجود ہے۔

انسان بھی ایک باشعور موجود بھی ارتقاء اور کمال کا جویا ہے مگر اس اندرونی پیام اور ہدایت سے عاری ہے۔ باقی تمام موجودات کی حرکت جبلی ہے اور اپنے کمال کے راستے پر جبراً رواں ہیں جب کہ انسان آزاد خلق ہوا ہے اور ارادہ اور اختیار رکھتا ہے۔ اسی ارادے اور اختیار کے ذریعے اس کو خود اپنے کمال کی طرف اور زمین میں خداوند تعالیٰ کا خلیفہ ہونے کے لیے اپنا راستہ طے کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیام ان کے داخل میں نہیں تاکہ اپنے ارادے کو ارتقاء کی سمت بروئے کار لا سکے۔

چنانچہ ارتقاء کے لیے جب پیام داخلی موجود نہیں تو ضروری ہے کہ یہ پیام آوری خارج سے ہو تاکہ پیام دینے والے کے پیام کو پہنچائے اور راہِ کمال کو پہچنوائے۔ اگر ایسا نہ ہو تو انسان اس آفرینش کے وسیع تناظر میں بے ہنگم اور بے مقصد بھٹکتا رہے گا اور نظام

۳۲۔ اصول فلسفہ۔ علامہ طباطبائی ۴ ص ۲۲۸

۳۳۔ فلسفہ کی ۲۳۔

Presented by Ziaraat.Com

سے ہم آہنگ کمال کی طرف پیشقدمی نہیں کر پائے گا۔

اسی لیے وحی تکوینی خدا کے فطرت سے رابطے کو بیان کرتی ہے۔ یہی وہ رابطہ ہے جو فطرت کے قوانین جبلت اور طبائع کو برقرار رکھے ہوئے ہے اور نظامِ ہستی کو قائم رکھے ہے۔ جب کہ وحی تشریعی، ماورائے فطرت سے ارتباط پیدا کرنا اور اس سے رہنمائی حاصل کرنا ہے اور اس کا ذریعہ غیب ملکوت سے ضمیرِ نبی کا اتصال ہے۔ یعنی ہستی میں پیغمبر کا وجود کے اصل سے ارتباط ہے۔ یا اس ہدایت کا مظہر ہے جو ہستی پر کارفرما ہے۔

یہ کہا جاتا ہے کہ انسان کی تجربہ یافتہ اور دوراندیش عقل خود انسان کی ہدایت کا تعین کیوں نہیں کرتی؟ امریکی فلسفی جان ڈیوی کے بقول انسان پر قانونِ نفع کی حکومت ہے۔ ہر شخص فائدہ حاصل کرنے اور اپنے آپ سے نقصان کو دور کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔ چنانچہ افراد کے فائدے اور ان کی غرض مندی ایک دوسرے سے متضاد اور متصادم ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ہر ایک کا فائدہ دوسرے کا نقصان ہے اور انسان فطرتاً ہمیشہ زیادہ کا خواہشمند اور طلبگار رہتا ہے[کہ] یہی قانون معاشرۂ انسانی پر بھی لاگو ہے۔ ایک گروہ کا مشترک فائدہ، دوسروں کا مشترک نقصان ہو سکتا ہے۔

اس لیے ضروری ہے کہ معاشرے کے نظام کو جو خود نظامِ آفرینش کا ایک حصہ ہے، محفوظ بنانے کی اور اس کے کمال کی طرف اس کی ہدایت کے لیے ایسا قاعدہ اور قانون بنایا جائے جو افراد اور انسانی معاشرے کے منافع سے بالا اور برتر ہو اور قانونِ کائنات سے ہم آہنگ ہو۔ انسانی معاشرے میں توازن کا فقدان اور نظامِ کائنات سے اس کا ہم آہنگ نہ ہونا سارے توازن پر اثر انداز ہو گا اور اس کو بگاڑ دے گا۔

علمائے کلام کہتے ہیں، دین وحیِ آسمانی سے اخذ ہوتا ہے، عقل و خرد سے نہیں۔ انسانوں کے درمیان ہمیشہ نفع اور فائدے پر جھگڑا رہتا ہے۔ یہ نظامِ خلقت ہے جس کو حقیقی کمال کی طرف نوع کی رہبری کرنی چاہیے۔ اس کی رہبری کے لیے نظامِ خلقت کو انسانیت کے لیے عمدہ دین منتخب کرنا چاہیے کہ جو وہ عالمِ انسانی کو وحی کرے۔ بقول علامہ طباطبائی،

> "انسان کا جبلی شعور جو خود اختلاف اور فساد کے ظہور کا سرچشمہ ہے وہ اختلاف اور فساد کے رفع کرنے کا ذریعہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کیونکہ اس طرزِ آفرینش کا کوئی ایسا ذریعہ نہیں جو اول خود ایک اثر کو ظاہر کرے اور پھر وہ خود ہی اس اثر کو ختم کر دے۔ علاوہ ازیں یہ قوانین (بشری) لوگوں کے اجتماعی افعال اور اعمال پر نگرانی کرتے ہیں، ان کے شعور داخلی اور احساساتِ مخفی پر نہیں۔"[شہ]

چنانچہ تجربوں سے آراستہ عقل کی ہدایت، وحی کی ہدایت کی جانشین نہیں بن سکتی۔ مگر وحی ہے کیا اور اس ہدایت کی کیفیت کیا ہے؟ وحی خالقِ جہان و مستی کے مبدا اور انسان کے درمیان وہ ارتباط ہے جس کے ذریعہ انسان کے ارتقاء کا راستہ پورے وجود ہستی کے ارتقاء کے راستے سے ہم آہنگ ہو اور اس راستے کی واضح نشاندہی ہو جائے اور مکمل پروگرام بن جائے۔ دوسرے لفظوں میں

[کہ] سوشلزم کہتا ہے کہ انسان انسانوں میں بھیڑیا ہے۔ جو کہتا ہے یہ بات اور بھی پرانی ہے۔

[شہ] وحی یا شعورِ مرموز۔ ۹۲۔

Presented by Ziaraat.Com

وحی وہ خدائی مشعل ہے جو اس کے حکم سے اس کے برگزیدہ بندے پاتا ہے اور اپنے اس برگزیدہ بندے کو غیبی راستوں اور نامانوس راز جیسی ہدایت و دانش سے آگاہ کرتا ہے تاکہ انسان کی زندگی کا پروگرام اس کے ارتقاء کی جہت پر تیار ہوسکے۔

جنہوں نے وحی کو اس طرح سے قبول نہیں کیا ہے مگر صداقت محمدی کو جانتے پہچانتے ہیں اور سہارا اختیار کیا ہے کہ گو پہلے ایمان لا بھی چکے ہیں مگر انہوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا ہے۔ اس خیال کا انکار تو نہیں کیا جاسکتا۔ تو پھر اس حقیقت کی موجودگی میں وحی کا ادراک کیا جاسکتا ہے۔ ایک مادہ پرست شخص کہتا ہے کہ پیغمبر کی صداقت مسلم مگر ان کی شناخت کا اصلی سرچشمہ خود وہی ہیں۔ وہ خدا پر جو ایمان و اعتقاد رکھتے ہیں اور اس کی عبادت جو وہ دل و جان سے کرتے ہیں، وہ صداقت جو ان کی روح کی گہرائیوں سے اٹھتی ہے اپنے اور جو بھرپور اعتقاد رکھتے ہیں، ان کی وجہ سے یہ پاکیزہ خیال ان کے دل اور ذہن میں سماتا ہے اور نہاں خانۂ شعور سے غیر ارادی طور پر ابھرتا ہے اور وہ تصور کرتے ہیں کہ رہنمائی الٰہی اور فرشتۂ آسمانی سے ان کو پیام ملا۔ جب کہ سوائے اس کے کہ خود آپ کے خیالات کا وہ انعکاس ہے اور کچھ بھی نہیں۔ سرچشمۂ وحی وہی تابناک اور قوی روح ہے جو پیغمبر میں موجود ہے اور ان کی باطنی شخصیت کے واسطے سے ان پر ظاہر ہوئی ہے ....

اس تجزیے پر نظر کرنے سے ہزاروں سوالات ذہن میں ابھرتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے کہ پیغمبر کے بعد اور ختم نبوت کے بعد دوسرا کوئی اس راستے پر چلتا ہو، کیوں نہیں پیدا ہوا؟ پھر آخر یہ اعجاز کیوں نہیں دہرایا گیا؟ کیوں ...؟ یہ صحیح ہے کہ نبی کے نبوغ MANIFEST اور باطنی شخصیت نے مسائل کو نئے اور عمیق طریقے سے واضح کیا مگر جو کچھ ماورائے حس و شعور ہے اس کے بارے میں کیا کیا جائے؟ ہر آیت کے اندر جو اعجاز چھپا ہوا ہے وہ نبوغ، دانش و بینش کی حکایت بیان نہیں کرتا۔ وہ ایمان جو پیغمبر کے پاک وجود میں تھا اور جو ان کے پیروؤں میں سرایت کر گیا تھا، جس کا ہر مومن کے دل میں عکس دیکھا جاسکتا ہے وہ کس شعور باطنی کے نہاں خانے سے ظاہر ہوسکتا ہے۔

بقول آقای مہندس مہدی بازرگان "وحی محمدی یا آیات قرآن کوئی عیاری اور ریاکاری نہیں اور کسی کی تقلید یا تعلیم کے ذریعے بھی حاصل نہیں ہوئی ہیں۔ پیغمبر نے قرآن کو اپنے اختیار، محنت اور استدلال سے نہیں تیار کیا بلکہ ان کی ذات کے لیے خارج سے اور خدا کی جانب سے القاء ہوا ہے۔ یہ فعل و انفعال داخلی اور لاشعور کی فکر سامانی بھی نہیں ہے کیونکہ وجدان کی عنایات اور لاشعور کی پیداوار بہرحال خود انسانی اُپج کہی جائے گی، جب کہ قرآن ان اعتقادی اور اخلاقی حصوں سے قطع نظر، جن کو شاید کہا جائے کہ ذہنی اور نفسانی پہلو کے حامل ہیں، ایسی لامحدود حکایات اور اطلاعات سے پُر ہے جو صرف خارج ہی سے حاصل ہوسکتی ہیں۔ علاوہ ازیں اس میں طبقاتی یا گروہی یا بشری اور ذاتی خواہشات کا گذر نہیں ..." [1]

"وحی" وہ مشترک لفظ ہے جو فطرت، نباتات، حیوانات یا انسان سے خداوند تعالیٰ کا رابطہ بیان کرتا ہے، وہ رابطہ خواہ قولی ہو یا فعلی۔ اول رابطے نے قوانین "فطرت" کو ظاہر کیا ہے۔ دوسرے رابطے نے قوانین "حیات" اور رابطۂ سوم نے مدوّن اور خصوصی معنی میں "کتاب" کو ظاہر کیا۔ اس بنا پر قرآن ان دو حیات تکوینی ــ فطرت اور حیات ــ کے مثل ایک وجود ہے۔

---

[1] مسئلۂ وحی۔ ۱۷۔ ۱۱۱۔

Presented by Ziaraat.Com

اور اپنے خاص نظامِ طبیعی اور علمی کا حامل ہے۔ قدرتی بات ہے کہ اس کو الفاظ کے عناصر سے تیار کیا اور ڈھالا گیا ہے۔ ؎

اس پر بھی قابلِ توجہ بحث کی گئی ہے، جیسا کہ عرض کیا گیا کہ وحی کو صرف ایک بُعد (DIMENSION) ــــــــ یعنی انبیاء پر وحی آنے نہیں سمجھا جاسکتا۔ یا صرف ان آیات سے کہ جن میں وحی اور تنزیل کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، سند نہیں لی جاسکتی۔ پورا قرآن، ملا قرآن نظر تک رہنا چاہیے اور اس سے تدبر اور تفکر کی رہنمائی حاصل کرنی چاہیے۔ اس طرح عالم محسوس سے ماوراء یہ وجود خود کو آشکار کرسکے گا۔ اس وجود کے روشن جلوے کو پورے آیاتِ ہستی میں دیکھنا چاہیے، صرف ایک چھوٹے سے بُعد اور پہلو میں نہیں۔

چونکہ جہانِ ہستی میں بھی ارتقاء کا قانون کارفرما ہے اور ارتقاء کے لیے تبدیلی اور حرکت ضروری ہے، اس لیے کمال کی طرف حرکت کو سارے جہانِ ہستی میں مشاہدہ کرنا چاہیے۔

کیا انسان اسی فطرت میں ایک وجود اور اسی کائنات کا جزء نہیں؟ اور کیا اس کائنات میں ہر شے حرکت میں نہیں؟ ہر وجود کی ایک حرکت ہے اور ہر حرکت کی ایک جہت ہوتی ہے۔

وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ

اور سب ہی خلاء میں تیر رہے ہیں۔

ہیچ چیزی ثابت و برجای نیست

جملہ در تغییر و سیر سرمدی است

شد مبدل آبِ این جو چند بار

عکسِ ماہ و عکسِ اختر، برقرار

ہستی میں کوئی چیز یکساں وجود نہیں رکھتی۔ ہر چیز تغیر اور حرکت پر مجبور ہے۔ ہر وجود اسی سے اپنی ہستی کے تسلسل اور تواتر کا خواہاں ہے۔

يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ (۵۵:۲۹)

اسی سے سب آسمان اور زمین والے مانگتے ہیں۔ وہ ہر وقت کام میں رہتا ہے اور آیات بھی ہیں: ۱۵:۱۶، ۵۰:۱ و ۱۴: ۸، ۴۸ و ۵۶:۶۱۔

کل یوم هو فی شأن خوان

مر ورا بیکار و بی فعلی مدان

قدرتی بات ہے کہ حرکت کے لیے جہت اور سمت چاہیے۔ بہرحال حرکت کی سمت ضرور ہوتی ہے۔ اگر حرکت کی جہت ارتقاء کی طرف ہو تو وہ اللہ کی طرف حرکت ہے۔ اور اگر ارتقاء کے برخلاف (اور ضد ارتقاء) ہے اور انحطاط کی طرف ہے تو آخرکار فنا اس کا مقدر ہے۔

؎ امت و امامت: ۱۵۱۔

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ (۲۸ : ۸۸)

سب چیزیں فنا ہونے والی ہیں بجز اس کی ذات کے۔

یعنی ہر موجود جدا ہو جب خدا کی طرف رخ کھاتا ہو گا فنا ہو جائے گا۔

ہر چیز حرکت (اور عمل) کو حقیقت اور معنی عطا کرتی ہے اور وہ انسان کی تعمیر میں (اور پھر ساری ہستی کی تعمیر میں) اہم کارکردگی کی حامل ہے وہ اس حرکت کی جہت اور DIRECTION ــــــ ہے۔

بے جہت اور بے مقصد حرکت انسان کو نابود کرنے والی اور وجود کی حقیقت تشخص اور قدر و قیمت کو فنا کرنے والی ہو سکتی ہے (اور وسیع تر تناظر میں، ہستی کے سارے موجودات کو نابود کرنے اور نظم ہستی میں خلل ڈالنے کا باعث ہو سکتی ہے)۔ عالم اور موجوداتِ ہستی پر تفکر و تدبر سے بآسانی سمجھ میں آجاتا ہے کہ ہستی کے لیے حرکت کا مقصد اور معنویت ہونا کیوں ضروری ہے۔ کوئی حرکت نہیں جس کا مقصد نہ ہو ہر وجود کی ایک غرض و غایت ہوتی ہے۔

کاروانِ ہستی ایک بہتری راستے پر اپنی غایت نہائی (اللہ) کی طرف حرکت میں ہے۔

يُسَبِّحُ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ (۶۲ : ۱)

جو چیز آسمانوں اور زمین میں ہے اسی کی تسبیح کرتی ہے۔

ہر نفس نو می شود دنیا و ما بی خبر از نو شدن اندر بقا

قَالَ رَبُّنَا الَّذِيٓ أَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدٰى (۲۰ : ۵۰)

کہا کہ ہمارا (سب کا) رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کے مناسب بناوٹ عطا فرمائی۔ پھر رہنمائی فرمائی کہ وہ جہان لے کر راہ کمال کو کس طرح طے کرے۔

ہر موجود پہلی بار خلق ہوا اور پھر اس کی اپنی حرکت کو جہت اور مقصد عطا ہوا۔ ہر موجود شرائط سے واقف ہے اور اپنی ذات میں رہنمائی کا حامل ہے تاکہ اپنے ارتقاء کے ہدف کو پا سکے۔ یہ ہدایتِ تکوینی ہر موجود کو گھیرے میں لیے ہوئے ہے اور ہر موجود اپنی حرکت کے راستے پر گامزن اپنے کمال کے مراحل طے کر رہا ہے۔

اَلَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى (۸۷ : ۲، ۳)

وہ خدا جس نے ہر شئے کو خلق کیا اور اس کے کمال تک پہنچایا۔ وہ خدا جس نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ (قدر) مقرر کیا اور پھر اس کو ہدایت کی۔

چنانچہ ہر موجود کے لیے ایک حرکت ہے۔ اور جو ہدایت اس وجود میں نہاں ہے اس کے مطابق متعین جہت (کمال) کی طرف حرکت جاری ہے۔ قدرتی بات ہے کہ انسان کے لیے بھی ایک جہت پر حرکت متعین ہو گی ورنہ وہ جس نظام کے تحت ہے درہم برہم ہو جائے گا۔ کسی گھڑی میں کسی پرزے کی اپنی حرکت متعین نہیں ہو گی تو وہ گھڑی اپنا کام نہیں کر پائے گی۔

جہاں چوں چشم و خط و خال و ابرو است

کہ ہر چیزی بجای خویش نیکو است

Presented by Ziaraat.Com

اگر یک ذرہ را برگیری از جائی!!

فرو ریزد ہمہ عالم سراپائی

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَإِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (۳ : ۱۰۹)

اور اللہ ہی کی ملکیت ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے اور اللہ ہی کی طرف سارے امور راجع کیے جائیں گے۔

آل عمران کی آیت ۸۳ (طَوْعًا وَّ كَرْهًا) اور سورۂ ہود کی آیت ۱۲۳ سورۂ حدید کی آیت ۱۵ اس کی نشاندہی کرتی ہیں کہ نظامِ ہستی یا سارے موجودات کی حرکت ارتقا کی سمت اور خدا کی طرف (یعنی ساری ہستی میں ہدایت عامہ کے منبع کی طرف) ہے۔

ظاہر ہے کہ انسان کی حرکت بھی اس عام نظام سے مستثنیٰ نہیں ہوگی اور ضروری ہے کہ یہ ارتقا کے لیے اور خدا کی طرف ہو۔ سارے موجودات ارتقا کی سمت ایک واحد جہت کے حامل ہیں۔

ہر وجود اپنے اندر کی ہدایت کے مطابق اپنے ارتقا کے سفر کو جاری رکھتا ہے۔ مگر انسان اس ہدایتِ داخلی کا حامل نہیں ہے۔ آزاد پیدا ہوا ہے تاکہ اس کی آزمائش ہو سکے، برے اور اچھے راستے میں امتیاز کر سکے اور پھر اس میں سے ایک کا اپنے ارادے سے انتخاب کرے۔ اس کے لیے اس کی ہدایت خارج سے ہونی چاہیے۔ اچھی اور بری راہ کی ہدایت کرنے والے اور پیام پہنچانے والے کے ذریعے نشاندہی ہونی چاہیے تاکہ انسان کے انتخاب کا پتہ چل سکے۔

اتفاق یہ ہے کہ وہ صرف انسان ہے جو اپنے ارتقا کے خلاف (انحطاط کی) جہت پر چل سکتا ہے۔ انتخاب خود اس کے ذمے ہے۔ چنانچہ ہر وجود کے لیے حرکت ہے اور ہر حرکت کی ایک جہت ہوتی ہے۔ مگر جہت آخر کہاں سے حاصل ہوتی ہے؟ وہ چیز جو حرکت کو جہتِ خدائی و الٰہی عطا کرتی ہے وہ وحی ہے، اس لیے کہ جمادات، نباتات اور حیوانات کی ہدایت کے لیے 'وحی' کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ یعنی ان کو ہدایت و ارشادِ تکوینی ملا ہے۔ انسان کے لیے ہدایت تشریعی ہے اور وحی انبیاء کے وسیلے سے انسان کو ابلاغ ہوتی رہی ہے۔

وحی تین صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے — جبلت، فطرت اور مکتب (دین)۔

جبلت حرکتِ جبری کو ہدایت دیتی ہے اور آفرینش کی موجودات کو جہت عطا کرتی ہے کہ وہ ارتقا کے راستے پر ہستی کی غایتِ نہائی (اللہ) کی طرف رواں ہیں۔ یہ جبلت معین اور عمومی روابط کا مجموعہ ہے۔

موجودات کی حرکت پر جبلت کی جبری حکمرانی کی نشاندہی شہد کی مکھی پر وحی کے ذکر کے ذریعے ہو چکی ہے۔ شہد کی مکھی کو وحی ہوتی کہ پہاڑوں، درختوں اور مکانوں میں اپنے چھتے بنا۔ (یہ چھتے بنانا اور فلاں فلاں جگہ بنانا) حرکت جبلی ہے۔ اس سے پتہ چلا کہ جبلت خود وحی کا ایک حصہ ہے اور اس کے خارج سے اس کا امکان نہیں۔

فطرت بھی مستقل ضوابطِ جبری ہے جو جنت کی زندگی کے دوران انسان و اجتماع کو ہدایت کرنے اور دنیا کی زندگی میں مکتب (دین) اس کی ہدایت کرتا ہے۔

فطرت اور مکتب کے ہدایت کرنے اور جہت عطا کرنے کے سلسلے میں اس آیت پر توجہ کرنی چاہیے:

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ

Presented by Ziaraat.Com

الدِّيْنُ الْقَيِّمُ، وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۰:۳۰)

تم یکسو ہو کر اپنا رخ اس دین (مکتب) کی طرف رکھو جو فطرت خدائی ہے وہ فطرت جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ خلقت و آفرینش میں کوئی تغیر اور تبدیلی نہیں آتی۔ یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

یہاں واضح طور سے نظر آ رہا ہے کہ دین فطرت پر منطبق ہے۔ یہ دونوں ناقابل تغیر ضوابط ہیں اور یہ کہ انسان کو چاہیے کہ اپنا رخ ان ہی کی طرف رکھے اور اسی ذریعے سے ہدایت حاصل کرے۔

وحی خواہ وہ جبلت اور فطرت کی شکل میں ہو خواہ مکتب و دین کی شکل میں، ہستی کے سارے موجودات کی حرکت کو جہت عطا کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اسی صورت میں خلقت کو کمال کے راستے کی ہدایت مل سکتی ہے۔ ہستی کی حرکت کے لیے جہت مقرر کرنے میں اصلی عامل وحی ہے۔ وحی کے بغیر حرکت ممکن ہے مگر یہ حرکت اعتدال کی سمت میں نہیں ہو گی۔ بغیر وحی کے ہستی اور وجود اعتدال کے راستے سے ہٹ جائے گا اور ایک طویل مدت کے بعد نظام ہستی معرض خطر میں پڑ جائے گا۔ یہ اس خلیے CELL کی مثل ہے جو نارمل نشوونما نہ پا کر انسان کے پورے وجود کو خطرے میں ڈال دیتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں وحی ان ضوابط اور معیار کا مجموعہ ہے جو آفرینش کی کلی حرکت پر حکم فرما ہے۔ ضابطہ سب سے اہم عامل ہے جو موجودات کی حرکت کی جہت متعین کرتا ہے اور وحی ان ہی ضوابط کا مجموعہ ہے۔

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ (۵۵:۷)

اور اسی نے آسمان کو اونچا کیا اور اسی نے میزان (ضابطۂ اعتدال) برقرار کیا۔

مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ (۴۶:۳)

ہم نے آسمان و زمین اور جو اشیاء ان کے درمیان ہیں ان کو حکمت کے ساتھ پیدا کیا۔

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ (۴:۵۸)

اور یہ کہ جب لوگوں کا فیصلہ کرو تو عدل سے فیصلہ کیا کرو۔

ان ضوابط کا مجموعہ ہی "وحی" کہلاتا ہے۔ کیونکہ جو ارتقاء کی طرف اس حرکت کو جہت مہیا کرتی ہے وہ "وحی" ہے اور ہدایت تشریعی کی صورت میں ارتقاء کے مختلف مراحل میں رشد و ہدایت پہنچاتی رہتی ہے۔ اور آہستہ آہستہ مکمل شکل اختیار کر کے "قرآن" کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

انسان ہستی کی دوسری موجودات کے ارتقاء کا تسلسل ہے اور باقی تمام موجودات میں وحی جبلت اور فطرت کی صورت میں (داخلی طور پر) ان کی ارتقائی حرکت کی رہنمائی کرتی ہے تو خود انسان کو ارتقاء کی رہنمائی کے لیے وحی ہدایت تشریعی کی صورت میں نازل ہوتی ہے۔ انبیاء کا کردار انسانوں کو آگاہ کرنا اور قسط اور عدل الٰہی کے برپا کرنے کی شرائط اور مقتضیات کا تیار کرنا ہے۔ یہ حقیقی اقدار کے ذریعے ہی ممکن ہے جو انسان کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کی عظمتوں کو ابھار کریں تا کہ جہان ہستی سے اس کا ارتباط استوار کر سکیں۔

انسان کی یہ "خود آگاہی" درحقیقت اس کے ارتقاء کی جہت اور سمت سے آگاہی ہے۔ اس لیے یہ صرف انسان کی ترقی اور اعلیٰ اس کے وجود کی اصلیت کے منافی نہیں بلکہ اس کے ارتقاء میں حقیقی طور سے مدد و معاون ہے۔

Presented by Ziaraat.Com

مختصر یہ کہ "وحی" فطرت اور انسان سے خداوند تعالیٰ کا رابطہ ظاہر کرتی ہے۔ یہ وہ رابطہ ہے جس کے ذریعے قوانینِ قدرت، فطرت، دین اور کتاب ظاہر ہوئے۔ نظامِ فطرت قائم ہوا اور موجوداتِ طبیعی کو تکامل کی طرف جہت ملی۔ چنانچہ قرآن بھی قدرت اور فطرت (دو کتبِ تکوینی) کی طرح ایک وجود ہے، جس کے نتیجے میں وہ اپنے خاص نظامِ طبیعی اور قوانینِ علمی کا حامل ہے۔ یہ فطری بات ہے کہ ان کے وجود کو ایک منبع سے تیار کیا گیا ہے۔

اور پیغمبر؟ نبی باقی انسانوں اور دوسرے عالم کے درمیان رابطے کا ذریعہ ہے۔ درحقیقت وہ انسانوں کے جہان اور جہانِ غیب کے درمیان ایک پل ہے۔ نبوت کا ذاتی اور فرد سے متعلق پہلو یہ ہے کہ یہ ایک انسان کی روحانی شخصیت کی وسعت اور بالیدگی کا مظہر ہے۔ اس کا عمومی پہلو یہ ہے کہ وہ پیغامبرِ الٰہی ہے انسانوں کے لیے مقصود ان کی رہبری ہے جو ایک فرد کے ذریعے دوسروں تک پہنچتی ہے۔[1] اس طرح پیغمبر وہ فرد ہے جو خدا کی طرف سے منتخب ہوتا ہے اور قیام کرتا ہے۔ وہ اپنی ذات میں وحی اور عالمِ غیب سے آگاہی حاصل کرنے کی صلاحیت اور قابلیت رکھتا ہے۔ کسی میں اس صلاحیت کو سوائے خداوند تعالیٰ کے اور کون پہچان سکتا ہے۔ صرف خدا جانتا ہے اور بس۔

اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ (۶: ۱۲۴)

خدا خود بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت، سفارت اور امانت کس کے سپرد کرے۔

اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ (۲۲: ۷۵)

یہ خدا ہے جو فرشتوں اور انسانوں میں سے خود رسول منتخب کر لیتا ہے۔

بے شک یہ انتخاب خود اپنی جگہ پیغمبر پر ایک عظیم اثر کا حامل ہوتا ہے کہ اس کو ایک نیا انسان بنا دیتا ہے، ایسا انسان جو اوجِ رفعت علوِ معنوی کا حامل ہو جاتا ہے۔ جو صلابت اور استقامت میں چٹان سے بڑھ جاتا ہے۔ ایسا انسان جس کی ساری قوتیں اور توانائی بروئے کار آ چکی ہوتی ہیں کہ وہ معاشرے میں ایک عظیم انقلاب لا سکے۔ وہ انقلاب جس کے ذریعے وہ معاشرے کو اس انحراف سے نجات دے سکے جس سے وہ دوچار ہے تاکہ پھر رشدِ معنوی کے راستے پر اس کی رہبری کر سکے۔

چنانچہ وہ صرف اپنی ذات میں ہی کمالِ معنی تک نہیں پہنچ جاتا اور نیا انسان نہیں بن جاتا بلکہ اپنے معاشرے اور ان تمام لوگوں کو بھی جو اس کی نبوت کے دائرے میں آتے ہیں اور پیغمبر آخر الزمان کے معاملے میں جب تک انسان باقی ہے، ایک نیا تحرک عطا کرتا ہے اور نیا جوش و جذبہ اور تعہد و جدیت لے آتا ہے۔

یہ نبی ہے جو تاریخِ انسانی کا نقطۂ انقلاب بنتا ہے۔ معاشرۂ انسانی کے انحراف کو درست کرتا ہے، اس کو راہِ اعتدال پر لاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی شخصیت عام لوگوں سے ممتاز ہوتی ہے۔ یہ امتیاز وحی کے پرتو سے حاصل ہوتا ہے۔ نزولِ وحی کے اول لمحے سے یہ تغیر و تبدیلی اور یہ انقلاب و نمود متشکل ہونا شروع ہو جاتا ہے اور بعد میں مزید گہرائی اور گیرائی کا حامل ہو جاتا ہے۔

غیرِ فہم و جان کہ در گاو و خر است
آدمی را عقل و جانی دیگر است

---

[1] مقالۂ وحی، استاد شہید مرتضیٰ مطہری (مجلہ [illegible] ۱۳۸۲ — ۵۱۴)۔

Presented by Ziaraat.Com

باز فیر عقل و جانِ آدمی ؛
ہست جانی در نبی و در ولی

مگر نبی کو پہچانا کس طرح جائے؟ ان کو شناخت کرنے کا ایک ذریعہ تو مابعد الطبیعات سے ان کے رابطے کی نشانیاں (معجزات) ہو سکتی ہیں، جو قوانین فطری سے بالا ہونے کا ثبوت دیں۔ ایک دوسرا طریقہ بھی ہے ـــــ اس کو عقل کے ذریعے پہچانا جائے۔

یہ صحیح ہے کہ وحی کا وجود، نظر نہیں آتا۔ وہ غیب ہے اور نظروں سے پنہاں ہے۔ اور انسانی احساسات اور تجربے سے بالا ہے۔ مگر اس کے آثار ضرور ظاہر ہوتے ہیں جو لوگوں کو بھی محسوس ہو سکتے ہیں۔ جس شخص پر وحی نازل ہو رہی ہے اس پر جو اثر ظہور میں آئے اس کی شناخت کو ممکن بنا دیتے ہیں۔ جسم کے حالات و کیفیات کے علاوہ سب سے بڑا اثر، خود وحی ہے۔ یعنی وہ چیز جو وحی کی گئی اس پر غور و فکر کے بعد اور دوسرے شواہد اور قرینات سے موازنہ کر کے اس کا تعین کیا جا سکتا ہے کہ آیا انسانی قیاس آرائیوں سے یہ بالا ہے یا محض عقلِ خام کی پیداوار ہے۔ پیغمبر کی رفتار و گفتار اور جو روش انھوں نے اپنائی، یعنی پیغام کا مطالعہ اور اس کا نبیؐ اور ان کے پیروؤں کے کردار پر انطباق، نبیؐ کی معاشرتی جہت کا تعین، وہ کس طبقے سے ہے اور کس طبقے سے وابستہ ہے، وہ اپنی باتوں پر جو دلیلیں لائے اور وہ دلیلیں بھی جو ان کے مخالفین نے ان کے رد و انکار کے لیے پیش کیں، یہ ساری چیزیں ان کے دعوے کی گواہ بن سکتی ہیں۔

یہاں ایک سوال ذہن میں ابھرتا ہے۔ وہ یہ کہ یہ داخلی ہدایت، یہ وحی جو پوری کائنات میں جاری و ساری ہے اور جس نے کائنات کو نظم عطا کیا ہوا ہے، دوسرے موجودات کی طرح انسان میں کیوں موجود نہیں کہ وہ بھی دوسروں کے ساتھ ساتھ ہستی کے اس سارے سلسلے سے ہم آہنگ ہو جاتا۔ انسان کے اندر یہ داخلی پیام کیوں نہیں ہے کہ خارج سے کسی پیغام لانے والے کی احتیاج نہ رہتی؟

یہ وہی سوال ہے جو مشرکین پیغمبر سے کیا کرتے تھے کہ ہم سب وحی کے حامل کیوں نہیں ہو جاتے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں انسان کا امتحان اور آزمائش نہیں ہو سکتی۔ وہ بے قیمت ہو جاتا، آزادی، حقِ انتخاب و اختیار کے بلند مقام سے نیچے آگرتا اور باقی موجودات کی صف میں شامل ہو جاتا۔ نہ امانتِ الٰہی کا حامل بن سکتا اور نہ خلیفۃ اللہ ہونے کا حقدار رہتا۔ اسی لیے خداوندِ عالم نے فرمایا ہے:

"اگر خدا چاہتا تو سارے اہلِ زمین ایمان لے آتے (۱۰:۹۹)۔

اور یہ بھی کہ

"اگر تمہارے پروردگار نے چاہا ہوتا تو سارے لوگوں کو ایک امت کر دیا ہوتا" (۱۱:۱۱۸)

چنانچہ ہدایتِ جبری انسان کے لیے مناسب نہیں جس سے اس کے انتخاب کا اختیار چھن جائے اور اس کی ذمہ داری ختم ہو جائے۔

ایک دوسرا نکتہ یہ ہے کہ وحی کی تحقیق اور چھان بین آج کے زمانے کے سائنسی اصول کے تحت لیبوریٹری میں ممکن ہے یا نہیں؟ ہم بعض دانشوروں کی طرح چاہیں کہ موجودہ دور کے سائنسی طریقوں سے وحی کا تجزیہ، تحلیل یا توجیہ کریں تو ابھی ممکن نہیں ہوگا، اس لیے کہ ہماری سائنسی پیشرفت اور وسعت کے باوجود اب بھی ہم طبیعی اور مادی روزمرہ کے مسائل کے تجزیے اور تحلیل میں بہت کورے ہیں اور ہمارے سامنے ایک طویل راستہ باقی ہے جسے ہمیں طے کرنا ہے تب جا کر ہم ان مسائل کو تجربہ گاہ میں لے جا سکیں گے جو مابعد الطبیعات سے متعلق ہوں اور عام طبیعی مسائل سے بالا ہوں کہ اس تجزیے اور تحلیل کے نتائج ہر شک و شبہ سے بالاتر ہوں۔

Presented by Ziaraat.Com

جسم ظاہر، روح مخفی آمدہ است
جسم ہمچون آستیں، جان ہمچو دست
باز عقل از روح، مخفی تر بود
حس بہ سوی روح، زوتر رہ برد
روحِ وحی از عقل پنہاں تر بود
زانکہ او غیب است او زان سر بود
عقلِ احمد از کسی پنہاں نشد
روحِ وحیش مدرکِ ہر جان نشد
روحِ وحی را مناسبہاست نیز
در نیابد عقل، کان آمد عزیز

الہام اور وحی

وحی کے بارے میں یہ بحث گفتگو کو اس نقطے پر لے آئی کہ معلوم کیا جائے کہ وحی کیا، الہام، کو کہا جاتا ہے اور کیا یہ اسی نوع کی ہے؛ اکثر سننے میں آتا ہے کہ وہ یہ ایسا تھا گویا مجھ پر الہام ہوا ہو" یا الہام کیا وحی کی قسم ہے؟ نہیں، الہام وحی نہیں بلکہ دونوں مختلف چیزیں ہیں لغت میں الہام کے معنی اعلان کے اور دل میں ڈالنے کے ہیں۔ اصطلاح میں یہ ذہن میں ایک معنیٰ کا حصول ہے جو پہلے نہ کہیں سنا ہوا اور نہ پڑھا ہو نہ ذہن پر زور دے کر اس کو حاصل کیا ہو۔ ایک دم ایک بجلی سی ذہن میں کوندتی ہے اور معنیٰ دل میں اتر جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ معنیٰ یا نظریہ یا عقیدہ جو بھی ہو، اچھا ہو یا برا ہو۔

اسی مفہوم کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے مگر ایک مرتبہ سے زیادہ لفظ "الہام" نہیں آیا ہے،

وَنَفْسٍ وَمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا (۹۱ : ۷، ۸)

قسم ہے (انسان کی) جان کی اور اس (ذات) کی جس نے اس کو درست بنایا پھر اس کی بدکرداری اور پرہیزگاری (دونوں باتوں) کا اس کو الہام کیا۔

اس آیت میں "الہام" کے بارے میں ایک بہت پرانی تفسیر[۱] میں دو شرحیں کی گئی ہیں؛

۱ ۔ خداوند تعالےٰ نے اس بدی اور خوبی کو نفس کے لیے واضح کر دیا ہے اور بیان کر دیا ہے۔
۲ ۔ خداوند تعالےٰ نے نفس میں اس فجور و تقویٰ کو پیدا کیا ہے۔

---

[۱] طبری ۔ ۳۰ : ۱۱۵ ...

Presented by Ziaraat.Com

عام طور پر معتزلہ پہلی تفسیر[۲] کو اور اشاعرہ دوسرے معنی[۳] کو منتخب کرتے ہیں۔ شیعہ تفاسیر میں الہام کو زیادہ تر اعلان کرنے اور تعریف بیان کرنے کے معنی میں لیا گیا ہے۔ یعنی خداوند تعالیٰ نے فجور اور تقویٰ کے راستوں کو پہنچوا دیتا ہے اور انسان کو ان دونوں میں سے ایک راستے کے اختیار کرنے کا ذمہ دار سمجھتا ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ الہام سے مراد توفیق اور کنارہ کشی ہے[۴]

الہام زیادہ تر اولیاء سے متعلق ہے اور وحی انبیاءؑ سے۔

شرع کی اصطلاح میں ہم نے دیکھا کہ وحی خدا کا کلام پیغمبرِ اکرمؐ کے لیے تھا۔ وحی ایک طرح دو قسم کی ہے: ظاہر یا جلی اور باطن یا خفی کہ یہ وہ ہے جو رائے اور اجتہاد کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔

وحیِ ظاہر بھی تین قسم کی کہی جا سکتی ہے:

۱۔ وہ جو فرشتے کی زبان سے ادا ہوتی ہے اور پیغمبر سنتے ہیں۔ جیسے قرآن۔

۲۔ وہ پیغام جو فرشتہ بغیر کلام کیے پہنچاتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

نَفَثَ فِیْ رُوْعِیْ

ذہن میں ڈال دیا (دم کر دیا یا پھونک دیا)۔

۳۔ الہام: شرع کی اصطلاح میں، فیضان کے طریقے سے دل میں القاء معنیٰ ہونا ہے۔ یعنی الہام فیضِ ربانی ہے جو یکایک نمودار ہوتا ہے اور جس پر الہام ہوا وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیوں اور کس طرح اس نتیجے پر پہنچا ہے۔ ہاں اس الہام اور علمِ عقلی میں فرق ہے۔ بقول شیخ محمد عبدہ: ایک معرفت ہے جو حاصل ہوتی ہے جس طرح غم و شادی کا احساس، گرسنگی و تشنگی کا احساس کہ اس کا مبداء اور منشاء سمجھ میں نہیں آتا۔ یعنی ایک احساس ہے جس کے مبداء کا پتہ نہیں چلتا[۵] مگر محمد عبدہ کے نظریئے کے برخلاف یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یقین بھی پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ عارفوں کا کشف اور واصلوں کا الہام دوسروں کے لیے یقین مہیا نہیں کرتا۔ ایک معرفت ہے بغیر یقین کے۔ اس کا مصدرِ حقیقی بھی پہچانا نہیں جاتا۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ یہ زیادہ تر اسی شخص سے مربوط ہوتا ہے جس پر الہام ہوا۔

الہام صرف انسان سے متعلق ہے کیونکہ یہ انسان ہی ہے جو اپنے حقِ انتخاب کے ذریعے دو متضاد جہتوں میں سے ایک کو منتخب کر سکتا ہے۔ جب کہ وحی، الہام کے برخلاف، بطورِ کلی ایک عمومی پہلو رکھتی ہے جو سارے فطری اور انسانی وجود دونوں سے متعلق ہے۔ جیسا کہ پچھلے صفحات میں ہم نے دیکھا کہ وحی انبیاءؑ، عام آدمی، شہد کی مکھی اور آسمان و زمین سب ہی پر کی گئی۔

---

[۲] کشاف۔ زمخشری ۴/۲۱۲ طبع بیروت، بیضاوی بھی زمخشری کا اتباع کرتا ہے ۲/۶۰۲ طبع عثمانی، تفسیر جو محی الدین سے منسوب ہے، وہ بھی بیضاوی کا اتباع کرتا ہے ۲/۳۹۶، تفسیر جلالین سیوطی میں ہے: بیّن لها طریق الخیر والشر

[۳] مفاتیح امام فخر۔ ۸: ۴۲۸۔

[۴] توفیق یعنی عطیۂ الٰہی جو کام کو انجام تک پہنچانے کا سبب بن جائے۔ کنارہ کشی یعنی لطفِ الٰہی سے بے بہرہ رہ جانا۔ تفاسیر ابو الفتوح رازی و مجمع البیان، صافی۔ سورہ الشمس آیت ۸ کے ذیل میں۔

[۵] رسالۃ التوحید۔ ۱۰۸۔

Presented by Ziaraat.Com

قرآن کی زبان میں الہام "تقویٰ اور فجور" دو موضوع پر محیط ہے۔ انسان ان ہی دونوں میں سے ایک کو اپنا سکتا ہے۔ چنانچہ الہام خود کوئی ہدایت کا پہلو نہیں رکھتا۔ یہ خود انسان ہے جو اپنے انتخاب سے اس کو ہدایت کا یا گمراہی کا پہلو دیتا ہے۔ اگر اس نے تقویٰ کا انتخاب کیا تو ہدایت پا گیا اور اگر فجور کو منتخب کیا تو گمراہ ہو گیا۔ مگر الہام اپنی جگہ گمراہی یا ہدایت کا سرچشمہ نہیں، جب کہ وحی صرف ہدایت کا پہلو رکھتی ہے اور اس کے نتیجے میں صرف تقویٰ کے پہلو کی حامل ہے۔

عارفوں کی نظر میں انبیاءؑ پر وحی اور الہام میں اس طرح کا فرق پایا جاتا ہے:

۱۔ الہام کشفِ معنوی ہے اور وحی کشفِ شہودی ہے[۶]

۲۔ نبیؐ اور غیر نبیؐ دونوں کو الہام ہو سکتا ہے مگر وحی (تنزیل) شرع کی نظر میں صرف نبیؐ سے مخصوص ہے یعنی خواصِ نبوت میں سے ہے جو شہودِ ملک (فرشتہ) سے اور کشفِ معنوی اور بعض اوقات بغیر فرشتے کی وساطت کے نازل ہوتی ہے۔ الہام میں عمومیت ہے اور ہر انسان کے دل میں اس کا امکان ہے —— خواہ نبیؐ ہو خواہ غیر نبی۔ جب کہ وحی انبیاءؑ کے ساتھ مخصوص ہے۔

۳۔ الہام میں تبلیغ نہیں ہے۔ وحی تبلیغ سے مشروط ہے۔ یعنی نبیؐ پر وحی کے ابلاغ کی ذمہ داری ہے۔ اگر وہ تبلیغ نہ کرے تو اس نے اپنی رسالت انجام نہیں دی۔ مگر جس پر الہام ہوا اس پر اس کی تبلیغ کی ذمہ داری نہیں۔

صوفیاء "خاطرِ ملکی"[۷] کو بھی الہام کہتے ہیں۔

مگر بہر حال شرع کی نگاہ میں انبیاءؑ پر الہام حجت ہے مگر اولیاء پر الہام صرف اسی شخص کے لیے امر یقینی ہے جس پر وہ الہام ہوا۔

الہام میں اور "وسواسِ شیطان" میں بھی فرق ہے۔ جس طرح خیر و شر میں فرق ہے[۸]

وحی اور الہام میں ایک اور بنیادی فرق ہے جس کو صدر المتالہین نے پیش کیا ہے۔

"وحی یعنی کان اور دل پر فرشتے کا نازل ہونا ماموریت اور پیغمبری کی خاطر تو منقطع ہو گیا ہے اور اب کوئی فرشتہ کسی پر نازل نہیں ہو گا کہ اس کو حکم کے اجراء کے لیے مامور کرے۔ "اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ" کے حکم کے تحت اس ذریعے سے جو کچھ انسانوں تک پہنچنا تھا وہ پہنچ چکا۔ مگر الہام و اشراق کا باب بند نہیں ہوا ہے اور اس کا امکان نہیں ہے کہ یہ راستہ مسدود ہو جائے"[۹]

---

۶ لغت میں "کشف" پردہ اٹھانا ہے اور اصطلاح میں غیبی معانی اور امورِ مخفی سے آگاہ ہونا ہے۔ کشفِ معنوی معانی غیبی سے پس پردہ جانا اور کشفِ شہودی یا تو مشاہدے کے ذریعے ہے، جیسے دیکھ کر یا سننے کے ذریعے سے جیسے پیغمبر اکرمؐ سنتے تھے (تعریفات، جرجانی ۱۶۲، کشاف اصطلاحات ۲: ۱۲۵۴، دستور العلماء ۳: ۱۲۴، شرح قیصری ۳۴)۔

۷ "خاطرِ ملکی" دل میں وہ ملکہ اور محرک ہے جو انسان کو نیکی کی ترغیب دیتا ہے اور برائی اور گناہ سے روکتا ہے۔

۸ احیاء العلوم۔ غزالی ۳: ۱۴ طبع مصر۔ دستور العلماء ۱: ۱۶۵، شرح فصوص ۳۵، شرح مقدمہ قیصری از آقای سید جلال الدین آشتیانی ۳۸۲ مشہد۔ کشاف اصطلاحات، کلیات ابو البقاء، تعریفات جرجانی ذیل الہام، وحی، کشف۔

۹ مفاتیح الغیب۔ ملا صدرا ۱۳۱، نقل از مقالہ ختم نبوت، استاد مطہری، خاتم پیامبران۔ ۱۲-۵۴۔

Presented by Ziaraat.Com

مختصر یہ کہ وحی، الہام سے جدا ہے۔ وحی فرشتے کا نازل ہونا اور پیغمبر سے کلام کرنا ہے جب کہ الہام ایک قسم کا اندرونی احساس و ادراک اور روحانی عمل ہے جس نے کبھی انسان کو واسطہ ہوتا ہے۔ اس کی مثال عارفانہ اور شاعرانہ الہام ہے۔ ادراک تو ہوتا ہے مگر اس کا سرچشمہ اور منبع واضح نہیں ہوتا۔ وحی کا منبع روشن اور آشکار ہوتا ہے۔ خود وحی انسان کے لیے تازہ احکام و قوانین کے صادر ہونے کا منبع ہوتا ہے۔ الہام صرف قوانین ہستی کا کشف کرتا ہے۔

"افسانۂ غرانیق"

پیغمبر کے لیے ضروری ہے کہ وہ وحی کو حاصل کرنے میں خطا اور غلطی سے قطعی مبرا ہو۔ سب ہی یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جو عصمت انبیاء کی حقیقت پر مکمل یقین نہیں رکھتے، وہ بھی وحی کے ابلاغ میں عصمت رسول کو قبول کرتے ہیں۔ وحی کے حاصل کرنے، اس کے یاد کرنے، اس کو محفوظ کرنے اور لوگوں تک اس کو پہنچانے میں نبی کو ہر خطا اور لغزش سے معصوم اور محفوظ ہونا چاہیے۔ وہ کلمات الٰہی کو دل اور جان سے سنتا ہے۔ وہ حق جو اس پر نازل ہوا اس کو شعور اور بصیرت کامل کے ساتھ دن جیسی روشنی میں اور بغیر کسی ابہام کے درک کرتا ہے اور کسی خطا اور لغزش کے بغیر اس کو محسوس کرتا ہے[1] اور انتہائے امانت کے طور پر اس کو لوگوں تک پہنچاتا ہے۔

خداوند تعالیٰ نے خود اس کی عصمت کی ضمانت دی ہے اور بار بار تائید کی ہے۔ مثال کے طور پر

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى (۸۷ : ۶)

ہم تم پر آیات قرآن پڑھتے ہیں کہ فراموش نہ کرو۔

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ (۷۵ : ۱۷)

قرآن کا جمع کرنا اور پڑھوانا ہمارے ذمے ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵ : ۹)

ہم نے تم پر قرآن نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔

اس صورت میں یہ بات بالکل روشن ہے کہ شیطان یا شیطان صفت لوگوں کے لیے اب کوئی راستہ نہیں رہ گیا کہ پیغمبر پر نفوذ کریں اور وحی میں تغیر پیدا کریں۔ خداوند تعالیٰ نے خود شیطان سے کہا:

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ (۱۷ : ۶۵)

ہمارے بندوں پر تو تسلط حاصل نہیں کر سکے گا۔

یہ خدا نے خود فرمایا کہ "ہمارے بندوں" پر شیطان قطعاً تسلط حاصل نہیں کر پائے گا۔

اس جگہ ایک دوسری داستان جو بعض زندیق لوگوں نے وضع کی اور جس کو "افسانہ غرانیق" کہا جاتا ہے قارئین کے لیے دہرائی جاتی ہے۔

---

[1] شرح تجرید الاعتقاد - ۱۹۵، وحی یا شعور مرموز - ۱۴۰

www.ziaraat.com
Sabeel-e-Sakina

Presented by Ziaraat.Com

افسانہ یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ جب مسلمانوں پر قریش کی سختیاں بہت بڑھ گئیں تو ان میں سے کچھ لوگوں نے اپنا گھر بار چھوڑا اور مکہ سے حبشہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ حبشہ آئے ہوئے تقریباً تین مہینے گزرے تھے کہ خبر ملی مکہ میں قریش کے ظلم و ستم میں کمی آگئی ہے اور وہاں ماحول بہت بہتر ہو گیا ہے۔ اس خبر سے سب میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور انہوں نے مکہ واپسی کی ٹھانی۔ مکہ کے قریب پہنچے تو بنی کنانہ کے کچھ لوگوں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ ان سے مکہ کا حال احوال پوچھا۔ بنی کنانہ والوں نے بتایا کہ محمدؐ (مشرکین) کے خداؤں کو اچھے لفظوں سے یاد کیا تو وہ نبیؐ کے پیرو ہو گئے۔ بعد میں اپنے کہے سے پھر گئے اور ان کے خداؤں کو برا بھلا کہنے لگے۔ اب ان (مشرکین) نے بھی دوبارہ ظلم و ستم پر کمر باندھ لی ہے۔ مسلمان یہ سن کر تذبذب میں پڑ گئے مگر بہر حال مکہ دیکھنے کے شوق میں آگے چل پڑے۔ مکہ پہنچ کر بعضوں نے کچھ لوگوں کی پناہ حاصل کر کے بود و باش اختیار کر لی اور ان میں سے کچھ دوسرے نئی جمعیت کے ساتھ حبشہ واپس گئے اور پھر مدینہ ہجرت تک وہیں رہے۔

مگر یہ جو کہا گیا کہ ان (مشرکوں) کے خداؤں کو اچھے نام سے یاد کیا گیا۔ یہ کیا بات تھی؟ اس واقعے کو واقدی، طبری اور ابن سعد نے نقل کیا ہے۔ ان کے بعد بہت سے مفسرین اور سیرت نگاروں نے اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے۔ اس ذریعے سے اسلام کے مخالفوں اور غیر مسلموں کو بہترین بہانہ مہیا کر دیا ہے۔ وہ قصہ آخر ہے کیا؟

کہا جاتا ہے کہ جب پیغمبرؐ کو قریش کی شدید مخالفت کا سامنا ہوا اور ان کے ظلم و زیادتی اور عقوبتوں کو دیکھا تو دل میں خیال آیا کہ کاش کوئی ایسی چیز ہم پر نازل نہ ہو جو اپنے لوگوں اور رشتہ داروں کی نفرت کا باعث بنے۔ چنانچہ آپؐ اپنے لوگوں (قریش) سے اور قریب ہوئے اور ان میں گھلنے ملنے کی کوشش کی۔ ایک دن کعبہ کے پاس قریش کے سرداروں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ وہاں آپؐ نے سورۂ نجم کی تلاوت کی اور اس آیت پر پہنچے:

اَفَرَاَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى (۵۳: ۱۹ و ۲۰)

کیا تم نے لات و عزیٰ اور تیسرے منات کے حال میں غور بھی کیا ہے۔

اور آگے پڑھا:

تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى. وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى.

یہ بلند پرواز پرندے (بگلے) ہیں۔ شاید ان کی شفاعت کی امید ہو۔

سورہ کے آخر میں سجدے کی آیت آئی تو سجدے میں جھک گئے۔ مسلمان جو آپؐ کے ساتھ وہاں موجود تھے وہ بھی سجدے میں گئے۔ مشرکین بھی جو وہاں بیٹھے تھے سب سجدے میں چلے گئے۔ یہاں تک کہ چند آدمیوں کے لیے کہا گیا ہے کہ بڑھاپے کی وجہ سے جھک نہیں سکے تو انہوں نے حرم کی ریت ہاتھ میں اٹھا کر اس پر سجدہ کیا۔ ان میں سے ایک ولید بن مغیرہ تھا اور دوسرا ابواحیحہ سعید بن عاص یا امیہ بن خلف تھا۔ جو کچھ پیغمبرؐ نے پڑھا تھا اور اس میں ان کے خداؤں کو شفاعت کے درجے پر قبول کیا تھا اس سے قریش خوش ہو گئے۔ مگر جب آپؐ نے سنا کہ قریش کہہ رہے ہیں کہ "اب آپؐ بتوں کے حق ہونے کے قائل ہو گئے ہیں تو ہم سب آپؐ کے ساتھ ہیں" تو آپ بہت برہم ہوئے۔ رات کو جبرئیلؑ نازل ہوئے اور پیغمبرؐ نے سورۂ نجم ان کو پڑھ کر سنائی۔ جب "تلک الغرانیق" کے الفاظ پہنچے تو جبرئیلؑ نے کہا: "میں یہ الفاظ نہیں لایا تھا۔" پیغمبرؐ بہت پریشان ہوئے۔ آپؐ کی تسلی اور دلداری کے لیے یہ آیات

Presented by Ziaraat.Com

نازل ہوئیں :

وَإِن كَادُوا لَيَفْتِنُونَكَ عَنِ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهُ ۖ وَإِذًا لَّاتَّخَذُوكَ خَلِيلًا ۔ وَلَوْلَا أَن ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدتَّ تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا ۔ إِذًا لَّأَذَقْنَاكَ ضِعْفَ الْحَيَاةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيرًا (۱۷ : ۷۳ - ۷۵)

قریب تھا کہ جو کچھ ہم نے تمہاری طرف وحی کیا تھا یہ (کافر) لوگ اس کی نسبت تم کو فتنے میں ڈال دیتے تاکہ تم اس کے خلاف ہم پر افترا کرو اور اس صورت میں تم کو دوست بنا لیتے ۔ اگر ہم نے تم کو ثابت قدم نہ رکھا ہوتا تو یقیناً تم ان کی طرف کچھ تھوڑا سا جھکنے کے قریب ہو جاتے ۔ اس صورت میں ہم تم کو زندگی کا دگنا اور موت (کے بعد) کا دگنا (عذاب) چکھاتے پھر تم ہمارے خلاف کسی کو مددگار نہ پاتے ۔

اس بارے میں روایات بیشک بہت بے ترتیب اور گڈمڈ ہیں ۔ کچھ لوگ اس کو نقل کرتے ہیں اور کبھی کسی نے اس کی تائید بھی کی ہے ۔ مگر اکثریت نے اس کو رد کر دیا ہے اور اس کو قبول نہیں کیا ۔ کچھ کا کہنا ہے کہ ممکن ہے جب رسولؐ اللہ نے بتوں کا نام لیا تو بعض مشرکین جو وہاں بیٹھے تھے انہوں نے خیال کیا کہ کوئی ایسی بات نہ کہہ دیں جس سے لوگ خفا ہو جائیں ، اپنی طرف سے ان الفاظ کا خود اضافہ کر دیا ۔ جو دور بیٹھے تھے انہوں نے خیال کیا کہ یہ خود رسولؐ اللہ کے الفاظ ہیں ۔ کیونکہ عموماً یہ ہوتا تھا کہ جب رسولؐ اللہ ان کے درمیان قرآن کی تلاوت کرتے تو یہ (مشرک) آپس میں باتیں کرتے رہتے ، اشعار پڑھا کرتے ، تالیاں بجاتے اور قسم قسم کی آوازیں نکالتے تاکہ لوگ آپؐ کی بات سمجھ نہ سکیں ، دوسرے بالکل نہ سنیں اور خود رسولؐ اللہ کے کلام میں رخنہ پڑے ۔

علاوہ ازیں یہ دو الفاظ ایک مقبول گانے میں سے لیے گئے تھے جو زمانۂ جاہلیت میں لوگوں کو بہت پسند تھا اور رسم و رسومات کے موقع پر اس کو گایا کرتے تھے ۔

"غرانیق" کے طرفدار اپنی بات کے لیے یہ شہادت لاتے ہیں :

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّىٰ أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ فَيَنسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ آيَاتِهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۔ لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ فِتْنَةً لِّلَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ ۗ وَإِنَّ الظَّالِمِينَ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ (۲۲ : ۵۲ ، ۵۳)

اور ہم نے تم سے پہلے نہ کوئی رسول بھیجا اور نہ کوئی نبی مگر یہ کہ جب اس نے (تمنا کی) یا (اللہ تعالیٰ کے احکام میں سے) کچھ پڑھا تو شیطان نے اس کے پڑھنے میں (یا تمنا میں) شبہ ڈالا ۔ پھر جو کچھ شیطان کہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو مٹا دیتا ہے ۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنی آیات کو محکم کر دیتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ بہت جاننے والا بڑی حکمت والا ہے ۔ تاکہ شیطان نے جو کچھ کہا ہے اس کو ان لوگوں کے لیے آزمائش قرار دے جن کے دلوں میں مرض ہے اور جن کے دل سخت ہیں ۔ یقیناً ظالم پرلے درجے کی مخالفت میں پڑے ہیں ۔

طرفداروں کا کہنا ہے کہ جب مشرکین کا ظلم و ستم حد سے بڑھا تو آنحضرتؐ نے حکم فرمایا کہ مسلمان حبشہ ہجرت کر جائیں ۔ آپؐ چونکہ دل سے چاہتے تھے کہ قریش ہدایت حاصل کریں لہٰذا آپؐ ان کے قریب ہوئے اور سورۂ نجم کو ان دو الفاظ (تلک غرانیق) کے ساتھ

www.Ziaraat.Com Sabeel-e-Sakina

Presented by Ziaraat.Com

پڑھا۔ مستشرق مورخ اس میں اضافہ کرتا ہے کہ جب حبشہ میں مسلمانوں کو صلح اور میل ملاپ کی خبر پہنچی تو وہ کے واپس آ گئے۔

یہ اس حادثہ کے وقوع پذیر ہونے کے طرفداروں کے دلائل تھے جنہیں افسوس ہے کہ تفسیر، حدیث اور سیرت کی کتابوں میں خوب خوب جگہ ملی ہے اور قدیم افسانہ گھڑنے والوں اور جدید دور کے نکتہ پردازوں کی کوششوں سے اس میں رنگ و بار آ گئے ہیں۔ مگر خود اس افسانے میں اس کے گھڑے ہوئے اور جعلی ہونے کا پہلو موجود ہے۔ یہ بلا وجہ کا شور و غل ہوتا رہا ہے جب کہ بات کچھ بھی نہیں تھی۔

اس کے بے حقیقت افسانہ ہونے کا ثبوت قرآن سے، روایات سے، لغت سے، تاریخ سے اور خود عقلِ انسانی سے بہم پہنچتا ہے۔ ممکن ہے یہ بحث کچھ طویل ہو جائے مگر موضوع کی وضاحت کے لیے زمانۂ جاہلیت میں عربوں کا بتوں کے بارے میں کیا عقیدہ تھا اس کا بھی ذکر بہتر رہے گا۔

عرب بت پرستوں میں تین بت لات، منات اور عزّیٰ بہت مقبول تھے۔ ان کو فرشتوں کا مظہر اور اپنے اور "اللہ" کے درمیان واسطہ، وسیلہ اور شفیع سمجھتے تھے۔

لات: طائف میں ثقیف قبیلے کا بت (آج کی مسجد کے مینار کے بائیں طرف) سفید پتھر کا بنایا گیا تھا جو بعد میں رسول اللہ کے حکم سے توڑ دیا گیا[53] قریش اور دوسرے قبائل بھی اس کو بڑا (خدا) سمجھتے تھے[54] مکہ اور دوسری جگہوں کے لوگ زیارت کو آیا کرتے۔ اس کے حرم کے طور پر باغ اور چراگاہ خاص تھی جس میں درخت کاٹنا، شکار کرنا اور خونریزی قطعی ممنوع تھی۔

منات: یثرب (مدینہ) کا بت تھا جس کے خزاعہ اور ہذیل میں سے بھی کچھ اس کی پرستش کرتے تھے۔ قریش اور باقی عرب بھی اس کو بڑا سمجھتے تھے۔ منات کا بتکدہ جو سنگ سیاہ کا تھا مکہ اور مدینہ کے درمیان سمندر کے کنارے واقع تھا۔ فتح مکہ کے موقع پر (۸ھ) حضرت علیؑ کے ہاتھوں ڈھایا گیا[55] لوگوں نے اپنے لیے اس کے مختلف مظاہر قیاس کیے ہوئے تھے۔

عُزّیٰ: یہ زہرہ ستارے کا مظہر تھا اور اس کی بڑی عظمت تھی۔ قریش کا سب سے بڑا بت تھا۔ اس کی مجاوری بعد میں بنی سُلَیم، کنانہ، خزاعہ اور یہاں تک کہ ثقیف تک پہنچی۔ مدینہ کے اشراف نے بھی اس کے لیے کچھ مظاہر اور صفات گھڑ رکھے تھے۔ اس بت کا معبد وادی نخلہ شامیہ، میں مکہ اور عراق کے درمیانی راستے پر تھا۔ اس کا حرم، قربانگاہ اور دوسری عمارتیں بھی تھیں جن کو پیغمبرؐ کے حکم پر (۸ھ) نابود کر دیا گیا[56] عزّیٰ کا حرم تین درختوں سے بنایا گیا تھا جہاں انسان کی قربانی پیش کی جاتی تھی۔

یہ تینوں بت وہ مثلث تھے جو حق کی تجلی، ملائکہ کی تصویر اور خدا کی بیٹیاں سمجھے جاتے تھے۔

---

۵۲ مثال کے طور پر سیوطی نے اس مضمون کی ۱۴ روایات نقل کی ہیں۔ الدرالمنثور ۴: ۸۱ – ۳۶۶۔

۵۳ بخاری، تفسیر ۵۳: ۲ و ۳؛ ابن ہشام ۱۶۹ گوٹنگن۔

۵۴ البلدان ۷: ۳۱۰؛ المحبّر ۳۱۵؛ واقدی ۳۸۴ برلن، مسالک الذہب ۴: ۱۰؛ بلوغ الارب آلوسی ۲: ۲۰۳۔

۵۵ اصنام۔ کلبی ۱۳، ۱۴، ۱۹۔

۵۶ ابن سعد ۲/۱/۱۵۰، واقدی ۳۵۱ برلن، ابن ہشام ۸۳۹، اصنام۔ کلبی ۲۵/۱۴/۱۱۔ اعلام قرآن خزائلی ۴۳۱۔

Presented by Ziaraat.Com

جبرئیل سے کہ برعکس جو ملائکہ کو "بنی ابراہیم" یعنی خدا کے بیٹے کہتے تھے، مشرکین فرشتوں کو "خدا کی بیٹیاں" سمجھتے تھے۔[7] اسی کی کوشش کی گئی ہے کہ ایسی باتوں کا جواز تلاش کیا جائے۔ چنانچہ کہا گیا کہ "خدا کی بیٹیاں" حقیقی معنوں میں نہیں کہا جاتا تھا بلکہ امکان ہے "بنات اللہ" کا استعمال مجازی معنی میں ہو جیسے "بنت الشفۃ" یعنی لبوں کی بیٹی سے مراد الفاظ اور "بنت العین" یعنی آنکھوں کی بیٹی سے مراد آنسو ہیں یا پھر "بنت الدھر" مصائب کو کہا کرتے ہیں۔ اس طرح "بنات اللہ" سے مراد آسمانی مخلوقات اور مافوق الفطرت موجودات تھے۔[8] مگر حقیقت یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عربوں کے سروں میں یہی سمایا ہوا تھا اور ان کا اس پر اعتقاد تھا کہ خدا اور جنوں میں شادی ہوتی ہے اور فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں۔[9]

چنانچہ یہ تینوں بت لات، عزّیٰ اور منات بھی "خدا کی بیٹیاں" شمار ہوتے تھے۔ ان کے خیال میں یہ تینوں بت فرشتوں کے جانشین اور مظہر تھے اور خدا کی بیٹیاں ہونے کی وجہ سے اس سے قریب تھے اور خدا سے انسانوں کی شفاعت کر سکتے تھے (یا کر سکتی تھیں) اور حاجتمندوں کی حاجت بر لا سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں ان بتوں کے بارے میں بحیثیت "شفیع" کے زیادہ ذکر آیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ صرف بت اور فرشتے ان کے عقیدے کے مطابق شفیع نہیں ہو سکتے بلکہ کوئی مادی معبود بھی شفیع ہو سکتا تھا (۳۹ : ۴۴) بعض آیات سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے ان شفیعوں کے لیے قسم قسم کی عبادات اختراع کی ہوئی تھیں (مثال کے طور پر ۱۰ : ۱۸)۔ قرآن میں ان کی شفاعت کے رد کے بارے میں اتنی بہت سی آیات سے پتہ چلتا ہے کہ مشرکوں کا ان کی شفاعت پر اعتقاد بہت گہرا اور ہر جگہ مروج تھا۔ قرآن اس عقیدے کی رد پر بہت اصرار کرتا ہے۔[11] یہ ممکن ہی نہیں کہ یہ شفیع بن سکیں۔[12] روز حساب جب مشرکین بتوں کو اپنی مدد کو پکاریں گے تو ان کو کوئی جواب نہیں ملے گا۔[13] بت انسان کی کسی قسم کی اعانت اور مدد نہیں کر سکتے۔[14] بتوں کی شفاعت ان کے ذہنوں میں ایسی راسخ ہو گئی تھی کہ خدا تک پہنچنے کا واحد ذریعہ وہ ان ہی شفیعوں سے توسل کو جانتے تھے۔ اسی بنا پر پیغمبر اکرم سے جھگڑتے تھے کہ ہمارے یہ خدا "خدا کی بیٹیاں" ہیں اور اس نسبت سے ہمارے شفیع ہیں۔ ان مشرکین کا یہ خیال زیادہ معقول اور منطقی معلوم ہوتا ہے بہ نسبت اس قیاس آرائی کے کہ "عیسیٰ خدا کے بیٹے" ہیں۔ اسی لیے خداوند تعالیٰ نے ان کی اس بات کو رد کرتا ہے (۴۳ زخرف : ۵۷ - ۶۰) کہ یہ قیاس غلط ہے۔ نصاریٰ کے عقیدے پر اعتراض دو سرے پہلو سے ہو سکتا ہے۔ حضرت عیسیٰ ایک انسان تھے، خدا کے بندے جن کو خداوند تعالیٰ نے رسالت کے لیے

---

[7] سفر پیدائش ۶: ۲، ایوب ۱: ۶ ۔

[8] قرآن مجید میں ذکر آچکا ہے۔ ۱۷: ۴۰ و ۲۱: ۲۶ - ۲۹ و ۳۴: ۴۰ و ۳۷: ۱۵۰ و ۴۳: ۱۹ و ۵۳: ۲۷ و ۲۸ ۔

[9] بقایای بت پرستی۔ ولہاؤزن ۲۴ — WELLHAUSEN; RESTE, 24.

[10] لباب النقول ۔ سیوطی ۔ ۱۱۲ طبع ۱۲۹۰ ۔

[11] ۲: ۴۸، ۲۵۵ و ۶: ۵۱، ۹۴ و ۱۰: ۳، ۱۸ و ۱۹: ۸۷ و ۲۰: ۱۰۹ و ۳۲: ۴ و ۳۴: ۲۳ و ۳۹: ۴۳، ۴۴ و ۵۳: ۲۶ و ۷۴: ۴۸ ۔

[12] ۱۰: ۱۸ و ۱۹: ۸۷ و ۳۰: ۱۳ و ۴۳: ۸۶ ۔

[13] مثل ۷: ۱۹۴ و ۱۶: ۸۶ و ۱۸: ۵۲ و ۱۹: ۸۵ - ۹ و ۲۸: ۶۲، ۶۳، ۷۴ ۔

[14] مثل ۴: ۱۹۶، ۷: ۱۰، ۱۸۱، ۱۹۴ و ۱۷: ۵۶ و ۲۱: ۴۳ ۔

منتخب کیا (۴۲ : ۵۱ - ۴۴)۔

اب "افسانۂ غرانیق" کے رد میں دلائل پیش کیے جاتے ہیں۔

قرآن سے

اول اور سب سے اہم دلیل خود سورۂ نجم ہے، جس کے بارے میں کہا گیا کہ پیغمبر اکرمؐ نے دو اضافی الفاظ کے ساتھ اس کی قراءت کی۔ یہ ہیں سورۂ نجم کی آیات:

اَفَرَاَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى (۵۳ : ۱۹ - ۲۳)

کیا تم نے ان دو بتوں لات و عزیٰ کو دیکھا، اور آخری تیسرے منات کو؟ کیا تمہارے نصیب میں تو لڑکے ہیں اور خدا کے نصیب میں لڑکیاں؟ (ان تینوں بتوں کو خدا کی لڑکیاں کہتے تھے اور خود اپنی لڑکیوں کو زندہ زمین میں گاڑ دیتے تھے) یہ بڑی نامنصفانہ تقسیم ہے۔ یہ بس وہ نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں۔ خدا نے ان کے لیے کوئی سند نہیں اتاری۔ وہ محض گمان کا اتباع کرتے ہیں، اور اس کا، جس کو ان کے نفس چاہتے ہیں۔ اگرچہ ان کے پاس ان کے پروردگار کی طرف سے ہدایت آچکی ہے۔

کس آسانی سے ان کے خداؤں اور پوچ اور باطل اعتقادات کو غلط ثابت کیا گیا اور ان کی تحقیر کی گئی ہے۔ یہ لات و منات و عزیٰ جس کی اتنی عزت و تکریم ہے محض نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباء و اجداد نے رکھ لیے ہیں۔ خداوند تعالےٰ نے تو ان کو کوئی دلیل یا قدرت عطا نہیں کی۔

اب کس طرح ممکن ہے کہ ایسی آیات کے بیچ میں دو الفاظ اس طرح یکایک ٹھونس دیے جائیں جن سے ان بتوں کی مدح اور تعریف ہو رہی ہو۔ ایسا کیا جائے تو کیا نتیجہ نکلے گا وہ بھی دیکھ لیا جائے:

اَفَرَاَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى اِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى......

کیا تم نے ان دو بتوں لات اور عزیٰ کو دیکھا اور تیسرے منات کو...... یہ بلند پرواز پرندے ہیں جن کی شفاعت کی امید کی جاتی ہے...... کیا تمہارے نصیب میں لڑکے ہیں اور خدا کے نصیب میں لڑکیاں؟

قابلِ غور بات یہ ہے کہ اسی سورہ کے شروع میں خصوصاً کہا گیا ہے کہ پیغمبر کبھی بھی ہوائے نفس سے بات نہیں کرتے اور یہ کلام بھی سوائے خدا کی وحی کے اور کچھ نہیں (۵۳ : ۳ و ۴)۔ کیا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ دونوں جملے خدا کی طرف سے وحی کیے گئے تھے اور بتوں کی بڑائی اور ان سے (شفاعت کی) صفات منسوب کرنا آیاتِ الٰہی ہو سکتی ہیں، جب کہ ان دونوں جملوں کے اضافے سے آیات کا مجموعہ گڈمڈ ہو جاتا ہے۔ قرآن کی خصوصیات میں سے ہے کہ اس کی چند آیات مل کر ایک مجموعے کو تشکیل دیتی ہیں کہ جن کو بے جگہ کیا جائے یا کم و بیش کیا...

Presented by Ziaraat.Com

تو اس مجموعے کا نظم بگڑ جاتا ہے۔ اس سورہ میں اوّل ان خداؤں کا تمسخر کیا جاتا ہے اور مذاقیہ پیرائے میں کہا جاتا ہے کہ ان تین بتوں کو دیکھا؟۔ یکایک یہ پیرایہ بدل جاتا ہے اور عتاب کی جگہ تعریف ہونے لگتی ہے کہ بلند پرواز پرندے ہیں جن سے شفاعت کی امید وابستہ ہے اس کے بعد پھر دوبارہ وہی سخت حملہ شروع ہو جاتا ہے کہ یہ سب صرف نام ہیں، خداوند عالم نے ان کو کوئی قدرت و طاقت عطا نہیں کی ہے! کیا عقل سلیم اس طرز گفتگو کو قبول کرتی ہے؟ باقی باتوں کو چھوڑیئے خود اس زمانے کے لوگوں کے بارے میں ہم کیا خیال کریں۔

ولید بن مغیرہ ایک سخن شناس شخص تھا۔ زمانۂ جاہلیت میں عرب کا نامی قاضی اور منصف تھا۔ اس کا نام "عدل قریش" تھا[۱۵۵] خالد کا باپ تھا۔ عربوں میں ذہانت اور فراست کے لیے مشہور تھا۔ وہاں جو دوسرے بیٹھے تھے وہ بھی قریش کے اکابرین میں سے تھے۔ ان میں سے ایک سعید بن عاص تھا جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اسلام سے اس قدر بغض رکھتا تھا کہ بستر مرگ پر کہا کرتا تھا اگر اس بیماری سے شفا پائی اور اس بستر سے اٹھا تو پھر مکہ میں کوئی محمّد کے خدا کی عبادت نہیں کر پائے گا۔ اس کا لڑکا خالد دعا کرتا تھا کہ خدایا اس کو پھر اس بستر سے نہ اٹھانا[۱۵۶] اور اسی بستر پر اس کو واحد غم یہ تھا کہ اس کے بعد کوئی عُزّیٰ کی پرستش نہیں کرے گا[۱۵۷] بہرحال یہ سب لوگ اپنی فطانت و ذہانت کا اپنے شہر میں شہرہ رکھتے تھے۔ ان سب کو سخن شناسی اور فصاحت پر ناز تھا۔ زبان کے زیروبم کو خوب سمجھتے تھے۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہ سورہ یا کم از کم اس کی پہلی ۲۶ آیات بعثت کے دو یا تین سال بعد یعنی اس واقعے سے دو تین سال پہلے نازل ہو چکی تھیں مسلمان تو یقینی طور پر ان آیات سے اچھی طرح واقف تھے مشرکوں کو بھی ان سے شدبد ضرور ہو گی۔ آخر ان کا سارا جھگڑا پیغمبرؐ سے اسی بات پر تو تھا۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ مشرکوں کو خبر نہ ہو کہ پیغمبرؐ آخر کیا کہہ رہے ہیں۔ ایسے بہت سے مواقع نظر میں ہیں جب مشرکین آیات الٰہی پر پیغمبرؐ سے بحث مباحثہ کرتے نہ تھکتے۔ ایک واقعہ تو پچھلے صفحات میں بیان ہوا ہے۔ قدرتی بات ہے کہ ان کے ذہن پہلے سے اس بات سے آشنا تھے کہ پیغمبرؐ نے کیا کہا اور اگر پہلے سے اندازہ نہیں تھا تو اسی موقع پر جب ساری آیات پیغمبرؐ سے سنیں تو کیسے ممکن ہے کہ یکایک دو مختصر جملوں کی بنیاد پر مشرکین خوش ہو جائیں اور اپنی رضامندی (اور میل جول) کا اظہار بھی کر دیں۔ کیا انہوں نے اس سے پہلے اور بعد کی آیات پر ذرا بھی غور نہیں کیا۔ سورہ کے آغاز میں بھی ان بتوں اور ان کے پوجنے والوں پر حملہ ہے اور آخر میں بھی وہی سختی اور تنبیہ ہے۔

اب ان دو آیات کا بھی مطالعہ کیا جائے جو اس "افسانۂ غرانیق" کے طرفدار دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں:

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ ۔۔۔۔ (۱۷: ۷۳ تا ۷۵)

کے بارے میں جو ان کا کہنا ہے کہ اس وجہ سے نازل ہوئی وہ صحیح نہیں۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ رسولِ خدا کے پاس ثقیف کا وفد آیا ہوا تھا اور کوئی درخواست پیش کی تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کے قبیلے کے بت "لات" کی حرمت محفوظ رہے، ان کا شہر طائف، مکہ کی طرح حرم امن مانا جائے اور عرب ان کی برتری اور فضیلت پہچانیں ۔۔۔ اور اسی طرح کی باتیں جس سے خدا پر ایمان لین دین (کچھ دو کچھ لو) کے ذریعے طے

---

[۱۵۵] الاعلام - زرکلی - (یہی نام) -

[۱۵۶] ابن سعد ۴/۱/۹۹ -

[۱۵۷] اسلام و کلبی - ۲۴ -

Presented by Ziaraat.Com

پلٹ گئے۔ پیغمبرِ خدا خاموش رہے اور جواب نہیں دیا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی[۱۵]۔ اس کے علاوہ ایک دو اور سبب بیان کیے گئے ہیں[۱۶] یہ واقعہ مدینے سے مربوط ہو جاتا ہے اسی لیے اس آیت کو مدنی لکھا گیا ہے۔ جو اس کو مکی آیت سمجھتے ہیں وہ اس کا نزول بعثت کے آٹھویں سال کہتے ہیں، یعنی اس فرضی واقعے کے تقریباً دو تین سال بعد۔ علاوہ ازیں ابلاغِ رسالت میں عصمت طے شدہ بات ہے۔ پیغمبر کو ہمیشہ خدا کا فضل و رحمت ڈھانپے رہتی تھی جیسا کہ فرمایا:

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا ۔ (۴۸:۵۲)

تم اپنے پروردگار کے حکم کے لیے صبر کرو۔ یقیناً تم ہماری نگرانی میں ہو۔

چنانچہ نہ صرف یہ کہ مشرکین آپ کو گمراہ نہیں کر سکتے بلکہ ایسا غرور کرنے کی سوچ بھی نہیں سکتے کیونکہ آپ کے لیے فضلِ خدا کہیں زیادہ برتر اور وسیع ہے (۴ : ۱۱۳)۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ .... (۲۲ : ۵۲-۵۳)

یہی شانِ نزول کچھ اور ہے۔ یہ بعثت کے دسویں سال اور اس واقعے کے پانچ سال بعد نازل ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں اس آیت کا حقیقی معنی لفظ "تمنّیٰ" سے ربط رکھتا ہے جب رسول اللہ تمنا کرتے ہیں تو شیطان چاہتا ہے کہ اس تمنا میں کچھ القا کرے۔ اللہ تعالیٰ اس شیطان کے القا کو مٹا دیتا ہے۔

لغت میں تمنّیٰ کے دو معنی ہیں: دلپسند چیز کے وجود کا فرض کرنا۔ آرزو تمنا ہے۔ آرزو کرنے والا اس چیز کیلیے اس کے وجودِ خارجی کا خواہاں ہوتا ہے۔ پیغمبر کی آرزو خلق کی ہدایت ہے۔ شیطان اس کے مقابل میں وسوسہ القا کرنا چاہتا ہے۔ اگر تمنا کے معنی تلاوت کے لیے جائیں تو آیت کا معنی یہ ہوا کہ جب ہمارے پیغمبر ہماری آیات کی تلاوت کرتے تھے تو شیطان انسانوں میں القا اور وسوسہ ڈالتا تھا تاکہ تلاوت کا اثر زائل کر دے[۱۷]۔

بقول آلوسی یہ آیات خصوصاً غرانیق کے قصے کے سلسلے میں نازل نہیں ہوئیں بلکہ انبیاء اور رسولوں پر شیطان کے وسوسے کے بارے میں ہیں۔ اب ان دونوں جملوں کا جن کو پیغمبر اکرم سے منسوب کیا گیا تھا، قرآن سے موازنہ کریں۔

اس افسانے کو قرآن کے مقابل رکھ کر دیکھا جائے تو قرآن سے اس کا گہرا تضاد صاف نظر آتا ہے۔

خداوند تعالیٰ نے خود فرمایا:

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ، لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ۔ (۶۹ : ۴۴-۴۶)

اگر یہ (محمد) ہم پر بعض باتوں کا افترا کرتے تو ہم یقیناً ان کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے اور ان کی شہ رگ کاٹ ڈالتے۔

یہ آیت بعثت کے تقریباً تیسرے سال اور اس (غرانیق کے) فرضی واقعے سے ایک دو سال پہلے نازل ہوئی تھی۔ اب یہ کیونکر ممکن تھا

---

۱۵ تفسیر فخر رازی، کشاف زمخشری و اسباب النزول واحدی ص ۱۶۷

۱۶ لباب النقول ص ۸۴۔

۱۷ تفسیر المیزان۔ ۱۴ : ۴۲۹۔

www.ziaraat.com
sabeel-e-sakina

Presented by Ziaraat.Com

کہ پیغمبرِ خدا کوئی بات خدا سے منسوب کر دیں اور پھر انکار کریں اور اللہ تعالیٰ اس گناہِ عظیم سے چشم پوشی کرے۔ یہ اللہ تعالیٰ سے قول منسوب کرنا ہے کیا؟ اگر قرآن پر غور کریں اور اس کی شہادت قبول کریں تو کبھی بھی ایسا افسانہ حقیقت کا لباس نہیں پہن سکتا۔

یہ بھی کہ قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي ..... (۱۰ : ۱۵)

اور ایسی بہت سی دوسری آیات۔ شفاعت کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا!

قُلْ لِلَّهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا (۳۹ : ۴۴)

کہہ دیں کہ سب شفاعت اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔

اور "اس دن کوئی سفارش فائدہ نہ دے گی سوائے اس (کی سفارش) کے جس کو (خدا نے) رحمٰن نے اجازت دے دی اور جس کی بات کو اس نے پسند کر لیا۔" (۲۰ : ۱۰۹)

ان ساری آیات کی موجودگی میں ایک مسلمان کس طرح کہہ سکتا ہے کہ ان آیاتِ الٰہی کے بیچ میں پیغمبرِ اکرمؐ نے ایسے جملے بولے اور (نعوذ باللہ) ان کو خدا سے نسبت دی تاکہ مشرکوں کی تسلی تشفی ہو۔ یہ عقل و فہم سے دور کی بات ہے۔

احادیث سے

اس بارے میں روایات قسم قسم کی ملتی ہیں۔ ان کے مطابق:

پیغمبرؐ نے خود ان دونوں جملوں کو سورۂ نجم میں بڑھایا تھا، شیطان نے آپ کی زبان پر رکھ دیا تھا، شیطان نے خود بلند آواز سے پڑھا تھا، مشرکوں میں سے کسی ایک نے جو پیغمبرؐ کے قریب تھا، آیات کے درمیان ان دو جملوں کو ادا کیا تھا۔

کوئی کہتا ہے کہ آپؐ نے نماز میں پڑھا تھا، دوسرا کہتا ہے کہ جب سورہ نازل ہوئی تو قوم کو آواز دی؛ تیسرا کہتا ہے کہ پیغمبرؐ بیٹھے ہوئے تھے جب یہ کہا وغیرہ....

یہ مشہور جملہ بھی کئی طریقوں سے نقل ہوا ہے[۱] یہ شاید ایک گانا تھا جو قریش طوافِ کعبہ کے وقت گایا کرتے تھے[۲]

اس روایت کو واقدی (م ۲۰۷ھ)، طبری (م ۳۱۰ھ) نے نقل کیا ہے۔ اتفاقاً دونوں ہی اسرائیلیات اور خرافات کے نقل کرنے میں بے پروا تھے، خصوصاً طبری جو مختلف احادیث کو جمع کرنے کا بڑا لالچی تھا۔ مگر محمد بن اسحاق (۱۵۱ھ) نے جو واقدی سے پچاس سال پہلے اور طبری سے ۱۶۰ سال پہلے ہوا تھا اور بخاری (م ۲۵۶ھ) نے بھی جو واقدی کے پچاس سال بعد ہوا تھا اور طبری سے ۶۰ سال پہلے

---

[۱] ۱۔ تلك الغرانيق العلا۔ ان شفاعتهن لترتجى ۲۔ تلك الغرانقة العلا، ان شفاعتهن ترتجى۔ ۳۔ ان شفاعتهن ترتجى ۴۔ وانها لهى الغرانيق العلا ۵۔ ان شفاعتها لترتجى، وانها لمع الغرانيق العلى ۶۔ وانهن لهن الغرانيق العلا، وان شفاعتهن لهى التى ترتجى ۷۔ وان شفاعتهن ترتجى ۸۔ والغرانقة العلى تلك الشفاعة ترتجى۔ روایات کی مزید جستجو کی جائے تو دوسرے نمونے بھی یقیناً ملیں گے۔

[۲] بخاری: ابواب سجود القرآن۔ ج ۱۔

Presented by Ziaraat.Com

فوت ہوا، اس داستان کو نقل نہیں کیا ہے۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ بخاری اپنی صحیح میں لکھتا ہے کہ پیغمبرؐ نے سورۂ نجم کی قرائت کی اور مسلمانوں اور مشرکوں نے آپؐ کے ساتھ سجدہ کیا مگر اس میں "غرانیق" کا نام نہیں ہے[23]۔ اوروں نے بھی بخاری کی طرح اس حدیث کو نقل کیا ہے مگر اس میں غرانیق کے قصے کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔

ان روایات کی ذرا چھان بین بھی کر لینی چاہیے۔ طبری اس داستان کو محمد ابن کعب قرظی (م ۱۰۸ یا ۱۱۹ھ) سے نقل کرتا ہے جو[24] یہودی قبیلہ بنی قریظہ سے بتایا جاتا ہے۔ یہ وہ قبیلہ ہے جو مدینے میں آنحضرتؐ کا سخت دشمن تھا۔ یہ شخص صحابی بھی نہیں تھا۔ حجر عسقلانی اس بات کو نہیں مانتا کہ یہ شخص رسول اللہؐ کے زمانے میں پیدا ہوا تھا[25]۔ بخاری بھی ترجمۂ محمد میں یہی کہتا ہے[26]۔ اب وہ اس داستان سے کس طرح واقف ہوا یہ اللہ ہی جانتا ہے۔

ابن سعد بھی اس داستان کو واقدی سے نقل کرتا ہے[27]۔ اس نے اپنے طور پر مطلب اور اس کے باپ عبداللہ بن حنطب سے روایت کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عبداللہ بن حنطب نے رسول اللہؐ کو قطعی نہیں دیکھا تھا[28]۔

بہرحال تعجب تو اس بات پہ ہے کہ ابن عباس، سعید ابن جبیر، شعبہ، امیہ بن خالد، ابوبشر، محمد بن کعب، محمد بن قیس، ابن شہاب زہری، سُدی، موسیٰ بن عقبہ، ابن اسحاق، عکرمہ، سلیمان التیمی، عوفی، بزار، طبری، ابن ابی حاتم، ابن منذر اور ابن مردویہ جیسے راویوں نے بھی اس فرضی داستان کو نقل کیا ہے۔

صاف الفاظ میں اتنے بلند و بالا ناموں کی فہرست کے باوجود جو کچھ کہا گیا ہے وہ اصطلاح کے مطابق ضعیف ہے یعنی راوی قابلِ اعتماد نہیں ہے یا پھر جعل اور جھوٹ کا اس پر الزام ہے۔ یا پھر منقطع ہے یعنی راویوں کے درمیان فاصلہ موجود ہے[29] (یہ خود ضعف ہوا)۔ مرفوع حدیث شعبہ کی ابوبشر، سعید بن جبیر اور ابن عباس سے ہے۔ اس بات کے علاوہ کہ ابن الصلاح شہرزوری (م ۶۴۲ھ) صرف "مرفوع" کو حدیث سمجھتا ہے جو پیغمبرؐ کی ذات تک مخصوص طور سے پہنچتی ہے[30]۔

اگر صحابہ کو بھی اس نظر سے دیکھا جائے تو ابن عباس کا کہنا ہے :

---

[23] بخاری: ابواب سجود القرآن۔ ح ۱۔

[24] تاریخ طبری ۱ : ۱۱۹۲۔

[25] تہذیب التہذیب ۹ : ۴۲۰۔

[26] بخاری: کبیر ۱/۱/۲۱۶ و صغیر ۱۱۶؛ جرح۔ ابن ابی حاتم ۴/۱/۶۸۰؛ حلیہ۔ ابونعیم ۳ : ۲۱۲؛ تہذیب نووی ۱۱۲؛ البدایۃ۔ ابن کثیر ۹ : ۲۵۷؛ کامل ابن اثیر ۵ : ۵۶؛ شذرات۔ ابن عماد۔ ۱ : ۱۳۶۔

[27] طبقات۔ ۱/۱/۱۳۷۔

[28] اسد الغابہ حصہ سوم۔

[29] درایۃ الحدیث ۵۴ آقائے مدیر شانہ چی۔

[30] مقدمہ ابن صلاح ۲۲۔

www.Ziaraat.com Sabeel-e-Sakina

Presented by Ziaraat.Com

تھی۔ وہ اتنی سی بات پر ایسا خوش بھی ہو گئے کہ پیغمبرؐ کے ساتھ ساتھ سجدے میں گر گئے اور ولید اور سعید اگر سجدہ نہ کر سکے تو خاک اٹھا کر ہاتھوں میں اٹھا کر پیشانی پر لگا لی کہ دنیا ان کے لیے بہشت بریں بن گئی!

۴۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ کہ اگر یہ سلسلہ جائز ہے تو شرع مطہر نابود ہو جائے گی۔ احکام و شرائع میں سے ہر ایک میں ایسی لغزش کا خطرہ موجود ہوگا۔ خود عصمت خطرے میں پڑ جائے گی۔ عقل کی نگاہ میں وحی میں کمی یا بیشی ایک ہی بات ہے۔ دونوں تحریف ہیں اور مردود۔[۴۲]

قاضی عیاض کہتے ہیں کہ امت مسلمہ پیغمبر اکرمؐ کی عصمت اور ان کے اس قسم کے نقص سے منزہ اور پاک ہونے پر اجماع رکھتی ہے۔ خواہ آپ نے غیرِ خدا کے لیے کسی مدح کے نازل ہونے کی تمنا کی ہو جو کفر ہے، خواہ شیطان نے قرآن کی جگہ وسوسہ ڈالا ہو کہ پیغمبرؐ اس کو قرآن کا حصہ سمجھیں یہاں تک کہ جبرئیلؑ آپؐ کو آکر اس سے آگاہ کریں ـــــ یہ ساری باتیں نبیؐ کے حق میں ممتنع اور محال ہیں۔ اگر یہ کہیں کہ پیغمبرؐ نے اپنے پاس سے جان بوجھ کر یہ جملے کہے تھے تو یہ کفر ہوگا یا یہ کہ سہواً زبان سے نکل گئے تھے تو آپؐ ایسی باتوں سے بھی منزہ اور مبرا ہیں۔ ہم دلیل، برہان اور اجماع سے آپؐ کی عصمت کو مسلّم جانتے ہیں، آپؐ کے دل یا زبان سے عمداً و سہواً کلمۂ کفر ناممکن ہے نیز یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ آپؐ کے سامنے شیطان خود کو فرشتہ ظاہر کرے کسی اور طرح سے آپؐ تک پہنچے یا خدا پر کوئی بہتان باندھے۔[۴۳]

حقیقت یہ ہے کہ حدیث کے قواعد و ضوابط سے الگ اور انبیاءؑ کی عصمت و طہارت سے جدا، اعتقاد و ایمان کے علاوہ کیا عقل باور کرتی ہے کہ محمدؐ، وہ محمدؐ کہ جن کا خون رگوں میں ایک مدت دراز تک مسلسل بغیر رکے ہوئے، بتوں کی نابودی کے لیے دوڑتا رہا، یکایک اور طرفۃ العینی میں ہر چیز کو فراموش کر کے بتوں کو شفاعت کرنے والے کہہ کر خدا پر افترا باندھیں گے۔ کیا محمدؐ کفر اور کافری کی حقیقت اب نہیں پہچان پا رہے تھے اور نعوذ باللہ شیطان کے ہاتھ میں کھیلنے لگے تھے؟

یہ کس طرح ممکن ہے کہ پیغمبرؐ جو ان کے خلاف مسلسل جدوجہد کرتے رہے اور جنہوں نے زندگی میں کبھی ایک لمحے کے لیے بھی بتوں کے آگے سر خم نہیں کیا تھا، جن کی دعوت کا حقیقی سرمایہ اور جن کی رسالت کا بنیادی رکن توحید کی تبلیغ اور شرک و بت پرستی سے جنگ تھی۔ وہ یکایک ان ہی بتوں کے لیے ایسی عظمت کے قائل ہو گئے کہ خدا سے ان کی شفاعت قبول کر لی! وحی اور نبوت کے علاوہ بھی کسی ذمہ دار آدمی سے ایسی خطا قابلِ معافی نہیں۔ یہ کس طرح قبول کیا جائے کہ سچے، صدیق اور امین پیغمبرؐ ایسی سنگین لغزش کے حامل ہوں گے۔ علاوہ ازیں ان کے صحابیوں کے بارے میں کیا خیال کیا جائے؟ وہ کس طرح اس بات کا یقین کر پائے کہ پیغمبرؐ ایک بار اپنی دعوت کی بنیاد فراموش کر بیٹھے، دشمن سے مفاہمت کر لی اور پھر اسی دن اس مفاہمت کو ختم بھی کر دیا۔ اور یہ صحابہ اسی طور اپنے محکم ایمان پر پہاڑ کے مثل ڈٹے رہے۔ کیا یہ دیکھ کر بھی دشمن خاموش بیٹھے رہتے؟ مکہ کے مشرکین اس کیفیت کو چپ چاپ دیکھتے رہتے اور آپؐ سے آکر اس کی پرسش نہ کرتے؟

کیا پیغمبرؐ کے بعد ایک وقت ایسا نہیں آیا کہ ابوسفیان کے لوگ اسلامی مملکت کے حاکمِ مطلق بن گئے۔ اس وقت یہ اعتراض یقیناً ان کی زبان پر آسکتا تھا جب کہ دوسری ہزاروں باتیں وہ اسلام کے بارے میں کہتے رہے۔ وہ بآسانی یہ سب کچھ کہہ سکتے تھے۔

---

۴۲ اس کی تفصیل، تفسیر امام فخر رازی ملاحظہ کیجیں۔ ذیل آیت ۵۲ سورہ حج۔

۴۳ شفاء۔ قاضی عیاض ۲/۱۱۶، طبع ۱۲۹۰۔ مطبع خلیل آفندی۔

Presented by Ziaraat.Com

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبرؐ کی زبانِ مبارک سے اس بات کو کہلوانا دراصل مشرکین کو تسلط اور غلبہ عطا کرنا تھا۔ کیا وہ اس بہترین موقع کو ہاتھ سے جانے دیتے؟ اور یہودیوں کو تو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک بہت بڑا نکتہ ہاتھ آ جاتا۔ غرض کہ آپ اس قصے کو جس رخ سے دیکھیں اور اس کے جس پہلو پر غور کریں، آپ کو یہ محض گھڑا ہوا افسانہ ہی نظر آئے گا۔

تاریخ کی رُو سے

کہتے ہیں کہ حبشہ کو پہلی ہجرت بعثت کے پانچویں سال رجب کے مہینے میں ہوئی اور یہ سجدہ یعنی اسلام کا اولین سجدہ، اسی سال رمضان کے مہینے میں کیا گیا[۳۲] یعنی حضرت حمزہ اور حضرت عمر کے اسلام لانے سے پہلے کیونکہ یہ لوگ بعثت کے چھٹے سال اسلام لائے[۳۳] یہ تو ہم جانتے ہیں کہ حضرت حمزہ اور حضرت عمر کے اسلام لانے سے پہلے مسلمان 'دارالارقم' میں جمع ہوتے تھے (عام جگہوں پر جمع نہیں ہو سکتے تھے)۔ نمازیں گھروں میں یا گوشوں میں چھپ کر ادا کرتے تھے۔ اس وقت تک ان میں سے کوئی بھی کعبہ کے پاس نہ قرآن پڑھ سکتا تھا اور نہ وہاں سجدہ کر سکتا تھا۔ ایک دفعہ رسول اللہ کے بعد عبداللہ ابن مسعود نے بڑی خاص دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے سورۂ 'الرحمٰن' کعبے کے پاس بلند آواز سے تلاوت کی[۳۴] قریش نے ان کی اس دلیری پر ان کو بہت ایذا پہنچائی۔ پھر اس کے بعد کوئی وہاں نہ نماز پڑھ سکا اور نہ قرآن کی تلاوت کر سکا، تو یہ کس طرح ممکن ہوا کہ حضرت حمزہ اور حضرت عمر کے اسلام لانے (یعنی بعثت کے چھٹے سال) سے پہلے کعبہ کے پاس بیٹھ کر کوئی مسلمان سجدہ کرے۔

یہ بات تاریخی اعتبار سے بھی صحیح نہیں جو سر ولیم میور اور اس کے ہم خیال کہتے ہیں کہ مسلمان حبشہ سے یہ سن کر واپس ہوئے کہ پیغمبرؐ اور قریش مکہ کے درمیان مفاہمت ہو گئی ہے اور اس کی بنا 'داستانِ غرانیق' تھی۔

حبشہ سے یہ مہاجر دو وجہ سے واپس ہوئے تھے۔ ایک تو یہ کہ نجاشی کے مسلمانوں کے ساتھ اچھے سلوک کی بنا پر اس کی عیسائی رعیت اس کے خلاف ہو گئی تھی اور ہنگامے پر اتر آئی تھی۔ مسلمان اس صورتِ حال سے پریشان تھے۔ دوسری بات یہ کہ انہوں نے سنا تھا کہ قریش نے مسلمانوں پر سختیاں کچھ کم کر دی ہیں۔ چنانچہ وہ بعثت کے پانچویں سال کے ماہ شوال میں واپس آئے جب کہ کعبے میں سجدہ اسی سال کے ماہ رمضان میں بتایا جاتا ہے۔ یہ مہاجرین مکہ پہنچے تو کیفیت کچھ اور تھی۔ نتیجہ یہ کہ دو (عثمان بن مظعون اور عبداللہ بن مسعود) کو چھوڑ کے باقی سب نے مکہ کے مختلف لوگوں کی پناہ تلاش کی ــــــ پھر جلد ہی حبشہ واپس گئے اور پیغمبرؐ حسبِ معمول بتوں کو برا کہتے رہے۔ روایات جو یہ کہتی ہیں وہ کس طرح ممکن تھا کہ صبح کو محمدؐ 'غرانیق العلا' کہیں اور اسی شام اس پر پشیمان ہوں اور قریش بھی پہلے کی طرح پھر سختیوں اور عقوبتوں پر اتر آئیں۔ اسی صبح و شام کی مختصر مدت کی 'مفاہمت' کی خبر حبشہ پہنچ جائے اور وہ خوش خوش مکہ کے لیے واپس روانہ ہو جائیں۔

---

[۳۲] ابن سعد۔ ۱/۱/۱۳۸۔

[۳۳] تہذیب الاسماء۔ نووی۔ ۲۴۹۔ طبع گوٹنگن۔

[۳۴] ابن ہشام ۱/۳۳۶۔

Presented by Ziaraat.Com

قابل غور بات یہ ہے کہ اس افسانے کو ابوبکر بن عبدالرحمن بن حارث بن ہشام کے قول سے نقل کیا گیا ہے[۴۷] یہ حضرت عمر کی خلافت کے زمانے میں پیدا ہوا تھا[۴۸] یعنی اس افسانے کے تیس سال بعد، خواہ وہ کتنا بڑا عالم ہی کیوں نہ کہلاتا ہو[۴۹]

جس زمانے میں پیغمبرؐ اسلام پر مشرکین نے بے پناہ سختیاں روا رکھی ہیں اور آپ کے پیرو جسم و جان کے رشتے کو برقرار رکھنے کے لیے بیرون ملک ہجرت پر مجبور ہوئے اور جو نہیں جا سکے ان پر بدستور ظلم و ستم جاری رہا، مغرب کے مستشرقین اور مصنفین پیغمبرؐ اسلام کے لیے مشرکوں سے سازگاری اور جھوٹی مفاہمت تجویز کرتے ہیں۔ مگر اللہ کی حکمت بالغہ تو محمدؐ کی استقامت کو اوج صلابت پر دیکھنا چاہتی ہے۔

مستشرقین میں سروليم موئر اس افسانے کو حقیقی اور قطعی سمجھتا ہے[۵۰] کیمبرج یونیورسٹی کے قرون وسطیٰ کی تاریخ لکھنے والوں کو بہت افسوس ہے کہ اطالوی دانشور مؤرخ کاتانی اس واقعے کو حقیقی تسلیم نہیں کرتا[۵۱] جرمن کارل بروکلمن کہتا ہے کہ محمدؐ اپنی بعثت کے شروع سالوں میں اپنے ہم وطن مکہ والوں کے تین خداؤں کو جن کو وہ اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے، قبول کرتے تھے اور ایک آیت میں انہوں نے ان کا ذکر بھی کیا اور پھر دوسرے دن اس کا انکار کیا[۵۲]

بہرحال جو تحقیق اور تفتیش کا صحیح جذبہ رکھتے ہیں (جیسے اطالوی کاتانی) وہ ایسے معاملات میں منصفانہ بات ہی کہتے ہیں۔

اب ہم لوگوں نے خوب اندازہ کر لیا کہ وحی کے حاصل کرنے اور اس کے ابلاغ میں پیغمبرؐ کے لیے لازم ہے کہ وہ خطا اور غلطی سے مبرا ہو۔ وہ واحد واقعہ، جو اس کے برخلاف ذکر کیا گیا تھا اس پر ہم لوگوں نے غور و خوض کیا اور اس کی چھان بین کی۔ ایک نکتہ اور رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ آپؐ دوسرے انسانوں کی طرح انسان ہیں۔ خداوند عالم نے آپؐ سے فرمایا:

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ (۱۸ : ۱۱۰)

کہیں کہ میں تمہارے جیسا انسان ہوں، مجھ پر وحی ہوتی ہے۔

اس میں کوئی کلام نہیں ہے۔

کیا یہ انسان دوسرے انسانوں کی طرح نسیان و فراموشی سے دوچار ہو سکتا ہے؟

پیغمبرؐ اور نسیان

کیا دوسرے انسانوں کی طرح پیغمبر اکرمؐ بھی فراموشی اور نسیان سے دوچار ہو جاتے تھے یا نہیں؟ اگر کبھی بھول سرزد ہو جاتی تو

---

[۴۷] ابن سعد ۱/۱/۱۳۷۔

[۴۸] وفیات الاعیان۔ ابن خلکان ۱ : ۹۲۔

[۴۹] ابن سعد ۲/۲/۱۳۳۔

[۵۰] حیاۃ محمدؐ۔ ۱۲۶، زندگانی محمدؐ۔ ترجمہ فارسی پائندہ۔ ۲۲۸۔

[۵۱] CAMBRIDGE MEDIEVAL HISTORY, VOL 2 (1913)PP. 310 - 311.

[۵۲] تاریخ الشعوب الاسلامیہ۔ بروکلمن۔ ص ۳۴۔ اور اسی طرح .WATT, W.M. MAHOMET A'LA MECQUE. PP 133 - 144.

Presented by Ziaraat.Com

پھر یہ کس حد تک ہوتی؟ وہ پیغمبر جس کا قول و فعل حجت ہے، احکام کے استنباط کے لیے ایک شرعی دلیل وہ قول و فعل، تقریر، خطاب، یا حالت اور صفت ہے جو آپ سے نقل ہوئی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وحی الٰہی کے صحیح طور سے حاصل کرنے اور اس کے صحیح ابلاغ کا ایک وسیلہ ہے اور وہ عصمت رسول ہے۔ کیا ایسے پیغمبر کے لیے مناسب ہے کہ اس کو نسیان لاحق ہو؟ اگر ایسا ہو بھی تو کس حد تک مناسب ہے؟ کیا ابلاغ اور احکام الٰہی میں بھی وہ نسیان سے دوچار نہیں ہو جائے گا؟ ایک طرف وہ انسان ہے اور نیند، بیماری، فراموشی اور بیہوشی انسان کے اختیار میں نہیں۔ دوسری طرف آپ معصوم ہیں کہ ہر خطا اور گناہ سے مبرا ہیں۔ اگر فراموشی سے واسطہ پڑ جائے تو کیا یہ نقص نہیں ہوگا اور اس سے احکام خداوندی کے ابلاغ میں خلل نہیں پڑے گا؟ اور اگر اس کو قبول کر لیا جائے تو عصمت انبیاء پر آنچ نہیں آئے گی؟ ان کی ذمہ داری، امتیاز و انتخاب اور قدرت و طاقت کی صورتوں میں ان کا کوئی عمل شرع کے خلاف نہیں ہونا چاہیے۔ یہ وہ سوالات ہیں جو اس وقت ہمارے سامنے ہیں۔

بیشک یہاں بھول اس مسئلہ کا جزو ہے جو فقہا کی اصطلاح میں "سہو النبی" کہا جاتا ہے۔ اس موضوع پر بہت سی فقہی، تفسیری، حدیثی اور کلامی بحثیں ہو چکی ہیں۔ نماز کے فوت ہونے اور اس کے قضا ہونے کے بارے میں فقہی، کلامی اور اصولی کتابوں میں بہت بحث ہوئی ہے۔ مؤرخین اور محدثین دونوں، عام اور خاص نے اس کی مثالیں پیش کی ہیں اور اس کے رد و قبول میں تفصیلی بحث کی ہے[1]

مگر اس سے زیادہ اہم مسئلہ بھی ہے اور وہ یہ کہ کیا آیات قرآن کے سلسلے میں نسیان روا ہے؟ اہل سنت نے ایک حدیث حضرت عائشہ زوجہ رسولؐ اور دختر ابوبکر سے نقل کی ہے کہ ایک دن پیغمبرؐ مسجد سے گذر رہے تھے جہاں قاری عباد بن بشار حفظ کیا ہوا قرآن پڑھ رہے تھے۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: خداوند تعالیٰ اس پر اپنی رحمت نازل فرمائے کہ فلاں سورہ کی فلاں آیت پڑھ کر اس نے مجھ کو وہ یاد دلا دی[2] یہ حدیث مستشرقین کو (اعتراضات کے لیے) وسیع زمین فراہم کرتی ہے[3]

مگر کسی بھی صورت میں نسیان اور فراموشی کا نبیؐ سے قطعی کوئی تعلق نہیں۔ قاری قرآن سے ایک آیت پڑھتا ہے، رسول اللہ اس کے لیے مغفرت کی دعا کرتے ہیں کہ فلاں سورہ کی فلاں آیت مجھے یاد دلا دی۔ آیاتِ الٰہی، سب ہی خود آنحضرتؐ کے زمانے میں اور روزانہ طور سے وحی نازل ہونے کے وقت لکھ لی جاتی تھی۔ ایک نسخہ رسول خدا کے پاس بھی تھا۔ جو کچھ نازل ہو چکا تھا وہ سال میں ایک دفعہ بھی جبرئیل سے دوبارہ بھی فرما لیتے تھے۔ خصوصاً جب اس خبر کی ناقل حضرت عائشہ ہیں جو مدنی آیات کے نزول کے بارے میں خوب جانتی ہیں۔

---

[1] خاص کتابیں: من لایحضرہ الفقیہ۔ صدوق۔ احکام نماز میں سہو۔ روایت سعید اعرج کی امام جعفر صادق سے۔ شہید اول اپنی کتاب الذکری میں امام محمد باقر سے یہ روایت کے دوران زرارہ کا قول۔ فروع کافی۔ کلینی۔ نہایہ۔ شیخ طوسی۔ الرواشح السماویہ۔ میرداماد۔ راشحہ۔ ۲۵۔ بحار مجلسی۔ ادعا رضا آقای محمود شہابی ۲۲۵۱۱۔ سفینۃ البحار ۱: ۶۷۷۔ کمپنی بحار الانوار ۶: ۲۱۸۔ کمپانی۔

عام کتابیں، کتب ستہ، الدارمی، طیالسی و مسند احمد از المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث ۵: ۲۳۲/۲ و ۱۴۲: ۱۴۲/ ادو ۴۳م ۴/ ۲۔ موطا مالک، قوت ح ۵۱: ۲۶ و قصر الصلاۃ ح ۸۸، جب کہا گیا کہ فرمایا۔ انا بشر مثلکم انسی کما تنسون، بخاری، صلاۃ ۳۱، مسلم مساجد ۹۰۔۔۔

[2] بخاری، کتاب الشہادات ۱۱ مسلم ۱: ۵۴۳ (مسافرین ۲۲۴) ارشاد الساری۔ قسطلانی ۴: ۴۲، مسند احمد ۶: ۱۳۸۔

[3] نولدکے، تاریخ قرآن ۱: ۴۷، ج ۲، مقدمہ ناشر ۱۶۔

Presented by Ziaraat.Com

اس زمانے میں متعدد کاتبانِ وحی مستعد تھے اور نازل ہونے کے فوراً بعد نبی اکرمؐ کے سامنے ہر آیت لکھ لی جاتی اور لوگوں تک ابلاغ کر دی جاتی۔ صحابہ بھی آیات کو لکھ لیتے اور حفظ کر لیتے۔ ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ تواتر کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ پر کوئی ایسا موقع نہیں تھا کہ نسیانِ تام، اور قطعی بھول ہو گئی ہو۔ ایسا نہیں کہ کوئی چیز حافظے سے بالکل ہی محو ہو گئی ہو اور یاد ہی نہ آئے سارے مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق ایسی بھول نبی کے لیے ناممکن اور محال ہے۔ کیونکہ یہ تو رسالت اور تبلیغ کی ذمہ داری میں خلل ڈال دے گی۔

اب رہا یہ کہ اس حدیث میں قاری نے جن آیات کو حفظ کیا تھا اور پڑھ رہا تھا، ان ہی آیات کو آنحضرتؐ اس سے کہیں پہلے حفظ کر چکے تھے۔ لوگوں تک ابلاغ کر چکے تھے اور صحابہ اس کو حاصل کر چکے تھے۔ ان ہی صحابہ میں سے ایک یہ عباد بن بشار تھا (جس کا ذکر اس روایت میں ہوا ہے) جو آیت اس نے پڑھی وہ رسول اللہ کے ذہن سے بالکل محو نہیں ہوئی تھی۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ذہنِ انسانی کسی چیز میں مشغول ہوتا ہے اور دوسری چیز سے غافل ہوتا ہے۔ وہ مطالب ذہن میں موجود ہیں اور موقع پر یاد بھی آ جاتے ہیں مگر کبھی خارج سے کچھ اسباب اس کے یاد آ جانے کی وجہ بن جاتے ہیں۔ یہ طے شدہ ہے کہ وہ آیت پیغمبرِ گرامی کے ذہن میں موجود تھی جو قاری کے پڑھنے سے دوبارہ آپؐ کو یاد آ گئی۔

ہو سکتا ہے اس روایت میں ایک لفظ بحث کا موضوع بنے۔ روایت کے مطابق پیغمبر نے فرمایا: "كُنْتُ اَسْقَطْتُهُنَّ" یا "اَنْسِيتُهُنَّ" (ان کو چھوڑ رکھا تھا یا فراموش کیا ہوا تھا) اس سے مراد کوئی ارادی عمل نہیں۔ رسول اللہ نے کلام خدا سے کوئی چیز چھپائی نہیں تھی، کم و بیش نہیں کی تھی اور نہ آگے پیچھے کی تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو گویا یہ بہت بڑی خیانت ہوتی اور رسالت کسی خائن کو نہیں ملتی۔ جو کچھ تھا آپ نے اس کی تبلیغ کی۔ چنانچہ یہاں چھوٹ جانا یا رہ جانا وہی وقتی فراموشی ہے۔

فراموشی کے موضوع پر، احادیث اور روایات کے علاوہ، صاحبِ نظر علمائے تفسیرِ قرآن میں اپنے مدعا کی تائید میں ایک آیت پیش کرتے ہیں:

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا (۲ : ۱۰۶)

جو آیت ہم منسوخ کرتے ہیں یا اس کی یاد اٹھا لیتے ہیں، تو اس سے بہتر یا اسی قسم کی لے آتے ہیں۔

گویا جب خدا ایک آیت کو بھلا دیتا ہے تو اس سے بہتر نازل کر دیتا ہے۔ قدرتی بات ہے کہ یہاں بحث اسی فراموش کر دینے سے ہے جو آیت میں "نُنْسِهَا" کے لفظ سے پیش کیا گیا ہے۔ (اصل بحث نسخ یا ناسخ و منسوخ آیاتِ قرآنی سے ہے۔ اس کا ذکر آگے کسی باب میں آئے گا)۔

فراموشی اور سہو کے سلسلے میں مفسرین نے "نُنْسِهَا" کی مختلف قرائت کی بنا پر مختلف معنی لکھے ہیں۔ جیسے بھلا دینا، تاخیر کر دینا، ترک کر دینا۔ بہرحال جو بھی معنی لیے جائیں اصل سوال یہی رہے گا کہ کیا یہ آیت رسول اللہ کے شاملِ حال ہے یا نہیں۔ کیا پیغمبرؐ بھی آیاتِ الٰہی میں سے کچھ دل سے ہٹا دیتے اور ان کی یاد نہ آتی تھی یا ایسا نہیں؟

علمائے تسنن میں سے کچھ اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے کہ آیاتِ الٰہی کے حفظ کرنے میں پیغمبر سے بھی بھول ہو جاتی۔ سیوطی نے درِّ منثور اور لباب النقول میں اور ابن کثیر نے نقل کیا ہے کہ کبھی کبھی رسولِ خدا کسی آیت کو فراموش فرما دیتے تو خداوند تعالیٰ نے یہ آیت

(حاشیہ نمبر بعد کے صفحے پر)

Presented by Ziaraat.Com

نازل فرمائی :

جو آیت ہم منسوخ کرتے ہیں یا اس کی یاد اٹھا لیتے ہیں، تو اس سے بہتر یا اسی قسم کی لے آتے ہیں۔

مگر یہ بات بھی ہے کہ علماء کا اجماع اس پر ہے کہ نسیان (اگر اس کا وجود ہو) تبلیغ میں خلل نہیں ڈال سکتا۔ یعنی پیغمبرؐ نے آیاتِ خدا سے کوئی بھی چیز فراموش نہیں کی اور جو کچھ بھی تھا اس کا ابلاغ فرمایا تھا۔

چنانچہ اس آیت کے سلسلے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ آیت کسی طور بھی پیغمبرِ گرامی کے شاملِ حال نہیں۔ آپؐ کا اس آیت سے تعلق نہیں۔ کیونکہ خداوندِ عالم نے فرمایا تھا :

وَاذْكُرْ رَبَّكَ إِذَا نَسِيتَ (۱۸ : ۲۴)

اور جب آپ بھول جائیں تو اپنے رب کو یاد کر لیا کریں۔

علاوہ ازیں زیرِ بحث آیت (جو مدنی ہے) کے نازل ہونے سے پہلے جب پیغمبرؐ خدا مکے میں تھے اور وحی کے نازل ہونے کا شروع زمانہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر لطف فرمایا تھا :

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَىٰ ۝ إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ (۸۷ : ۶، ۷)

تم کو ہم عنقریب (قرآن) پڑھا دیا کریں گے۔ پھر تم نہیں بھولو گے سوائے اس کے جو اللہ تعالیٰ چاہے۔

اپنے رسولؐ پر یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا لطف و کرم ہے۔ اگر اوروں کی طرح پیغمبرؐ بھی آیات کو بھولتے جاتے تو پھر یہ مہربانی اور لطف کے حامل کہاں رہے۔ اب رہا کہ "اِلّا ما شاء اللہ" کا استثناء خدا کی قدرت کو ظاہر کرتا ہے اور بس۔ یہاں استثناء منقطع ہے اور تاکیدِ نفی کے لیے ہے۔ مطلب یہ کہ جب ہم تم پر آیات پڑھیں گے تو اس کو فراموش کرنا تمہارے لیے محال ہوگا۔ مگر یہ کہ خدا چاہے کہ تم سے بھلا دے، کوئی چیز اس کی مشیت کو نہیں بدل سکتی۔

اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کا قصہ ہے کہ جہاں انہوں نے کہا :

"میں ان چیزوں سے جن کو تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک بناتے ہو نہیں ڈرتا۔ ہاں لیکن اگر میرا پروردگار ہی کوئی امر چاہے"
(۶ - انعام : ۸۰)۔

بقول فراء کے یہ صرف تبرک اور تیمن کے لیے کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کسی چیز کا استثناء نہیں۔ بیشک یہاں بھی اللہ تعالیٰ کی قدرتِ قاہرہ اور مشیتِ بالغہ کا ذکر ہے کہ وہ جو چاہے وہی ہوگا۔ اس کی مثال اس آیت میں بھی ہے جہاں خداوند تعالیٰ نے فرمایا :

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ (۱۷ : ۸۶)

اگر ہم چاہیں تو جس قدر آپ پر وحی بھیجی ہے سب سلب کر لیں۔

امام جعفرِ صادقؑ نے فرمایا کہ خدا نے ایسا کبھی چاہا تھا اور نہ اس نے وحی کبھی سلب کی۔ اس سلسلے میں کہا جا سکتا ہے کہ خدا نے ایسا چاہا اور نہ کبھی پیغمبرؐ کو تبلیغِ رسالت کے کام میں بھول چوک سے واسطہ پڑنے دیا۔ چنانچہ اس آیت سے پیغمبرِ اکرمؐ کا قطعی تعلق نہیں ہے[۵]۔ قرآن کی دوسری

حاشیہ زیرِ بحث سورہ البقرہ تفسیر ابنِ کثیر ۱ : ۱۵۰، تفسیر فتح القدیر شوکانی ۱۰۸۱ - ۱۰۹

[۵] اس کی تفصیل علامہ طباطبائی کی تفسیر المیزان میں سورہ بقرہ کی آیت ۱۰۶ کے ذیل میں دیکھیں۔ عصمتِ انبیاء کے ذیل میں سورہ بقرہ کی آیت ۲۱۳ کی تفسیر دیکھیں۔

Presented by Ziaraat.Com

آیات (جیسے ۲۰: ۱۱۵ و ۱۸: ۲۴، ۴۱: ۶۳ و ۳) کے بارے میں بھی یہی دلیل ہے کہ فرمایا:

لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ (۲۵: ۳۲)

ہم اس (قرآن) کے ذریعے سے تمہارے دل کو مضبوط کرتے ہیں۔

درحقیقت بے شمار آیات ہیں جو وحی اور ابلاغِ رسالت میں کسی فراموشی سے رسول اللہ کی عصمت کو بیان کرتی ہیں۔ مثلاً ان میں سے ایک آیت:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ، اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ
ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (۷۵: ۱۶-۱۹)

آپ قرآن پر اپنی زبان نہ ہلایا کیجئے کہ آپ اس کو جلدی جلدی لیں۔ ہمارے ذمے ہے اس کا جمع کرنا اور اس کا پڑھوانا۔ جب ہم اس کو پڑھنے لگا کریں تو آپ اس کے تابع ہو جایا کیجئے۔ اس کا بیان کرا دینا (بھی) ہمارا ذمہ ہے۔

ابن عباس کہتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی رسول اللہ فرطِ شوق سے اور آیات کو فوری طور سے اخذ کرنے اور حفظ کر لینے کے لیے جلد جلد زبان پر ان آیات کو پڑھتے تھے کہ کہیں فراموش نہ کر دیں۔ خداوند تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا۔

بلخی کا کہنا ہے کہ اس سے مراد قرآن کی آیات نہیں بلکہ سیاق و سباق سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں مقصد "کتابِ اعمال" ہے جو روزِ قیامت ہر شخص کو اس کے ہاتھ میں دی جائے گی۔

یہ صحیح ہے کہ اس آیت کے پہلے اور بعد کی آیات قیامت اور اعمالِ انسانی کے حساب کتاب کے بارے میں ہیں۔ مگر یہ بیچ کی آیات کسی اور ہی موضوع سے متعلق ہیں۔ قیامت کے بارے میں نہیں۔ ان کے معنی بالکل روشن ہیں کہ قرآن کا جمع کرنا میرے ذمے ہے تمہارے ذمے نہیں۔۔۔ یہ نامۂ اعمال سے کوئی مناسبت نہیں رکھتیں[1] اس کے برعکس یہ آیات واضح طور سے نشاندہی کر رہی ہیں کہ خود اللہ تعالےٰ قرآن کی حفاظت اور اس کے بیان کی ضمانت دے رہا ہے۔ اس آیت سے یہ بھی واضح ہے کہ قرائتِ قرآن اور اس کی قرائت کا دوام بھی خدا کے ذمے ہے۔ چنانچہ نبیؐ کی بھول چوک اور نسیان اور فراموشی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ اسی معنی کو ایک دوسری آیت بھی واضح کر رہی ہے:

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ (۲۰: ۱۱۴)

تم قرآن (پڑھنے) میں جلدی نہ کیا کرو اس سے پہلے کہ تمہاری طرف اس کی وحی پوری کر دی جائے۔

وحی کے انجام تک پہنچنے سے پہلے، اقتضاءِ وحی سے پہلے، وحی کی قرائت نہ کریں تاکہ اس کے معانی بھی تمہارے لیے بیان ہو جائیں یا یہ کہ کسی مسئلے کے بارے میں وحی نازل ہونے کی جلدی نہ کریں۔ خداوند تعالےٰ مصلحت اور اقتضاء کے مطابق قرآن کو نازل کرتا ہے۔ ایک دوسری جگہ فرمایا:

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى (۸۷: ۶)

---

[1] بحوث فی تاریخ القرآن۔ ابوالفضل میر محمدی ص ۴۳۔

Presented by Ziaraat.Com

تم کو ہم عنقریب (قرآن) پڑھا دیا کریں گے۔ پھر تم نہیں بھولو گے۔

قرائت یہاں واضح ہے۔ پڑھنا اس کے لیے ہے کہ ذہن کے ذہن پر لفظ و معنی ثبت ہو جائے۔ دوسری اور بہت سی آیات ہیں جن میں واضح طور سے ابلاغِ وحی میں آنحضرتؐ کی حفاظت اور حمایت کا ذکر ہے۔

آیاتِ شریفہ میں جو لفظ نسیان آیا ہے اس کی تاویل کرتے ہوئے سید شریف مرتضیٰ انبیاءؑ کو اس سے مبرّا کرتے ہوئے کہتے ہیں...

"اگر نسیان کو حقیقی بھی سمجھیں (اور اس لفظ کا ترجمہ فراموشی کیا جائے) پھر بھی کہنا پڑے گا کہ تشریع اور ابلاغِ رسالت کے کام میں فراموشی غلط اور صحیح نہیں۔ مگر اس موقع کے علاوہ نسیان میں کوئی حرج نہیں.."

مگر شیخ صدوق کے استاد ابو جعفر محمد بن حسن بن احمد ولید یہاں تک آگے بڑھ گئے کہ نبیؐ کے سہو کے بارے میں بطور کلی کہا کہ غلو کے راستے پر پہلا قدم یہ ہے کہ کوئی پیغمبرؐ اور امامؑ سے سہو کی نفی کرے...[۵۴] اس کے مقابلے میں میر داماد (م ۱۰۴۱ھ) ایسے نظریے کو صحیح نہیں سمجھتے اور استدلال کے اسی طریقے سے ایک سخت جواب دیا ہے کہ نبوت کے انکار کا پہلا قدم امرِ نبوت میں نبیؐ سے سہو کی نسبت دینا ہے۔ ورنہ "سہو سے مبرا ہونے کے اثبات" میں قطعی کوئی غیر معقول اور متجاوز بات نہیں۔ کیونکہ نفسِ نبیؐ کے لیے عصمت اللہ تعالیٰ کا فضل و رحمت ہے۔ عقاید صدوق کی شرح میں شیخ مفید (م ۴۱۳ھ) نے بھی ابن ولید کے اس عقیدے کو غلط کہا ہے۔

مگر شیخ صدوق (م ۳۸۱ھ) بھی اس مسئلے میں اپنے پیشروؤں کے طرفدار ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ پیغمبرؐ کے بعض حالات دوسروں سے مشترک ہیں چنانچہ ان حالات کے احکام و عوارض میں بھی ان کو دوسرے لوگوں کے ساتھ شریک رہنا چاہیے۔ مگر ایسے حالات بھی ہیں جو ان سے مخصوص ہیں اور دوسرے اس میں شریک نہیں۔ ان موقعوں پر ہر حکم ان ہی کے ساتھ مخصوص ہوگا۔ ان میں سے ایک حالت تبلیغِ وحی اور ابلاغِ رسالت ہے جو ان کی ذات سے مخصوص ہے۔ یہ صحیح نہیں کہ تبلیغ میں ایسی کیفیت پیش آئے جو نماز میں جائز اور روا تھی۔ بغیر قصد و ارادے کے نماز کے وقت آپؐ پر نیند کا غلبہ، آپؐ سے صرف ربوبیت کی نفی کرتا ہے۔ کیونکہ "لا تأخذہ سنۃ و لا نوم" کا وصف خدائے حی و قیوم کے اوصاف میں سے ہے۔ اور نبیؐ کا سہو ہم لوگوں کے سہو کے قبیل کا نہیں۔ کیونکہ یہ سہو خدا کی جانب سے ہے اور اس لیے ہے کہ پتہ چلے کہ پیغمبرؐ بشر اور مخلوق ہیں۔ کسی کو انہیں پروردگار و معبود قرار نہیں دینا چاہیے اور اس لیے بھی کہ نبیؐ کے وسیلے سے لوگوں کے سہو کے حکم کا پتہ چلے[۵۵]۔

شیخ مفید بھی اس نماز میں، جو نیند کی وجہ سے فوت ہوئی، اور نبیؐ سے سہو میں بہت بڑا فرق سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں، نماز کا فوت ہو جانا عیب اور نقص شمار نہیں ہوتا کیونکہ انسانوں پر نیند کا غلبہ قدرتی بات ہے جب کہ سہو ایسا نہیں۔ سہو نقص اور عیب ہے۔ سہو کرنے والے کے عمل یا اس کے غیر کے عمل کے نتیجے میں سہو ہوتا ہے۔ نیند اختیاری چیز نہیں۔ اگر معذور عباد ہو تو غیر ارادی موقعوں پر عیب نہیں شمار ہوگی۔ مگر سہو کے لیے ایسا نہیں کیونکہ اس سے دوری اور اجتناب ممکن ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ عقلمند لوگ اپنا مال اور اپنے راز بھول جانے والے اور سہو میں مبتلا لوگوں کے حوالے نہیں کرتے، جب کہ یہاں امین

---

۵۴ "من لا یحضرہ الفقیہ" باب "السہو فی الصلاۃ"

۵۵ ایضاً۔ احکام السہو۔

Presented by Ziaraat.Com

پر ان کو اطمینان ہوتا ہے۔ فقہا اس حدیث کو جو سہو میں مبتلا شخص روایت کرتا ہے قبول نہیں کرتے جب تک کہ اس کی دوسرے ذرائع سے تائید نہ ہوئی ہو[9]۔

مجتبائی (م ۴۰۳ھ) امامیہ عقیدے والوں پر اعتراض کرتا ہے کہ وہ انبیاءؑ کے لیے نسیان جائز نہیں سمجھتے۔ شیخ طوسی (م ۴۶۰ھ) اس کا واضح اور دقیق جواب دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ نظریہ کسی صورت میں درست نہیں۔ ہم کسی بھی صورت میں لوگوں میں تبلیغِ احکام اور ابلاغِ وحی کے کام میں سہو و نسیان کو روا نہیں سمجھتے۔ مگر اس کے علاوہ موقعوں پر جائز سمجھتے ہیں یہاں تک کہ کمالِ عقل میں (اور عصمت میں بھی) کوئی خلل نہیں پڑتا[10]۔

طبرسی اور ابوالفتوح رازی بھی اسی نظریے کی تائید کرتے ہیں[11]۔ مجلسی کو بھی انبیاءؑ کے سہو کی مطلق نفی میں علمائے امامیہ کا اجماع نہیں ملا۔ بقول شیخ محمود ابوریہ: علمائے اہلِ تسنن تبلیغِ وحی کے علاوہ دوسرے موقعوں پر انبیاءؑ کے لیے عصمت کے قائل نہیں ہیں۔ وہ سفارینی (م ۱۱۸۸ھ) سے نقل کرتا ہے[12] کہ اس نے ابن حمدان ('نہایۃ المبتدئین' میں) اور ابن عقیل (صاحب الارشاد) کی بات دہرائی ہے کہ انبیاء ابلاغِ وحی میں معصوم ہیں اور اس کے علاوہ دوسرے موقعوں پر خطا، نسیان اور صغیرہ میں ان کے لیے عصمت ضروری نہیں۔

مگر علمائے شیعہ کا اس پر اجماع ہے کہ انبیاءؑ سے خطا نہیں ہوتی۔ ان کو سہو اور نسیان سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ کبیرہ اور صغیرہ، یہاں تک کہ دنیوی معاملات میں بھی معصوم ہیں[13]۔

مختصر یہ کہ علمائے اہلِ تسنن نے نسیان کو بجز ابلاغِ وحی کے جائز شمار کیا ہے۔ علمائے شیعہ نے بھی نبی سے سہو کی نفیِ مطلق میں اجماع اور اتفاقِ رائے نہیں کیا ہے۔ مگر اس پر اجماع ہے کہ اگر نسیان نبی کا وجود تھا بھی تو تبلیغِ رسالت اور ابلاغِ وحی میں اثر انداز نہیں ہوا۔ ورنہ جس طرح تبلیغ کا چھپانا روا نہیں، نسیان بھی جائز نہیں ہونا چاہیے۔ یہ صحیح ہے کہ چھپانے اور کتمان میں قصد و ارادے کا اہم عنصر شامل ہوتا ہے اور کتمان قصد اور ارادے سے انجام پا سکتا ہے، جب کہ نسیان فطری امر ہے اور اس میں قصور کا پہلو نہیں نکلتا کہ فراموش کرنے والے کی گرفت ہو سکے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ان دونوں پر ایک فیصلے کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ ایک میں قصد و ارادہ ہے اور دوسرے میں نہیں۔ مگر دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے۔

پیغمبرِ گرامی کے معاملے میں کتمان کسی بھی صورت میں نہ تھا اور نہ ہے۔ نسیان کا اگر وجود تھا بھی تو تبلیغ میں کوئی نقص اور خلل نہیں ڈال سکا ہے۔

اصولی طور سے پیغمبروں کی ساری خصوصیات میں سے ایک عصمت ہے۔ عصمت یعنی گناہ اور غلطیوں سے پاک ہونا۔ یعنی پیغمبر نہ گناہ کرتا ہے اور نہ غلطی۔ یہ عصمت ہے جو پیغمبر کو وہ اعتماد عطا کرتی ہے کہ جس کے بغیر پیغمبر کا کلام قابلِ قبول نہ ہو — اور وہ بھی اس درجے

---

۹ ادوار فقہ۔ آقای شہابی۔ ۱: ۳۸۷۔

۱۰ تفسیر تبیان۔ طوسی۔ آیت ۶۷، سورۂ انعام۔ مجمع البیان ۲، ۳۱۷، روض الجنان ۴: ۲۰۳ طبع قمشائی تہران۔

۱۱ لوامع الانوار البہیہ۔ ۲: ۲۹۱۔

۱۲ اضواء علی السنۃ المحمدیۃ۔ ابوریہ۔ ۴۲۔

Presented by Ziaraat.Com

اعتقاد، ایمان، گہرائی اور وسعت کا کلام۔

استاد شہید مطہری نے اس بارے میں ایک بہت لطیف نکتہ بیان کیا ہے، گناہ سے عصمت، ایمان کے کامل ہونے اور تقویٰ میں شدت کا نتیجہ ہے۔ اشتباہ اور غلطیوں سے پاک ہونا بھی پیغمبروں کی خاص بصیرت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جب ایک انسان براہِ راست ایک خاص حس کے ذریعے عینی واقعات کے آمنے سامنے ہو اور اس کو حقیقت کا ادراک ایسا ہو جیسے حقیقت سے عینِ اتصال، تو اس صورت میں خطا اور غلطی کوئی معنی نہیں رکھتے۔

اللہ کے انبیاؑ اپنے درون اور باطن سے ہستی کی حقیقت سے ربط اور اتصال رکھتے ہیں۔ حقیقت کی اصلیت میں اشتباہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ مثال کے طور پر اگر ہم ایک پیالے میں تسبیح کے سو دانے ڈالیں اور اس کے بعد پھر سو دانے ڈالے جائیں اور اس عمل کو سو بار دہرایا جائے تو ممکن ہے ہمارا ذہن غلطی کرے اور ہم سوچیں کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ عمل ۹۹ بار یا ۱۰۱ بار دہرایا گیا ہے۔ مگر یہ ناممکن ہے کہ خود حقیقت غلط ہو جائے اور جب یہ عمل ایک سو بار دہرایا گیا ہے تو مجموعی دانے کم بیش نہیں ہو سکتے۔

وہ انسان جو آگاہی اور علم کے ذریعے حقیقت کی اصلیت سے وابستہ رہتے ہیں اور رشتہ وجود اور عینِ ہستی اور اس کے تسلسل سے متصل اور ایک ہو جاتے ہیں پھر وہ ہر طرح کے اشتباہ اور غلطی سے مبرا اور معصوم بھی ہو جاتے ہیں[۱۳]

آری، لوحِ محفوظ است او را پیشوا   از چہ محفوظ است؟ محفوظ از خطا[۱۴]

---

[۱۳] "وحی و نبوت"۔ استاد مطہری۔ ص ۱۵، ۱۶۔ تہران۔

[۱۴] (از روزنامہ "نوائے وقت"۔ لاہور۔ ۱۹/۱۱/۱۹۸۸ء)

عجیب و غریب "حدیث"

قاری حبیب الرحمٰن صدیقی لکھتے ہیں۔

یہ بات عرصہ دراز سے مشہور چلی آرہی ہے کہ حضور اکرمؐ پر جادو کیا گیا۔ اور اس کا آپ پر اثر بھی ہوا۔ ہم بچپن سے یہی تصور کرتے آئے تھے، کیونکہ صحیح بخاری میں یہ روایت حضرت عائشہؓ سے منقول ہے۔ اور اس کا راوی سفیان بن عیینہ ہے۔

امام ابوبکر جصاص رازی مشہور اکابر حنفیہ میں سے ہیں، بلند پایہ محدث اور اپنے وقت میں احناف کے امام تھے۔ انہوں نے لکھا ہے "بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضور کریمؐ پر جادو کیا گیا تھا اور جادو نے آپ پر اثر بھی کیا تھا۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ آنجنابؐ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ جادو کے زیرِ اثر مجھے ایسا خیال ہوتا ہے کہ کوئی بات کہہ رہا یا کام کر رہا ہوں، حالانکہ میں نے نہ ایسا کہا ہوتا ہے، نہ کیا ہوتا ہے۔

دراصل اس طرح کی حدیثیں وضع کردہ ہیں اور یہ اس مقصد کے لیے گھڑی گئی ہیں تاکہ انبیاء کے معجزات کو باطل کیا جائے اور ان میں شبہ ڈالا جائے۔

نبی اکرمؐ پر ایمان لانا، آنجنابؐ کی رسالت کی تصدیق کرنا اور آپ سے محبت کرنا شرطِ ایمان ہے۔ آپ کی عزت و توقیر بھی ایمان ہے اس کے بغیر ایمان باقی نہیں رہتا۔ مگر ایسے راویوں پر ایمان لانا نہ ہمارے لیے لازم ہے نہ ان کی تصدیق ہم پر واجب ہے۔

نبی کریمؐ پر جادو ہونا اور اس کا اثر ایک سال تک قائم رہنا اگر واقعہ ہوتا تو سینکڑوں حضرات اسے نقل کرتے۔ لیکن سوائے ایک فرد کے اور کوئی اس کا ناقل نہیں۔ ام المومنینؓ سے عروہ کے علاوہ اور کوئی اسے روایت نہیں کرتا اور عروہ سے ہشام کے علاوہ اور کوئی اسے بیان نہیں کرتا۔ حافظ عقیلی کہتے ہیں کہ ہشام آخر عمر
(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

Presented by Ziaraat.Com

رسول و نبی

اس بحث کے آخر میں ایک طرح سے یہ نامناسب نہیں ہوگا کہ رسالت اور نبوت اور ان دونوں میں جو فرق ہے اس کے بارے میں بھی گفتگو ہو جائے۔ بادی النظر میں دونوں میں کیا فرق ممکن ہے۔ رسول ہو یا نبی، ان میں جو بھی مقدم ہو اور ان میں سے جس کے بھی معنی زیادہ وسیع یا محدود ہوں، نتیجہ ایک ہی ہے ___ یعنی پیغام لانے والا اور پیغام پہنچانے والا۔ مگر آپ نے دیکھا ہے کہ ایسی لغوی اور لفظی بحث کا کوئی نہ کوئی علمی نتیجہ ضرور نکلتا ہے اور ہم اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

چنانچہ یہاں بھی ہم ان الفاظ کے بارے میں مختصر گفتگو کریں گے۔

'نبی' کا لفظ ۷۵ دفعہ، اس کی جمع 'نبیون' ۱۶ دفعہ اور جمع مکسر 'انبیاء' ۵ دفعہ اور اس کا مصدر 'نبوت' ۵ دفعہ قرآن میں آیا ہے۔ عربی میں یہ لفظ 'نباء' سے ہے۔ 'نباء' اس خبر کو کہتے ہیں جو بہت فائدہ مند ہو اور جھوٹ سے خالی ہو۔ نبوت خداوند تعالٰے اور اس کے صاحبِ خرد بندوں کے درمیان سفارت ہے جس کے ذریعے بندوں کے معاد اور معاش میں حائل مشکلات اور رکاوٹوں کو ہٹایا جا سکے۔ پیغمبر کو نبی کہتے ہیں کہ وہ خبر لاتا ہے جس کے ذریعے عقل و فہم کو سکون ملتا ہے۔[1]

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ نبی بروزن فعیل ہے۔ بعض اس کو 'نبیء' پڑھتے ہیں، رسول اکرمؐ کو اسی طرح خطاب کیا گیا تو لوگوں کو منع کر دیا گیا۔ نبیّ (تشدید کے ساتھ) زیادہ بلیغ اس لیے سمجھا گیا ہے کہ یہ رفعتِ قدر و عظمتِ مقام پر دلالت کرتا ہے۔

مگر اس میں اختلاف ہے کہ یہ فعیل مفعول کے معنی میں ہے یا فاعل کے معنی میں۔ جو فعیل کے معنی مفعول کے قائل ہیں وہ نبی کو "مُنبَاء" یعنی 'آگاہ' اور 'آگاہ کیے گئے' کے معنی میں لیتے ہیں کیونکہ خداوند تعالٰے ان کو غیب سے آگاہ کرتا ہے اور ان کو بتاتا ہے کہ وہ نبی ہیں۔ مگر زیادہ تر نے اس 'فعیل' کو فاعل کے معنی میں لیا ہے۔ نبی کو "مُنبِیء" "آگاہ کرنے والا" سمجھتے ہیں کہ وہ لوگوں کو وحی سے آگاہ کرتے ہیں۔[2]

بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ: میں سٹھیا گئے تھے۔ پھر ہشام کے مشہور شاگردوں میں سے امام مالکؒ یہ روایت نقل نہیں کرتے بلکہ اہلِ مدینہ میں سے کوئی بھی اسے نقل نہیں کرتا۔ ہشام سے نقل کرنے والے سارے راوی عراقی ہیں۔ کیا معلوم ہشام نے یہ بات انہی دنوں کہی ہو جب اس کا دماغ صحیح نہیں رہا تھا۔ پھر اس روایت کے متن میں بھی کئی تضاد ہیں۔ ایک راوی کہتا ہے کہ جس کنگھی پر جادو کیا گیا تھا وہ کنویں سے نکالی گئی، دوسرا کہتا ہے نہیں نکالی گئی۔ ایک روایت میں ہے آپؐ نے اچانک خواب بیان کیا ہے دوسری میں ہے علالت خوب دعا کی تو خواب دیکھا۔

نبی پر جادو اثر کر سکتا ہے یا نہیں، یہ مسئلہ اعتقادی حیثیت رکھتا ہے اور جملہ علماء اس پر متفق ہیں کہ اعتقادی معاملات میں خبرِ واحد پر انحصار نہیں کیا جا سکتا۔

قرآن پاک میں حضرت موسیٰ کے واقعہ کے سلسلہ میں ارشاد ہے (ترجمہ) "جادوگر کامیاب نہیں ہو سکتا خواہ وہ کیسے (سامنے) آئے" (ختم) مگر اس قصہ کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ لبید بن اعصم یہودی جادو کرنے میں نعوذ باللہ حضور اکرمؐ کے مقابلہ میں کامیاب ہوا۔

ہم کتبِ رجال میں متعدد ایسے راویوں کے حالات پڑھتے ہیں جو خود روایات گھڑ کے انہیں راویوں سے منسوب کر دیتے تھے کئی لوگوں نے اپنی وضع کردہ باتیں امام مالکؒ اور ہشام وغیرہ سے منسوب کر کے پھیلائیں۔

[1] مفردات۔ راغب۔ لفظ نباء۔

[2] مصحف شاہی ۔ ۱۲، ۳۶، ۲، ۲۷۲۔

Presented by Ziaraat.Com

مستشرقین حسبِ معمول قائل ہیں کہ نبی کا لفظ عربی میں عبری (نبیم NABI) یا آرامی (نِبیا NEBIA) یا نبیو NABIIO سے آیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ نبوت کی جڑیں اسرائیل میں تھیں۔ مگر ان کے نظریے کے برخلاف مرحوم استاد عباس محمود عقاد کا کہنا تھا کہ یہود نے نبوتِ الٰہی کو لفظاً و معانی میں عرب قوم سے حاصل کیا تھا۔ کنعان کی سرزمین پر وارد ہونے سے پہلے اور مدین[۵۳] کی سرزمین میں مقیم عربوں کے ہمسایہ بننے سے پہلے ایسا لفظ جس کے یہ معنی ہوں، وہ نہیں جانتے تھے۔

محمود عقاد کہتے ہیں:[۵۴] "لفظ 'نبی' لفظاً اور معناً عربی ہے۔ کیونکہ دوسری زبانوں میں ایسا ایک لفظ جس میں یہ معنی جمع ہوں موجود نہیں۔ عبرانیوں نے جزیرہ نما کے شمالی علاقے کے عربوں سے رابطے کے بعد اس لفظ کو اپنایا۔ وہ قدیم پیغمبروں کو "آبا" PATRIARCH کہتے تھے اور شروع میں لفظِ نبوت سے صرف ڈرانے والا کے معنی لیتے تھے ..... وہ نبی کو "رائی"[۵۵] یا ناظر یا مردِ خدا کہتے تھے۔ ان پر اسم نبی کا اطلاق نہیں ہوتا تھا، یہاں تک کہ وہ ان چار انبیائے عرب (ملک صادق[۵۶]، ایوب، بلعام باعورا، شعیب یا یثرون) سے تورات میں ذکر کیے جانے پر آشنا ہوگئے۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کو "جدِ امجد"، "رئیسِ آبا" (پیٹریارک) کہتے تھے۔[۵۷]

پھر محمود عقاد بعض یورپی دانشوروں مثلاً ہولشر اور شمیدت کے نظریات سے استناد تلاش کرتے ہیں کہ وہ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ یہ لفظ عبری میں فلسطین میں آنے کے بعد داخل ہوا۔ تورات میں اس واقعے کا ذکر کرتے ہیں کہ جب عاموس نے سنا کہ امصیا اس کو نبی پکارتا ہے تو غصہ ہوا اور چلا کر کہنے لگا کہ "میں نہ نبی ہوں نہ نبی کا بیٹا۔ میں تو گڈریا تھا اور ذمین سے انجیر چنا کرتا تھا۔ خداوند نے مجھے دنبوں کے پیچھے سے پکڑ لیا اور خداوند نے مجھ سے کہا جاؤ اور قوم اسرائیل پر میری نبوت پیش کرو۔"[۵۸]

بیشک یہ بھی ایک نقطۂ نظر ہے۔ مگر کچھ ایسی باتیں ہیں جو ثبوت چاہتی ہیں۔ خصوصاً یہ کہ رسول اللہ ایک ایسی امت پر بھیجے گئے کہ جن پر اس سے پہلے خداوند تعالیٰ نے کوئی نذیر نہیں بھیجا تھا (۲۸: ۴۶ و ۳۲: ۳ و ۳۴: ۴۴)۔

نبی کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ صاحبِ خبر ہے، خدا سے اور عالمِ غیب سے۔ اور یہ تعریف اس کی قدر و منزلت پر دلالت کرتی ہے۔

---

۵۳ مدین کی سرزمین خلیج عقبہ کے طول میں موآب اور طور سینا، یا جزیرہ سینا میں فرات تک ہے۔ وہاں کے رہنے والے فلسطین، لبنان اور مصر سے تجارت کرتے تھے۔ یہی تاجر تھے جنہوں نے حضرت یوسف کو بدلے کے کنوئیں سے نکالا تھا (سفرِ پیدائش ۳۷: ۲۸)۔ حضرت موسیٰ فرعون مصر سے فرار کر کے مدتوں وہاں حضرت شعیب کے پاس رہے (خروج ۲: ۱۱ تا ۱۵) اور ان کی صاحبزادی سے شادی کی (خروج ۲: ۱۶ تا ۲۲)۔

۵۴ الثقافة العربية اسبق من ثقافة اليونان والعبريين ، ۶۱

۵۵ عاموس ۔ ۷: ۱۲ ۔

۵۶ ملک صادق یا ملک صدق MELEBIZEDEK یروشلم کا قدیم ترین بادشاہ، کاہن اور پہلے سامی موحدین میں سے ایک ہے جس نے حضرت ابراہیم کو متبرک کیا اور ان سے عشر لیا (سفرِ پیدائش ۱۴: ۱۸ تا ۲۰)۔

۵۷ انجیل، رسالہ عبرانیان ۔ ۷: ۴ ۔

۵۸ عاموس ۷: ۱۴ و ۱۵

Presented by Ziaraat.Com

یا نبی وہ ہے جو فرشتے کو رؤیا میں دیکھتا ہے اور اس کی آواز سنتا ہے جیسے حضرت ابراہیمؑ کا خواب اور وحی نازل ہونے سے پہلے خود رسولؐ کا خواب دیکھنا۔[9]

شاید یہ کہا جا سکے کہ قرآن کی آیات میں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ انبیاءؑ وہ ہیں جو خداوند عالم کی طرف سے لوگوں میں نذیر (ڈرانے والے) بنا کر بھیجے گئے ہوں۔ مگر رسول کی طرح امت کے سربراہ اور امت کے نمائندہ نہ ہوں۔ مگر یہ نظریہ بھی قطعی نہیں ہے۔

ادبیاتِ عرب میں لفظِ رسول (جس کی جمع رُسُل) یا مُرسَل اور مُرسَلُون ہے) پیغام بر کو کہتے ہیں اور یہ غیر روحانی پیغام لے جانے کے معنی میں آتے ہیں۔

یہ اصلی عربی لفظ ہے۔ سریانی میں اس کا متبادل شَلِیحَ (جمع شلیحون) انبیاءؑ کے ساتھ مربوط عہد عتیق[10] میں آیا ہے۔ یہ لفظ نصرانی اصطلاحات میں سے ایک ہے جو عبری میں بھی استعمال ہوا ہے۔ ممکن ہے عربی میں رسول کے معنی میں "سلیح" کا لفظ جو ہے وہ اسی سے ماخوذ ہو۔ عیسائی میں اسی معنی میں اس لفظ کو استعمال نہیں کرتے جس معنی میں مسلمان 'رسول' کا لفظ استعمال کرتے ہیں وہ اس لفظ کو عموماً حواریوں کے لیے استعمال کرتے ہیں[11] رسول اللہ کے معنی میں رشلیحہ ذلیہہ آیا ہے۔[12]

عربی میں رسول پیغامبر ہے اور رسولِ خدا پیغمبر الٰہی ہے۔ لوگوں میں خدا کی طرف سے سفیر ہے۔ کبھی بطور مطلق "رسول" کہا جاتا ہے اور سوائے "رسول اللہ" کے کسی اور پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔

قرآن مجید میں رسول یا مُرسَل کا پیغمبروں کے علاوہ ملائکہ (۲۲:۷۵؛ ۱۹:۱۹؛ ۲۰:۹۶؛ ۵:۶۱ وغیرہ) اور عام آدمی (۱۲:۵۰؛ ۲۷:۳۵) اور حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں (۳۶:۱۳) پر بھی اطلاق ہوا ہے۔ رسول اور امت کے درمیان قرآن میں بہت ربط دکھائی دیتا ہے۔ خداوند عالم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا (۱۰:۴۷؛ ۱۶:۳۶؛ ایضاً ۲۳:۴۴ و ۴۰:۵)۔ یہ آیات جو اگلی سورتوں میں آئی ہیں ان سے مطابقت رکھتی ہیں اور وہ یہ کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہر امت میں سے ایک شاہد لے گا (۴:۴۱ و ۲۸:۷۵)۔[13] مگر یہ قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ رسول امت کا سربراہ ہے اور نبی فاقدِ امت۔ کیونکہ خداوند تعالیٰ نے انبیاءؑ کے بارے میں بھی فرمایا ہے:

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللهُ النَّبِيِّينَ (۲:۲۱۳)[14]

تو پھر رسول اور نبی میں کیا فرق ہے؟ اس بارے میں تفصیلی گفتگو ضرور ہوئی ہے لیکن واضح اور قطعی نتیجہ نہیں نکالا جا سکا ہے۔ بعضوں کا کہنا ہے کہ رسول وہ پیغام لانے والا ہے جس کی رسالت لوگوں تک اس پیغام کا ابلاغ ہے۔ جب کہ نبی وہ ہے جس پر وحی نازل ہوئی ہے

---

9. اصولِ کافی ۱: ۱۷۶۔ طبع دوم الاختصاص۔ شیخ مفید۔ ۳۲۸۔ تہران۔ البصائر: الجزء الثامن، الباب الخامس، بحار ۷: ۲۹۳؛ تفسیر المیزان ۲: ۱۴۳۔
10. خروج ۴: ۱۳؛ اشعیا ۶: ۸؛ ارمیا ۱: ۷۔
11. انجیل لوقا ۲۲: ۲۸؛ اقرنتیان ۹: ۱۔
12. اعمال سنت توماس کے ضمیمے میں۔ مقالہ رسول سے۔ ونسینک۔ مختصر دائرۃ المعارف اسلام۔
13. اس روز سوائے رسولوں کے کوئی بات نہیں کرے گا۔ بخاری: اذان ۱۲۹، توحید ۲۴، مسلم: ایمان ۲۹۹۔
14. حدیث میں بھی آیا ہے "ان نبیا من الانبیاء کان اعجب بامتہ" ترمذی۔ تفسیر سورۃ ۲۱۸۵۔

Presented by Ziaraat.Com

اور ممکن ہے اس پیغام کے ابلاغ پر بھی مامور ہو۔ اس صورت میں وہ نبی بھی ہے اور رسول بھی۔ ممکن ہے تبلیغ کی ذمہ داری اس کو دی گئی ہو۔ اس صورت میں صرف نبی ہے۔ چنانچہ ہر رسول لازماً نبی بھی ہوتا ہے۔ جب کہ ہر نبی رسول نہیں (یعنی عموم و خصوص مطلق ہے)۔

یا پھر رسول صاحب کتاب و شریعت ہے اور پچھلی شریعت کو منسوخ کرتا ہے جب کہ نبی صاحب کتاب نہیں ہوتا یا پچھلی شریعت کو منسوخ نہیں کرتا۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اکرمؐ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وحی الٰہی شروع میں نبوت کے سلسلے میں تھی اور وحی کے تیسرے یا چوتھے سال میں تمام لوگوں کے لیے رسالت کی دعوت کا موقع آیا۔ نبوت کے لیے پہلی آیت جو نازل ہوئی وہ " اقرا باسم ربک " ہے یعنی اللہ کا یہ کہنا " اپنے رب کے نام سے پڑھو " محمد مصطفیٰ کی نبوت پر دلالت کرتا ہے کیونکہ نبوت عبارت ہے ایک خاص ذمہ داری کے تحت فرشتے کی زبان سے ایک شخص پر وحی ہونا۔ مگر اللہ تعالٰے کا یہ کلام " یا ایها المدثر، قم فانذر " رسولؐ خدا کی رسالت پر دلیل ہے کیونکہ رسالت عام ذمہ داری کے تحت فرشتے کی زبان سے ایک شخص پر وحی ہے[۱۵۹]۔ اگر اس نقطۂ نظر کو ہم قبول کریں تو نبوت کی مدت تیئیس سال اور رسالت کی مدت بیس سال ہوتی ہے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ آیات قرآن میں یہ فرق واضح نظر نہیں آتا۔ کیونکہ اس طرح رسالت پر نبوت کو مقدم سمجھنا ہوگا اور اس طرح نبوت میں عمومیت ہے کہ وہ رسالت میں بھی شامل ہے۔ جب کہ قرآن مجید میں حضرت موسیٰؑ کے بارے میں فرمایا:

كَانَ رَسُولًا نَبِيًّا (۱۹ : ۵۱)

اگر نبی کا مفہوم رسول کے مفہوم سے جدا ہوتا اور اس میں شامل بھی ہوتا تو تعظیم و تکریم کی رو سے رسول کے ذکر سے پہلے نبی کا ذکر ہوتا ہے۔

ایک دوسری جگہ فرمایا:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ (۲۲ : ۵۲)

تم سے پہلے رسول اور نبی نہیں بھیجا . . . .

یہاں نبی کا رسول کے مقابل ذکر ہوا۔ دونوں ہی کو خدا کے فرستادہ کہا گیا (اور یہ بھی دیکھیں ـــ ۷ : ۱۵۷، ۱۵۸ و ۱۹ : ۵۴ اسمٰعیل صادق الوعد) آیات (مثلاً ۲۹ : ۶۹ و ۳۳ : ۴۰) میں غور و خوض سے پتہ چلتا ہے کہ جو خداوند عالم کی طرف سے خلق کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوتا ہے اور مبشر اور منذر ہوتا وہ نبی کہلاتا ہے۔ ہر امت کا، جیسا کہ ذکر ہوا، ایک رسول ہوتا ہے جس کی بعثت اس امت کے سارے کاموں کی اصلاح کے لیے ہوتی ہے۔ اور اس کی تکذیب کرنا پروردگار کی عقوبت کا باعث ہوتی ہے (۱۰ : ۴۷، ۱۷ : ۱۵ و ۴ : ۱۶۵)۔

بعض محققین قرآن میں اس لفظ کے استعمال کو زمانے اور دور کے حساب سے تلاش کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ نبی کا لفظ مکہ میں پیغمبرؐ کے قیام کے وقت (دوسرے دور) میں مفرد اور جمع سالم (نبی اور نبیون) کی شکل میں نازل ہوا تھا۔ مدینے میں جمع مکسر (انبیاء) کے طور پر آیا[۱۶۰]۔ لفظ رسول پہلی بار سورۂ مزمل میں آیا۔ حالانکہ قرآن کی آیات اور احادیث میں غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ دونوں الفاظ

---

[۱۵۹] البرہان فی علوم القرآن ۔ ۱ : ۲۰۸ ۔

[۱۶۰] مقالہ "نبی" از بوہل ـــ مختصر دائرۃ المعارف اسلام۔

Presented by Ziaraat.Com

نبی اور رسول اس سے کہیں پہلے سے استعمال ہو رہے تھے۔ آغازِ وحی کے زمانے میں (تقریباً بعثت کے چوتھے سال) نبی کے لفظ کا حضرت اسحٰق پر اطلاق ہوا (۲۷ : ۱۱۲) رسول کا لفظ بھی پہلی بار کریم کی صفت کے ساتھ (بعثت کے تیسرے سال) حضرت جبرئیل کے لیے استعمال ہوا (۸۱ : ۱۹ اور ۶۹ : ۴۰ ۔ بعثت کے تیسرے سال)۔ اسی زمانے میں حضرت صالح کو بھی رسول اللہ کہا گیا (۹۱ : ۱۳) حضرت موسیٰ کو بھی رسول پکارا گیا (۳۰، ۱۵۶)۔

چنانچہ ترتیبِ نزول سے استناد حاصل کرنے سے بھی یہ مشکل کا حل نہیں نکلتا۔

لوگوں نے ایک دوسرا راستہ بھی نکالا ہے اور کہا ہے کہ رسالت، نبوت سے افضل ہے، کیونکہ رسالت کے ذریعے ہدایت ہوتی ہے جب کہ نبوت صرف نبی تک محدود ہوتی ہے، جیسے علم اور عبادت۔

شیخ عزالدین بن عبدالسلام کہتے ہیں کہ نہیں، نبوت افضل ہے۔ کیونکہ وحیِ خدا کی معرفت اور اس کی صفات کے بارے میں ہے اور دونوں طرف سے اللہ سے متعلق ہوتی ہے (یعنی خدا سے نبی کی جانب اور نبی کا خدا سے واسطہ) جب کہ رسالت امرِ تبلیغ ہے جس کا صرف ایک طرف سے خدا سے تعلق ہے (اور دوسری طرف انسانوں سے)

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ رسالت میں نبوت بھی شامل ہوتی ہے اس لیے رسالت افضل ہے[17] مگر حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں کی افضلیت کا دارومدار دونوں کی صحیح تعریف کے تعین پر ہے۔

امام محمد باقرؑ نے فرمایا ہے کہ نبی وہ ہے جو خواب دیکھتا ہے اور آواز سنتا ہے مگر فرشتے کو نہیں دیکھتا۔ رسول وہ ہے جو آواز سنتا ہے، خواب نہیں دیکھتا اور فرشتے کو دیکھتا ہے[18] مقصد یہ ہے کہ نبوت کی علامت خواب دیکھنا اور رسالت کی علامت وحی کے فرشتے کو دیکھنا ہے۔

علامہ طباطبائی اپنی فراستِ ملی سے آیاتِ قرآنی میں غور و خوض کر کے نتیجہ نکالتے ہیں کہ نبوت اور رسالت دو مقام ہیں جن میں ایک کی خصوصیت خواب میں دیکھنا اور دوسرے کی خصوصیت فرشتۂ وحی کو دیکھنا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ دونوں مقام ایک شخص میں جمع ہو جائیں جو دونوں خصوصیات کا حامل ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ نبوت بغیر رسالت کے ہو۔ چنانچہ رسالت مصداق میں نبوت سے ممتاز ہے اور مفہوم میں نہیں۔ نبی مصداق میں رسول سے جدا ہے۔ مگر مفہوم کے لحاظ سے دونوں اپنا اپنا خاص مفہوم رکھتے ہیں[19]

یہ نبی اور رسول میں فرق کا مسئلہ بظاہر سادہ سا ہے۔ دونوں ہی خدا کے پیام بر ہیں خواہ تبلیغ کی ذمہ داری سونپی گئی ہو یا نہیں۔

اس کی بہترین وضاحت سورۂ احزاب کی آیت ۴۰ سے ہوتی ہے، جہاں فرمایا:

وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ

پیغمبرِ اسلام خاتم انبیاء ہیں۔

یعنی نبی اگر رسول کے علاوہ ہو تو خاتم رسل کون ہوگا۔ جب رسول بھی انبیاء کے گروہ میں سے تھے اور جب رسول اللہ خاتم انبیاء

---

[17] سیر و شاہی۔ ۲، ۱۲۰۔

[18] اصول کافی۔ ۱:۱۷۶۔ طبع دوم تہران۔

[19] تفسیر المیزان۔ ذیل آیت ۲۱۳۔ سورۂ بقرہ۔

Presented by Ziaraat.Com

تھے تو لازماً خاتم رسل بھی ہوتے۔

نبی اور رسول کے درمیان فرق میں دیکھنا یہ نہیں ہے کہ ان میں سے کس کی اہمیت زیادہ ہے بلکہ اہمیت ان کے شمول اور شرکت کی ہے۔ ان میں سے کون زیادہ شریک اور عام ہے۔

اگر ہم کہیں کہ نبی، رسول سے زیادہ خصوصیت کا حامل ہے اور ہماری توجہ رسالت کے مقابلے میں نبوت کی اہمیت پر مرکوز رہے، مگر اس نقطہ کی عمومیت اور شرکت پر نظر نہ رہے تو قدرتی بات ہے کہ اس کا دائرہ محدود ہو جائے گا۔ اور رسالت زیادہ عمومیت اور شرکت کی حامل ہو جائے گی، جب کہ ہم سب جانتے ہیں کہ خاتم انبیاءؑ، خاتم رسل بھی ہیں۔

www.ziaraat.com
Sabeel-e-Sakina

Presented by Ziaraat.Com

www.ziaraat.com
Sabeel-e-Sakina

Presented by Ziaraat.Com

(۷)

نزولِ قرآن

نزولِ قرآن کے معنی

جیسا کہ اصفہانی[۱] کا کہنا ہے کہ اہلِ سنت والجماعت اس بات پر متفق ہیں کہ کلامِ خداوندی مُنَزَّل ہے مگر وہ اس (نزول) کے معنی میں اختلاف کرتے ہیں۔[۲]

کتاب و سنت میں بہت سے مقامات پر قرآن کو کلماتِ نزول، انزال و تنزیل سے تعبیر کیا گیا ہے۔

لغت میں (نزول) کے دو معنی آئے ہیں: وارد ہونا اور کہیں جاگزین ہونا۔ اس کا فعل متعدی 'انزال' ہے۔ مثال کے طور پر:

وَقُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ (۲۳: ۲۹)

اور کہنا کہ اے میرے رب مجھ کو (زمین پر) برکت والی جگہ اتارنا، تو ہی سب سے بہتر اتارنے والا ہے۔

لغت میں اس لفظ کا ایک دوسرا اطلاق بھی ہے اور وہ کسی چیز کا اوپر سے نیچے کی طرف اترنا (نشیب میں آنا) ہے۔ جیسے نزل فلانا من الجبل — فلاں شخص پہاڑ سے اترا۔ اس کا فعل متعدی حرکت دینا اور نیچے لانا ہے۔ مثال کے طور پر:

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً (۲: ۲۲)

مگر قرآن مجید میں ان دونوں معنی کے علاوہ لفظ نزول، دوسرے معنی میں بھی آیا ہے، یعنی مہیا کرنا، تیار کرنا۔ جیسا کہ فرمایا:

وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ (۵۷: ۲۵)

ہم نے لوہا اتارا (مہیا کیا)۔

اور پیدا کرنا بھی:

وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ (۳۹: ۶)

اور تمہارے لیے آٹھ نر و مادہ چوپایوں کے پیدا کیے۔

بغیر شبہ کے ان میں سے ایک بھی لغوی معنی قرآن کے لیے مناسب نہیں ہے کیونکہ ان معنی کے لیے جسم ہونا اور (مکان) میں جگہ لینا ضروری ہے۔ اور قرآن کوئی (جسم) نہیں کہ (مکان) میں جگہ گھیرے یا اوپر سے نیچے بھیجا جائے۔ نزول کے یہ معنی نہیں کہ ایک فرشتہ قاصد

---

[۱] محمد بن بحر، ابو مسلم، مشہور معتزلہ مفسر قرآن (م ۳۲۲ ھ)۔ صاحب تفسیر جامع التاویل۔

[۲] اتقان: نوع ۱۶، المسألة الثانیہ۔

Presented by Ziaraat.Com

کبوتر کے سے پروں کے ساتھ آسمان سے نیچے اترے اور اپنے ساتھ خط (اور پیغام) لائے اور وہ تحفے میں پیش کرے یا پھر مادی انداز میں کلام کرے اور لوگ کہیں کہ ہاں ہم نے بھی مدھ مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ کی آواز سنی تھی۔ نزول سے مقصود پیغمبر پر ظہور وحی ہے، یعنی معنوی اور روحانی نزول جس کا ادراک صرف پیغمبر کر سکے اور اس کی حقیقت کو وہی جانے۔

مگر یہاں مجبوراً نزول کے لیے مجازی معنی سے استفادہ کیا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ زیادہ تر اصطلاحات، استعارے اور تمثیلات ملی ہیں تاکہ بات عام فہم ہو سکے۔ چنانچہ پیغمبر پر ظہورِ وحی کو بھی نزولِ وحی کہا جاتا ہے۔

پچھلے زمانے میں جب قرآن کے "مخلوق" ہونے پر گرما گرم بحثیں چل رہی تھیں تو اس لفظِ "نزول" پر بھی خوب بحثیں ہوئی ہیں۔ قطب رازی[۵۳] کہتے ہیں: نزول مجازی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جس شخص کا اعتقاد ہے کہ قرآن قدیم ہے اس کے لیے انزالِ قرآن کے معنی ہوں گے اس معنی پر حروف دالہ اور الفاظ کی ایجاد اور ان کا لوحِ محفوظ پر ثبت ہونا۔ مگر جو کہتا ہے کہ قرآن بس یہی الفاظ ہیں (یعنی قرآن کو مخلوق جانتا ہے) تو اس کا انزال صرف لوحِ محفوظ میں اثبات ہونا چاہیے۔ اور یہی معنی مناسب ہے۔ ممکن ہے اس کے انزال سے مراد اس عالم کے آسمان میں اثبات ہو جب کہ لوحِ محفوظ میں پہلے اثبات ہو چکا ہو۔

پیغمبروں پر کتابوں کے نزول کا مطلب یہ ہے کہ فرشتہ ان کو خداوند تعالیٰ سے حاصل کرتا ہے، یہ حاصل کرنا روحانی ہوتا ہے، یا ان کو لوحِ محفوظ سے حفظ کرتا ہے اور پھر اس کو نیچے لاتا ہے اور وحی کرتا ہے۔[۵۴]

ہم نے اوپر ذکر کیا تھا کہ "نزول" کے معنی میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس کے معنی اظہارِ قرآن ہے۔ بعض دوسرے کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خداوندِ عالم اپنا کلام اور اس کی قرائت جبرائیلؑ کو سمجھا دیتا ہے اور وہ اس کو زمین پر لے آتے ہیں۔[۵۵] ہاں انزال اور تنزیل میں فرق ہے۔ راغب کہتے ہیں کہ وصفِ قرآن و ملائکہ میں ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ تنزیل کسی جگہ سے مخصوص ہوتی ہے کہ قرآن کو باری باری کر کے بھیجے جانے پر اشارہ کرتی ہے جب کہ انزال عام ہے اور تنزیل میں بھی شامل ہے۔[۵۶]

جیسا کہ ہم جانتے ہیں قرآن کا ایک نام "تنزیل" بھی ہے۔ یہ نَزَّلَ کا اسم فعلی ہے۔ (مصدر باب تفعیل) جس کے معنی اتارنے کے ہیں یہ یا مفعول کی جگہ مصدر ہے (تنزیل منزل کی جگہ) کہ مبالغے کے طور پر آیا ہے۔ یعنی اس بات پر تاکید ہے کہ خدا کی طرف سے آئی ہوئی کتاب ہے، کسی اور کی طرف سے نہیں۔[۵۷]

مگر راغب کا یہ کہنا کہ تنزیل بتدریج نازل ہونے اور اترنے کو کہتے ہیں زیادہ صحیح معلوم نہیں ہوتا ہے۔ خداوندِ عالم نے فرمایا:

---

۵۳ محمد بن محمد بن ابی جعفر۔ علامہ حلی (م ۷۷۶) کے دمشق میں ایک ممتاز شاگرد۔ کشاف پر "بحر الاصداف" نام کا حاشیہ لکھا ہے۔ ایک دوسری شرح "کشاف" پر "تحفۃ الاشراف" کے نام سے بھی لکھی ہے۔

۵۴ اتقان۔ نوع ۱۶: المسالۃ الثانیہ۔ نقل از حواشی "کشاف"۔

۵۵ البرہان۔ زرکشی۔ ۱: ۲۲۹۔

۵۶ مفردات۔ ۵۰۸۔ لفظ "نزل"۔

۵۷ ابو الفتوح رازی۔ ۸: ۳۴۲۔

Presented by Ziaraat.Com

يَسۡـَٔلُكَ اَهۡلُ الۡكِتٰبِ اَنۡ تُنَزِّلَ عَلَيۡهِمۡ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ (۴:۱۵۳)

تم سے اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) کہتے ہیں کہ تم ان پر آسمان سے (ایک ہی مرتبہ اور ایک ہی جگہ) ایک کتاب اتار لاؤ۔

اس کے علاوہ ۱۷: ۹۳ و ۶: ۳۷ و ۲: ۱۰۵ اور دوسری آیات میں ہم دیکھتے ہیں کہ "تنزیل" کے معنی ایک ساتھ اور یکجا کے بھی آئے ہیں اور اس لفظ کے معنی محض تدریجی طور سے جزو جزو کر کے نازل ہونا نہیں۔

بعض کا یہ بھی کہنا ہے کہ "تنزیل" قرآن کے لیے اور دوسری مقدس کتابوں کے لیے "انزال" کا لفظ استعمال ہوا ہے[۸]۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ تورات کے لیے بھی "تنزیل" استعمال ہوا ہے (۳: ۹۳)۔ یہ بھی قابلِ غور ہے کہ جب بھی "تنزیل" کا لفظ سورہ کے آغاز میں آیا ہے (بجز سورہ ۳۹۔ الزمر کے) وہاں سورہ کے شروع کے الفاظ کے بعد آیا ہے[۹]۔

مختصر یہ کہ قرآن خود بہت سے موقعوں پر "تنزیل" اور "انزال" کے الفاظ کو کلمات اور آیاتِ الٰہی کے اعلان کے لیے لایا ہے۔ اور بلاشبہ اس کا مقصد کلمات و آیاتِ الٰہی کا وہی اعلان ہے جو خصوصی کیفیات کے ساتھ قلبِ رسولؐ پر وحی ہوتا اور آپؐ کے دل پر نقش ہوتا تھا۔

مگر یہ نزولِ قرآن کس طرح ہوتا تھا۔ کیا قرآن سارا اور ایک ساتھ آسمان سے نازل ہوتا یا بتدریج اور چند آیات اتریں پھر چند آیات نازل ہوئیں۔

نزول کے مراحل

قرآنِ کریم خود اس نزول کو تین آیات میں بیان کرتا ہے۔ اگر ترتیبِ نزول کو بھی نظر میں رکھیں تو وہ اس طرح آئی ہیں:

۱۔ فرمایا:

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ (۹۷:۱)

یقیناً ہم نے اس (قرآن) کو شبِ قدر میں نازل کیا۔

اور پھر تعظیم اور تکریم کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہوئے پوچھتا ہے کہ تم جانتے ہو کہ شبِ قدر کیا ہے؟ شبِ قدر ہزار مہینوں سے بہتر اور برتر ہے۔ اس رات فرشتے اور روح اپنے پروردگار کی اجازت سے نازل ہوتے ہیں، ہر امر کے ساتھ۔

۲۔ ایک دوسری آیت میں خداوند تعالےٰ جس رات قرآن نازل ہوا اس کی وضاحت کرتا ہے:

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ (۴۴:۳)

ہم نے اس (قرآن) کو ایک مبارک رات میں اتارا۔

معلوم ہوا کہ قرآن شبِ قدرِ مبارک میں نازل ہوا تھا۔ مگر وہ مہینہ کون سا تھا؟

---

۸ قرآن را بگو بہ شناختم۔ کنت کوشیک۔ ۳۱۹۔

۹ سورہ (۳۲) سجدہ میں الم کے بعد، اور (۴۰) غافر، (۴۱) فصلت، (۴۵) جاثیہ اور (۴۶) احقاف میں حم کے بعد لفظ "تنزیل" آیا ہے۔

Presented by Ziaraat.Com

۳ - ماہِ نزول کے تعین کے سلسلے میں فرمایا:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ ۔ (۲ : ۱۸۵)

رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا۔

اگر ان تین آیات کے ساتھ ایک اور آیت کو بھی نگاہ میں رکھیں تو بظاہر سرے سے مسئلہ حل ہو جاتا ہے اور پھر پوچھ گچھ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ جہاں فرمایا:

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ (۸ - ۴۱)

جو ہم نے اپنے بندے (محمد) پر فیصلے کے دن نازل کیا تھا، جس دن دو گروہ (مسلمان اور کافر جنگ بدر میں) باہم مقابل ہوئے تھے۔

اس طرح سے مطلب بظاہر روشن اور واضح ہے۔ قرآن شبِ قدر میں جو، رمضان کے مطابق تھی، پیغمبر پر نازل ہوا تھا۔

مگر بات یہاں ختم نہیں ہو جاتی۔ یہ صحیح ہے کہ ان قرآنی آیات میں یکبارگی اور ایک ساتھ نزول کا بطورِ کلی ذکر ہوا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن سب ایک ساتھ نازل ہو گیا تھا۔ مگر تاریخ اور روایات متواتر کہہ رہی ہیں کہ پہلی آیت رسولِ خدا کی چالیس سال کی عمر میں نازل ہوئی تھی اور اس کے بعد ۲۳ سال تک پیغمبر اکرم کی ۶۳ سال کی عمر تک یہ نزول رات اور دن، رمضان اور غیر رمضان میں جاری رہا۔ مسلمان خود اس تدریجی نزول کے شاہد تھے۔ علاوہ ازیں خداوند تعالیٰ خود ایک دوسری جگہ فرماتا ہے:

وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ (۱۷ : ۱۰۶)

اور قرآن کو ہم نے جز جز (نازل) کیا ہے تاکہ تم اس کو لوگوں پر ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔

اور ۲۵ : ۳۲ اور کچھ دوسری آیتوں میں بھی ذکر ہے۔ یہ آیت گواہ ہے کہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے آیا اور تاریخ بھی ہم کو یہی بتاتی ہے۔ پھر شبِ قدر میں نزولِ قرآن سے کیا مراد ہے؟ ان دو مختلف مفہوم کو کس طرح یکجا کیا جا سکتا ہے؟

یہ سوال آغازِ اسلام ہی سے لوگوں کے سامنے رہا ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ اصحابِ پیغمبر نے آپ سے اس سلسلے میں کچھ نہیں پوچھا۔ پہلی بار اس سوال کو عطیہ بن اسود (م تقریباً ۷۵ھ)[۱۰] نے ابن عباس سے پوچھا۔ وہ کہتا ہے "میرے دل میں شک پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ تو کہتا ہے کہ "شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ" یا "اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ" مگر نزول شوال، ذی قعدہ اور دوسرے مہینوں میں بھی جاری رہتا ہے" ابن عباس اس کی مشکل حل کرنے کے لیے جواب دیتے ہیں کہ "قرآن سارا ایک بار شبِ قدر میں نازل ہوا تھا اور بعد میں (تھوڑا تھوڑا کر کے) مہینوں اور دنوں میں یکے بعد دیگرے نازل ہوا"[۱۱]۔ مگر اس جواب نے بھی مشکل حل نہیں کی مگر اس نے مفصل بحثوں کا سلسلہ ضرور شروع کر دیا۔

---

[۱۰] وہ خوارج کے بڑے لوگوں میں سے تھا: ملل و نحل ۱ : ۱۵۵ - ۱۶۹، الاعلام ۵ : ۲۳ -

[۱۱] الاتقان - نوع ۱۶ - الاولی، ایضاً مجمع البیان ۱۰ : ۵۱۸؛ ابوالفتوح رازی - ۱۰ : ۳۲۴؛ کشف الاسرار - ۱۰ : ۵۴۹؛ فتح القدیر - ۱ : ۱۵۹ و ۵ : ۵۹۹؛ کتاب الاسماء والصفات بیہقی - ۲۳۶ -

Presented by Ziaraat.Com

۱۔ پہلا قول خود ابن عباسؓ کا ہے۔ ابتدا شب قدر میں سارے قرآن کے نزول سے کی ہے۔ آسمان پر نزول جو پیغمبر پر نزول سے پہلے ہے اور اس سے پہلے ایک مرحلہ اور ہے اور وہ لوح محفوظ پر ثبت ہونا ہے[۱۲]۔ یہ تین مرحلے ہیں (۱) لوح محفوظ پر نزول (۲) چوتھے آسمان یا اس جہان کے آسمان پر بیت العزۃ یا بیت المعمور پر تنزیل، (۳) پیغمبرؐ کے قلب پاک پر نزول۔

مگر یہ کہنا پڑے گا کہ نزول کے ان تین مراحل کے بارے میں نہ پیغمبرؐ نے کچھ فرمایا اور نہ کوئی گواہی موجود ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حاکم، طبرانی، ابن حجر، ابن کثیر، سیوطی، زرکشی، بیہقی اور ان جیسے دوسرے اکابرین نے اس کو نقل کیا ہے اور اس کی سند صحیح مانی ہے مگر بات ابن عباسؓ تک پہنچتی ہے۔ یہ حدیث غیبی امور میں سے ایک ہے۔ قرآن کا نزول لوح محفوظ سے دنیا کے آسمان پر ہوا۔ ابن عباسؓ کو یہ کہاں سے معلوم ہوا! سارے علمائے حدیث اس کو امور غیبی میں سے جانتے ہیں، ایسی بات جو کسی صحابی سے ذاتی طور پر قبول نہیں ہو سکتی۔ قرطبی اجماع کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتا ہے: "اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ قرآن شب قدر میں ایک ساتھ اور یکجا نازل ہوا" مگر خود وہ اور دوسرے بھی اس سلسلے میں مختلف رائے بیان کرتے ہیں جس سے اختلاف ظاہر ہوتا ہے۔ ان کی سند صحیح ہونے کے باوجود وہ ان قرآنی آیات سے جو بتدریج نازل ہونے کا ذکر کرتی ہیں، مختلف رخ پیش کرتی ہیں۔

ایک سوال یہ بھی ہے کہ آسمان پر نزول کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟ یقیناً جبرئیلؑ کے کام کو زیادہ آسان کر دینے کے لیے یا پھر پیغمبرؐ کی مصلحت کا تقاضا ہے کہ وحی کی قریب ترین حدود سے توقع رکھیں؟[۱۳]

خداوند تعالےٰ نے فرمایا:

رمضان کا مہینہ تھا جب قرآن لوگوں کی ہدایت کے لیے نازل ہوا۔

یہ لوگوں پر اللہ کی رحمت ہے۔ اللہ تعالےٰ انسان پر انعام کی بات کرتا ہے۔ ناس (انسانیت) متعین ہے یہی خلقت انسانی ہے تو کس طرح مناسب ہے کہ لوگوں کے ہادی کا کلام لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر نازل ہو۔ اور ایک مدت تک وہاں رہے۔ وہاں کیا ہوگا! کیا ساکنِ ملاءِ اعلیٰ اور ملکوتِ خدا کی آگاہی کے لیے؟ لوگوں تک کیا پہنچے گا؟ یہ کلامِ الٰہی انسان کے لیے حق و باطل کی سرحد بیان کرنے کے لیے ہے۔ آسمان کے فرشتوں کے لیے نہیں۔ ہاں آسمان پر نزول جیسا کہ ابوشامہ[۱۴] اور اس کے ہم خیال لوگوں نے کہا ہے تعظیم و تکریم ہے۔ مگر یہ گفتگو کچھ اور ہے اور ان آیات اور حقیقت کو یکجا کرنا دوسری بات ہے۔

سورۂ قدر کی تفسیر کرتے ہوئے شیخ محمد عبدہ نے ایک لطیف نکتہ بیان کیا ہے کہ خداوند عالم نے نزولِ قرآن کا مقصد سورۂ دخان کی آیت میں بیان فرمایا:

اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ

---

۱۲ اس کو جامع ترین طور سے سیوطی نے نقل کیا ہے۔ اتقان، نوع ۱۶ الاولیٰ۔ ملاحظہ کریں، البرہان ۱: ۲۲۹ مستدرک۔ حاکم ۲: ۲۲۲، فضائل القرآن۔ ابن کثیر، تفسیر طبری ۱: ۸۴ تا ۸۶، الدر المنثور ۱: ۱۸۹، الجامع لاحکام القرآن۔ ۲: ۲۹۷۔ دار الکتب مصریہ۔

۱۳ تفسیر کبیر۔ امام فخر رازی۔ ۵: ۸۵۔

۱۴ عبدالرحمن بن اسمٰعیل (م ۶۶۵) شافعی فقیہ۔ المرشد الوجیز کا مصنف اور شاطبیہ کا شارح ہے۔

Presented by Ziaraat.Com

یعنی انسان کو ہم نے عملی طور سے تعلیم و ارشاد کا محتاج بنایا تو عہد کیا کہ اس کو دوسروں کی زبان سے انذار کریں گے (ڈرائیں گے) اور متنبہ کریں گے۔ چنانچہ قرآن کو نازل کیا کہ لوگ ڈریں اور جان لیں کہ اپنے کیفرِ کردار تک پہنچیں گے۔ اور فرمایا:

فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ

یعنی احکامِ دین میں سے ہر حکم کی اس میں تفصیل موجود ہے۔ اس میں صرف ایسے احکام مقرر کیے جاتے ہیں جو تم کو حق تک پہنچائیں اور باطل سے دور کریں۔

بلاشبہ نزولِ قرآن کی ابتدا حق و باطل میں امتیاز سے ہوئی۔ اور قرآن حکمت سے پُر ہے۔ مگر اس کے یہ اوصاف کہ وہ حق و باطل میں فرق ظاہر کرنے والا اور حکمت کے احکام پر مشتمل ہے اس وقت ہی ظاہر ہوں گے جب وہ انسانوں کی نگاہوں کے سامنے آئے۔ لوگ اس کو پڑھ سکیں، سمجھ سکیں اور جان سکیں کہ یہ رحمت ہے اور ڈرانے والا اور متنبہ ہے۔ یہ جب ہی ممکن ہے جب ان پر نازل ہوا سارے کا سارا یا اس کا کچھ حصہ)۔ یہ عقل کے خلاف ہے کہ قرآن کی ان اوصافِ جمیلہ سے تعریف ہو جب کہ وہ ابھی لوگوں پر نازل نہ ہوا ہو۔ وہ کس طرح جان سکتے ہیں کہ قرآن کے آسمان پر نزول کی شبِ مبارک تھی اور یہ کہ وہ قرآن حق و باطل کے درمیان فرق کرتا ہے مگر لوگ اس نزول کے اثر سے قطعی ناواقف ہوں۔ ہدایت انسانوں کے لیے ہو اور اس کا ذریعہ آسمانوں میں ہو اخواہ آسمانِ جہان ہو یا لوحِ محفوظ ہو۔ جب لوگوں تک نہیں پہنچی اور ان پر کوئی اثر نہ ڈال سکی تو ماہِ رمضان اور روزوں کی اہمیت کا اندازہ کس طرح ہوگا۔

فرمایا:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ
هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ

یہ بات روشن ہوئی کہ قرآن جب نازل ہوا تو انسانوں کے لیے رہنما، دلیل، البرہان اور حق و باطل میں امتیاز کرنے والا بنا۔ مگر جب قرآن آسمان میں ہو تو اس کی یہ صفات کچھ مناسبت نہیں رکھتیں۔ وہاں کس کی ہدایت کرتا ہے کہ کہا جائے کہ قرآن رمضان کے مہینے میں، عبادات اور روزوں کے مہینے میں ہدایت اور رہنمائی کے لیے نازل ہوا ہے۔ کچھ لوگوں نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ ہدایت شانی ہے، ہدایتِ فعلی نہیں۔ یعنی قرآن کی کیفیت یہ ہے کہ اگر کسی کو رہنمائی کی احتیاج اور ضرورت ہے تو یہ اس کی ہدایت کرتا ہے، اور اگر حق اور باطل گڈمڈ ہو جائیں تو ان کو جدا کرتا ہے۔ اس لیے اس کی ان صفات کا ذکر کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ایک مدت گذرنے کے بعد اس کا اثر ظاہر ہو۔

اس کا جواب آسان ہے۔ قرآن میں بے شمار خطاب ہیں، اس میں ناسخ و منسوخ ہیں۔ کیا یہ بات صحیح ہے کہ کسی ایک شخص سے خطاب ہو (مثلاً ۵۸ : ۱ و ۶۲ : ۱۱ و ۳۳ : ۳۷) اور کسی خاص واقعے کا ذکر ہو اور اس کا ذکر اس واقعے سے پہلے ہو جائے اور ناسخ و منسوخ بھی ایک ساتھ ایک وقت میں نازل کیے جائیں۔ یہ کوئی معقول بات نہیں۔

بعض امامیہ روایات میں بھی بیت المعمور پر نزول کا ذکر ہے[55]۔ شیخ صدوق نے بھی اپنی کتاب "اعتقادات" میں اس کی گواہی

---

[55] تفسیر عیاشی ۱ : ۸۰، اصول کافی ۲ : ۶۲۹، تہذیب الاحکام ۴ : ۱۹۳۔

Presented by Ziaraat.Com

دی ہے[16] مگر شیخ مفید اس کو صرف ایک واحد روایت پر مبنی کہتے ہیں جو کسی علم کا سبب نہیں بن سکتی۔ وہ کہتے ہیں :

"یہ بات شک کرنے والوں سے زیادہ قریب ہے جنہوں نے گمان کیا تھا کہ خداوند عالم نے ازل میں قرآن سے تکلم کیا تھا اور لفظ ماضی سے مستقبل کی خبر دی تھی۔ اس نظریئے کو اہلِ توحید نے رَد کیا ہے۔"

۲۔ ایک دوسرا قول بھی نقل کیا گیا ہے کہ وحی کے نازل ہونے کی پوری مدت میں یعنی ۲۰ یا ۲۳ سالوں کے دوران جب بھی شبِ قدر آئی جتنا کچھ خداوند عالم نے تقدیر کیا تھا اور لوگوں کی ضرورت کے مطابق تھا، اس کے حکم سے آسمانِ دنیا پر نازل ہو جاتا تھا جو ایک سال میں بتدریج رسولِ خدا پر نازل ہوتا رہتا۔

امام فخر رازی اس پر بحث کرتے ہیں مگر کوئی نتیجہ نہیں نکالتے کہ یہ دوسرا قول بہتر ہے یا قول اول[17]۔ راویوں میں بزرگوں نے بھی اس کو نقل کیا ہے اور ابن عباس سے بھی روایت کی ہے[18]۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ عقلاً صحیح معلوم ہوتی ہے نہ نقلاً۔ اور آیاتِ قرآنی سے مطابقت نہیں رکھتی۔ آیات واقعات اور مواقع کی مناسبت سے نازل ہوتی ہیں۔ کیا ضرورت تھی کہ ایک سال کی لازم مقدار آسمان پر رکھی رہے اور موقع پر نازل ہوتی جائے۔

۳۔ اور دوسرے اقوال بھی ہیں جن کے ذکر سے گفتگو طویل ہو جائے گی۔ ان میں سے اہم قول بعض اہلِ تشیع علماء کا ہے :

شیخ صدوق اپنی کتاب "اعتقادات" میں اس بات کی وضاحت یوں کرتے ہیں کہ قرآن مجید یکجا بیت المعمور پر نازل ہوا اور وہاں سے ۲۰ سالوں میں پیغمبر اکرمؐ پر وحی ہوا، فرماتے ہیں "اور حق تعالیٰ نے تمام علم یکجا پیغمبرِ اکرمؐ کو عطا فرمایا اور پھر کہا : اس سے پہلے کہ وحی نازل ہو قرآن میں جلدی نہ کریں۔"

علامہ مجلسی بھی نقل کرتے ہیں کہ ماہِ رمضان کی اول شب قرآن سے کچھ حصہ پیغمبرؐ پر نازل ہوتا کہ وہ تو سمجھ لیں مگر لوگوں میں نہ پڑھیں، بعد میں مناسب موقعوں پر آیات کی قرائت کریں[19]۔

ابو عبداللہ زنجانی بھی کہتے ہیں : ممکن ہے ہم یہ کہہ سکیں کہ روحِ قرآن اور جن اصولوں پر قرآن کی توجہ ہے ان کی غرض و غایت پیغمبرؐ کے قلب پاک پر اس ایک شب تجلی کرتی ہو :

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ

اس کے بعد آیت آیت کر کے جدا جدا سال بھر میں آپؐ کی زبانِ مبارک پر ظہور کرتی ہو[20]۔

مگر اس سلسلے میں علامہ طباطبائی محکم استدلال پیش کرتے ہیں[21]۔

---

[16] اعتقادات، باب ۳۱۔

[17] برہان۔ ۱: ۲۲۹، اتقان۔ ۱: ۱۴۸، امام فخر رازی ۵ : ۸۵، الدر المنثور۔ ۱ : ۱۸۹۔

[18] مجمع البیان۔ ۲ : ۲۷۶۔

[19] بحار الانوار ۱۸ : ۲۵۳ - ۲۵۴۔

[20] تاریخ قرآن۔ زنجانی۔ ۱۰۔

[21] تفسیر المیزان، ذیل آیت ۱۸۲ تا ۱۸۵۔ سورۂ بقرہ۔ اور سورۂ طٰہٰ آیت ۱۱۵۔

Presented by Ziaraat.Com

نزول سے یکبارگی اور سارے کا سارا نازل ہونے کے معنی نکلتے ہیں۔ "انزال" کے بھی ایسے ہی معنی ہیں۔ چنانچہ ماہِ رمضان اور شبِ قدر میں نزول (۲ : ۱۸۵ اور ۴۴ : ۳ و ۹۷ : ۱) ایک ساتھ اور یکجا ہوا تھا، بتدریج نہیں۔ مگر چونکہ الفاظِ قرآن تدریجی جمع ہوئے تو یکبارگی اور کل قرآن کا اتارنا یا تو اس نقطۂ نظر سے ہے کہ اس کی آیات بطورِ کلی ایک چیز فرض کی گئی ہیں جیسے بارش کہ قطرہ قطرہ گرتی ہے مگر سب ایک کہی جاتی ہے۔ یا پھر اس معنی میں ہے کہ قرآن ایسی حقیقت کا حامل ہے، اس سے قطعِ نظر کہ انسان کی عام فہم سے بالا ہے اور وہ یہی ہے کہ اس کی آیات جدا جدا اور تدریجی ہیں، جو درحقیقت واحد ہے اور اس کا نزول یکبارگی اور یکجا ہوا تھا۔

قرآن کی آیات اسی دوسرے امکان کی تائید کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر:

كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ (۱۱ : ۱)

یہ ایک ایسی کتاب ہے کہ اس کی آیات محکم کی گئی ہیں، پھر صاف صاف بیان کی گئی ہیں، ایک حکیم آگاہ و باخبر کی طرف سے۔

یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ قرآن، فصل فصل اور جدا جدا ہونے سے پہلے، سارے احکام کا یکجا حامل تھا اور اس مقام پر اس کے اجزاء جدا اور الگ الگ نہیں تھے۔ اور جو کچھ تفصیل اس وقت آیاتِ قرآنی کی دکھائی دیتی ہے وہ صورت بعد میں پیدا ہوئی ہے۔ (یہ آیات بھی۔۔: ۳ و ۱۰ : ۳۹ و ۴۳ : ۴ و ۵۶ : ۷۵ تا ۸۰ و ۸۵ : ۲۱ و ۲۲) ظاہر آیات سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن کتابِ مکنون میں مقر رکھتا ہے اور ام الکتاب میں بلند مقام کا حامل ہے۔ کتابِ مبین جو اس قرآن اور اس تفصیل کا مرجع ہے، ایک ایسی حقیقت ہے جو اس نازل شدہ امر کے علاوہ ہے۔ یہ قرآن اس حقیقت کا لباس کہا جا سکتا ہے۔ قرآن کی کتابِ مبین سے نسبت وہی ہے جو حقیقت سے مثال اور صورت کی نسبت ہوتی ہے۔ کبھی اصلِ کتاب کو بھی قرآن کہا جاتا ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماہِ رمضان، لیلۃ القدر اور لیلۂ مبارکہ (۲ : ۱۸۵ و ۴۴ : ۳ و ۹۷ : ۱) کا مقصد یہ ہے کہ ماہِ رمضان میں حقیقتِ قرآن ایک بار قلبِ پیغمبرؐ پر نازل ہوئی، جیسا کہ اس کی تفصیل آنحضرتؐ کی رسالت کی مدت میں بتدریج نازل ہوتی رہی۔

مختصر یہ کہ اس سے استنباط کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کے دو نزول ہیں۔ کچھ لوگوں کے نقطۂ نگاہ کے مطابق ایک بار لوحِ محفوظ سے آسمان پر اور دوسری بار پیغمبرِ گرامیؐ پر۔ دوسرے لوگوں[۱] کے نظریئے کے مطابق ایک نزولِ دفعی (یکبارگی) یعنی نزولِ اجمالی جو غیر زمانی ہے اور قرآن اس کو "انزال" سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ نزولِ تدریجی پر مقدم ہے جو ایک روح کی صورت میں پیغمبرؐ پر نازل ہوا۔ یعنی وہ روحِ قرآن ایک بار اور مجموعاً قلبِ پیغمبرؐ پر نازل ہوئی۔ بعد میں تفصیل دی گئی۔ وہ نزولِ اول بھی ماہِ رمضان میں تھا اور اس وقت پیغمبرؐ ابھی مبعوث نہیں ہوئے تھے۔ دوسرا وہ نزولِ تدریجی یعنی نزولِ تفصیلی جو خاص خاص اوقات میں آیات، کلمات، الفاظ اور سورہ کی صورت میں نازل ہوا، جس میں تفصیل کی کیفیت ہے۔ اور یہ اس وقت ہوا جب جبرئیلؑ نازل ہوئے اور بعثت کا آغاز ہوا، یہ ۲۷ ماہ رجب تھی پھر ۲۰ یا ۲۳ سال نزول جاری رہا۔

یہ نظریہ بہت مقبول ہے اور دوسرے ذکر شدہ نظریات سے اس کی زیادہ پذیرائی ہوئی ہے۔ مگر بعض نکتے ایسے ہیں جن کی تشریح کی ضرورت ہے۔ یہ جو کہا گیا کہ "انزال" کسی چیز کا یکجا اور یکبارگی نیچے آنا ہے اور "تنزیل" بتدریج نیچے آنا ہے، یہ شروع میں ہم نے دیکھا

تفسیر سورۂ قدر - استاد مطہری۔

کہ صحیح نہیں ہے کیونکہ یکبارگی اور یکجا نازل ہونے کو بھی قرآن میں "تنزیل" کہا گیا ہے (۱۵۳:۴)۔

دوسرے یہ کہ فرض کریں بعثت ۲۷ رجب کو ہوئی تو پہلا نزول (وحی) ماہِ رمضان میں ہونا تعجب کا باعث نہیں۔ اس صورت میں نبوت کے لیے ابلاغ رمضان کے مہینے میں اور اعلانِ رسالت ۲۷ رجب کو ہوا۔ علاوہ ازیں نزول سے پہلے پیغمبرؐ کو وحی کے اجمالی اور کلی علم کا نہ کتاب سے اور نہ حدیث سے پتہ چلتا ہے۔ بلکہ وحی اخذ کرنے اور قرآن حفظ کرنے کے لیے زبان کے جلدی جلدی ہلانے اور خصوصاً

مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰۤى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ (۲۰:۱۱۴)

لفظ "اقضا" کے معنی یہ توجیہ دینے سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ ان کو پہلے سے نہیں جانتے تھے،

اس سے پیشتر کہ آیات تمام و کمال ان تک پہنچیں۔

ہاں اس قبیل کی آیات جیسے

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ

سے استفادہ کریں تو قرآن کے نزولِ کلی کا اشارہ ملتا ہے۔ مگر یہاں بھی بحث اور گفتگو کی بہت گنجائش ہے۔

۴۔ یہ آخری قول محمد بن اسحاقؒ[۲۳] اور شعبیؒ[۲۴] سے نقل کیا گیا ہے۔

"ماہِ رمضان کی شبِ قدر میں نزولِ قرآن سے مراد آغازِ وحی اور نزولِ قرآن کا شروع ہے"[۲۵]

چنانچہ نزول کے اُن مختلف مرحلوں کی یہاں ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ قرآن اس اصل کتاب (ام الکتاب یا کتاب مبین اور لوح محفوظ) سے ایک ساتھ پیغمبرؐ اکرم پر نازل ہوا۔ بہت سے مفسرین اس نظریئے کے طرفدار ہیں۔ زمخشری آیت کی اس طرح تفسیر کرتا ہے کہ یہاں سے قرآن کے نزول کا آغاز ہوا[۲۶] امام فخر رازی کہتا ہے کہ یہ ملتوں اور دولتوں کا آغاز ہے کہ تاریخ کے باب کا شروع ہے[۲۷] ابن شہر آشوب بھی اس نزول کو آغازِ وحی جانتے ہیں[۲۸] شیخ مفید بھی "شرح عقاید صدوق" میں ان کے نظریئے کے رد کے آخر میں اس بارے میں کہتے ہیں: ممکن ہے اس نزول سے کہ قرآن شبِ قدر میں نازل ہوا، قرآن کا کچھ حصہ مراد ہو جو بعد میں رسول اللہؐ کی وفات تک جاری رہا۔ مگر یہ کہ سارا قرآن ایک ساتھ شبِ قدر میں نازل ہوا ہو، بعید ہے۔ ظاہرِ قرآن، احادیثِ متواتر اور اجماعِ علماء (مع نظریاتی اختلافات) سے بھی یہی قرینہ مصلحت معلوم ہوتا ہے[۲۹]

۲۳۔ مجمع البیان۔ ۲:۲۷۶۔

۲۴۔ ابو عمرو عامر بن شراحیل (م ۱۰۹) پانچسو صحابہ سے ملا تھا، علیؑ بن ابی طالب، جابر بن عبداللہ اور زید بن ثابت سے روایت کی ہے۔

۲۵۔ اتقان۔ نوع ۱۶، الاولیٰ۔

۲۶۔ کشاف۔ ۱:۲۲۷۔

۲۷۔ تفسیر کبیر۔ ۵:۸۵

۲۸۔ مناقب آل ابی طالب۔ ۱:۱۵۰۔

۲۹۔ شرح عقاید۔ صدوق۔ ۵۸۔

Presented by Ziaraat.Com

حقیقت یہ ہے کہ آغازِ وحی تغیرِ انسانی کی تاریخ کی ابتدا ہے۔ رحمت اور نعمتِ الٰہی کے نزول کا آغاز اسی دن ہوا تھا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اس پوری آسمانی کتاب کو یا اس کے ایک حصے کو قرآن کہا جاتا ہے (جیسے آیات: ۱۰:۱۵ و ۱۲:۲ وغیرہ) یہاں تک کہ ایک آیت کو بھی قرآن کہا گیا ہے (مثلاً آیت ۱۰:۶۱ اور ۱۳:۳۱) پیغمبر کے ماہِ رمضان میں غارِ حرا میں ہونے اور آپ پر پہلی وحی کے نزول پر سنت اور تاریخ گواہ ہے۔ تو پھر ہم حقیقت کو کیوں نہیں قبول کر لیتے جس کو عقل صحیح بتاتی ہے، کتاب اس پر گواہ ہے اور سنت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ قرآنِ مجید میں اس آغازِ نزول کا ذکر دراصل اس واقعے کی عظمت اور بزرگی پر دلالت کرتا ہے۔ یہ وہ دن تھا جب تاریخِ انسانی کا ورق پلٹا گیا اور سرنوشتِ انسانی اس پر لکھی گئی۔ جب تک انسانیت زندہ ہے اس وقت تک کے لیے بشر کی ہدایت کا آغاز ہوا۔ اس واقعے کی ایسی ہی قدر و قیمت تھی کہ اس شان و شوکت سے اس کا قرآن میں ذکر آیا ہے کہ یہ واقعہ لیلۃ القدر، لیلۂ مبارکہ اور ماہِ رمضان میں پیش آیا۔ ہم اس تعظیم و تکریم سے غافل کیوں رہیں؟

وحی کا اختتام بھی بڑی شان سے ہوا کہ جب فرمایا:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (۵:۳)

آج کے دن ہم نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا۔ اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور ہم نے تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کر لیا۔

مگر وحی کا اختتام، کام کا اختتام نہیں تھا۔ ہدایت جاری رہی اور جاری ہے۔

یہاں گفتگو وحی کے آغاز اور ابتدا سے ہو رہی ہے۔ اس تغیر کی گفتگو ہے جو تاریخ میں آیا۔ اور یقینی بات کہ اس کا ذکر کرنا اور یاد منانا خداوندِ عالم کی رضا کا سبب بنے گا۔ قرآن کے نقطۂ نگاہ سے بھی یہ قول:

اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ

خود امرِ گذشتہ کا ذکر ہے اور اسی عظیم واقعے کی طرف اشارہ ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ شب و روز سب یکساں ہیں۔ ان میں کوئی فرق نہیں۔ اگر کوئی دن یا کوئی رات خصوصی عزت اور حرمت کی حامل ہوتی ہے تو وہ اس واقعے کی وجہ سے جو اس دن یا اس شب پیش آیا ہو، اور اس اثر کی بنا پر جو اس واقعے نے انسانوں پر ڈالا ہو۔ چنانچہ بعض ایام کی حیاتِ انسانی میں اہمیت ہو جاتی ہے اور ان کو یاد رکھا جاتا ہے۔ ہر امت اور ملت کسی نہ کسی وجہ سے بعض ایام کو اہمیت دیتی ہے اور یاد رکھتی ہے — جشن اور خوشیاں مناتی ہے یا پھر کسی واقعہ پر غم مناتی ہے۔ اس واقعہ کی یاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ لوگوں کو متحرک کرے۔ کیونکہ دن یا رات ان کو متحرک نہیں کرتے۔ وہ واقعہ جس قدر اہم ہو گا اتنا ہی لوگوں کا جوش و خروش زیادہ ہو گا۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ لوگوں کی حیاتِ معنوی اور مسلمان کی روزمرہ کی زندگی ہر پہلو سے قرآن سے گہرا واسطہ رکھتی ہے۔ قرآن کا اثر تو غیر مسلم معاشروں پر بھی واضح نظر آتا ہے۔ خداوند تعالیٰ بھی لوگوں تک اس شریعت کامل اور اس ہدایت، جس کو وہ پسند کرتا ہے، کے پہنچنے سے راضی ہے۔ یہ انسانیت کے لیے بڑی عظیم نعمت تھی۔ آسمان سے آخری کتاب اور ہدایت نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کے لیے جو بھی خیر و برکت چاہتا تھا اس نے نازل کی۔ چنانچہ یہ دن خدا کو بھی عزیز ہے اور خلقِ خدا کو بھی۔

اس طرح یہ نزول اس کی عظمت سے ایک عظمت اور اس کے شرف سے ایک شرف ہے۔ یہ شب، مبارک شب تھی یہ

www.ziaraat.com
Sabeel-e-Sakina

Presented by Ziaraat.Com

شب جو قدر و شرف کی حامل تھی۔

وَمَا أَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ (۹۷: ۲، ۳)

تم کو معلوم ہے شب قدر کیا ہے۔ شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔

جی ہاں ایسی مبارک رات جو ہزار مہینوں بلکہ لاکھوں مہینوں اور سالوں سے جو نزولِ قرآن کے شرف سے بے بہرہ ہیں، بہتر اور گرامی ہے۔

دعا ہے کہ ایک مخصوص یوم بنام "یوم قرآن" متعین کر کے پوری دنیائے اسلام اس نعمت عظیم کی شکر گزاری کرے جیسا کہ شکر گزاری کا حق ہے۔ بمنّہ و کرمہ۔

لیلۃ القدر

جب شب قدر کی بات ہو رہی ہے تو عرض کروں کہ یہ شب، شب تقدیر ہے۔ یعنی یہ وہ رات ہے جب مقدرات متعین ہوتے ہیں۔ یہ رات کب آئی تھی اس کے بارے میں مختلف رائے کا اظہار کیا گیا ہے:

اوّل رمضان، رمضان کے آخری دس روز، شب ۵، ۷، ۹، ۱۷، ۱۹، ۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۷، ۲۹ رمضان، ماہِ رمضان کی راتوں میں سے ایک رات، ۱۵ شعبان، ۱۵ رمضان بھی کہا گیا ہے۔ یا آنحضرتؐ کی زندگی میں کسی ایک سال میں ایک رات مخصوص تھی جب قرآن نازل ہوا تھا، یا ممکن ہے ہر سال ہو یا شب قدر ایک سے زیادہ ہو مگر پیغمبر اکرم کے لیے خصوصی مدت طے تھی۔ بہر صورت ایک رات ہے جو متعین نہیں ہوئی۔

بقول بغوی[۲۰] اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کے لیے اس رات کو مبہم رکھا ہے تاکہ لوگ اس لالچ میں کہ یہ شب عبادت میں گذاریں پورے ماہِ رمضان کی شبوں میں عبادات کی طرف متوجہ رہیں۔ جس طرح دعا کے قبول ہونے کی ساعت جمعہ کے دن میں اور صلاۃ وسطیٰ کو نمازِ پنجگانہ میں پنہاں رکھا گیا ہے[۲۱]۔ شوکانی نے لیلۃ القدر کے بارے میں ۵۰ اقوالِ احادیث سے جمع کیے ہیں[۲۲]۔

کلماتِ قرآن کس کے ہیں؟

ایک اور تعجب خیز بات جو کہی گئی ہے وہ نزولِ قرآن کے بارے میں سمرقندی کے ذریعے سے تین قول ہیں[۱]۔ اصلی راوی کا

۲۰۔ ابوالقاسم عبداللہ بن محمد (م ۲۱۷)۔ حدیث و سنت اور رجال پر کتابیں لکھی ہیں۔

۲۱۔ تفسیر بغوی اور تفسیر خازن۔ سورہ قدر کے سلسلے میں۔

۲۲۔ نیل الاوطار۔ ۴: ۲۷۲۔

۱۔ زرکشی نے سمرقندی سے نقل کیا البرہان ۱: ۲۲۹، سیوطی نے سمرقندی کا نام لیے بغیر ذکر کیا الاتقان ۱: ۱۵۷ نوع ۱۶ مسئلہ ثانیہ۔ بظاہر وہ محمد بن یوسف ناصر الدین سمرقندی فقیہ حنفی ہے جو علماء کے لیے سخت زبان استعمال کرتا تھا، ۵۵۶ھ میں اسے شکنجہ میں کس کر قتل کر دیا گیا۔

Presented by Ziaraat.Com

ذکر نہیں کہ کون ہے۔ مگر اس قول کے نقل کیے جانے کے بعد تو بہت ہنگامہ ہوا۔ کہا گیا ہے کہ نزول قرآن کا طریقہ ان تین طریقوں میں سے ایک ہے:

۱۔ جبرائیلؑ نے قرآن کے الفاظ و معنی کو لوحِ محفوظ سے سیکھا اور حفظ کیا۔ اور پھر اس کو نازل کیا۔

۲۔ جبرئیلؑ نے صرف معانی کو پیغمبرؐ پر نازل کیا، پیغمبرؐ نے ان معانی کو سمجھا اور ان کو عربی زبان میں بیان کیا۔ اس سلسلے میں اس آیت شریفہ کے ظاہر سے تمسک کی کوشش کی گئی ہے:

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَىٰ قَلْبِكَ (۲۶: ۱۹۳، ۱۹۴)

اس کا ذکر پچھلے صفحات میں آچکا ہے۔

۳۔ قرآن کا مفہوم تو وحیِ الٰہی ہے مگر عربی میں اس کی تعبیر جبرئیلؑ کی طرف سے ہے۔ آسمانی موجودات اس کو عربی میں پڑھتے ہیں اور جبرئیلؑ اس کو اسی طرح نیچے لائے۔

آخری دونوں نکتوں کا باطل اور غلط ہونا واضح ہے اور کتاب و سنت اور اجماع کے خلاف ہے۔ اگر لفظ و معانی دونوں خدا سے نہ ہوں تو اس کلام کو خدا سے کس طرح نسبت دی جا سکتی ہے۔ یہ واحد کتاب ہے کہ تمام تاریخی اور علمی دلائل سے اس کی عصمت اور ہر انحراف اور تحریف سے مبرّا ہونا، علوِ مکان اور اس کا بلند مقام انسان اور غیر انسان کی دسترس سے محفوظ رہا ہے اور ثابت ہے۔ مخالفوں اور کافروں کے سامنے جو محکم دلائل پیش کیے گئے وہ وحیِ الٰہی کی سچائی اور عصمت پر گواہ ہیں۔ خداوندِ عالم کی طرف سے نبی اکرمؐ پر جبرئیلِ امین کے توسط سے اسی لفظ و معنی کے ساتھ قرآن کا نزول تواتر سے ثابت ہے۔ اور عقلِ سلیم کے لیے اس میں کوئی شک اور تردد نہیں۔ یہ خیال بھی نہیں کیا جا سکتا کہ کلام جبرئیلؑ کا یا رسولِ خداؐ کا ہوگا۔ خداوند تعالےٰ تو خود فرماتا ہے:

> اس کتاب کا نزول اللہ غالب حکمت والے کی طرف سے ہے ... یہ اللہ کی آیات ہیں جو صحیح صحیح طور پر ہم تم کو پڑھ کر سناتے ہیں تو پھر اللہ تعالےٰ اور اس کی آیات کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گے۔ ہر جھوٹ باندھنے والے گنہگار پر افسوس ہے۔ وہ اللہ تعالےٰ کی آیات کو سنتا ہے جب اس کے سامنے پڑھی جاتی ہیں پھر وہ تکبر کرتا ہوا (اپنے کفر پر) اس طرح اڑا رہتا ہے جیسے اس نے ان کو سنا ہی نہیں۔ (۴۵: ۲، ۶ ـ ۸)

ان آیات کے بعد عقلِ سلیم کبھی تسلیم نہیں کرے گی کہ یہ رفیع و عالی معانی اور یہ بلند پایہ اور آفاقی کلمات کسی انسان کے ہوں گے۔ جب اللہ تعالےٰ اپنے رسولؐ کے لیے جنگ کا ایک قاعدہ بیان کرتا ہے تو فرماتا ہے:

> اگر مشرکین میں سے کوئی شخص آپؐ سے پناہ کا طالب ہو تو آپؐ اس کو پناہ دیجیے تاکہ وہ کلامِ الٰہی سن لے۔ (۹: ۶)

اب یہ گفتگو بیچ میں کہاں سے آگئی کہ اس کلامِ خدا میں معنی خدا کی طرف سے ہے اور اس کے الفاظ رسولؐ اللہ کے یا خدا کے فرشتے کے ہیں!

احادیث میں رسولؐ اللہ کی زبان موجود ہے جو اوجِ فصاحت پر ہے مگر کلامِ خدا سے کہیں دور ہے۔ اب رہ گیا کہ فرشتوں کی زبان عربی کہاں سے ہو گئی اور اس کی فصاحت و بلاغت کا یہ عالم کیسے ہو گیا کہ کوئی انسان اس کی مثل ایک فقرہ بھی نہ کہہ سکے! قرآن سے ان باتوں کا کیا واسطہ۔ خداوندِ عالم نے فرمایا:

Presented by Ziaraat.Com

وانك لتلقى القرآن من لدن حكيم عليم

اللہ تعالٰی تصریح کرتا ہے کہ قرآن، حکیم اور علیم کی طرف سے ہے۔ تو کیا اس سے مراد صرف اس کے معانی ہیں اور اس کے الفاظ اور کلام نہیں؟ تو پھر پیغمبر خدا پر وہ سخت کیفیتیں کیوں طاری ہوتی تھیں اور پیغمبر کو آخر کیا جلدی تھی اور لالچ تھا کہ وحی کو جلدی جلدی حفظ کرلیں آپ صحابہ سے اس کو لکھ لینے اور حفظ کرنے کی تاکید کیوں فرمایا کرتے تھے۔ خداوند تعالٰے خود فرماتا ہے:

کہہ دیں اے پیغمبر کہ یہ میرے لیے قطعی درست نہیں کہ ایک لفظ بھی قرآن میں رد و بدل کر دوں۔

یہ بلند و رفیع الشان کلام سوائے خدا کی طرف کے اور کسی کا ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ لفظ و معانی میں ذم اعجاز سوائے حق کے اور کہیں سے ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ نص کی عصمت، مضمون کی طہارت اور موضوع کی وحدت سوائے اس کی جانب سے کس کی تائید سے ممکن ہے؟ لفظ و معانی دونوں مل کر انسان کو عاجز کیے ہوئے ہیں کہ اس کی مثال لے کر آئیں۔

قرآن کے الفاظ، اس کا نوشتہ، اس کے کلمات اور معنی سب تواتر سے قطعی اور مسلّم طور پہ خدا کی طرف سے ہیں۔ جبرئیل یا پیغمبر یا کسی بھی موجود کا اس میں گذر نہیں۔ جو بھی ایسی بات کہتا ہے وہ بلاشبہ لایعنی اور بے ربط بات کہتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بحث انحرافی بنیادی طور سے ایک دوسری بحث سے نکلی تھی اور وہ دراصل وحی کے معنی کے بارے میں گفتگو کا شاخسانہ تھا۔ زُہری سے وحی کے بارے میں کچھ پوچھا گیا۔ اس نے وحی کی تعریف کرتے ہوئے اس کو دو قسموں میں تقسیم کیا:

۱۔ وہ جو انبیائہ کے قلب پر وحی ہوتی ہے اور زبان پر جاری ہوتی ہے اور پھر کتاب میں لکھی جاتی ہے کہ یہ وہی کلام الٰہی ہوا۔

۲۔ وہ جس کا تکلم نہیں ہوا لکھنے کا بھی حکم نہیں۔ مگر لوگوں میں بیان کی جاتی ہے اور ان میں اس کی تبلیغ ہوتی ہے۔

یہ دوسری قسم وحی کی کوئی حقیقی تعریف بیان نہیں کرتی۔ اس سے مراد سنت اور حدیث ہو سکتی ہے۔ جوینی[2] نے اس کی اس طرح وضاحت کی ہے: وحی کی ایک قسم وہ ہے جو خداوند عالم نے جبرئیلؑ کے ذریعے نبیؐ کے لیے پیغام بھیجا۔ وہ پیغام ایک حکم کے اجراء کے لیے تھا۔ جبرئیلؑ جانتے ہیں کہ یہ حکم اور فرمان ہے اجراء کے لیے۔ چنانچہ وہ عبارت کی قید کا خیال کیے بغیر اس حکم کو پہنچا دیتے ہیں۔ مگر دوسری قسم وہ ہے جو فرمان کتبی ہے۔ یہ لفظ بہ لفظ اور حرف بہ حرف پیغمبرؐ تک پہنچایا جاتا ہے یہی کتاب خدا اور کلام اللہ ہے۔

اس تعریف کو پیش نظر رکھیں تو پہلی قسم سنت اور حدیث ہوئی اور دوسری قسم قرآن کی صورت میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر حدیث کے صرف معنی ہی بیان کر دیے جائیں تو وہ درست سمجھا جائے گا۔ لیکن قرآن کے صرف معنی بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا (اس کا متن بھی پڑھنا ضروری ہے)[3] اس گفتگو سے بھی وحی "متلوّ" اور "متروک" میں تقسیم ہوتا ہے۔ یعنی وہ وحی جس کی قرائت اور تلاوت ہونی چاہیے (قرآن)، اور دوسری وہ وحی جس کی نماز میں قرائت صحیح نہیں ہے[4]۔

وحی کی یہ تعریف دراصل غلط بحث کا نتیجہ ہے۔ بنیادی طور پر یہ وہی بحث ہے کہ قرآن کے الفاظ و معنی دونوں خدا کی طرف سے

---

۲ رکن الاسلام عبداللہ بن یوسف فقیہ شافعی۔ امام الحرمین عبدالملک کے والد (م ۴۳۸)

۳ اتقان۔ ۱:۱۵۹-۱۶۰-

۴ اسی کتاب میں، حدیث قدسی، کے بارے میں بیان ملاحظہ کیجیے۔

Presented by Ziaraat.Com

ہیں یا ان میں سے صرف ایک! ظاہر ہے کہ قرآن کے بارے میں ایسے سوالات لایعنی اور مہمل ہیں۔ حدیث کے سلسلے میں بھی اس قسم کے سوالات وضاحت کے محتاج ہوتے ہیں۔

ایک مشکل اور بھی درپیش رہی ہے اور وہ فرشتے سے وحی کے حاصل کرنے کے بارے میں ہے۔ یعنی ایک انسان جیسے پیغمبرؐ کا دوسرے وجود جیسے ایک فرشتے جبرئیلؑ سے کس طرح ارتباط رہا ہوگا۔ مادی جسم رکھنے والا انسان کس طرح فرشتہ روحانی سے تفاہم اور ربط پیدا کر لیتا ہوگا۔ فرشتے خالص روحانی وجود ہیں اور ان کی بول چال سننا ممکن نہیں، خصوصاً ان کے لیے جو جسمانی وجود رکھتے ہیں اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ وحی دو طریقوں سے حاصل ہوتی تھی، یا تو پیغمبرؐ خصوصیات بشری سے نکل آتے تھے اور فرشتے کی صورت اختیار کر لیتے تھے، یا پھر جبرئیلؑ انسان کی شکل میں نازل ہوتے تاکہ تفاہم اور ارتباط ہو سکے[۵۹]

یہ بھی اسی قبیل کی بات ہے جہاں وحی کو صحیح طور پر لوگ سمجھ نہیں پائے اور اس کی ناقص تعبیریں کرتے رہے۔ فرشتے کو تو پیغمبرؐ کے ذہن اور دل سے سروکار تھا۔ چنانچہ قرآن کے معجز نما معانی اور الفاظ رسول اللہ کے ذہن پر نقش ہوئے اور آپؐ کی زبان پر جاری ہوئے۔ پیغمبرؐ کو ایسی کیا ضرورت پڑ گئی تھی کہ اپنی بشری خصوصیات کو چھوڑتے یا پھر فرشتہ انسان بن جاتا۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ سب غیبی امور ہیں اور اس میں عقل کا دخل نہیں ہونا چاہیے۔ ہم محض گمان اور قیاس سے کام لیتے ہیں جب کہ حقیقت پر گفتگو کی جائے تو اس کو معصوم سے روایت کی گئی صحیح حدیث پر مبنی ہونا چاہیے۔

اس نزول کی مدت

پیغمبرؐ اکرم پر قرآن مجید کے نزول کی مدت بعثت سے شروع ہوئی اور آپؐ کی زندگی کے اواخر کے قریب ختم ہوتی ہے۔ اس مدت کو ۲۰ یا ۲۳ یا ۲۵ سال کہا گیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ بعثت کے آغاز کے بعد سے مکہ میں آپ کی اقامت کی مدت میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ آیا دس سال تھی یا ۱۳ سال یا ۱۵ سال۔ مگر مدینے میں آپ کے قیام کی مدت دس سال تھی اس پر سب کو اتفاق ہے[۶۰]

اسلام کی قانون سازی کی تاریخ کے ایک محقق کا کہنا ہے کہ آنحضرتؐ کی مکہ میں اقامت کی مدت ۱۲ سال، ۵ ماہ اور ۱۳ دن تھی، (۱۷ رمضان یوم الفرقان سے لے کر جب آپؐ ۴۱ سال کے تھے، یکم ربیع الاول تک جب آپؐ ۵۴ سال کے تھے)۔ ہجرت کے بعد مدینہ میں قیام کی مدت ۹ سال، ۹ ماہ اور ۹ دن تھی (یکم ربیع الاول آنحضرتؐ کے سال تولد کے ۵۴ سال سے ۹ ذی الحجہ تک جب آپؐ ۶۳ سال کے ہوئے) یہ سنہ ۱۰ھ سے موافق ہے۔

مگر اس تحقیق پر بھی تین رخ سے تحقیقات ہونی چاہیے۔ اول تو رویائے صادقہ کے ۶ مہینے حساب میں نہیں لیے گئے۔ دوسرے یہ

---

۵۹ کشاف اصطلاحات الفنون: ۱۱۶۲۔ ذیل "وحی قرآن" و ۱۴۱۹ و ملصقة الجرس۔ کامل مبرد۔ ۳: ۲۲، تعریفات۔ جرجانی۔ ذیل "جرس"، الاتقان۔ ۱: ۱۵۶ نوع ۱۶، المسالة الثانیة، سبل الہدیٰ۔ ۲: ۳۴۲۔

۶۰ البرہان۔ ۱: ۲۳۲۔ فضائل القرآن۔ ابن کثیر۔ ۶۔

۶۱ اسی کتاب میں پیغمبرؐ اکرمؐ کی عمر" کا باب ملاحظہ کریں۔

Presented by Ziaraat.Com

کہ ہجرت کو یکم ربیع الاول سے شمار کیا گیا ہے۔ اور اختتام وحی کو قرآن کی آخری آیت

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ

کے نزول سے حساب میں لیا گیا ہے۔ یہ ۹ ذی الحجہ ۱۰ھ کی بات ہے جب کہ پیغمبر اکرمؐ ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ ۶۳ سال کی عمر تک بقید حیات تھے۔ اور ۸۲ روز اس سے پہلے (یا زیادہ سے زیادہ اسّی دن پہلے) تک وحی جاری تھی۔

اگر ہم رویائے صادقہ کی مدت نگاہ میں نہ رکھیں اور پہلی وحی ۱۷ رمضان ہی سے حساب کریں تو یہ ۶/ اگست ۶۱۰ء کے مطابق ہوگا۔

ہجرت یعنی مدینہ پہنچنے کا دن دوشنبہ ۱۲ ربیع الاول بعثت کے ۱۴ ویں سال جب آپ ۵۳ سال کے تھے۔ حساب کریں تو وہ ۲۸ ستمبر ۶۲۲ء کے مطابق ہوتا ہے۔

اس طرح مکہ میں اقامت ۱۲ سال، ایک مہینہ اور ۲۲ روز شمسی حساب سے ہوئی۔ نزول کے اختتام کو بھی اگر ہم (مشہور قول کے مطابق سورۂ بقرہ کی آیت ۲۸۱) یکم ربیع الاول ۱۱ھ رکھیں تو وہ ۲۸ مئی ۶۳۲ء کا دن پڑتا ہے۔ گویا مدینے میں وحی نازل ہونے کی مدت ۹ سال اور ۸ مہینے شمسی ہوئی اور سارے نزول وحی کی مدت ۲۱ سال ۹ مہینے اور ۲۲ دن شمسی ہوئی جو قمری حساب سے ۲۲ سال ۵ مہینے اور ۷ دن ہوتے۔

یہ اس قول کے مطابق ہی ہوا جو کہا جاتا ہے کہ مکہ میں رسول اللہؐ کی اقامت ۱۳ سال اور مدینے میں ۱۰ سال رہی۔ اس طرح وحیِ قرآن کی مدت ۲۳ سال شمار کی جائے گی۔

نزولِ تدریجی کی دلیل

وحی کے بتدریج تھوڑا تھوڑا کر کے اترنے کی بہترین دلیل خود خداوند عالم کا قول ہے کہ جہاں فرماتا ہے؛

وَ قُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ (۱۷ : ۱۰۶)

اور قرآن میں ہم نے جا بجا فصل رکھا ہے تا کہ آپ اس کو لوگوں کے سامنے ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں۔

(اس کے علاوہ آیت ۲۵ : ۳۲ و ۳۳)

روایات میں ہے کہ یہودی اور مشرکین تھوڑا تھوڑا قرآن نازل ہونے پر پیغمبرؐ پر اعتراض کرتے کیونکہ تصور یہی تھا کہ انبیاءؑ پر کتاب یکبارگی نازل ہوا کرتی تھی[1] وہ پیغمبرؐ سے بھی یہی چاہتے تھے کہ پہلے زمانوں کی طرح قرآن بھی ایک بار اور یکجا نازل ہو۔ یہ آیت ان لوگوں کے اسی اعتراض کے رد میں نازل ہوئی۔ سیوطی کا کہنا ہے کہ گذشتہ کتابیں سب ہی ایک بار اور یکجا نازل ہوئی تھیں۔ یہ بات سارے علماء میں مشہور تھی اور سب کی زبان پر یہی بات تھی۔ تقریباً سب کا اس پر اجماع تھا مگر ایک عالم کو میں نے

---

[1] درالمنثور ۵ : ۶۸، تفسیر عیاشی ۱ : ۸۰، مسند احمد ۵ : ۱۴۷، شاکر ۱ : ۴۰۷، حلبی، تفسیر ابن کثیر ۱ : ۱۹۲، الاسماء والصفات بیہقی ۲۳، الاتقان کی طبع ۱ : ۱۸۲، الدر المنثور ۱۸۳ : ۴

[2] الاتقان ۱ : ۵۲ طبع نو ۲، تذنیب معترک الاقران ۱ : ۲۰۷۔

دیکھا جیا اس کو قبول نہیں کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ دلیل نہیں ہے بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ بھی قرآن کی طرح تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوئی تھیں۔ میرا کہنا ہے کہ پہلی بات صحیح ہے۔ اس پر سورۂ فرقان کی آیات ۳۲ اور ۳۳ دلیل ہیں۔ کہ کافر اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن ایک ساتھ کیوں نہیں نازل ہوا)۔

علاوہ اس کے کہ احادیث بھی ان کی تائید کرتی ہیں، جب یہودیوں اور مشرکوں نے قرآن کے ایک ساتھ نازل کرنے کی بات کی تو خداوند عالم نے ان کے رد سے سکوت اختیار کیا، بلکہ اس کی حکمت کو بیان کیا۔ اگر پچھلی کتابیں بتدریج نازل ہوئی ہوتیں تو وہاں کی بات کو رد کرتا اور کہتا کہ یہ تو سنت الٰہی ہے۔ جیسا کہ اس موقع پر انہوں نے جب طعن کیا کہ یہ کیسا پیغمبر ہے کہ کھانا کھاتا ہے، بازاروں میں چلتا پھرتا ہے تو خداوند عالم نے ان کی بات رد کی اور فرمایا؛

اور تم سے پہلے ہم نے رسولوں کو نہیں بھیجا مگر یہ کہ وہ سب یقیناً کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے۔ (۲۵:۲۰)....۵۳

فراء (م ۷، ۲ھ)، بزرگ ماہر صرف و نحو، جواب دیتا ہے کہ یہ آیت مشرکین کے قول کو دہرا رہی ہے۔ یہی لوگ تھے جو ایسا گمان کرتے تھے ۵۴ اگلی آیت میں بھی ہے؛

یہ کوئی مثال بھی میرے پاس نہیں لاتے مگر یہ کہ ہم حق بات اور بہترین وضاحت تم کو عطا کر دیتے ہیں۔ (۲۵:۳۳)۔

یہ خود کافروں کے قول کا رد ہے۔

ابن فورک ۵۵ تورات کے یکبارگی اور یکجا نازل ہونے کی بات کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ جو کہا گیا کہ تورات ایک بار نازل ہو گئی اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایسے پیغمبر پر نازل ہوئی جو پڑھنا اور لکھنا جانتا تھا۔ یعنی حضرت موسیٰؑ پر۔ جب کہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے اس لیے نازل ہوا کہ وہ ایک امی پیغمبر پر بغیر لکھے ہوئے نازل ہوا ۵۶

اس سلسلے میں ابن فورک کی نظر تورات پر تھی جہاں "الواح" کے بارے میں ہے :

"خداوند نے موسیٰؑ سے کہا کہ ان باتوں کو تم لکھو کیونکہ ان ہی باتوں کے مطابق تم سے اور اسرائیل سے ہم نے عہد لیا ہے۔ وہ چالیس دن اور چالیس رات خداوند کے نزدیک وہاں رہے، نہ روٹی کھائی نہ پانی پیا۔ اور عہد نامہ یعنی دس فرمان الواح پر لکھے" ۵۷

---

۵۳ دوسری آیات بھی سند کے طور پر پیش کی ہیں مثلاً ۱۷/۲:۹۴ و ۱۲:۱۰۹ و ۱۰۹، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۵۰، ۱۵۴، ۱۷۱۔

۵۴ معانی القرآن۔ ۲: ۲۶۷۔

۵۵ ابوبکر محمد بن حسن اصفہانی، مشہور متکلمین اور اصولیین میں سے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک سو سے زیادہ کتابیں معانی قرآن اور اصول فقہ میں لکھی ہیں۔ محمود سبکتگین کے ہاتھوں زہر دیئے گئے (م ۴۰۶)۔ الاعلام۔ ۶: ۳۱۳ و انباہ الرواۃ۔ ۳: ۱۱۰۔

۵۶ البرہان۔ زرکشی۔ ۱: ۲۳۱، اتقان۔ ۱: ۱۵۲، معترک الاقران۔ سیوطی ۲: ۲۰۶۔ دارالفکر العربی ۱۹۶۹۔

۵۷ سفر خروج۔ ۳۴: ۲۷۔ ۲۸۔

Presented by Ziaraat.Com

گذشتہ کتابوں کے نزول سے قطع نظر قرآن مجید کا بتدریج نزول، کتاب کے واضح دلائل، سنت کی تائید اور تاریخ سے بھی مسلّم اور قطعی ثابت ہے۔

نزولِ وحی کی کیفیت

قرآن کی آیات، حکمت عالی کے تحت موقع کی مناسبت سے نازل ہوا کرتی تھیں۔ کبھی ایسا واقعہ پیش آتا جہاں احکامات کی ضرورت ہوتی۔ کبھی کچھ لوگ ایسے سوالات کرتے جن کا جواب دیا جانا ضروری ہوتا۔ یا کبھی بنیادی احکام نازل ہوتے۔ کبھی لوگوں کو اچھے کاموں کی ترغیب دی جاتی اور برے کاموں سے روکا جاتا۔ کبھی حکمت متقاضی ہوتی کہ گذشتہ انبیاءؑ کے قصے بیان کیے جائیں۔ ان صورتوں میں ایک موضوع سے متعلق کچھ آیات یکجا نازل ہو جاتیں۔

عکرمہ سے ابن اشتہ اصفہانیؒ نقل کرتا ہے کہ "بمواقع النجوم" (۵۶ : ۷۵) کے بارے میں اس کا کہنا ہے کہ خداوندِ عالم نے قرآن کو بتدریج ۳ آیات، ۴ آیات اور ۵ آیات کر کے نازل کیا۔

نکزاوی (م ۶۸۳ھ) اپنی کتاب "وقف" میں کہتا ہے کہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا۔ ایک آیت، دو آیات، تین، چار اور کبھی اس سے زیادہ۔

ابو سعید خدری اپنے شاگردوں کو صبح پانچ آیات اور شام کو پانچ آیات سکھاتا تھا اور کہتا تھا کہ جبرئیل بھی قرآن ۵۔ ۵ آیات کر کے لائے تھے۔

حضرت علیؑ ابن ابی طالب سے بھی اسی مضمون کی ایک روایت نقل کی گئی ہے۔ دوسرے راویوں اور حدیث نقل کرنے والوں نے صحابہ اور تابعین سے اسی انداز کی روایات نقل کی ہیں[2]۔

روایات پر نگاہ ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ قرآن زیادہ تر چار آیات اور ۵ آیات کے انداز پر نازل ہوا ہے۔ مگر ہمیشہ یہ ترتیب نہیں رہی۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ ایک آیت کا ایک حصہ ایک جگہ نازل ہوا اور اس کا دوسرا حصہ دوسرے موقع پر۔

کہا جاتا ہے کہ قصۂ افک[3] کی دس آیات (۲۴ : ۱۱ تا ۲۰) اور سورۂ مومنون کی اول دس آیات یکجا نازل ہوئی تھیں۔ مگر "غیر اولی الضرر"[4] کا جملہ الگ نازل ہوا تھا۔

اسی طرح "وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً" (۹ : ۲۸) کی پوری آیت، پہلی آیت کے بعد نازل ہوئی تھی۔

سورۂ "اقراء" کی پہلی ۵ آیات اور سورۂ "والضحیٰ" کی پہلی ۵ آیات یکجا نازل ہوئی تھیں۔ چھوٹی سورتوں کو بھی کہا جاتا ہے کہ ان میں

---

[1] ابو بکر محمد بن عبداللہ (م ۳۶۰) قرائت و علوم قرآن کے علماء میں سے ہیں۔ ان کی دو کتابیں "المجر" اور "المفید" مشہور ہیں۔ غایۃ النہایہ۔ ۲/ ۱۸۴۔

[2] اتقان ج ۱: ۱۵۵۔

[3] افک کا قصہ مشہور ہے کہ ان آیات میں رسولِ خدا کی زوجہ تہمت اور افترا سے بری قرار پائیں۔

[4] آیت: لا یستوی القاعدون من المومنین غیر اولی الضرر والمجاھدون فی سبیل اللہ۔ (۴ : ۹۵)

Presented by Ziaraat.Com

سے پہلے ایک ساتھ اتری تھیں۔ معوذتین "قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس" فوراً ایک ساتھ نازل ہوئی تھیں[9]

کبھی ایسا بھی ہوا کہ بڑی سورہ جیسے سورہ "انعام" اور سورہ "المرسلات" یکجا اور ایک بار ہی نازل ہوئیں۔

ابن مسعود کہتے ہیں کہ ہم لوگ نبی اکرمؐ کے ساتھ منیٰ کے ایک غار میں تھے[10] کہ "والمرسلات عرفا" نازل ہوئی۔ میں نے اس کو آپؐ کی زبان مبارک سے سنا۔ ابھی آپؐ کی زبان پر وہ جاری تھی کہ اچانک ایک سانپ ہم لوگوں کی طرف بڑھا۔ پیغمبرؐ نے فرمایا کہ اس سانپ کو مار دو۔ ہم لوگ اس کو مارنے اٹھے تو وہ بھاگ گیا۔ مگر یہ نہیں پتہ کہ کس آیت پر آپؐ نے سورہ تمام کی تھی۔ آیت "فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ" (۵۰:۷۷) یا پھر "إِذَا قِيلَ لَهُمُ ارْكَعُوا لَا يَرْكَعُونَ" (۴۸:۷۷) پر۔

سورہ "انعام" ایک رات مکہ میں یکجا نازل ہوئی۔ اس کو ستر ہزار فرشتے گھیرے ہوئے تھے[11]

اس سلسلے میں بہت سی روایات ہیں۔ ان سے صحیح نتیجہ اخذ کرنے کے لیے موضوع بحث اور آیات کا متن اور ان میں ربط کی اہمیت پر نظر رکھنی ہوگی۔

اس نزول کا راز

تاریخ اسلام کی پیشرفت اور مسلمانوں میں تحرک و تحریک کا پیدا ہونا، وہ جوش و خروش جو معاشرۂ انسانی میں ظاہر ہوا، مسلمانوں کے قوی اور مستحکم جذبے، ان کا ایثار و قربانی اور جاں سپاری، ان سب کا سرچشمہ صدرِ اسلام کے مسلمانوں کا تحرک اور ان کا ایمان ہے۔ اس تحرک اور ایمان کے پیچھے ایک بڑا راز کارفرما تھا اور وہ آیات کا بتدریج نازل ہونا تھا!

اسلام کی کامیابی اور کامرانی کا حقیقی راز اور محرک یہی تدریجی نزول تھا۔

جب بھی مصلحت کا تقاضا ہوتا اور پیغمبرؐ اور آپؐ کے صحابہ کے لیے کسی تحرک کی ضرورت ہوتی تو فرشتۂ وحی نازل ہوتا اور پیکرِ اسلام میں نئی روح پھونک دیتا۔ زمانۂ جاہلیت کے پروردہ دانستہ یا نادانستہ اس تدریجی نزول کا مذاق اڑاتے اور ایک تیار شدہ کتاب ایک ساتھ طلب کرتے۔ تحریر شدہ آیاتِ مقدسہ ایک جامد انداز اختیار کر لیتیں جو ان کی زندگیوں کو تبرک کے طور پر زینت بخشتیں۔ اس کے مقابلے میں آیات جو بار بار وقفے وقفے سے نازل ہو رہی تھیں مومنوں کے دل و جان میں راسخ ہوتیں اور سینہ بہ سینہ، دست بدست ایک سے دوسرے تک پہنچتیں اور حرکت اور جوش و جذبے کا ذریعہ بنتیں۔ یہی تحریک و تحرک اگلی نسل اور اس سے اگلی نسل تک دریا کی موجوں کی طرح پیہم جاری رہا اور معاشرۂ اسلامی کو استحکام و استقامت بخشتا رہا۔

اور تدریجِ نزولِ وحی کا اصل راز اور مصلحت یہی ہے۔

---

[9] اتقان۔ نوع ۱۶۔ فرع دوزدہ ۳۔

[10] شبِ عرفہ، ۹ ذی الحجہ کی رات تھی یا پھر لیلۃ الجن غارِ حرا میں تھے۔ اتقان نوع ۳۔ ص ۴۴۔

[11] اتقان ۱:۲۶ نوع ۱۴۔ فتح القدیر ۵:۲۴۴۔

www.Ziaraat.com
Sabeel-e-Sakina

Presented by Ziaraat.Com

وحی کے بتدریج نازل ہونے میں ایسے ایسے راز اور حکمتیں مضمر ہیں کہ جن کا تفصیلی بیان یہاں ممکن نہیں۔ مثال کے طور پر بعض کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے[1]

۱۔ پہلی حکمت کا تو خود خداوند عالم نے ذکر فرمایا،

كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ (۲۵ : ۳۲)

اس طرح (قرآن کو تھوڑا تھوڑا نازل کیا) تاکہ اس سے تمہارے دل کو قوت بخشیں۔

بتدریج نزولِ وحی پیغمبرؐ کو پائیدار تر کر رہا ہے اور آپؐ کو قوت بخش رہا ہے۔ ہر تازہ وحی سے اور حق کی طرف سے فرشتے کے بار بار نازل ہونے سے آپؐ کے دل کو تقویت ملتی ہے اور آپؐ کا سینہ خوشیوں سے لبریز ہو جاتا ہے۔ یہ عنایتِ الٰہی اور آپؐ کے پروردگار کا تعہد آپؐ کے لیے ہر نئے نزولِ وحی پر میسر ہوتا ہے۔

اس آہستہ آہستہ نازل ہونے نے وحی کا حفظ کرنا، اس کا سمجھنا اور احکام سے شناسائی کو آسان بنا دیا ہے۔

اس تدریجی نزول کے ساتھ ہر بار ایک تازہ معجزہ شامل ہوتا ہے۔ جس طرح کہ ہر دفعہ مشرکین کو چیلنج ہوتا ہے کہ ایک بار بھی ایسی وحی کے مثل کلام بنا کر لائیں اور دکھائیں۔

جب دشمنوں کی طرف سے سختیاں بڑھ جاتی ہیں اور بدخواہوں کی یورش ہونے لگتی ہے تو اللہ تعالےٰ ان کی ڈھارس بندھاتا ہے۔ آپؐ کو تنہا نہیں چھوڑتا اور ان ہونے والی سختیوں کی مذمت کرتا ہے۔ بلاشبہ یہ سختیاں مختلف زمانوں میں آتی رہیں اور آپؐ کی دلداری اور حوصلہ افزائی بھی مختلف مراحل میں کی جاتی رہی[2] جب بھی دشمن آپؐ پر میدان تنگ کرتے تو رب آپؐ کی دلدہی کرتا۔ کبھی یہ پیغمبروں کے قصوں کے بیان کے ذریعے ہوتا، جو قرآن میں پھیلے پڑے ہیں۔ سورۂ ہودؑ کی آیت ۱۲۰ میں فرمایا:

ہم رسولوں کی خبروں میں سے سب قصے تم سے اس لیے بیان کرتے ہیں کہ اس سے تمہارا دل مضبوط کریں۔

کبھی پروردگار کی یہ دلدہی اپنے رسولؐ سے وعدے کی صورت میں ہوتی ہے جو آپؐ کی کامیابی، تائید اور حفاظت کے لیے کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ سورۂ طور کی آیت ۴۸ میں فرمایا:

تم اپنے پروردگار کے حکم کے لیے صبر کرو۔ یقیناً تم ہماری نگرانی میں ہو۔

اور سورۂ مائدہ کی آیت ۶۷ میں فرمایا:

اللہ تعالےٰ تم کو لوگوں (کے شر) سے بچائے گا۔

اسی طرح سورۂ "والضحیٰ" اور سورۂ "الم نشرح" میں وعدۂ گرامی اور عطائے عظیم کا ذکر ہے[3]

---

[1] اس کی تفصیل "مناہل العرفان" زرقانی ۱ : ۴۶ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ایضاً صحیح بخاری، فضائل القرآن۔ باب ۶، موجز علوم قرآن ڈاکٹر داؤد عطار۔ ۱۱۷ تا ۱۲۳۔

[2] قرآن مجید کی ان آیات کو دیکھیں: ۳ : ۱۷۶، ۵ : ۴۱، ۶ : ۳۳ و ۳۴، ۶۸ و ۶۹، ۱۰ : ۶۵، ۱۱ : ۱۲، ۱۲۰ و ۱۲۱، ۱۳ : ۱۱۰، ۱۵ : ۸۸، ۹۴ و ۹۷ — ۱۶ : ۹۹، ۱۲۷، ۱۲۸ و ۱۸ : ۶، ۱۹ : ۷۶، ۲۰ : ۱۳۰۔

[3] مثلاً ۹۳ : ۵، ۹۴ : ۱ و ۴، ۱۳ : ۴۶، ۱۵ : ۳، ۳۵ : ۸، ۱۶ : ۱۲۷، ۲۶ : ۳۔

Presented by Ziaraat.Com

یہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ کبھی آپ کی زیادہ حوصلہ افزائی بھی نہیں کی جاتی مصلحت یہ ہوتی ہے کہ آپ زیادہ پریشان نہ ہوں اور رنجیدہ خاطر نہ ہوں۔ جیسا کہ سورۂ انعام کی آیت ۳۵ میں فرمایا:

اگر ان لوگوں کا روگردانی کرنا تم پر گراں گذرتا ہے تو اگر تم میں طاقت ہے کہ زمین میں سرنگ تلاش کرو یا آسمان میں سیڑھی لگا دو، تو ان کو کوئی نشانی لا دو۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ ضرور ان کو ہدایت پر یکجا کر دیتا۔ اور تم ہرگز بے خبروں میں سے نہ ہونا۔

۲۔ فرمایا:

لِتَقْرَأَهُ عَلَى النَّاسِ عَلَىٰ مُكْثٍ (۱۷: ۱۰۶)

تاکہ تم اس کو لوگوں پر ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔

لوگوں کی علمی اور عملی تربیت کی درجہ بندی کی گئی ہے:

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں عرب کے لوگ پڑھے لکھے نہیں تھے اور لکھنے پڑھنے والوں کے لیے آسانیاں موجود نہیں تھیں۔ ۔۔گی کے کاموں میں سرگرم تھے اور ایمان لانے والے اپنے تازہ دین کا اپنے خون اور شمشیر سے دفاع کرتے تھے۔ اس صورتحال میں قرآنِ مجید اگر ایک مرتبہ نازل ہو جاتا تو اس کا حفظ کرنا ان کے لیے مشکل ہوتا، جب کہ آہستہ آہستہ نازل ہونے نے قرآن کا حفظ کرنا ان کے لیے آسان بنا دیا تھا۔ علاوہ ازیں قرآن کی آیات کا سمجھنا بھی آسان ہو گیا تھا۔

یہ اس کا بھی سبب بنا کہ باطل عقائد اور فاسد پرستش اور عادات رذیلہ کو یہ لوگ آہستہ آہستہ ترک کر دیں۔ اسلام جب ایک بدی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا تو مسلمانوں کو اس پر آمادہ کرتا کہ وہ دوسری برائی سے بھی پیچھا چھڑائیں۔ اس طرح باطل عقائد کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا گیا اور سختی اور سنگدلی کے بغیر ان کو جاہلیت کی نجاست سے پاک کیا گیا۔ ایک ایسی قوم کے لیے جو پرانی روایات سے بری طرح چمٹی ہوئی تھی اور خونریزی اور غارتگری میں جس کو کوئی باک نہیں تھا ان میں ترتیب اور تدریج سے اچھا رجحان پیدا کرنا لازمی تھا۔

اس تربیت اجتماعی اور زمانۂ جاہلیت کی عصبیت کی نابودی اور تفاخر کی تقویٰ اور پرہیزگاری سے تبدیلی کی مثال حضرت بلال حبشی کے واقعے سے ملتی ہے۔ فتح مکہ کے دن جب اسلام کی کامیابی اور کامرانی اپنے اوج پر تھی، اسی کامیابی اور کامرانی کے اعلان کے لیے حضرت بلال حبشی کعبہ کی چھت پر گئے اور وہاں جا کر اذان دی۔ مشرکوں کو بہت برا لگا کہنے لگے کہ کیا ضروری ہے کہ یہ کالا حبشی کعبے کی چھت پر چڑھ کر اذان دے؟

یہی وہ موقع تھا جب شخصیتوں اور اقدار کے لیے میزانِ قسط پیغمبرِ اکرم کے قلب پر نازل ہوئی:

اے لوگو! یقیناً ہم نے تم کو نر (مرد) اور مادہ (عورت) سے پیدا کیا اور ہم نے تم کو خاندان اور قبیلے بنایا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ بیشک اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں زیادہ مکرم وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا پوری پوری خبر رکھنے والا ہے۔ (۴۹: ۱۳)

اور ٹھیک جس طرح ان لوگوں کو باطل عقائد سے آہستہ آہستہ دور کیا اسی طرح رفتہ رفتہ عقائد حقہ، اور عبادات اور اخلاق

Presented by Ziaraat.Com

فاصلے سے آراستہ بھی کیا سا دل ان کے دلوں کو توحید کے نور سے روشن اور منور کیا اور پھر موت کے بعد جی اٹھنے کو دلائل و براہین سے ثابت کیا۔ اور حساب و کتاب اور ثواب و عذاب کا بیان پیش کیا۔ (یہ سب بتدریج وحی کے ذریعے ہوا)۔

عبادات میں بھی ہجرت سے قبل ہی شروع میں نماز واجب کی گئی۔ ہاں شروع میں نمازِ فجر فرض کی گئی تھی۔ بعد میں رکعت کی تعداد اور دن اور رات کی نمازیں اور ان کی ادائیگی کا طریقہ ہجرت سے پہلے متعین ہوا[۴]

آغازِ اسلام ہی سے مسلمان صدقات اور روزے سے واقف ہو گئے تھے۔ مگر زکوٰۃ کی مقدار اور روزے کی شرائط کا ہجرت کے دو سال بعد تعین ہوا[۵] ہجرت کے چھٹے سال حج بھی واجبات میں سے شمار ہونے لگا۔ اسی طرح پہلے کبائر سے منع کیا گیا پھر صغیرہ گناہوں سے روکا گیا۔

چنانچہ اس درجہ بدرجہ حکیمانہ ترتیب سے امت کی تربیت اور اصلاح پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

یہاں یہ نکتہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ سارے احکام بتدریج نازل نہیں ہوئے۔ جن کو فوری نافذ ہونا تھا اور اس میں کسی قسم کا ابہام نہیں تھا وہ ایک بار ہی صادر ہوئے۔ قتل، چوری، ڈاکہ، غصب، لوگوں کا مال ناجائز کھانا، معاملات میں دھوکہ فریب، زنا ایسی ساری باتوں کا بغیر کسی تاخیر کے ایک ہی بار قطعی حکم صادر ہوا اور ان کو ممنوع اور حرام قرار دیا گیا۔

یہ صحیح ہے کہ حکمتِ بالغۂ الٰہی کے حکم سے ان میں سے اکثر کی حرمت مدینہ میں ظاہر کی گئی مگر اس میں تدریج کا عنصر نہیں تھا اور ایسے احکام ٹھہر ٹھہر کر نہیں پیش کیے گئے تھے۔ بیشک جن باتوں میں ضروری سمجھا گیا حکم بتدریج نازل ہوا۔

یہ رفتہ رفتہ نزول، فطرتِ انسانی اور خصوصاً معاشرۂ انسانی سے مکمل مطابقت رکھتا ہے۔ سنتِ الٰہی اور اجتماعی تبدیلیوں اور فطرتِ انسانی میں یہی مطابقت اپنی جگہ خود آیاتِ الٰہی میں سے ایک آیت اور نشانی ہے۔ اور مصدرِ ربانی سے صدورِ کتاب کی ایک اور دلیل ہے۔

اجتماعی تبدیلیاں، افراد اور معاشرے دونوں کے نقطۂ نگاہ سے، کوئی میکانیکی عمل نہیں۔ بلکہ ایسا متحرک DYNAMIC اور اثر آفریں عمل ہیں جو معاشرے کی ہیئت اور عمومی اجتماعی زندگی کے ظاہر و باطن کو سنوار دیتی ہیں۔

اس میں سب سے اہم تبدیلی روح کی گہرائیوں تک اس کی رسائی اور نفوذ اور حقیقی فطرتِ انسانی کا جلوہ گر ہونا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس کا حصول جب ہی ممکن ہے جب یہ تبدیلی اور تغیر، حقیقی انسانی حاجات اور ضروریات کے مطابق ہو۔ اگر نہیں تو جلد یا بدیر یہ معدوم ہو جائے گی۔ انسانی فطرت ایسی پیشرفت کو جلدی قبول کرتی ہے جو آہستہ اور رفتہ رفتہ ظہور پذیر ہو۔ طوفانی اقدامات ایک لمحے کے لیے تو یقیناً جوش و خروش پیدا کر دیتے ہیں لیکن یہ جلد ہی سرد بھی پڑ جاتے ہیں۔ قطرہ قطرہ بارش زمین

---

[۴] نماز شروع میں جبرئیل نے پیغمبرؐ کو غارِ حرا میں سکھائی (مفتاح کنوز السنۃ ۱/۲۶۸ اور طبری و بلاذری) اول نماز فجر اور نماز عصر تھی۔ دونوں دو رکعت کی تھی (مفتاح کنوز۔ ۱/۲۷۰) شبِ معراج نمازوں کے وجوب کی تائید ہوئی (مفتاح۔ ۱/۲۶۸) بہرحال ہجرت سے قبل پنجگانہ نمازیں نازل ہو چکی تھیں۔ اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں۔ سفینۃ البحار۔ ۲: ۴۲۔ ۵۰، ادوارِ فقہ۔ ۱: ۴۳۔

[۵] ادوارِ فقہ۔ ۱: ۷۰ و ۳۵۳۔

Presented by Ziaraat.Com

کی اندرونی تہوں تک پہنچ جاتی ہے۔ چنانچہ معاشرے میں جو تبدیلی آہستہ آہستہ لائی جائے وہی پائیدار اور گہری ہوتی ہے۔

اس نزولِ تدریجی نے مومنوں کو ایمان و عمل میں مستحکم بھی کیا اور ان کو صبر و تلقین کے اسلحہ سے مسلح بھی کیا۔ ان کو ہر وقت، ہر ہر مرحلے پر انبیاء کے قصے اور گزشتہ قوموں کی عبرتناک زندگی کا وحی کے ذریعے سبق ملتا رہا۔ جو کچھ پچھلی قوموں پر گزرا تھا اور ان میں اچھے اور صالح لوگوں کے لیے ان کے پروردگار کی طرف سے جو رحمتیں اور برکتیں نازل ہوئی تھیں اور مزید وعدے کیے گئے تھے، ان سب کامیابیوں، ثواب، تائید اور نعمتوں سے ان کو بار بار آشنا کیا جاتا رہا۔ اس سلسلے میں اس کتاب کے ۱۴ویں باب میں ہم مزید گفتگو کریں گے۔

۳۔ فرمایا:

وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا (۲۵:۳۳)

یہ (کافر) کوئی مثال بھی تیرے پاس نہیں لاتے مگر یہ کہ ہم حق بات اور بہترین وضاحت تم کو عطا کر دیتے ہیں۔

جیسے جیسے وقت گزرتا رہا نئے نئے واقعات اور معاملات درپیش ہوتے اور مسائل سر اٹھاتے رہے۔ ان ہی کی مناسبت سے قرآن کی آیات بھی نازل ہوتی رہیں اور خداوندِ عالم ان کے مطابق احکام بھیجتا رہا۔

سوال کرنے والے آنحضرتؐ کے سامنے آتے اور آپؐ سے سوال کرتے۔ بعض اوقات آپؐ کی رسالت کی حقانیت جانچنے کے لیے سوال ہوتے جیسے کہ آپؐ کے دشمنوں کے ایک سوال کے جواب میں خداوندِ عالم سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۸۵ میں فرماتا ہے:

لوگ تم سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دیں کہ روح میرے پروردگار کے امر سے ہے۔ تمہیں تو علم میں سے بہت ہی تھوڑا حصہ دیا گیا ہے۔

اور سورۂ کہف کی آیت ۸۳ میں فرمایا:

(اے رسولؐ) لوگ تم سے ذوالقرنین کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ تم کہہ دو (کہ) میں تمہیں اس کا ذکر پڑھ کر سناتا ہوں۔

کبھی یہ سوالات آگاہی اور وضاحت کی خاطر ہوتے، جیسے کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۱۹ میں فرمایا:

تم سے پوچھتے ہیں کہ وہ (راہِ خدا میں) کیا خرچ کریں۔ (اے رسولؐ ان سے) کہہ دو کہ جو تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو۔

اور آیت ۲۲۰ میں فرمایا:

لوگ تم سے یتیموں کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ (ان سے) کہہ دو کہ ان کی اچھی پرورش بہتر ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ سوال مختلف ادوار میں کیے جاتے رہے۔ جواب بھی مختلف اوقات ہی میں دیے گئے ہوں گے۔

ان واقعات کے ساتھ احکامِ خداوندی بیان کیا جاتا رہا۔ یہ ساری باتیں ایک ساتھ تو نہیں ہوئی ہوں گی۔ جیسے جیسے سوالات اور معاملات سامنے آئے ویسے ہی رفتہ رفتہ ان کے جوابات اور وضاحتیں بھی پیش کی گئیں۔ چنانچہ کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا بجز اس کے کہ قرآن ٹکڑے ٹکڑے اور بتدریج نازل ہو۔ جیسا کہ زوجۂ رسولؐ حضرت عائشہؓ پر تہمت کے سلسلے میں سورۂ نور کی آیت ۱۱ میں فرمایا:

یقیناً وہ لوگ جنہوں نے بہتان لگایا وہ تم ہی میں سے ایک گروہ ہے۔ تم اسے اپنے لیے برا نہ سمجھو۔ بلکہ وہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ ان میں سے ہر شخص کے لیے جو کچھ گناہ کا اس نے کمایا ہے، اور جس نے ان میں سے گناہ کا بڑا حصہ اٹھایا اس کے لیے بڑا عذاب ہے۔

Presented by Ziaraat.Com

اس کے آگے دس آیات اور بھی اسی سلسلے کی ہیں۔

ایک دوسری مثال سورۂ مجادلہ کی شروع کی تین آیات ہیں۔ خولہ بنت ثعلبہ اپنے شوہر اوس بن صامت کی شکایت لے کر رسول اللہ کے پاس آئی اور آپؐ سے جھگڑنے لگی۔ اس کے شوہر نے اس کو چھوڑ دیا تھا۔ ان کی ایک کم عمر لڑکی تھی جو باپ کے حوالے کی جاتی تو اس کی دیکھ بھال مشکل ہوتی اور اگر ماں کے پاس رہتی تو اس کی پرورش کا مسئلہ تھا۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سورۂ مجادلہ کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں:

یقیناً اللہ تعالےٰ نے اس عورت کا قول سن لیا ہے جو تم سے اپنے خاوند کے بارے میں جھگڑتی ہے۔ اور اللہ تعالےٰ سے شکایت کرتی ہے اللہ تعالےٰ تم دونوں کی گفتگو کو سنتا ہے۔ یقیناً اللہ تعالےٰ سب کی سننے والا سب کچھ دیکھنے والا ہے۔ جو لوگ تم میں سے اپنی عورتوں سے ظہار کرتے ہیں، وہ ان کی مائیں نہیں ہو جاتیں۔ ان کی مائیں نہیں ہیں مگر وہی جنہوں نے ان کو جنا۔ وہ یقیناً ناپسندیدہ بات اور جھوٹ کہتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ بیشک معاف کرنے والا بڑا بخشنے والا ہے۔ جو لوگ اپنی عورتوں سے ظہار کرتے ہیں پھر جو کہا انہوں نے کہا اس سے پھر جاتے ہیں پس اس سے پہلے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو مس کریں ایک گردن (غلام) آزاد کرنا ہے۔ یہ کہ تم اس کے ذریعے نصیحت کیے جاتے ہو۔ اور جو بھی تم کرتے ہو اللہ تعالےٰ اس کی پوری پوری خبر رکھنے والا ہے۔

بعض اوقات مسلمان غلط فہمی سے دوچار ہوتے۔ اس کو دور کرنے اور رہنمائی اور ہدایت کے لیے صحیح راستے کی دعا اور استدعا کرتے۔ بلاشک و شبہ یہ غلطیاں مختلف ادوار میں پیش آئیں اور ان کی اصلاح بھی اسی زمانے میں نازل ہوتی۔

سورۂ آل عمران کی آیت ۱۲۱ اور اس سے آگے کی کچھ آیات اس کی مثال ہیں۔ یہ غزوۂ بدر کے سلسلے میں مسلمانوں کی اصلاح اور ہدایت کے لیے نازل ہوئیں۔

اس تدریجی نزول میں ایک بڑی حکمت پوشیدہ ہے اور وہ لوگوں کی قرآن کے مصدر اور منشا کی طرف ہدایت ہے یعنی یہ کہ یہ کلام خدا ہے اور بس! یہ کسی مخلوق کا کلام نہیں ہو سکتا۔

جیسا کہ پچھلے صفحات میں ہم نے دیکھا اور آگے بھی آئے گا کہ قرآن بیس سال کے عرصے میں مختلف ادوار میں جنگ، صلح کے دوران، شادی و غم کے زمانوں میں، خوشیوں اور مصائب کے دوران نازل ہوتا رہا مگر ان تمام مختلف کیفیات اور پس منظر میں آیات الٰہی ایک ہی انداز کی بسم اللہ کی "با" سے لے کر والناس کی "س" تک نظر آتی ہیں۔ فصاحت و بلاغت کا کمال اور دوام اعجاز اول سے آخر تک یکساں ہے۔ سب ہی گوہر یکدانہ اور دُرِ شاہوار ہیں۔ بلاشبہ آخر اول جیسا اور آغاز اختتام کے مثل!

اگر یہ (قرآن) خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے۔ (۴:۸۲)

ان کے علاوہ وحی کے بتدریج نازل ہونے کی تین وجوہات اور بھی نظر آتی ہیں:

ا۔ رسالت کے سلسلے میں اور وہ اس طرح کہ مکی اور مدنی آیات پر نظر کی جائے تو وہ آیات جو مکہ میں نازل ہوئیں وہ عقائد سے متعلق ہیں اور جو مدینہ میں نازل ہوئیں وہ احکام شرع بیان کرتی ہیں۔

ب۔ رسالت ہی کے سلسلے میں یہ تدریج دوبارہ نظر آتی ہے جب قرابت داروں کو دعوت دی گئی یعنی

وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ

Presented by Ziaraat.Com

پھر اور لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ

اور اس کے بعد ہی دعوت عام ہو جاتی ہے۔ دنیا کے سلاطین اور اقوام کو اسلام لانے کی دعوت دی جاتی ہے۔

مگر ایسا نہیں کہ شروع میں رسول اللہ کی دعوت عام نہیں تھی اور آپ کو بعد میں اس کا خیال آیا۔ یہ آہستہ آہستہ لوگوں تک پہنچنا اور دعوتِ اسلام دینا دراصل ماحول اور زمانے کے تقاضے کے مطابق تھا ورنہ اسلام تو شروع سے ہی ساری انسانیت کے لیے اور ہر زمانے کے لیے تھا۔ مستشرقین کا یہ کہنا کہ آنحضرتؐ شروع میں صرف قریش اور اپنے رشتہ داروں میں تبلیغ کرنا چاہتے تھے۔ دنیا میں کسی اور کی طرف دعوتِ اسلام کا ان کو خیال نہیں تھا، یہ محض تہمت اور بہتان ہے، اور قرآن میں اس کے بہتیرے دلائل موجود ہیں۔

ج۔ اسلوب میں بھی تدریج اور مراحل نظر آتے ہیں۔ شروع میں انداز نرم گفتاری کا ہے۔ وہاں نصائح اور ہدایات ہیں اور دشمنوں سے نرم روی ہے۔ آگے چل کر جب حملہ آوروں اور تجاوز کرنے والوں سے سابقہ پڑا تو ان سے جہاد اور جنگ کرنے کا حکم بھی صادر ہوا۔

ظاہر بات ہے کہ اگر نزول ایک ہی بار ہوا ہوتا تو دعوت اور تبلیغِ رسالت کی یہ تدریجی کیفیت ممکن نہ تھی۔

www.Ziaraat.com
Sabeel-e-Sakina

نزول کے بعد حکم

ہم لوگوں نے ابھی دیکھا کہ بتدریج نزول کی حکمت یہ تھی کہ لوگوں کی تربیت رفتہ رفتہ صحیح فطرت کے مطابق ہو سکے اور رسالت کی تبلیغ موقع کی مناسبت سے اور کلام کا خداوند تعالےٰ کی طرف سے ہونے کا ثبوت بہم پہنچایا جا سکے۔ کبھی کسی زمانے میں حکم کا بیان لازم ہوتا۔ چنانچہ اکثر اوقات نزول کے بعد حکم دیا جاتا۔ یعنی شروع میں آیت کریمہ نازل ہوتی اور لوگ بعد میں اس حکم کے پابند کیے جاتے یا وہ حکم بیان کیا جاتا۔ مثلاً آیت نازل ہوئی:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى (۸۷:۱۴)

یقیناً اس نے فلاح پائی جو پاک رہا (اور اپنے مال سے کچھ دیا)

عبداللہ ابن عمر (م ۷۳ھ) سے نقل کیا گیا ہے کہ یہ آیت زکوٰۃِ فطرہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ دوسروں کا کہنا ہے کہ یہ تاویل بلاوجہ ہے کیونکہ یہ سورہ مکی ہے اور مکے میں عید، زکوٰۃ اور روزہ نہیں تھا۔ مگر بغوی کا کہنا ہے کہ ممکن ہے آیت حکم نافذ ہونے سے پہلے نازل ہوئی ہو یعنی آیت شروع میں نازل ہو گئی اور زکوٰۃ کا حکم بعد میں صادر ہوا۔

ایک اور مثال سورۂ بلد کی پہلی اور دوسری آیات ہیں:

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝

میں اس شہر (مکہ) کی قسم کھاتا ہوں۔ تم اس شہر میں اترنے والے ہو۔

یہ سورہ مکی ہے مگر اس "حل"[1] کا اثر فتحِ مکہ کے دن ظاہر ہوا کہ اسی دن آپؐ نے فرمایا:

---

[1] لفظ "حل" کی تفاسیر میں سے ایک قول۔

Presented by Ziaraat.Com

"(آج کے) دن میں سے ایک ساعت مجھ پر (جنگ کے لیے) حلال ہوئی ہے"۔

اور اللہ تعالیٰ نے ایک بار اور فرمایا:

جُندٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُومٌ مِّنَ الْأَحْزَابِ (۳۸ : ۱۱)

اس جگہ (مکہ میں) ان لوگوں کی جو بھیڑ ہے سو (آپ کے مخالف) گروہوں کے وہ شکست سے دوچار ہوں گے۔

یہ وعدہ مکہ میں کیا گیا تھا (یہ آیت مکی ہے) کہ مشرکین کے لشکر فرار کریں گے اور شکست کھا جائیں گے۔ جب کہ اس کی تاویل جنگِ بدر میں ظاہر ہوئی جب احزاب اور کافروں کے گروہ درہم برہم ہو گئے۔

اسی طرح آیت نازل ہوئی:

قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ (۳۴ : ۴۹)

کہہ دیں کہ حق آگیا اور باطل نہیں ٹھہرے گا اور نہ دوبارہ پنپ سکے گا۔

ابن مسعود سے نقل کیا گیا ہے "جاء الحق" یعنی شمشیر باہر آ گئی۔ یہ مکی آیت ہے اور قتال و جہاد کے واجب ہونے سے پہلے نازل ہوئی تھی۔

بعض روایات ابن مسعود کی اس تفسیر کی تائید کرتی ہیں۔ فتح مکہ کے دن جب پیغمبر اکرمؐ مکہ میں وارد ہوئے تو اس وقت وہاں ۳۶۰ بت تھے جو آپؐ نے اپنے عصا سے توڑنے شروع کیے۔ اس وقت آپؐ کی زبان مبارک پر یہ آیات جاری تھیں:

جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا ۔ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ

حق آگیا اور باطل چلا گیا۔ باطل جانے ہی والا ہے۔ نہ باطل رہے گا اور نہ اس کی تجدید ہوگی۔

اس قسم کی مثالیں قرآن میں بہت ہیں جن سے ان احکام کا تعین ہوتا ہے جن کا اجرا سالوں بعد ہوگا۔ یہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ اگرچہ احکامات بتدریج نازل ہوئے مگر سب ایک خط اور ایک متعین ہدف کے لیے مرتب اور منظم کیے گئے تھے۔

ان میں سے ایک زکوٰۃ کا تعین ہے۔ ابن حصار کا کہنا ہے کہ خداوند عالم نے زکوٰۃ کا ذکر مکی سورتوں میں زیادہ کیا ہے، خواہ واضح الفاظ میں خواہ اشاروں میں۔ یہ ایسا وعدہ تھا جس کا ایفا مدینہ میں ہوا۔

ایسی ہی مثال کاشتکاری اور زراعت کے سلسلے میں ہے کہ جہاں فرمایا:

اُن کے کاٹنے کے دن ان کا حق دو (۶ : ۱۴۱)

اور پھر سورہ مزمل میں فرمایا تھا:

نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔

ایک دوسری مثال

وَآخَرُونَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ (۷۳ : ۲۰)

کچھ اور لوگ جو خدا کی راہ میں جنگ کریں گے۔

یہ آیت ہجرت سے پہلے نازل ہوئی تھی جب کہ جہاد و جنگ کا حکم بعد میں صادر ہوا تھا۔

Presented by Ziaraat.Com

پھر ایک دوسری جگہ فرمایا :
بات میں اس شخص سے بہتر کون ہے جس نے اللہ تعالےٰ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیے اور کہا کہ یقیناً مسلمانوں میں سے ہوں (۴۱ : ۳۳)۔

اس خدا کی طرف دعوت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ اذان دینے والوں سے نسبت دی گئی ہے۔ جب کہ اذان مدینے میں شروع ہوئی اور مؤذن وہاں تھے۔

حکم کے بعد نزول

اس کے مقابل کبھی ایسا بھی ہوا کہ حکم جاری تھا اور نزول اس کے بعد ہوا۔ اس میں سے ایک وضو کی آیت ہے (۵ : ۶)۔
یہ آیت مدنی ہے اور تقریباً ۵ھ میں نازل ہوئی۔ یہ طے ہے کہ مکہ میں ہی وجوبِ نماز اور فرض نماز شروع ہو چکی تھی۔
ایک دوسری مثال آیت جمعہ ہے (۶۲ : ۹)۔ یہ مدینے میں نازل ہوئی جب کہ نمازِ جمعہ مکہ میں فرض ہو چکی تھی۔
اسی طرح صدقات کی آیت (۹ : ۶۰) نویں سال میں نازل ہوئی اور زکوٰۃ اس سے پہلے ہی ہجرت کے اوائل میں متعین ہو چکی تھی۔

Presented by Ziaraat.Com

(۸)

رسول اللہ کے زمانے میں تالیفِ قرآن

الف۔ سینوں میں حفظ کیا جانا

قرآن کی جمع آوری

اس گفتگو کو شروع کرنے سے پہلے اس باب میں بار بار استعمال ہونے والی ایک دو اصطلاحات ہیں جن کی وضاحت ہو جانی چاہیے۔ ایک تو لفظ 'جمع' ہے جو عام طور سے اکٹھا آوری اور ایک کے اوپر ایک چیز بڑھانے اور زیادہ کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ علومِ قرآن کی تاریخ میں اس لفظ کو مختلف معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

مستشرقین جیسے نولدکے اور شوالی جن کا اس سلسلے میں بار بار ذکر ہوگا، اس لفظ کے معنی 'حفظ' اور 'اخذ' لیتے ہیں[۱] یعنی جب یہ لکھا گیا کہ فلاں صحابی نے قرآن جمع کیا تو یہ کہتے ہیں کہ اس سے قرآن یا اس کے کچھ پاروں کا حفظ کرنا مراد ہے۔ لکھنا اور اس کا مجموعہ اپنے پاس رکھنا مراد نہیں۔ اس سلسلے میں ان کے دلائل کچھ روایات اور کچھ قدیمی کتابیں ہیں۔ مثلاً محمد بن سعد کاتب واقدی (م ۲۳۰ھ) الطبقات الکبیر میں ایک باب " ذکر من جمع القرآن علی عهد رسول الله "[۲] کے نام سے قائم کرتے ہیں۔ اس باب میں جمعِ قرآن کی ساری گفتگو حفظ یا اخذ کے معنی میں کی گئی ہے۔

قسطلانی (م ۹۲۳ھ) مناقب زید بن ثابت میں 'جمع القرآن' کی 'استظهره حفظًا' کے طور پر وضاحت کرتا ہے[۳]۔ نووی (م ۶۷۶ھ) بھی 'جمعوا القرآن' کی "حفظوا جميعه" کے طور پر شرح کرتا ہے[۴]۔ سیوطی کہتا ہے کہ قرآن جمع کرنے سے مراد یہ ہے کہ قرآن کو حفظ کیا ہے[۵]۔ شعبی (م ۱۰۳ھ) ابن سعد کے بارے میں جمعِ قرآن کو 'اخذ'

۱؎ SOHWALLY; GESCHICHTE DES QORANS, DIE SAMMLUNG DES QORANS, 11 ; S.6.2. BLACKER, INT, AUCORAN, P. 20, N. 20.

۲؎ ابن سعد۔ ۲: ۲/۱۱۲۔ ۱۱۵۔

۳؎ ارشاد الساری در شرح صحیح بخاری۔ ۶: ۱۹۲۔

۴؎ تہذیب: ۱۶۱، ۱۵ س ۸ طبع وستنفلد۔ فتح الباری ۷: ۹۶۔

۵؎ اتقان: ۱۳۴۔ طبع قاہرہ ۔ ۱۳۰۶ یا کلکتہ ۱۸۵۲۔

Presented by Ziaraat.Com

کے طور پر پیش کرتا ہے۔[۱۶] حضرت عثمان کے بارے میں ایک حدیث ہے، "فجمع کتاب الله فی رکعة"[۱۷] یہاں جمع کے معنی قرائت اور اخذِ قرآن ہیں۔

یہ تھے ان کے دلائل۔ مگر قرآن کی جمع آوری کے مختلف مراحل کے بارے میں جو روایات اور احادیث آئی ہیں ان پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لفظ مختلف مرحلوں میں مختلف مناسب معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اور وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ جمع کرنا یعنی حفظ کرنا اور حافظے کے سپرد کرنا اور ازبر کرنا۔ چنانچہ ان صحابہ کو جنہوں نے قرآن کو حفظ کیا تھا "حفاظِ قرآن" یا "جماعِ قرآن" یا جامعانِ قرآن یعنی قرآن کے جمع کرنے والے کہا جاتا ہے۔ یہ قرآن کی جمع آوری کا پہلا مرحلہ ہے۔

۲۔ کبھی جمع کرنا لکھنے کے معنی میں تھا۔ یعنی آیات مختلف جگہ اور متفرق چیزوں پر لکھی ہوئی تھیں۔ ایک جلد میں جمع نہیں کی گئی تھیں۔ بعض سورتیں مرتب ہو چکی تھیں۔ یہ جمع آوری قرآن کا دوسرا مرحلہ تھا۔

۳۔ ایک دور وہ بھی آیا جب قرآن کو ایک مجموعے میں آیات اور سورتوں کی مناسبت سے لکھا گیا۔ جمع آوری کا یہ تیسرا مرحلہ تھا جو کافی عرصے تک جاری رہا۔

۴۔ ایک وقت قرآن کی تدوین اور جمع آوری قرائت متواتر اور رائج کے مطابق مرتب متن اور نص سے کی گئی۔

یہ وہ چار مرحلے ہیں جو آیات کی ایک متعین مجموعے میں تالیف اور جمع آوری کے سلسلے میں پیش آئے۔

اس بات کی وضاحت کر دینی چاہیے کہ تالیف سے مراد نگارش اور تصنیف قطعی نہیں ہے۔ اس سے مراد آیات اور سورتوں کا جمع کرنا اور گردآوری ہے۔ وہی معنی جو لغت ہم کو بتاتی ہے۔ قرآن کا منشا اور مصدر تو اللہ تعالٰی کی ذات پاک ہے۔ اور کسی بشر کی اس تک رسائی نہیں۔

وہ لوگ جو پہلے مرحلے یعنی قرآن کے حفظ کرنے کو حساب میں نہیں لاتے وہ قرآن کی جمع آوری کو تین مرحلوں میں دیکھتے ہیں۔

رسول اللہ کے زمانے میں جمع کرنے کو "تالیف" کہتے ہیں۔ حضرت ابوبکر کے اقدام کو "جمع" کا نام دیتے ہیں اور جو حضرت عثمان کے زمانے میں انجام پایا اس کو "نسخ" یا نسخہ برداری اور تکثیر نسخہ (یعنی اشاعت) کہتے ہیں۔[۱۸]

چنانچہ ہر جگہ جمع کے معنی حفظ کرنا نہیں لیے جا سکتے۔ موقع کی مناسبت سے اس لفظ کے معنی میں فرق ہوتا ہے۔

جب علی کہتے ہیں اس وقت تک چادر نہیں ڈالتے جب تک قرآن جمع نہ کر لیں تو اس کے معنی یہ نہیں کہ اس دوران وہ حفظ کرنے اور قرآن کو یاد کرنے پر کمربستہ ہو گئے ہیں۔ بلکہ جیسا کہ تاریخ ہم کو بتاتی ہے آپ نے اور بہت سے دوسرے صحابہ نے مجموعہ قرآن کو لکھا۔ آنحضرتؐ کے زمانے میں بھی جمع کے یہی معنی ہیں، یعنی حفظ کرنا بھی، لکھنا بھی اور جمع آوری بھی۔

اس گفتگو میں ایک دوسری اصطلاح جو کبھی کبھی سامنے آتی ہے وہ "ما بین الدفتین" یا "ما بین اللوحین" ہے۔

---

۱۶ ابن سعد۔ ۲:۲/۱۱۲ ص ۲۳۔

۱۷ ایضاً۔ ۳:۱/۵۴ ص ۱۵۔

۱۸ البرہان فی علوم القرآن۔ ۱:۲۳۵۔

Presented by Ziaraat.Com

دفت حیوانات کی کھال کا ٹکڑا تھا جس پر شروع میں علوم اور واقعات لکھے جاتے تھے۔ بعد میں کاغذ اور اوراق پر لکھ کر ان کو محفوظ کرنے کے لیے اوپر سے چمڑے کی جلد چڑھا دیتے تھے۔ اس کو "الدفتین" کہا جاتا تھا۔ کتاب کو "مجموع ما بین الدفتین" کہتے تھے کیونکہ یہ چمڑے کی دو تہوں کے درمیان مجموعہ ہوتا تھا۔ اسی طرح "ما بین اللوحین" بھی کہا جاتا جس کے معنی بھی وہی دو تہوں کے درمیان کے ہوتے۔ لوح یعنی لکڑی یا ہڈی کا چوڑا ٹکڑا جس پر لکھا جاتا۔ لوح محفوظ کو بھی کہا جاتا ہے کہ ایک صفحہ ہے لکھا ہوا جو خدا کی حفاظت میں ہے۔

تاثیرِ قرآن

رسول اللہ کے زمانے میں تالیفِ قرآن کے مسئلہ کو بہتر طور سے سمجھنے کے لیے اچھا ہو کہ اول اس زمانے کے لوگوں میں وضعِ قرآن اور ان کے ذہنوں میں اس کی تاثیر کا اندازہ کیا جائے۔ اس موضوع کے مختلف ابعاد (DIMENSIONS) ــــــ پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے اور اس کا تفصیلی تجزیہ اور تحلیل اور مطالعہ ہونا بھی چاہیے مگر یہاں ان سب کی گنجائش نہیں اس لیے مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔

معاشرۂ انسانی میں قرآن کے گوناگوں اثرات، عرب کے لوگوں میں تغیر و تبدل، اصلاح، بسط و کشاد اور عربی زبان پر قابو، عرب و عجم کے افکار پر غلبہ، ان تمام موضوعات پر یہاں گفتگو نہیں ہو سکتی۔ یہاں ہم افراد میں تبدیلی اور ان کے اسلام لانے میں قرآن کے اثرات کا ذکر کرتے ہیں۔

محض آیات سننے کے مختلف لوگوں پر جو اثرات مرتب ہوئے ان پر نظر کی جائے تو ہم تاریخ میں بیسیوں ایسے اشخاص کا نام اور ان کے ذکر کو لفظ بھی دیکھتے ہیں جو پیغمبرؐ کے پاس ان سے جھگڑنے اور اعتراض اور تنقید کے لیے آتے ہیں مگر جب یہی لوگ آپؐ کے پاس بیٹھ کر آپؐ کی باتیں اور آیاتِ خداوندی کو سنتے ہیں تو وہاں سے مسلمان ہو کر واپس جاتے ہیں۔

اس کی مثال عثمان بن مظعون اور حضرت عمرؓ بن خطاب کا اسلام لانا ہے۔ اس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے اور آگے بھی آئے گا۔ یا پھر عداس جو عتبہ اور شیبہ کا غلام تھا کہ پیغمبرِ اکرمؐ کی زبانِ مبارک سے صرف "بسم اللہ" سن کر اسلام کی طرف مائل ہوا۔ اس کے علاوہ اور بھی مثالیں ہیں جس سے قرآن کے گہرے اور وسیع اثرات کی نشاندہی ہوتی ہے۔

یہاں ہمارا مقصد صدرِ اول کے مسلمانوں پر قرآن کے فوری اور گہرے اثرات کو واضح کرنا ہے۔ تاریخ ہم کو بتاتی ہے کہ مخالفین جب قرآن سے شناسائی پیدا کرتے تو کس طرح یہ آسمانی آواز ان لوگوں کے قلب و روح پر اپنا اثر ڈالتی۔

اس کی پہلی مثال طفیل بن عمرو دَوسی (م ۱۱ھ) کا ایمان لانا ہے۔ یہ زمانہ جاہلیت کا دانشور اور اشراف میں سے تھا، دولتمند شاعر تھا اور وسیع دسترخوان رکھتا تھا۔ سب ہی اس کی باتوں پر کان دھرتے تھے[۱]۔ جس زمانے میں دعوت و تبلیغ کا معرکہ گرم تھا اور رسول اللہ فرمانِ خداوندی کے ابلاغ کے لیے خانۂ خدا کے ناٹروں سے خود جا کر ملاقات کرتے اور ان کو آیاتِ الٰہی سناتے اسی دوران قریش بھی ایڑی چوٹی کا زور لگائے رہتے کہ کوئی بھی محمدؐ کی باتیں سن نہ پائے اور اسلام پھیلنے نہ پائے[۲]۔ ہر آنے والے سے مل کر اس کے

۱۔ ابن ہشام۔ ۲: ۲۲۔

۲۔ صفۃ الصفوۃ۔ ۱: ۲۴۵۔ سمط اللآلی۔ ۲۵۱۔

حاشیہ نظر بر صفحہ آئندہ

ان صورت سے مقصد یہ کی ادا کیا کرتے تاکہ اس کی دعوت سننے سے پہلے ہی وہ اس دین سے اور اس کے لانے والے سے برگشتہ ہو جائیں۔ ہم قسم کی باتیں بناتے۔ محمد پر تفرقے اور اختلافات پیدا کرنے کا الزام لگاتے، ان کو جادوگر اور ان کی باتوں کو ساحری کہتے۔ بت پرستی کی جھوٹی عظمتوں کی محمد کے ہاتھوں پائمالی اور زمانۂ جاہلیت کی بے بنیاد اقدار کی بے حرمتی کا رونا روتے۔ ان سب کا مقصد یہ ہوتا کہ کسی طرح عربوں کو رسول اللہ کی شخصیت سے ڈرائیں اور ان کے کلام کے اثر سے محفوظ و مامون رکھیں۔

یہ صورت حال تھی جب طفیل بن عمرو مکہ آیا۔ چند چرب زبان قریش اس کے پاس گئے اور اس کو محمد سے متنبہ کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ محمد کی باتیں کیا ہیں جادو ہیں۔ ان کی باتیں لوگوں کو ایک دوسرے سے دور کر رہی ہیں اور بھائی بھائی میں جدائی ڈال رہی ہیں۔ اگر طفیل بھی ان کے پاس گیا اور ان کی باتیں سنیں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ مکہ والوں کی طرح اس کے قبیلے والوں میں بھی تفرقہ اور اختلافات شروع ہو جائیں۔ اس کو ہر طرح نصیحت کی گئی کہ وہ محمد سے بات بھی نہ کرے اور ان کی باتیں کہیں بھی نہ سنے۔ مگر طفیل کے کان میں آپ کی باتیں پڑ ہی گئیں اور وہ کعبے کی زیارت کو جاتا بھی رہا۔ ایک دن وہاں محمد کو دیکھا اور ان سے ان کی باتیں سنیں۔ یہ باتیں بہت پر مغز تھیں۔ اس کے دل میں اتریں اور اس کی روح کو تازہ کر گئیں۔ آپ کی گفتگو میں ایسی جاذبیت تھی جس نے اس شاعر سخن سنج کو اپنی طرف راغب کیا۔ اس نے جو کلام سنا اس میں وہ لطافت اور جوہر معنی نظر آیا، جو اس نے پہلے کسی بھی بشر کے کلام میں نہیں دیکھا تھا۔ اپنے آپ سے کہنے لگا: "اے طفیل تف ہے تجھ پر۔ تو سمجھدار آدمی ہے، شاعر ہے، اچھے اور برے کلام میں پہچان رکھتا ہے۔ اس شخص کی باتیں سننے میں تجھ کو کیا باک ہے؟ جو کچھ یہ شخص پیش کر رہا ہے اگر وہ عمدہ اور دلپسند ہوا تو قبول کرنا اور اگر فضول اور مہمل ہوا تو اس کو بھول جانا۔"

یہ سوچ کر وہ رسول اللہ کے پاس آپ کے گھر پہنچا۔ جو کچھ اس کے دل میں تھا آپ کے سامنے رکھا۔ پیغمبر نے اسلام کو اس کے سامنے پیش کیا۔ آیات قرآن اس کو سنائیں۔ اس کا صاف ضمیر اور پاکیزہ وجدان بیدار ہوا۔ آیات قرآنی نے اس پر ایسا اثر کیا کہ اسی جگہ اسلام لایا۔ پیغمبر اکرم کے ہاتھوں پر بیعت کی اور اپنے لوگوں میں واپس آیا۔ اپنے قبیلے والوں کو دائرۂ اسلام میں لانے کی مسلسل کوششیں کرتا رہا، یہاں تک کہ وہ سب کے سب فتح مکہ کے بعد پیغمبر سے آملے۔ وہ خود جنگ یمامہ میں شہید ہوا۔[۲]

یہ پاک و پاکیزہ وجدان کی مثال تھی۔ اب کینہ پرور اور مخالف مشرکین کا ذکر سنئے۔ آیات خدا اور کلام محمد بہر حال اپنا خاص اثر رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جو محمد پر دانت پیستے تھے اور زمانۂ جاہلیت کے طور طریقوں سے چمٹے ہوئے تھے وہ بھی کبھی کبھی اپنے ضمیر پنہاں میں اور اپنے وجود کی پہنائیوں میں اس سوال کے روبرو ہوتے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ باتیں صحیح ہوں، جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ سچ ہو، اور وہ کیا پیغام ہے جو وہ لائے ہیں؟

ان دشمنوں میں ابوسفیان، ابوجہل اور اخنس پیش پیش تھے۔ یہ لوگوں کو بہت ڈراتے دھمکاتے اور رسول اللہ کو طرح طرح سے آزار

حاشیہ ۲ صفحہ سابقہ: آیت کما انزلنا علی المقتسمین (۱۵: ۹۰) (جیسا کہ ہم نے تقسیم کرنے والوں پر اتارا) کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ یہ ۱۶ یا ۱۷ قریش کے آدمی تھے جن کو ولید بن مغیرہ نے مراسم حج کے دوران مکہ سے باہر قافلوں کے راستے پر بھیجا تاکہ مکہ آنے والے زائرین کو شہر پہنچنے سے پہلے ہی محمد کی باتوں سے متنبہ کر دیں۔ ابوالفتوح رازی ۶: ۲۱۶-۱۷، مجمع البیان ۶: ۳۴۵، قرطبی ۱۰: ۵۸، محبر ۱۶۰ و ۱۶۲، ابن ہشام ۱: ۲۹۱۔

[۲] سیرہ ابن حزم ۶۷، ابن ہشام ۲: ۲۱، ابن سعد ۴: ۱۷۵/۲، ابن سید الناس ۱: ۱۳۹، ابن کثیر ۳: ۹۹، امتاع ۱: ۲۴، روض ۳: ۲۷۶۔

Presented by Ziaraat.Com

پہنچاتے۔ مگر ان کے دلوں میں بھی ایک طوفان برپا تھا۔ رات کو ایک دوسرے سے چھپ کر تینوں محمدؐ کے گھر کا رخ کرتے اور گوشوں میں بیٹھ کر دوسروں کی نگاہوں سے پرے آپؐ کی باتیں سنتے۔ وہ جانتے تھے کہ پیغمبر اکرمؐ شب بیداری کرتے ہیں اور رات گئے بہت اچھے لحن سے قرآن کی آیات کی قرائت کرتے ہیں۔ یہ تینوں ایک دوسرے سے بے خبر کسی نہ کسی کونے میں چھپ کر قرآن سنا کرتے۔ رسول اللہؐ دلنشیں آواز میں قرآن پڑھتے۔ رات ڈھل گئی۔ قرائت قرآن مکمل ہوئی۔ یہ تینوں اپنے گوشوں سے اٹھے اور آہستہ قدم اپنے گھروں کے لیے روانہ ہوئے کہ یکایک آپس میں مڈبھیڑ ہو گئی۔ یہ راز افشا ہو گیا۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے کی نگاہ میں رسوا ہوا۔ ایک نے دوسرے کو برا بھلا کہا اور پھر ایک دوسرے سے عہد کیا کہ اب ایسی حرکت نہیں کریں گے۔

دوسری رات آئی اور یہ تینوں پھر کشاں کشاں محمدؐ کے گھر کے قریب پہنچ گئے کہ دوبارہ آیات خداوندی کو محمدؐ کی زبان سے سنیں۔ اس رات بھی واپسی میں تینوں کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ ایک دوسرے کی سرزنش کر کے پھر سے ٹوٹے ہوئے عہد کو دوبارہ جوڑا۔ تیسری رات پھر یہی کچھ ہوا۔ اس دفعہ آپس میں سخت عہد و پیمان ہوئے اور پختہ عزم کیا کہ آیات الٰہی کا اثر کسی صورت میں قبول نہیں کریں گے۔ یہ دوسروں کو پیغمبرؐ سے دور رکھنے کی کوشش کرتے۔ ان پر ہزاروں تہمت لگاتے مگر اس کے باوجود اپنے دل کی تہوں میں اس پیغام کا اثر محسوس کرتے۔ کبھی سویا ہوا وجدان ان کو پریشان کرتا۔ اپنے دل ہی دل میں کہتے کہ یہ کون سا کلام ہے جو دوسرے کسی انسان کے کلام سے نہیں ملتا۔ یہ قطعی دوسرے انداز کا کلام ہے۔ اس کا تار و پود ہی دوسرا ہے۔ یہی بات تھی کہ خداوند عالم نے فرمایا:

جب یہ لوگ تمہاری طرف کان لگا کر سنتے ہیں تو ہم خوب جانتے ہیں کہ یہ کس غرض سے سنتے ہیں۔ اور جب یہ سرگوشی کرتے ہیں اور ظالم کہتے ہیں کہ تم ایک ایسے آدمی کی پیروی کرتے ہو جس پر جادو کیا گیا ہے۔ (۱۷:۴۷)

ان بد اندیش کینہ پرور مشرکین کی ایک دوسری مثال ہمارے سامنے ہے کہ قرآن کی آیات کو سن کر ان کا ردعمل کیا ہوتا تھا اور اپنی ساری دشمنی اور ہٹ دھرمی کے باوجود ان آیاتِ الٰہی کا ان پر کیا اثر ہوا کرتا تھا۔

بعثت کے شروع ہی میں قریش پیغمبر اکرمؐ کی تبلیغ کے کام سے بہت پریشان ہوئے اور ولید کے پاس پہنچے کہ اس کا کچھ بندوبست کیا جائے۔ ولید بن مغیرہ، خالد بن ولید کا باپ تھا اور عرب کے سخن شناس فصحاء میں سے مانا جاتا تھا۔ لوگ اس کے پاس اپنے معاملات فیصلوں کے لیے لے جاتے تھے۔ اس کو ریحانۂ قریش کہا کرتے تھے۔

ایک دن قریش کے کچھ لوگوں نے ولید کی سرکردگی میں پیغمبر گرامیؐ سے ملاقات کی۔ ان کی منشا یہ تھی کہ اس ملاقات کے ذریعے پیغمبرؐ کی باتوں اور آیات قرآنی کو ٹکر دکھائیں اور آئندہ کے لیے زبان بندی کر کے ایک بڑا کارنامہ سرانجام دیں۔

گفتگو طویل ہو گئی۔ آنحضرتؐ "حم سجدہ" کی آیات شروع سے تلاوت کر رہے تھے۔ ولید اس کو حقارت سے سن رہا تھا۔ اس کے چہرے مہرے سے کبر و نخوت ٹپک رہی تھی۔ شروع میں اس نے یہ تاثر دیا کہ آیات کو سن تو رہا ہے مگر اس کے سامنے ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ مگر جیسے جیسے آنحضرتؐ کی صاف و شستہ قرائت آگے بڑھی ولید کے چہرے کی کرختگی اور غرور و تکبر کی کیفیت تبدیل ہونا شروع ہوگئی۔ جب آنحضرتؐ تیرھویں آیت پر پہنچے،

؎ ابن ہشام۔ ج ۱، ص ۳۳۷-۳۳۸۔

فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثَمُودَ

اگر انہوں نے منہ پھیر لیا تو کہہ دو کہ میں نے تم کو ایسی ہی بجلی سے ڈرا دیا ہے جیسی بجلی عاد اور ثمود (کی قوم) پر گری تھی۔

تو ولید کی کیفیت دگرگوں ہو گئی۔ اس کے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا اور وہ گھبرا اٹھا۔ جلسہ برخاست ہو گیا۔ لوگ اٹھ کر چلے گئے۔

اس واقعے کے بعد وہی لوگ ولید کے پاس شکایت کرتے ہوئے آئے کہ ہم لوگوں کو تم سے ایسی امید نہیں تھی۔ تم نے ہم سب کو رسوا کیا اور ہمارا سر شرم سے جھکا دیا۔

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر بعد کہنے لگا کہ تم جانتے ہو کہ میں نہ کسی سے ڈرتا ہوں اور نہ مجھے کسی قسم کا لالچ ہے۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ میں سخن شناس بھی ہوں۔ میں نے جو کلام محمدؐ سے سنا ہے اس کی کہیں دوسری مثال نہیں ملتی۔ اس میں عجیب و غریب کشش اور جاذبیت ہے۔ نہ اس کو شاعری کہا جا سکتا ہے اور نہ نثر۔ یہ بہت عمیق اور پر مغز کلام ہے۔

پھر کہا کہ ان کے کلام میں ایسی مٹھاس اور ایسا جادو ہے کہ جس کا بہترین حصہ باثمر ہے اور ان کی عام گفتگو پرتاثیر ہے۔ یہ کلام اوج اور عروج کا حامل ہو گا۔ اس پر کوئی دوسرا کلام برتری حاصل نہیں کر سکتا۔

بہرحال لوگوں نے اصرار کیا کہ تم کو محمدؐ کے اس کلام کے بارے میں ضرور کچھ فیصلہ دینا ہے تاکہ دوسرے لوگ پوچھیں تو ان سے کچھ کہا جا سکے۔

ولید کہنے لگا کہ اگر تم سمجھتے ہو کہ اس بارے میں کوئی حتمی فیصلہ دوں اور اپنے خیال کا اظہار کروں تو مجھے تین دن کی مہلت دو کہ اس دوران میں اس مسئلے پر غور کر سکوں۔

تین دن کے بعد جب لوگ اس کے پاس گئے تو ولید کہنے لگا کہ محمدؐ کا کلام سحر اور جادو ہے جو دلوں کو فریب اور دھوکہ دیتا ہے۔[1]

اس واقعے کے بعد سے مشرکوں نے ولید کی سوچ ہی میں قرآن کو سحر اور جادو کہنا شروع کر دیا۔ اس کے سننے سے خود بھی دور رہتے اور دوسروں کو بھی منع کرتے۔ چنانچہ آنحضرتؐ جب مسجد الحرام میں قرآن کی تلاوت کرتے تو یہ لوگ بلند آوازیں نکالتے اور تالیاں بجاتے تاکہ آنحضرتؐ کی آواز لوگوں تک نہ پہنچ سکے۔ یہ صورت حال تھی جو خداوند عالم نے فرمایا:

کافر لوگوں سے کہتے ہیں کہ اس قرآن کو نہ سنو۔ اور (جب یہ پڑھا جائے تو) لغو اور فضول باتیں کیا کرو تاکہ تم (اس پر) غالب ہو جاؤ۔ (۴۱: ۲۶)

کبھی ایسا ہوتا کہ آنحضرتؐ کعبہ کے پاس لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے اور ان کو قرآن کی آیات سناتے تو عرب کے سخنور جب آپؐ کے سامنے سے گزرتے تو جھک کر گزرتے کہ پہچانے نہ جائیں اور ان کو آپؐ نہ دیکھیں۔ جیسا کہ خداوند عالم نے فرمایا:

یاد رکھو یہ لوگ اپنے سینوں کو دوہرا کیے دیتے ہیں (اور اوپر سے کپڑا لپیٹ لیتے ہیں) تاکہ اپنی باتیں خدا سے چھپا سکیں۔
یاد رکھو یہ لوگ جس وقت (دوہرے ہو کر) اپنے کپڑے (اپنے اوپر) لپیٹتے ہیں وہ اس وقت بھی سب جانتا ہے جو کچھ چپکے چپکے باتیں کرتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر باتیں کرتے ہیں۔ وہ تو دلوں کے اندر کی باتیں جانتا بھی

---

[1] ابن ہشام۔ ۱: ۲۸۸، کامل۔ ابن اثیر۔ ۲: ۲۶، سیرہ شامی۔ ۲: ۲۷۲۔ یہ واقعہ مختلف انداز سے نقل کیا گیا ہے۔

Presented by Ziaraat.Com

ہے۔[57] (۱۱:۵)

ایسی بہت سی مثالیں ہیں جو آنحضرتؐ کی رسالت اور تبلیغ اسلام کی انجام دہی میں عزم و استقامت، مشرکوں کی کلام حق کو قبول کرنے میں ہٹ دھرمی اور کلام الٰہی کی رفعت اور اس کے نفوذ و اثر کی داستانیں ہماری نگاہوں میں لاتی ہیں۔

تاریخ میں ایک اور مثال نظر سے گذرتی ہے: یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت حمزہ، پیغمبرؐ کے چچا اسلام لے آئے تھے۔ اس واقعے سے قریش بہت پریشان تھے۔ روزانہ مسلمانوں اور اسلام کے بارے میں ان کو تازہ خبریں مل رہی تھیں۔ اس چھوٹے سے گروہ میں روز بروز نئے نئے افراد شامل ہوتے جا رہے تھے۔

اس فضا میں بنی ہاشم کے ایک بزرگ رکن حضرت حمزہ نے اسلام لا کر پیغمبرؐ کو بڑی حمایت فراہم کی تھی۔ قریش میں ہر طرف اس بات کا چرچا تھا۔ سب ہی اس پہ اپنی اپنی رائے کا اظہار کر رہے تھے۔ ایک مجمع میں قریش کے اکابرین میں سے ایک عتبہ بن ربیعہ (م ۲ھ) نے ایک تجویز پیش کی کہ ٹھہرو! میں محمدؐ سے بات کرتا ہوں۔ شاید میری بات سن لیں اور اس دین سے ہاتھ کھینچ لیں۔

قریش اس شخص کی دلنشیں باتوں کے معتقد تھے[58] انہوں نے عتبہ کی تجویز پہ صاد کی اور وہ مسجد الحرام کی طرف روانہ ہوا۔

وہاں پہنچ کر اول تو پیغمبرؐ سے بہت گرمجوشی سے ملا۔ اور پھر آپؐ سے درخواست کی کہ آپؐ اپنی دعوت اور تبلیغ بند کر دیں۔ اس کے بدلے میں آپؐ کو قوم کی قیادت اور حکومت حوالے کر دی جائے گی اور ہر قسم کی دولت و ثروت مہیا کر دی جائے گی۔

جب عتبہ اپنی بات کہہ چکا تو پیغمبر اکرمؐ نے دریافت فرمایا: تم نے اپنی ساری بات کہہ لی؟ عتبہ نے جواب دیا جی ہاں۔ آنحضرتؐ نے سورۂ حم سجدہ کی ابتدائی آیات اس کو سنائیں۔ وہ سر جھکائے خاموش محو ہو کر سنتا رہا۔ آنحضرتؐ آیت ۳۷ پر پہنچے تو سجدے میں گئے اور پھر اٹھ کر عتبہ سے کہا: ابو ولید! تو نے سنا جو حقیقت میں تجھ کو سننا چاہیے۔ یہ رہا تو اور وہ تھیں آیات جو تو نے سنیں۔

عتبہ اٹھا اور واپس چلا گیا۔ اس کے دوستوں نے اس کو دیکھا تو کہا کہ جس انداز سے عتبہ گیا تھا اس حال میں واپس نہیں آیا ہے۔ جب ان میں آ کر بیٹھا تو لوگوں نے دریافت کیا کہ تم پر وہاں کیا گذری؟

کہنے لگا کہ ہم نے آج ایسا کلام سنا کہ اس سے پہلے نہیں سنا تھا۔ خدا کی قسم نہ وہ شاعری ہے، نہ جادو ہے اور نہ کاہنوں کی باتیں ہیں۔ اے قریش کے لوگو! میری بات مانو اور اس شخص کو چھوڑ دو۔ کیا ٹھکانا کہ یہ باتیں جو آج میں نے سنیں کسی بڑی خبر کا پیش خیمہ ہوں۔ اگر عرب نے اس شخص پر غلبہ پا لیا تو تم آزاد ہو۔ اور اگر یہ شخص کامیاب ہو گیا تو اس کی حکمرانی اور غلبہ تمہاری ہی حکمرانی اور غلبہ شمار ہوگا۔ اس کی عزت و وقار تمہاری عزت و وقار گنا جائے گا۔ اس صورت میں تو تم سارے لوگوں میں سب سے زیادہ خوش قسمت شمار ہوگے۔

---

[57] تفسیر صافی صفحہ ۲۳۰ بحوالہ کافی اور تفسیر عیاشی جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے۔ آنجنابؑ فرماتے ہیں کہ مجھ سے جابر ابن عبد اللہ نے بیان کیا کہ بیت اللہ کے حوالی میں جب مشرکین جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس سے گذرتے تھے تو ان میں سے کوئی اپنا سر جھکا کر، کوئی پیٹھ کو دہرا کر کے اور کوئی سر پر کپڑا ڈال کر نکل جاتا تھا، تاکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ان کو دیکھ نہ لیں۔ اسی پر خداوند تعالے نے یہ آیت نازل فرمائی۔

[58] اعجاز القرآن۔ باقلانی۔ ۲۸۔

Presented by Ziaraat.Com

قریش کہنے لگے خدا کی قسم ابو ولید تم پر بھی ان کی زبان کا جادو چل گیا۔
عتبہ کہنے لگا کہ میری رائے ہے۔ اب تم جو چاہو کرو۔[۹]
ابھی تک تو ان کا ذکر تھا جو مخالفین تھے اور مشرک تھے۔ اب کچھ دوستوں کی بھی باتیں ہو جائیں۔

ضماد بن ثعلبہ ازدی اسلام سے پہلے سے آنحضرتؐ کو جانتا تھا۔ وہ طبیب بھی تھا اور علم کی تشنگی بھی رکھتا تھا۔ سالہا سال سے پیغمبرؐ کی سے ملاقات تھی۔ ایک مرتبہ مکہ کے لوگوں سے سنا کہ محمدؐ مجنون ہو گئے ہیں (معاذ اللہ)۔ قریش نے اسلام کو شکست دینے کے لیے اس کی اشاعت کے راستے میں یہ بہت بڑی رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کی تھی کہ اسلام کے داعی خود مجنون ہیں۔ ضماد سوچ میں پڑ گیا کہ خدا نہ کرے کہیں یہ حقیقت نہ ہو؟ وہ خود طبیب تھا اور اس بارے میں مدد کر سکتا تھا۔ وہ پیغمبرؐ کے پاس آیا اور مزاج پرسی کی۔ آپؐ نے فرمایا: خدا کا شکر ہے۔ میں اسی خدا کی حمد کرتا ہوں اور اسی سے مدد چاہتا ہوں۔ خدا نے جس کی ہدایت کی اس کو کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جس کو اس نے بے راہ کیا اس کو پھر کوئی ہدایت نہیں کر سکتا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی خدا سوائے اللہ کے دوسرا نہیں۔ وہ ایسا یکتا ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اور گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اس کا بندہ اور رسول ہے۔ اما بعد ...۔"

ضماد نے اصرار کیا کہ ان کلمات کو پھر دہرائیں۔ محمدؐ نے دوبارہ بیان کیا۔ تیسری بار پھر سنایا۔ ضماد کہنے لگا کہ میں نے کاہنوں کی باتیں، جادوگروں کی گفتگو اور شاعروں سے شاعری سنی ہے مگر قسم بخدا ایسا دقیق اور پر مغز کلام آج تک نہیں سنا تھا۔ آپؐ اپنا ہاتھ لائیں کہ آپؐ کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کروں۔ پیغمبر اکرمؐ نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور ضماد نے آپؐ کے دست مبارک پر اسلام کی بیعت کی۔[۱۰]

جُبیر بن مطعم (م ۵۹ ھ) اشرافِ مکہ میں سے تھا۔ فتح مکہ کے دن یا اس کے بعد پیغمبرؐ کے پاس آیا[۱۱] کہ فدیہ دے کر آزاد ہو جائے۔ پیغمبرؐ نماز فجر پڑھ رہے تھے۔ آپؐ نماز میں سورۂ طور کی تلاوت کر رہے تھے۔ جب آپؐ اس آیت پر پہنچے:

اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۙ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۝

یقیناً تمہارے پروردگار کا عذاب ضرور آنے والا ہے۔ اس کا کوئی دفع کرنے والا نہیں۔

تو جُبیر کا کہنا ہے کہ اس وقت مجھ پر ایسا ڈر طاری ہوا جو بیان سے باہر ہے۔ کچھ دیر بعد یہ کیفیت ذرا کم ہوئی تو سوچ میں پڑ گیا اور آخر کار فیصلہ کیا اور اسلام لے آیا۔[۱۲]

یہ صرف بت پرست ہی نہیں تھے جو قرآن سے اس طور متاثر ہوتے تھے۔ اہل کتاب کا بھی قرآن کی آیات سن کر یہی حال ہوتا۔ وہ بھی اس سے اسی طرح فیضیاب اور اقبالمند ہوتے۔ اہل کتاب میں بھی ایسے لوگ موجود تھے جو آیاتِ قرآنی سنتے تو ان کی آنکھوں سے

---

۹ سیرۂ ابن ہشام۔ ۱ : ۳۱۳۔
۱۰ دلائل النبوۃ بیہقی۔ ۲ : ۱۰؛ صحیح مسلم، کتاب ۷، جمعہ ۴۶؛ مسند احمد ۱ : ۳۰۲
۱۱ جوامع السیرۃ۔ ابن حزم۔ ۲۴۸۔
۱۲ یہ صاحب سالوں پہلے حضرت عائشہ سے منسوب تھے جو کہ یہاں سے جانے کے بعد رسول اللہ کی منکوحہ ہوئیں (ابن سعد ۸ : ۳۹، ۲۰)۔
۱۳ اعجاز القرآن۔ باقلانی۔ ۲۷۔

Presented by Ziaraat.Com

آنسو جاری ہو جاتے (۵ : ۸۲)۔ اس کی ایک مثال وہ ہے جو ابن ہشام نے نقل کی ہے:

عیسائیوں میں سے، جنہوں نے محمدؐ کی دعوتِ اسلام کے بارے میں سن رکھا تھا، بیس آدمی مکہ آئے اور پیغمبرؐ سے ملاقات کی۔ ان کی باتیں سنیں، ان کے جواب بھی سنے اور آپؐ کی دعوت قبول کی اور ایمان لے آئے۔ قریش کو یہ خبر ملی تو بہت ناراض ہوئے اور ان (نومسلموں) سے کہنے لگے: تم لوگ کیسے گھٹیا آدمی ہو۔ تمہارے ساتھیوں نے تو تم کو صرف اس لیے بھیجا تھا کہ اس شخص (محمدؐ) کے بارے میں معلومات حاصل کرو اور بس۔ ابھی تم ان کے پاس بیٹھے ہی تھے کہ اپنا دین چھوڑ کر ان کے دین کو قبول کر بیٹھے۔

مگر کافروں کی ان بھپتے دار باتوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ بلکہ وہ اپنے ایمان میں اور راسخ ہو گئے۔ ان کو وہ کچھ مل گیا تھا جس کے وہ انتظار میں تھے۔[۱۲]

یہ ان بہتیرے واقعات میں سے چند مثالیں ہیں جو تاریخ کے اوراق میں بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ گروہ در گروہ اور جوق در جوق لوگوں کے اسلام کے دائرے میں داخل ہونے کے حقیقی اسباب اور محرکات کیا تھے؟

جو معاملہ کا صرف ایک رُخ دیکھ کر فیصلہ کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ یہ بلاغتِ قرآن اور آیاتِ الٰہی کی فصاحت کا اثر تھا کہ دعوتِ نبویؐ اس قدر سرعت سے پھیلتی چلی گئی۔ اور یہی سبب تھا کہ اسلام اول روز سے عوام میں مقبولیت پا گیا۔ یہ بات ٹھیک ہے۔ کلامِ خداوندی اوجِ بلاغت اور فصاحت کی منتہائے کمال پر ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں۔ مگر ساری بات یہی نہیں۔ وہ رَم اعجازی جو قرآن کی آیات میں موجود ہے وہ صرف الفاظ و کلام کا مرہونِ منت نہیں۔ وہ اس سے بھی آگے کچھ ہے جو حقیقت میں اصل اور اساس ہے۔ وہ کلام کی روحانیت اور معنویت ہے جس نے اس کو جاذبیت اور نفوذ و اثر بخشا ہے کہ مومنوں کے وجود کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے اور راسخ ہوتا ہے۔ دعوت کی روحانیت اور رسولؐ کا صدقِ گفتار اور اس کے ساتھ جو گواہی تھی اس نے اس نفوذ اور اس تاثیر کی بنیاد مہیا کی۔ خاص و عام آدمی، دانا و نادان اور عرب و عجم میں یہ نفوذ یکساں ہے۔ ان سب ہی پر اثر پڑتا ہے اور ان کے دلوں میں اترتا ہے۔ جو علم والے ہیں اور پہلے سے آسمانی کتابوں سے واقف ہیں آئیں دیکھیں کہ ان کے بارے میں قرآن خود کیا کہتا ہے:

> یقیناً وہ لوگ جن کو اس سے پہلے علم دیا گیا ہے جس وقت ان کے سامنے (یہ قرآن) پڑھا جاتا ہے وہ منہ کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں۔۔۔۔۔ ٹھوڑیوں کے بل گر پڑتے ہیں۔ وہ روتے جاتے ہیں اور (قرآن کا سننا) ان کے خشوع کو بڑھا دیتا ہے۔ (۱۷ : ۱۰۷ و ۱۰۹)

اور یہ بھی:

> وہ لوگ جن کو ہم نے اس سے پہلے کتاب دی، وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور جب ان پر (کلامِ خدا) پڑھا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے۔ یقیناً یہ ہمارے پروردگار کی طرف سے برحق ہے۔ یقیناً ہم اس کے پہلے ہی سے ماننے والے ہیں۔ (۲۸ : ۵۲ و ۵۳)

---

[۱۲] ابن ہشام ۔ ۲ : ۳۲ ۔ قرآنِ مجید میں اہلِ کتاب میں سے مومنین کا بہت ذکر ہے۔ ان آیات کو دیکھیں:۔ ۲ : ۶۲ و ۱۲۱ ؛ ۳ : ۱۱۳ - ۱۱۵ و ۱۵۹ ، ۱۹۹ ؛ ۵ : ۶۶ و ۶۹ ؛ ۷ : ۱۵۹ ؛ ۱۳ : ۳۶ ؛ ۱۷ : ۱۰۷ - ۱۰۹ ؛ ۲۸ : ۵۲ - ۵۴ ؛ ۲۹ : ۴۷ ؛ ۳۴ : ۶ ؛ ۵۷ : ۲۷ ۔

جو علم رکھتے تھے اور پچھلی کتابوں پر اعتقاد رکھتے تھے اور دیندار تھے ان پر قرآن کا اثر صرف اس کی فصاحت و بلاغت الفاظ کی وجہ سے نہیں تھا۔ اس کے اس وصف کے ساتھ ساتھ قرآن کا روحانی اثر اور اس کی قوت نفوذ نیز دعوت نبوی کی روحانیت اور آپ کی صداقت کی گواہی بھی اس اثر پذیری میں برابر کی شریک ہے۔

خداوند تعالیٰ کے حکم کی اطاعت اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا، یہ فرمانبرداری اور ایمان صرف فصاحت اور بلاغت کلام کی بنا پر نہیں تھا۔ کلام کی روحانیت، دعوت کی سچائی اور عزم و استقامت کا اثر بھی اس میں شامل تھا۔ اس کی بہترین دلیل قرآن کا ان لوگوں پر اثر ہے جو عربی نہیں جانتے۔ قرآن کے ترجمہ کی بات نہیں ہو رہی ہے۔ آیات کا متن شریف بجائے خود جاذبیت رکھتا ہے۔ قرائت قرآن میں جو صوتی خوبی ہے، اپنے کلمات کے زیر و بم اور آہنگ کے ذریعے وہ سننے والے میں ایک رقت کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے اور روح میں تموج پیدا کرتی ہے جو کسی اور کلام اور کسی اور آواز و آہنگ سے میسر نہیں آتی۔ وہ لوگ جو عربی زبان نہیں جانتے اور اسلام سے واقف نہیں وہ بھی اس کی قرائت کو سنتے ہیں تو اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ قرائت قرآن انسانی وجود کے تار و پود اور سننے والے کے رگ و پے پر اثر انداز ہوتی ہے اور اس میں ہیجان پیدا کر دیتی ہے ـــــ آیات الٰہی میں جو روحانیت اور گہری معنویت پوشیدہ ہے یقیناً اس کا اثر ہے۔

پیغمبر اکرمؐ کی نگرانی

قرآن جمع کرنے کا پہلا مرحلہ سینوں میں قرآن کا حفظ اور محفوظ کرنا تھا۔ یہ مرحلہ خود پیغمبرؐ کی ذات گرامی سے شروع ہوا۔ رسول اللہؐ کی مدنی جدوجہد کا تقاضا یہ تھا کہ آپ خود قرآن کو حاصل کریں، اس کو حفظ کریں اور پھر آہستہ آہستہ اور ٹھہر ٹھہر کر اس کو لوگوں کو سنائیں تاکہ وہ بھی اس کو لیں اور حفظ کریں، اس پر عمل کریں اور آئندہ نسل کے حوالے کریں۔

وہ (اللہ تعالیٰ) وہی ہے جس نے امیین میں ان ہی میں سے ایک رسول مبعوث کیے جو ان پر اس کی آیات پڑھتے ہیں، ان کو پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔ (۶۲، ۲)

پیغمبر اکرمؐ کو قرآن حاصل کرنے اور اس کے حفظ کرنے کی بہت شدید خواہش تھی۔ آپ سخت حالات میں بھی زبان سے آیات کو ادا کرتے رہتے۔ آیات قرآنی (نازل ہوتے وقت) حاصل کرنے میں جلدی کرتے کہ مبادا کوئی لفظ ذہن سے اتر جائے یا کوئی حرف تبدیل ہو جائے۔ دل میں اتار لینے کے لیے جلدی کرتے اور آیات الٰہی کو زبان پر جاری رکھتے۔[۱]

یہاں تک کہ پروردگار عالم نے آپ کو اطمینان دلایا اور آپ سے وعدہ کیا کہ قرآن آپ کے سینے میں محفوظ کر دے گا اور الفاظ کی قرائت اور اس کے معانی آپ پر آسان کر دے گا۔ جیسا کہ فرمایا:

لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ۝ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ (۷۵، ۱۶، ۱۷)

اس (قرآن) کے ساتھ اپنی زبان کو حرکت نہ دو تاکہ تم اس کے ساتھ جلدی کرو۔ یقیناً اس (قرآن) کا جمع کرنا اور اس کا پڑھنا

---

[۱] مجمع البیان ۱۰: ۳۹۷۔ حدیث میں آیا ہے کہ اذا نزل علیه الوحی حرك به لسانه المعجم المفهرس لالفاظ الحدیث ۱/ ۵۰۱، مسند ۲/ ۳۰ ابن سعد ۱/ ۱۳۲۔

Presented by Ziaraat.Com

ہمارے ذمہ ہے۔

اس لیے کہ اس سے پیشتر کہ وحی مکمل ہو اور آیات کا نازل ہونا تمام ہو پیغمبر اکرمؐ ان کے حفظ کرنے اور دہرانے کی خواہش کے تحت صحابہ کو نہ سنا دیں، خداوندِ عالم نے فرمایا:

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّقْضٰۤی اِلَیْكَ وَحْیُهٗ ۔ (۲۰ : ۱۱۴)

تم قرآن (پڑھنے میں) جلدی نہ کیا کرو پیشتر اس کے کہ تمہاری طرف اس کی وحی پوری کر دی جائے۔

ممکن ہے آپؐ کلمات کو حاصل کرنے، ان کے آہنگ کو حفظ کرنے اور معانی کو سمجھنے کے لیے ان کلمات کو خود ہی بلند آواز سے بار بار پڑھتے ہوں۔ ممکن ہے اس کی کوشش کرتے ہوں کہ وحی کے تمام ہونے سے پہلے اس کو حفظ کرتے جائیں۔ خداوندِ عالم نے فرمایا کہ اس کی ضرورت نہیں۔ جلدی نہ کریں بلکہ وحی کے تمام ہونے کا انتظار کریں اور ساری آیات کو سکون سے حاصل کر لیں۔ اگر کبھی کسی خاص صورت میں کلمات مبہم رہیں، جیسا کہ کبھی ہوا، تو بعد میں اس کی وضاحت ہو جائے گی[۲]

اس کے بعد سے آنحضرتؐ نے جلدی نہیں کی۔ جب جبرئیل نازل ہوتے آپؐ آیت کے آخر تک ایک ایک لفظ کو سنتے اور پھر جس طرح نازل ہوئی تھی اس آیت یا آیات کی قرائت فرماتے۔

اس طرح آپؐ اپنے قلب شریف میں جامع قرآن اور سید حافظان ہوئے۔ اور قرآن اور علوم قرآنی میں سے مسلمان جو بھی چاہتے ان کے لیے آپؐ مرجع ہوئے۔

حکم کے مطابق آپؐ قرآن آہستہ آہستہ اور ٹھہر ٹھہر کر لوگوں کو سناتے۔ قرآن ہی سے شب زندہ داری کرتے اور اسی سے نماز کو آراستہ کرتے۔ آپؐ ہر شب ۸ یا ۹ یا ۱۱ یا ۱۳ رکعت نماز ادا کرتے[۳] کبھی ایسا بھی ہوا کہ ان نمازوں میں ایک رکعت میں سورۂ بقرہ اور آل عمران تلاوت کرتے[۳] رات کو جب تک سورہ "الم سجدہ" اور سورۂ "ملک" نہیں پڑھ لیتے ہونے کے لیے نہیں لیٹتے تھے۔

یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ آپؐ کی قرائت بہت آہستہ اور واضح ہوتی اور آیات کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرتے، جیسا کہ آپؐ کی زوجہ حفصہؓ اور آپؐ کے خادم انس بن مالک نے نقل کیا ہے کہ آپؐ کی قرائت "ترتیل" اور "مد" سے ہوتی۔ کبھی بلند ہو جاتی اور کبھی آہستہ[۵] حذیفہ بن یمان کہتے ہیں کہ ایک رات رسول اللہؐ کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے۔ آپؐ نے سورۂ بقرہ سے آغاز کیا، پھر سورۂ نساء پڑھی اور پھر آل عمران۔ جب تسبیح کی آیت پر پہنچتے تو اللہ تعالےٰ کی تسبیح کرتے۔ جب سوال پر پہنچتے تو سوال کرتے۔ جب تعویذ پر پہنچتے تو خدا سے پناہ مانگتے۔

عوف بن مالک کہتے ہیں کہ نماز میں (آپؐ نے) سورۂ بقرہ پڑھنا شروع کی۔ جب آیت رحمت تک پہنچے تو خدا سے (رحمت) طلب کی اور تعویذ میں خدا سے پناہ مانگی۔

---

[۲] منٹگمری واٹ: مقدمۂ بل ۲۲۔

[۳] المعجم المفہرس ۶ : ۱۵۸ اع آخر ۱۵۹-۲ حدیث اول۔ مفتاح کنوز السنہ ۴۳۱ س ۱ و ۲۔

[۴] مقدمتان ۔ ۲۸۔

[۵] سنن ابی داؤد، تطوع ۲۵، وتر ۲۰، احمد ۶ : ۲۹۴ ، ۲۸۶/۲۸۸-۳۲۳/۳-۳۲۳، ابن سعد ۱ ، ۲/ ۹۷۔

Presented by Ziaraat.Com

ابوذر غفاری (م ۳۲ھ) بھی نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ آیات میں تدبر اور غور کرتے۔ جب عذاب کی آیت آتی تو گریہ کرتے اور آیت رحمت پر رحمت کی درخواست کرتے کبھی ایسا ہوتا کہ ایک آیت کو نماز میں بار بار دہراتے تھے۔[۷۶]

ان روایات سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ قرآن کی تلاوت میں کس قدر اہتمام کرتے۔ آپ نص آیات میں تدبر ضروری جانتے اور ندائے الہٰی کا صحیح جواب دیتے۔ مثال کے طور پر جب اس آیت پر پہنچتے:

اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ الْحٰکِمِیْنَ (۹۵: ۸)

کیا اللہ تعالیٰ سب حاکموں سے بڑھ کر حاکم نہیں۔

تو فرماتے: "نعم"

یا اس آیت پر

فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ (۷: ۱۸۵)

پھر وہ اس (قرآن) کے بعد اور کس بات پر ایمان لائیں گے۔

فرماتے اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَمَآ اُنْزِلَ۔

خدا پر اور جو اس نے نازل کیا اس پر میں ایمان لایا۔

اور جب نماز میں پڑھتے:

فَاَلْھَمَھَا فُجُوْرَھَا وَتَقْوٰھَا (۹۱: ۸)

پھر اس نے اس کی بدکاریوں اور پرہیزگاریوں کا الہام کر دیا۔

تو فرماتے: اللھم آت نفسی تقواھا و زکھا و انت خیر من زکاھا انت ولیھا و مولاھا۔

یہاں تک کہ حق تلاوت ادا ہوا جو خداوند عالم نے فرمایا:

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ ط اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ ط (۲: ۱۲۱)

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کو ایسا ہی پڑھتے ہیں جیسا کہ پڑھنے کا حق ہے۔ یہی لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں۔

چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ قرآن کو ترتیل سے (ٹھہر ٹھہر کر) پڑھنا چاہیے اگر ایسی آیت پر پہنچو جہاں بہشت کا ذکر ہے تو رکو اور خدا سے اس کو مانگو اور اگر جہنم کا ذکر آجائے تو رک جاؤ اور خدا سے پناہ مانگو۔[۷۷]

ان ساری باتوں سے آپ کے صبر اور استقامت اور استقلال و ہمت کا پتہ چلتا ہے۔ یہ تو ہم (پچھلے صفحات میں) دیکھ چکے کہ آنحضرت کھڑے ہو کر قرآن کی سورتوں کی اس قدر تلاوت کرتے کہ آپ کے پیروں پر ورم آ جاتا۔[۷۸]

---

۷۶ المرشد الوجیز۔ ابو شامہ ۱۹۵۔

۷۷ محجۃ۔ ۲: ۲۲۲۔

۷۸ بخاری، الرقاق ۲۰، احمد ۴: ۲۵۱ و ۲۵۵، طیالسی ح ۶۹۳۔

Presented by Ziaraat.Com

آخر عمر میں جب زیادہ دیر کھڑے نہیں ہو پاتے تو بیٹھ کر نماز پڑھتے لیکن رکوع کے وقت کھڑے ہو جاتے اور رکوع کرتے۔[۹] شروع میں نمازِ شب مسجد میں ادا کرتے۔ مگر بعد میں اس خیال سے کہ لوگ اس کو واجب نماز نہ سمجھنے لگیں اور اس کو ادا نہ کر پائیں، آپ نمازِ شب گھر میں پڑھنے لگے۔[۱۰]

پیغمبرِ اکرم نہ صرف نماز میں بلکہ دن اور رات کسی وقت بھی جب بھی آپ کو موقع ملتا، یہاں تک کہ سفر میں سواری پر بھی[۱۱] اور محاذِ جنگ میں جب دشمن سامنے ہوتا قرآن کو بلند آواز سے تلاوت کرتے۔ دوسروں سے قرآن سننے کو بھی بہت پسند فرماتے تھے۔[۱۲] لوگوں کو اس بارے میں حوصلہ دیتے اور ترغیب دیتے۔

جنگ کے موقع پر پیغمبرِ اکرم قرآن کو برملا بلند پڑھتے۔ آپ کی گونجتی ہوئی آواز سے جہاد کی آیات صحابہ کے کانوں تک پہنچتیں اور ان کو جنگ و پیکار پر آمادہ کرتیں اور راہِ خدا میں جان دینے پر مستعد کرتیں۔ یہ اثر آفرینی عام موقعوں پر بھی شروع تبلیغ سے نظر آتی ہے۔ آیاتِ قرآنی کی تلاوت اعراب کو اپنی طرف کھینچتی۔ اور گہرا اثر ڈالتی۔ یہی وجہ تھی کہ کافر سر توڑ کوشش کرتے کہ لوگ قرآن نہ سن پائیں۔ جب آپ قرآن پڑھتے تو یہ لوگ شور و غوغا کرتے کہ آپ نہ پڑھ پائیں اور دوسرے نہ سن پائیں (۴۱ : ۲۶)۔ مگر یہ سارے مکر و فریب بے کار ثابت ہوئے اور قرآن کا جاوِدان اور دائم اثر قائم ہو کے رہا۔

مسروق (م ۶۳ ھ) جو تابعین یعنی دوسری نسل میں بزرگ اہلِ فتویٰ شمار کیا جاتا ہے، نقل کرتا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے دیکھا کہ رسول اللہ اپنی دخترِ گرامی حضرت فاطمہؑ سے کچھ راز کی باتیں فرما رہے ہیں۔ بعد میں حضرت فاطمہؑ نے نقل کیا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: "ہر سال جبرئیل ایک بار قرآن مجھے سناتے اور مجھ سے سنتے مگر اس سال انہوں نے دو بار سنایا اور سنا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ میری اجل قریب ہے۔"[۱۳] مشہور روایت کے مطابق ہر سال پیغمبرِ اکرمؐ رمضان میں قرآن جہاں تک نازل ہو چکا تھا جبرئیل سے مقابلہ کرتے اور دہراتے اور اس دوران رسول اللہ کا حافظہ قرآن سے سرشار ہو جاتا۔[۱۴]

یہ فرشتۂ وحی سے اتصال اور ارتباطِ دائمی اور خود پیغمبر کی ذاتی طور سے نگرانی اور ان کا اہتمام اس بات کا سبب بنا کہ آخری دم تک سارا قرآن بتمام و کمال آپ کے حافظہ میں محفوظ رہا اور قاریانِ قرآن کے حق میں آپ خود پیشوا بنے۔ آپ حد سے زیادہ حفظ اور حفاظتِ قرآن پر توجہ رکھتے تھے۔ سینے میں محفوظ کرنے کے بعد قرآن کی خاطر یہ توجہ اور اہتمام اپنے اصحاب اور دوسرے مسلمانوں میں بھی پیدا کر دیا تھا۔ آپ لوگوں کو حوصلہ دیتے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے قرآن حفظ کریں۔ چنانچہ یہی جذبہ تھا جب قرآن سیکھنے اور اس پر عمل کرنے کے سلسلے میں فرمایا:

---

۹ بخاری، التہجد ۴، احمد ۱: ۹۹۲ و ۶: ۲۲۵۔

۱۰ نبی اکرمؐ کی نمازِ شب کے لیے دیکھیں مفتاح کنوز السنہ ۴۲۹ س ۲ و ۳، ص ۴۳۰ س ۱۔

۱۱ مفتاح کنوز السنہ ۴۰۴ س ۱۴ المرشد الوجیز ۱۹۸

۱۲ مفتاح کنوز السنہ ۳۹۹۔ س ۳۔

۱۳ بخاری، ۶۱، مناقب ۲۵، استئذان ۴۳، فضائل القرآن، مسلم، فضائل الصحابہ ۹۸، ۹۹، ابن ماجہ، الجنائز ۶۴، طبقات ابن سعد ۲: ۲/۴۰ و ۴۰، احمد ۱: ۲۳۰، ۲۷۵، ۳۲۵، ۳۶۲، ۳۹۹ و ۶: ۲۸۲، طیالسی ا ح ۳: ۱۳۷، فضائل القرآن ابن کثیر ۲۶، ۲۷، ۴۴۔

۱۴ بخاری، صوم ۷، بدء الخلق ۶، مناقب ۲۲، مسلم فضائل ۵۰، نسائی صیام ۲، احمد ۱: ۲۸۸، ۳۶۳، ۳۶۶، ۳۷۳۔

Presented by Ziaraat.Com

"تم میں سے بہترین شخص اور بزرگ شخص وہ ہے جو قرآن کو خود سیکھے اور دوسروں کو سکھائے۔"[۱۱۵]

آپ نے یہ بھی فرمایا: "جو کتاب خدا سے ایک آیت سنتا ہے، روزِ قیامت وہ آیت اس کے لیے نور اور روشنی بن جائے گی۔ یا اس کے لیے دس نیکیاں لکھی جائیں گی"[۱۱۶]

اور پھر فرمایا: "دوسرے کلام پر خدا کے کلام کی فضیلت ایسی ہے جیسے اپنی مخلوق پر خدا کا فضل۔"

"وہ لوگ جو گھروں میں جمع ہو کر قرآن تلاوت کرتے اور اس میں غور و خوض کرتے ہیں وہ رحمتِ خداوندی میں ہیں۔"

"وہ گھر جس میں قرآن پڑھا جاتا ہے اس میں شیطان داخل نہیں ہوتا۔"[۱۱۷]

"میری امت کی بہترین عبادت، قرأتِ قرآن ہے۔"[۱۱۸]

"خداوند تعالیٰ نے فرمایا: جس کو قرآن کی تلاوت ہم سے سوال کرنے اور دعا کرنے سے مشغول رکھتی ہے اس کو ہم شکر کرنے والوں کی بہترین عبادت عطا کریں گے۔"[۱۱۹]

یہ حوصلہ افزائی و ترغیب، یہ عبادت کی جو یا روح، یہ حمد و ثنا کی بلندی صحابہ کی روح اور وجود پر بھی اثر پذیر ہوتی۔ اور وہ اس طرف بھرپور انداز میں متوجہ ہوتے۔ مثال کے طور پر ابو عبدالرحمٰن عبداللہ بن حبیب سُلَمی کوفی (م ۷۲ھ) نے اپنی عمر کے ستر سال قرآن سیکھنے میں صرف کیے[۱۲۰]۔ عملی میدان میں نظر آتا ہے کہ صحابہ جنگوں میں اپنی جانثاری کا ثبوت دیتے ہیں اور صلح اور امن کے زمانے میں قرآن کی تعلیم پر توجہ دیتے ہیں۔ اس کا حقیقی سبب ابلاغِ رسالت میں پیغمبرؐ کا اہتمام اور قرآن کا دمِ اعجاز تھا۔

جب رسولؐ اللہ مسجد میں تشریف رکھتے تو اصحاب ان کے چاروں طرف حلقہ بنا کر بیٹھتے[۱۲۱]۔ اس طرح کوئی پیچھے نہیں ہوتا۔ سب ہی ایک صف میں ہوتے۔ جو شخص آتا وہ اسی حلقے میں بیٹھ جاتا[۱۲۲]۔ کبھی ان کی تعداد ایک حلقے میں ۴۰ آدمیوں تک پہنچ جاتی۔ خود اصحاب بھی مسجد میں حلقہ حلقہ کر کے بیٹھتے اور قرآن کی تلاوت کرتے[۱۲۳]۔ بعض کی پشت قبلہ کی طرف بھی ہو جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض محدثین جیسے بخاریؒ اپنی کتاب میں "مسجد میں جلسہ" کے نام سے باب الگ قرار دیتے ہیں۔ یہ حلقے خصوصاً قرآن کی تعلیم کے لیے تھے۔

---

[۱۱۵] مجمہ-۲: ۲۱۰، فضائل القرآن- ابن کثیر ۴۳، مفتاح کنوز السنہ ص ۳۹۷- س ۳۲ و ۳۳-

[۱۱۶] احیاء العلوم- غزالی-

[۱۱۷] مجمہ ۲: ۲۱۰، پیغمبرؐ جو حوصلہ افزائی کرتے ہیں وہ ان کتابوں میں دیکھیں، بحار الانوار ۲: ۱۵۰، اصول کافی ۴: ۳۹۴-۴۱۸- کتاب فضل القرآن-

[۱۱۸] ایضاً-

[۱۱۹] ترمذی ۱۱: ۴۶-

[۱۲۰] فضائل القرآن- ابن کثیر- ۶۴-

[۱۲۱] تراتیب الاداریہ- کتانی- ۲: ۲۱۷-

[۱۲۲] المعجم المفہرس- ۱: ۵۰۳- س ۱۵ ۲-

[۱۲۳] کتانی- ۲: ۲۱۸ و ۲۷۸-

Presented by Ziaraat.Com

ابوسعید خدری (م ۷۴ھ) کہتا ہے کہ جب اصحاب رسول اکٹھا ہو کر بیٹھتے تو آپس میں حدیث بیان کرتے اور ان کی حدیث ختم ہوتی یا پھر قرائت قرآن کرتے تھے[24]۔ ایک دن رسول اللہ اپنے حجرے سے مسجد میں آئے تو اصحاب کو دیکھا کہ دو حلقوں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان میں ایک گروہ قرائت قرآن کر رہا ہے اور دوسرا فقہ سیکھنے میں مصروف ہے۔ آپ نے دونوں کے لیے دعا فرمائی[25]۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کا اجتماع زیادہ تر مسجد میں حلقے کی شکل میں ہوتا۔ ان کی مصروفیت فقہ اور قرآن کی تعلیم تھی۔ صرف مسجد ہی میں نہیں مسجد کے باہر بھی وہ صبح اور شام قرآن سیکھنے میں مشغول رہتے۔ بیشک زیادہ وقت ان کا مسجد ہی میں گذرتا تھا۔ عادات کو اپنی عورتوں اور بچوں کو سکھاتے۔ ایک دن آنحضرتؐ کے سامنے گفتگو ہو رہی تھی کہ کیا آئندہ قرآن کی تعلیم سست پڑ جائے گی۔ زیاد بن لبید جو ہجرت سے قبل اسلام لایا تھا[26] کہنے لگا کس طرح ممکن ہے کہ یہ علم ختم ہو جائے جب ہم اپنی عورتوں اور بچوں کو اس کی باقاعدہ تعلیم دے رہے ہیں۔

چنانچہ اول روز سے ہی قرآن کی تعلیم جاری ہو گئی۔ ابوموسیٰ اشعری کہتا ہے کہ رسول اللہ خود رات کو ان حلقوں میں جا کر تشریف رکھتے جہاں قرآن کی تعلیم ہو رہی ہوتی۔ آپ صحابہ کی قرائت سنتے۔ ان کے حفظ کرنے اور قرائت کے اسلوب پر توجہ دیتے اور ان کی اصلاح فرماتے۔ رسول اللہ اپنے گھر میں بھی ضرورت کے مطابق تعلیم کا بندوبست فرماتے۔ آپ نے شفا بنت عبداللہ العدویہ (م تقریباً ۲۰ھ) سے فرمایا کہ حضرت حفصہؓ (م ۴۵ھ) کو لکھنا سکھا دیں[27]۔ یہ شفا اسلام سے پہلے ہی سے لکھنا پڑھنا جانتی تھیں اور ہجرت سے پہلے اسلام لائی تھیں۔

آپ نے اپنی امت کو حکم دیا کہ ہر شخص جو حاضر ہے اور گواہ ہے ہر اس کو جو موجود نہیں پیغام پہنچا دے۔ فرمایا[28]

بَلِّغُوا عَنِّیْ وَلَوْ آیَةً

یعنی اگر ایک آیت سے زیادہ نہیں جانتے اور اس سے زیادہ تمہارے پاس نہیں اور اس سے زیادہ دوسروں تک نہیں پہنچا سکتے تو فقط وہی آیت دوسروں تک پہنچاؤ اور اس کی تبلیغ کرو۔

عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ نے مجھے گواہی دینے کا طریقہ سکھایا جس طرح آپ نے مجھے قرآن یاد کروایا[29]۔

ابی بن کعب کہتا ہے کہ میں مسجد (نبویؐ) میں گیا۔ ایک شخص کو قرآن پڑھتے سنا۔ اس سے میں نے پوچھا کہ قرآن تم کو کس نے سنایا کہ اس طرح یاد کر لیا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ رسول اللہ نے[30]۔

---

۲۴ ایضاً۔ ۲: ۲۲۱۔

۲۵ ایضاً۔ ۲: ۲۲۰؛ ابن ماجہ؛ مقدمہ ۱۷۔

۲۶ ابن سعد۔ ۱/۱/ ۱۵۲۔

۲۷ کامل۔ ابن اثیر۔ ۸: ۴، ۷۷، ۷۸۔

۲۸ بخاری؛ انبیاء ۵۰۔ ترمذی؛ علم ۱۳، دارمی؛ مقدمہ ۴۶، احمد ۲: ۱۵۹، ۲۰۲، ۲۱۴، فضائل القرآن۔ ابن کثیر ۱۷، اتقان ۱: ۶۶۔

۲۹ تاریخ جرجان از سہمی ۲۸۹۔ طبع حیدرآباد ۱۹۵۰۔

۳۰ ایضاً۔ ۱: ۳۲۔

Presented by Ziaraat.Com

جیسا کہ آگے چل کر (حافظانِ قرآن کے عنوان سے) بیان کیا جائے گا آپؐ نے اپنے چار آسودہ ترین اور تعلیم یافتہ صحابہ کو اسی بات پر مامور کیا تھا کہ وہ سے لوگوں کو قرآن سکھائیں۔ یہ لوگ بھی اس کام کو بہت مستعد اور بلند ہمت رہے۔ صحابہ میں سے جو کوئی بھی قرآن نہیں جانتا اس کو سیکھے یا اطلاع ہو جاتی۔ اگر صحابہ کی جماعت میں داخل ہوا تھا، وہ ان ہی معلمین سے قرآن سیکھتا۔

علاوہ ازیں کبھی ایسا بھی ہوتا کہ پیغمبر اکرمؐ اپنے صحابہ میں سے کچھ کو دور دراز علاقوں میں بھیجتے تاکہ وہاں کے لوگوں کو قرآن سنائیں اور اس کی تعلیم دیں۔ جیسا کہ ہجرت سے پہلے آپؐ نے اپنے دو صحابہ کو مکہ سے مدینہ اس سلسلے میں بھیجا تھا۔

عقبۂ اولیٰ (سال ۱۲ نبوت ۶۲۱ء) کے بعد مدینہ کے لوگوں نے پیغمبر اکرمؐ کو لکھا کہ آپؐ کسی کو مدینہ بھیجیں تاکہ وہ ہم لوگوں کو یہاں فقہ اور قرآن کی تعلیم دے۔ پیغمبرؐ نے مُصعبؓ بن عُمیرؓ کو مدینہ بھیجا۔ انہوں نے اطرافِ مدینہ کے قبائل کو اسلام اور قرآن کی دعوت دی اور قرآن کی قراءت کر کے لوگوں کو سنایا۔ جب اوس اور خزرج کے قبیلے اس پر اتفاق نہیں کر پائے کہ امام جماعت کون بنے تو ان لوگوں کو مصعبؓ نے ہی نمازِ جماعت پڑھائی۔[۱۶۱] ایک روایت کے مطابق اس اہم کام میں عبداللہؓ بن ام مکتومؓ نے بھی ان کا ہاتھ بٹایا۔[۱۶۲] ان کے بعد عمارؓ اور بلالؓ مدینہ روانہ ہوئے۔ رافعؓ بن مالک انصار کا پہلے شخص تھے جو سورۂ یوسفؑ مدینہ لے گئے۔

جب یمن کے لوگوں کے نمائندے آئے تو ابوعبیدہ بن جراح (م۔ ۱۸ھ) کو ان کی تعلیم کے لیے ان کے ساتھ روانہ کیا۔[۱۶۳] ستر سالہ نوجوان عمرو بن حزم انصاری کو ۱۰ھ میں ایک خط کے ساتھ نجران روانہ فرمایا تاکہ وہاں کے لوگوں کو قرآن اور فقہ کی تعلیم دیں۔ اس خط میں قرآن کے قاریوں کی ذمہ داریاں تفصیل سے درج تھیں۔ خیر اور نیکی کا حکم، تعلیم قرآن اور احکام شرع کے بیان، بہشت کی بشارت اور آتشِ دوزخ سے ڈرانا اس خط میں درج تھا۔[۱۶۴]

اُسَید بن حُضیر (م۔ تقریباً ۲۰ھ) اور خالد بن سعید بن عاص (م ۱۴ھ) بھی اسی کام پر مامور کیے گئے تھے۔[۱۶۵] بنی تمیم کے لوگ جب پیغمبرؐ کے پاس آئے تو آپؐ نے عُبّاد بن بشیر (م۔ ۱۲ھ) کو ان کے ساتھ روانہ کیا کہ شریعتِ اسلام اور قراءتِ قرآن ان کو سکھائیں۔[۱۶۶] فتحِ مکہ کے بعد حُنین کی جنگ کے لیے روانگی کے موقع پر (۸ھ میں) رسولِ اکرمؐ نے بیس سالہ نوجوان عَتّاب بن اَسید (م۔ ۲۳ھ) کو مکہ میں دیکھ بھال کے لیے چھوڑا۔ اور معاذ بن جبل (م ۱۸ھ) کو قرآن سکھانے حفظ کرانے اور اسلام کی بنیادی تعلیم دینے کے لیے مکہ میں چھوڑ گئے۔[۱۶۷]

---

۱۶۱ ابن ہشام ۲: ۷۶، ابن سعد ۱: ۱/۱۴۸، ۳/۱: ۸۳ و ۲/۲: ۱۳۶، احمد ۴: ۲۸۴ و ۲۹۱، طیالسی: ح ۷۰۴۔ مدینے میں ان کو "مُقری" کہتے تھے (طبری ۱: ۱۲۱۴) اس لیے کہ قاریوں کی قراءت کی اصلاح کرتے تھے۔

۱۶۲ ابن سعد ۴/۱: ۱۵۱، اس کے علاوہ ملاحظہ کریں۔ امتاع مقریزی ۳۴۔ ۳۵، جوامع السیرہ ۷۲، تراتیب الاداریہ۔ کتانی۔ ۱: ۴۲۔

۱۶۳ تراتیب الاداریہ۔ کتانی۔ ۱: ۴۳۔

۱۶۴ ابن ہشام ۴: ۲۴۱۔ ۲۴۳، مجموعۃ الوثائق السیاسیہ۔ ۱۰۵۔ ۱۰۶۔ اس کتاب کے آغاز میں بھی یہ ذکر آچکا ہے۔

۱۶۵ تراتیب الاداریہ ۱: ۴۴، اُسَید بن حُضیر ان تین افراد میں سے تھے جن کا لقب کامل تھا یعنی لکھنا پڑھنا بھی جانتے تھے اور پیراکی اور تیراندازی میں مہارت رکھتے تھے۔

۱۶۶ ابن سعد ۲: ۱/۱۱۶ و ۳/۲: ۱۷ و تہذیب التہذیب ۵: ۹۰۔

۱۶۷ ابن ہشام ۴: ۲۶۲ و ابن سعد ۲: ۱۰۸۔

Presented by Ziaraat.Com

ان ہی معاذ کو ایک بار پھر ستر ۹ھ میں یمن بھیجا تھا۔ روانگی کے وقت ان سے جو سوال کیے تھے ان سے اجتہاد کی حقیقت اور قدرت سے فتویٰ اخذ کرنے کے طریقے کی وضاحت ہوتی تھی۔ اور ان کو اس کام پر مامور فرمایا تھا [۲۲]

سنہ ۴ھ میں ایک اور مثال ملتی ہے کہ جہاں ایک دلدوز واقعہ بھی پیش آیا۔ اس سال صفر کے وسط میں دس صحابہ کو رجیع (مکہ کے نزدیک کنواں) کے پاس کفار نے گرفتار کر لیا۔ یہ لوگ عضل کے عربوں کے پاس ان کو قرآن کی تعلیم دینے کے لیے بھیجے گئے تھے [۲۳]

اسی مہینے میں، یعنی جنگ احد کے چار ماہ بعد اس سے بھی بڑا المیہ رونما ہوا۔ پیغمبر اکرمؐ نے ۴۰ افراد یا ایک روایت کے مطابق ۷۰ افراد جو انصار کے اکابرین میں سے تھے اور جن کو "قرّاء" کہا جاتا تھا، بنی عامر قبیلے کے سردار کی فرمائش پر اس قبیلے والوں کی تعلیم کے لیے روانہ کیا تھا۔ اس قافلے کی قیادت منذر بن عمرو (م ۴ھ) کر رہے تھے۔ یہ قبلِ اسلام بھی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ مدینہ سے مکہ کے راستے میں ایک کنواں "بئر معونہ" نام کا ہے جہاں ان لوگوں پر کافروں نے حملہ کیا اور ان سب کو شہید کر ڈالا۔ پیغمبر اسلام کو جب اس حادثۂ جانکاہ کی خبر ملی تو نماز فجر کی قنوت میں ایک مہینے تک ان ظالموں کا نام لے لے کر ان پر نفرین کرتے رہے [۲۴]۔ قنوت کا یہاں سے آغاز ہوا۔

---

[۲۲] اس بارے میں شہرستانی لکھتے ہیں: حضرت رسالت پناہ علیہ صلوٰۃ اللہ نے جب معاذ کو یمن بھیجا تو دریافت کیا کہ اے معاذ حکم کس کے مطابق کرو گے۔ معاذ نے جواب دیا کہ قرآن کے مطابق۔ فرمایا، اگر کتاب میں نص نہ پاؤ۔ کہنے لگے کہ پھر سنت رسولؐ کے مطابق۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر سنت کریمہ سے سند نہ ملے۔ معاذ نے کہا کہ پھر اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ رسالت پناہ نے فرمایا: الحمد للّٰہ الذی وفق رسول رسولہ لما یرضاہ (یعنی خدا کی حمد ہے کہ اس نے اپنے رسولؐ کے بھیجے ہوئے کو اس چیز کی توفیق عطا کی جو اس کی رضا کے مطابق ہے) ترجمہ ملل و نحل شہرستانی: ۱۰۸۔ توضیح الملل ۱: ۲۷۹، ملل و نحل ۱: ۱۱۲۔ بیروت، نیز رجوع کریں۔ بخاری، مغازی ۶۰، ابن سعد ۲: ۱۰۷/۲، ۱۲۱/۳، ۱۱۴/۳، ابن ہشام ۴: ۲۳۶، کتانی ۱: ۴۱۲، مفتاح کنوز السنۃ ۴۷۵، ۲، تحف العقول ۲۵، مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ ۱۰۹۔

[۲۳] قرآن مجید میں بھی اس حادثے کا ذکر ہے۔ (۲: ۲۰۴-۲۰۷)۔ ان میں سے سات افراد کے نام معلوم ہیں۔ باقی تین کے نام واضح نہیں ہیں۔ ملاحظہ کریں۔ واقدی ۳۴۴ (یا ۱۵۷ ایڈیشن)، ابن ہشام ۶۳۸، ۳، (یا ۴۸ گوٹنگن)، ابن سعد ۲: ۳۹/۱، ۳۹-۴۰، طبری ۱: ۱۴۳۱، ابن کثیر ۲: ۴۰۲، سیرت ابن کثیر ۴: ۶۲، امتاع ۱۴۴، مواہب ۱: ۱۰۳، تاریخ خمیس ۱: ۴۵۴، جوامع السیرۃ ۱۷۶، بخاری، مغازی، باب غزوۃ الرجیع، احمد ۲: ۳۱۰۔

[۲۴] واقدی ۳۴۶-۳۵۰ (۱۵۳ ایڈیشن)، ابن ہشام ۳: ۱۹۳ (۶۴۸ گوٹنگن)، ابن سعد ۲: ۳۶/۱، ۷۸/۱، انساب ۱: ۳۷۵، طبری ۱: ۱۴۴۱، ابن کثیر ۴: ۷۱، زاد المعاد ۲: ۲۳۲، تاریخ خمیس ۱: ۴۵۱، بخاری، جہاد ۹، ۱۸۴، مغازی ۲۸، احمد ۳: ۱۰۹، ۱۱۱، ۱۳۷، ۲۱۰، ۲۳۵، ۲۵۵، ۲۷۰، ۲۸۸، ۲۸۹، عمدۃ القاری ۸: ۲۳۰، مجمع الزوائد ۶: ۱۲۸-۱۲۹، جوامع السیرۃ ۱۷۸، جوامع ابن حزم ۱۸۰۔ جنگ احد کے بعد یہ سنگین ترین واقعہ تھا۔ اس میں دو نکتوں پر بحث ہوتی رہی ہے۔ اول یہ کہ قاریوں کی تعداد کیا تھی جو قتل ہوئے۔ دوسرے اس آیت کے بارے میں جس کو بعض راویوں نے کہا ہے کہ اس سلسلے میں نازل ہوئی بعد میں اٹھالی گئی یا فراموش کر دی گئی۔ تاریخی نقطۂ نظر سے اس واقعے کی حقیقت میں کوئی شک نہیں۔ مگر قاریوں کی تعداد کے بارے میں لامنس اعتراض پیش کرتا ہے (دائرۃ المعارف اسلام ۳: ۳۸۹-۳۹۰۔ مقالہ بئر معونہ)۔ ان کے کہنے کے مطابق اس ماموریت کے لیے دو عرب شیخ (ابو براء عامر ابن مالک و عامر بن طفیل کلابی) میں نزاع کا دخل دینا ظاہر ہے، ۷۰ قاریوں (بقیہ حاشیہ بر صفحہ بعد)

جنھوں نے قرآن کو سیکھا تھا اور اپنایا تھا رسول اللہ کے نزدیک ان کا دوسرا ہی مقام اور مرتبہ تھا۔ قرآن کی نزد یک ہیں اور صحابہ کی حوصلہ افزائی کی
میں کہ وہ قرآن حفظ کریں اور اس پر عمل بھی کریں آنحضرت ؐ ہر پہلو نگاہ میں رکھتے تھے جنگ اُحد میں جب شہیدوں کے جسد خاکی دفن کرنے
لگے تو اس کو مقدم رکھا جو قرآن زیادہ جانتا تھا اور آنحضرت ؐ کے چچا حضرت حمزہ کے نزدیک اس کو دفن کیا گیا جو زیادہ آیات حفظ کر چکا
تھا[۱۹] بعد میں قرآن کے واضح حکم (۹ : ۱۲۲) کے مطابق قرآن کے قاری جنگ اور جہاد میں شرکت سے رک گئے[۲۰]

بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ: ۔۔۔ کی ضرورت نہیں تھی۔ اس طرح آنحضرت نے ایک دو قاری بھیجے ہوں گے۔ مگر اس شخص کے اس دعوے کی تردید اس سے ہو جاتی ہے کہ
جب۔ اگر قاریوں کو بھیجنا شہروں کے معاملے میں دخل اور تصرفات سمجھا جائے تو پھر اس کے لیے آدمیوں کی اچھی خاصی تعداد چاہیے تھی۔ یہ عام اور تعلیمی
ماموریت جیسی نہیں تھی۔ دخل دینے کے لیے طاقت کی ضرورت ہے اور ستر آدمی یا کم از کم چالیس آدمی کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ مگر چونکہ یہ سب قاری
تھے اس لیے بحث "قرائت" سے متعلق ہو جاتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قدیم ترین کتاب یعنی ابن ہشام "قرّاء" کی گفتگو نہیں کرتا۔ بلکہ کا ہر مسلمان "شہداء المسلمین"
کا ذکر ہے۔ روایات میں جو طبری اپنی تاریخ میں نقل کرتا ہے تو اصحاب یا انصار کی بات کرتا ہے۔ مگر ان ناموں میں سے ایک بھی "قرّاء" کے نام
کی نفی نہیں کرتا اور احادیث (بخاری اور دوسرے محدثین نے تصریح کی ہے کہ "قرّاء" تھے) سے کوئی تردید نظر نہیں آتی۔ قاری سے بڑھ کر اور کون برگزیدہ
مسلمان ہو سکتا ہے۔ اہل صفہ اور قرآن پڑھنے والے شروع سے اسی نام سے پکارے جاتے تھے۔ قتل ہونے والوں میں عامر بن فہیرہ، منذر بن عمرو اور
نافع بن بدیل جیسے اکابرین کے نام لیے گئے ہیں۔ دس آدمیوں سے زیادہ کا نام لیا گیا ہے۔ بہرحال جو بات اہم ہے وہ اس کام میں قاریانِ قرآن
کی شرکت ہے۔ قابل توجہ یہ ہے کہ اسلام کے لشکر میں قاری بہت بڑی تعداد میں شریک ہوتے تھے۔
دوسرا سلسلہ اس آیت سے متعلق ہے جو کہا جاتا ہے کہ اس بارے میں نازل ہوئی تھی اور جو بعد میں اٹھالی گئی اور اس کی جگہ سورۂ آل عمران کی آیت
۱۶۹ نازل ہوئی۔ ابن ہشام اس بارے میں بالکل خاموش ہے (۳، ۱۹۴) طبری نے اس قصے کو اپنی تاریخ (۱ : ۸ - ۱۴۴۱) میں اور اپنی تفسیر (در ذیل آیت
۱۶۹ سورۂ آل عمران) (میں ابن مالک سے روایت کرتا ہے کہ ایک آیت اس بارے میں نازل ہوئی اور اس کی تلاوت منسوخ ہوئی۔ "نسخ" کی بحث
کہاں اس پر گفتگو ہوگی۔ کیا ایسی ایک عبارت "بلغوا قومنا عنا انا لقینا ربنا فرضی عنا و رضینا عنه" کا اس آیت سے مقابلہ کیا
جا سکتا ہے "ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل الله امواتا بل احیاء عند ربهم یرزقون"؟ کسی بھی صورت میں اس عبارت میں
یہ فصاحت و بلاغت قرآنی اور روحِ اعجازی نظر نہیں آتا۔ اس کی قرائت نماز میں صحیح نہیں۔ بغیر طہارت اس کا مس جائز ہے۔ اس سلسلے میں ایک
سوال نگاہ میں آتا ہے۔ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ جو قرآن کا انکار کرے وہ کافر ہے۔ اب وہ جو اس قسم کے منسوخ کا انکار کرے اس کے لیے کیا حکم
ہے؟ آخر کہاں تک ممکن ہے کہ ایک آیت کی تلاوت منسوخ ہو جائے اور اس کا حکم باقی رہ جائے؟ کیا یہ اپنے بندوں سے متعلق خدا کی حکمت
اور اس کی رحمت سے سازگار ہے؟ یہ گفتگو آگے آئے گی۔

۱۹۔ بخاری، مغازی ۲۸، ابن ہشام ۳، ۱۰۴/۱، ابن سعد ۱۰۲/۱، ۳۱ / ۳ : ۱، ۷ / ۸ و ۳ : ۲ / ۱۰۹۔
۲۰۔ تفسیر مجمع البیان میں امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ جب لوگوں کی تعداد بڑھ گئی تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ایک گروہ تو نکل کر جہاد کے لیے
جائے اور ایک گروہ ٹھہر کر فقہ حاصل کرے۔ اور جہاد کے لیے نکلنے والے باری باری بدلتے رہیں۔

Presented by Ziaraat.Com

اصل امور پر حکومت اور سرداری اس کے لیے تھی جو قرآن کو زیادہ جانتا ہو۔ عثمان بن ابی العاص (م ۵۱ھ) سنہ ۹ھ میں رسول اللہ کی خدمت میں طائف سے ثقیف قبیلے کے جو نمائندے آئے وہ اس وفد کا جوان رکن تھا۔ شہر طائف اور ثقیف قبیلے کی بڑی اہمیت تھی۔ مسجد کے ایک کونے میں ان کے لیے ایک خیمہ لگایا گیا اور ان کے لیے کھانے کا بندوبست آنحضرتؐ کے گھر سے کیا گیا۔ ان لوگوں کی (اسلام لانے کی) بات چیت کافی طویل تھی۔ چنانچہ مذاکرات ذرا طویل ہو گئے۔ اسی دوران عثمان بن ابی العاص دوسروں سے علیحدہ رسول اللہ کی خدمت میں آیا اور کچھ سوالات کیے۔ قرآن خود آنحضرتؐ کی زبان مبارک سے سنا۔ اس وقت جب رسول اللہ سو گئے تشریف لے گئے اس نے حضرت ابوبکرؓ اور اُبیؓ بن کعب سے قرائت سنی۔ جب مذاکرات تمام ہوئے تو اس وقت تک یہ نوجوان کچھ آیات قرآن اور کافی قرآن سیکھ چکا تھا۔ اسی بنا پر جب طائف کے نمائندے واپس جانے لگے تو پیغمبر اکرمؐ نے عثمان کو جوان سب میں نوجوان فرد تھا، طائف کا امیر منتخب فرمایا۔[۲۲۳]

ایک دوسری بہت اچھی مثال ابی حذیفہ کے غلام سالم (م ۱۲ھ) کی امامت کی ہے۔ یہ واحد مسلمان ہے جس کے نسب کا پتہ نہیں چل سکا۔ جب آنحضرتؐ کی ہجرت سے پہلے مسلمان مکہ سے مدینہ پہنچنا شروع ہوئے تو آپؐ کے مدینہ آنے تک یہ سالم ان کی امامت کرتا رہا۔ ان مہاجروں میں عمر بن خطاب، ابو سلمہ اور عیاش بن ابی ربیعہ جیسے صحابی بھی تھے۔ مگر چونکہ سالم ان سب سے زیادہ قرآن جانتا تھا تو جماعت کی امامت اس کے حوالے کی گئی۔[۲۲۴]

ایک تیسری مثال اسامہ بن زید (م ۵۴ھ) کی سرداری ہے جو موت (روانگی) کے وقت اس کو سونپی گئی۔ اس کے لشکر میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمرؓ جیسے صحابی بھی موجود تھے مگر پیغمبرؐ نے لشکر کا سالار نوجوان اسامہ کو بنایا۔ جب بعض لوگوں نے اس انتخاب پر اعتراض کیا اور کچھ کہا سنا تو آنحضرتؐ نے ان کو اس کی قرائت قرآن یاد دلائی۔[۲۲۵]

پیغمبرؐ کے اصحاب جب آپؐ سے کوئی آیت سیکھتے یا کوئی سورہ آپؐ سے سنتے تو بار بار آپؐ کی خدمت میں آ کر اس کو سناتے۔ یہاں تک کہ پیغمبر ان کی قرائت صحیح ہونے کی گواہی دیتے اور وہ آیات کریمہ کو صحیح طور پر حفظ کر لیتے۔ حفظ کرنے کے بعد جو کچھ جانتے وہ دوسروں کو بھی سناتے اور پھیلاتے۔ عورتوں اور بچوں کو تعلیم دیتے۔ ان کو بھی سکھاتے جو پیغمبرؐ کی تلاش میں آتے اور سیکھنے کے خواہشمند ہوتے۔ ابن اسحاق کتاب المغازی میں نقل کرتا ہے کہ جب وحی نازل ہوتی تو پیغمبرؐ پہلے مردوں کے مجمع میں اس کی قرائت کرتے اور بعد میں دوسری مرتبہ عورتوں کے مجمع میں قرائت فرماتے۔[۲۲۶] زیاد بن لبید کہتا ہے کہ ہم آیات اپنی عورتوں اور بچوں کو سکھاتے۔ اسی طرح کسی سورہ کے نازل ہونے کو

---

[۲۲۳] استاع ۴۸۹، ابن سعد ۲/۲۳: ۵۰۸ و ۵۲۲؛ ۲/۱۱۴ و ۲۶/۱، جمہرۃ الانساب ۲۵۴، ابن ہشام ۴/۱۸۵، بعد طبری ۱/۱۶۹۱، ابن سیلان کس ۲۲۸۱۲، ابن کثیر ۵/۲۹، زاد المعاد ۳، ۶۰ تاریخ الخمیس ۲: ۱۳۴، مفتاح کنوز السنہ ۳۲۲ ص اور ص ۱۰۲/۲، واقدی ۲۸۱ سلسلہ، جوامع السیرہ ابن حزم ۲۵۷، ابن سعد ۲: ۱۱۲/۲ و ۳: ۱/۶۱ و جوامع السیرۃ ابن حزم ۸۷۔

[۲۲۴] ابن سعد ۴/۲۱۴، تہذیب ابن عساکر ۲: ۳۹۱-۳۹۹، بخاری ۲: ۴/۱۹۴، مسلم ۷/۱، ۱۳۱، ابن سعد ۲: ۱/۱۲۷ و ۲: ۲/۴۰ و ۴۲، ۴۴، واقدی ۲۲۳، نوادر الاصول محمد بن علی حکیم ترمذی، ط، آستانہ ص ۲۳۲۔

[۲۲۵] مقدمہ ترجمہ قرآن بہ فرانسہ از ڈاکٹر محمد حمید اللہ، طبع ۱۹۶۶ پیرس، ص ۴۱، ج ۱۷، بہ نقل از تدوین قرآن ص ۲۸۰ غلام ہمدانی۔ ایک دن عورتوں کی تعلیم کے لیے مقرر فرمایا تھا: بخاری، علم ۳۶، اعتصام ۹، احمد ۳: ۳۴، ۷۲۔

Presented by Ziaraat.Com

۔ چند دن ہی گذرتے کہ آیات صحابہ کو سینہ بسینہ پہنچ جاتیں اور حفظ اور محفوظ ہو چکی ہوتیں۔ بعض اوقات مسجد میں لوگ نماز پڑھتے ہوتے تو پیغمبرؐ خود سنتے اور اگر ضرورت ہوتی تو ان کی تصحیح کر دیتے [۵۶]

آنحضرتؐ حافظانِ قرآن کی قرائت کو بہت اہمیت دیتے اور بہ خود ان کو سنا کرتے۔ عبداللہ ابن مسعودؓ جلیل القدر صحابی کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے مجھ سے فرمایا: مجھے قرآن پڑھ کر سناؤ! ابن مسعود نے کہا کہ قرآن تو آپؐ پر نازل ہوا ہے اور سناؤں میں؟ فرمایا: ہاں میں پسند کرتا ہوں کہ دوسروں سے بھی قرآن سنوں۔ تو میں نے سورۂ نساء پڑھنی شروع کی یہاں تک کہ آیت شمارہ ۴۱ تک پہنچا۔ تب آنحضرتؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے پھر فرمایا: میرے لیے یہاں تک کافی ہے [۵۷]

ایک روز پیغمبر اکرمؐ حضرت عائشہؓ کی آمد کے انتظار میں تھے۔ وہ کچھ دیر سے پہنچیں تو آپؐ نے دریافت فرمایا کہ دیر کیسے ہوگئی۔ کہنے لگیں کہ ایک شخص نہایت خوش الحانی سے قرآن پڑھ رہا تھا، میں اس کو سننے کھڑی ہوگئی۔ پیغمبر اکرمؐ اٹھے اور جا کر کچھ دیر اس کی قرائت سنتے رہے۔ واپس آئے تو فرمایا یہ ابی حذیفہ کا غلام سالم ہے۔ اللہ تعالےٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہماری امت میں ایسے لوگ پیدا کیے ہیں [۵۸]

جب آپؐ نے ابو موسیٰ اشعری کو قرآن پڑھتے سنا تو فرمایا کہ اس شخص کو لحن داؤدی نصیب ہوا ہے۔ ابو موسیٰ سے فرمایا کہ تم کو آلِ داؤد کے مزامیر میں سے ایک مزمار (خوش الحانی) ملی ہے۔ ابو موسیٰ یہ سن کر کہنے لگا کہ اگر مجھے علم ہوتا کہ آپ سن رہے ہیں تو میں اور بہتر طریقے سے قرآن کی تلاوت کرنے کی کوشش کرتا [۵۹] یہی ابو موسیٰ نقل کرتا ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا کہ رات کے وقت اشعری قبیلے والوں کی تلاوتِ قرآن کو پہچانتا ہوں اور ان کے قرآن پڑھنے سے ان کے گھروں کی سمت کا اندازہ کرتا ہوں اس کے باوجود کہ دن کے اوقات میں ان کے گھروں کی طرف سے نہ گذرا ہوں اور نہ ان کو دیکھا ہے [۶۰]

ان واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ صحابہ کی تعلیم میں کتنی کاوش کرتے اور اس کا کس قدر اہتمام فرماتے۔

بیشک آپؐ خاص توجہ فرماتے کہ صحابہ قرآن سیکھیں، اس کو حفظ کریں اور روز بروز اس کو بہتر طور پر اپنائیں مگر ساتھ ساتھ ہر وقت اس بات کا بھی خیال رکھتے کہ یہ کام صحابہ کے لیے مشکل اور سخت نہ ہو جائے۔

عبداللہ ابن عمرو نے اسلام لانے کے آغاز سے ہی اپنی عبادت میں اجتہاد کیا کرتا۔ رسول اللہؐ کے زمانے میں ہمیشہ روزہ رکھتا اور کتاب خدا کی تلاوت کرتا [۶۱] یہاں تک کہ اس کی ماں نے آکر پیغمبر اکرمؐ سے شکایت کی کہ میرا لڑکا دنیا سے کٹ گیا ہے۔ اپنے اوپر رات کی نیند حرام کر رکھی ہے۔ افطار نہیں کرتا۔ گوشت نہیں کھاتا۔ کسی کے کام نہیں آتا اور نہ حقوق ادا کرتا ہے۔ پیغمبر اکرمؐ نے اس کو بلا کر اس کی سرزنش کی اور

۵۶۔ کتاب المصاحف ابن ابی داؤد ، ۱۳۷ ۔

۵۷۔ مجمہ ۲ : ۲۳۲ ، المعجم والالفاظ الحدیث ۲ : ۵۲۸ ح ۱ ، مفتاح کنوز ۳/۳۹۹ ۔

۵۸۔ احیاء العلوم غزالی ۔

۵۹۔ المعجم المفہرس ۲ : ۳۴۳ ح ۲ و ۵ : ۳۴۸ س ۲ ح ۸ ۔ ص ۳۸۰ یہی کتاب ۔

۶۰۔ بخاری ، مغازی ، غزوۂ خیبر ح ۳۲ ۔

۶۱۔ تذکرۂ ذہبی ۱ : ۳۶ ۔

استدلال اور بیاد دہی کی تلقین فرمائی ٥٢ وہ خود کہتے ہیں کہ میں نے قرآن کو جمع کیا جس کو میں ہر ایک رات میں پڑھ لیا کرتا تھا۔ اس کی خبر نبی اکرمؐ کو پہنچی تو آپ نے مجھ سے فرمایا کہ قرآن ایک مہینے (یا ہر تین رات) میں پڑھا کرو ... ٥٣ یہی وجہ ہے کہ کہا گیا ہے کہ جو قرآن تین دن سے کم مدت میں ختم کرے وہ اس کو سمجھ نہیں سکتا ٥٤ چنانچہ اس کے بعد سے صحابہ قرآن کو دس دن یا پندرہ دن یا اس سے کم پانچ دنوں میں ختم کرتے تھے ٥٥ پیغمبر اکرمؐ لوگوں کو قرآن میں تدبر و تفکر کرنے کی بہت تاکید کرتے تھے اور اس کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ جلدبازی اور تیز تیز پڑھنا اس تدبر و تفکر میں رکاوٹ تھا۔

رسول اللہ خود جہاں تک ہو سکتا صحابہ کو اور خصوصاً نومسلموں کو قرآن کی تعلیم فرماتے تھے۔ چنانچہ عثمان بن ابی العاص ٥٦ بحرین کے نمائندوں اور عمرو بن عبد قیس کو سورۂ حمد اور اقرأ ٥٧ کی تعلیم فرمائی۔ سورۂ مریم کی شروع کی آیات جُبیرہ کو سکھائیں ٥٨ ابو رافع عدوی کو اس بات پر فخر تھا کہ اس نے سورۂ بقرہ خود رسول خدا سے سیکھی تھی۔ ابن مسعود ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ میں نے قرآن کی ستر سورتیں خود رسول اللہ کی زبان مبارک سے سیکھیں۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ صحابہ جو کچھ قرآن و سنت سے جانتے تھے وہ پیغمبر اکرمؐ ہی سے سیکھا تھا۔ بنیادی طور سے تو اسلام کا حقیقی مرجع اور دلیل خود ذات پیغمبر یعنی آپ کا قول و فعل ہے۔ یہاں ہم آپ کے تعلیم قرآن دینے اس کے اہتمام اور اسلام کی نسل اول کی تربیت کے چند نمونے بیان کر رہے ہیں۔ جب خود نہ پہنچ سکتے تو صحابہ سے فرماتے کہ وہ دوسروں کو تعلیم دیں ٥٩ مثال کے طور پر معدان کو ابان بن سعید بن عاص اور ابو ثعلبہ خشنی کو ابو عبیدہ بن جراح کے حوالے کیا تھا کہ خوب اچھی طرح تعلیم حاصل کریں ٦٠ بہت تاکید فرماتے کہ ہر شخص اپنے ہمسائے کو قرآن اور فقہ سکھائے۔ وہ لوگ جو اپنے پڑوسیوں کی طرف متوجہ ہوتے ان کی آپ تعریف کرتے تھے۔ اشعری قبیلے والے جو پڑھے لکھے افراد تھے ان کو ایک سال کا موقع فراہم کیا کہ اپنے عرب پڑوسیوں کو قرآن سکھائیں ٦١ اہل صُفّہ وہ لوگ تھے جن کا نہ گھر بار تھا اور نہ مال اسباب ٦٢ مسجد کے ایک کونے

---

٥٢ ابن سعد ۴،۲: ۹/۲۔

٥٣ غایۃ النہایہ ۱: ۴۳۹، اتقان ۱: ۵۷، مسند ثانی ۲: ۲، ابن سعد ۴: ۲/۹، احمد ۲: ۱۵۸، ۱۸۷ تا ۱۸۹ ... وہ کبھی دروازے بند کر کے گوشہ نشین رہتا اور دوسروں کو بھی رونے میں شرکت کے لیے بلاتا۔ حلیۃ ۱: ۲۹۰، احیاء العلوم ۱: ۲۷۵۔

٥٤ ترمذی ۱۱: ۲۵۔

٥٥ ابن سعد ۴/۲۶: ۵۸/۱، ۵۹۔

٥٦ ابن سعد ۵: ۳۷۲۔

٥٧ ایضاً ۵: ۴۰۷۔

٥٨ ایضاً ۵: ۴۱۱۔

٥٩ ایضاً ۴: ۱۶۸/۱، ۶۷، ۹۹/۲۔

٦٠ جیسے ابی بن کعب نے تعلیم دی کما فی ابن سعد ۵: ۳۷۲، ۲۰۷، سفینۃ البحار ۲: ۴۱۵، اصول کافی ۲: ۳۴۴۔ ۳۱۸۔

٦١ تراتیب الاداریہ ۱: ۴۰۲۔

٦٢ تراتیب الاداریہ ۱: ۴۱۔

٦٣ ابن سعد ۱: ۲/۱۳، مفتاح کنوز ۱/۳۶۶۔

Presented by Ziaraat.Com

عمل ملاحظہ فرمانے کے بعد ان صحابہ کے لیے چبوترے پر قیام تھا۔ مدینے کے لوگ ان کی مدد کرتے تھے۔ ان میں سے بعض جنگل سے جلانے کی لکڑی لاتے اور اس کو فروخت کرکے اپنی روزی کماتے تھے۔ رات ہوتی تو چبوترے پر آ کر قرآن کی تلاوت کرتے اور لوگوں کو سکھاتے تھے۔ قرآن پڑھتے اور شب بیداری کرتے۔ پیغمبر اکرمؐ ان کے پاس تشریف لاتے، ان کی تلاوت سنتے اور ان کی حوصلہ افزائی فرماتے۔ یہی لوگ تھے جن کو قراء کہا گیا اور بئر معونہ کے حادثے میں ان ہی میں سے اکثر لوگ مارے گئے۔ بعد میں اسلام میں ان کی بڑی قدر و منزلت ہوئی۔ پیغمبر اکرمؐ صرف ان کی قرائت اور تلفظ ہی صحیح کرنے میں کا دل لگاتے تھے بلکہ مطالب کے سمجھانے اور مشکلات کی وضاحت کرنے میں بھی آپ خاص توجہ فرماتے۔ جہاں ضرورت ہوتی شرح و بسط سے مطالب سمجھانے میں دریغ نہ فرماتے۔ جیسا کہ خداوند عالم نے حکم فرمایا تھا:

لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ (۱۶:۴۴)

جو لوگوں کے لیے نازل کیا گیا ہے آپ ان سے بیان کریں۔

(یا پھر آیت ۲ : ۱۵۲)۔ جیسا کہ زید بن ثابت نے کہا کہ جب آخرت کا ذکر آتا تو آپ اس کے معنی سمجھاتے اور جب دنیا کا ذکر آتا تو اس کے معنی بتاتے۔ جب ہم طعام اور کھانے کا ذکر کرتے تو آپ اس کے معنی بیان فرماتے۔ یہاں ان میں سے ہر ایک کا تم سے ذکر کرتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی تفسیر میں ذاتی رائے اور نظریات پیش کرنے کو سختی سے منع فرمایا تھا کہ جس نے بھی قرآن کی تفسیر اپنی رائے کے مطابق کی اگر وہ صحیح بھی ہو تو بھی اس نے خطا کی ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ قرآن کی آیات میں غور و تدبر کے لیے اس کی وضاحت اور بیان کی ضرورت ہے۔ ہمارے پاس قرآن کی تفسیر ان ہی وضاحتوں کے ذریعے موجود ہے۔ سارے اصول دین قرآن میں ہیں۔ پیغمبرؐ کا کام ان اصولوں کی توضیح اور بیان تھا۔ مثال کے طور پر نماز قرآن میں ہے مگر اس کی رکعتیں اور ان کے اوقات نہیں ہیں۔ زکوٰۃ کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں۔ حج، نکاح، طلاق اور تمام عبادات و معاملات اور فرائض کی توضیحات اور سارے فروع پیغمبر اکرمؐ سے حاصل کیے گئے ہیں۔ قرآن میں خداشناسی، نبوت، قیامت و معاد کی تفصیل، اخلاق کریمہ اور اخلاق رذیلہ کی شرح سب ہی پیغمبر گرامی کی زبان سے ہوئی ہے۔ قرآن میں محکم اور متشابہ آیات ہیں۔ ان متشابہات کو سوائے پیغمبرؐ کے اور کون سمجھا سکتا تھا۔

ایثار و قربانی کے تحت یہ ساری کاوشیں اور اہتمام جو تزکیۂ نفوس اور لوگوں کی تعلیم کا باعث بنا آخرکار اور رہا اور قرآن صحابہ کے دل و جان میں اترا۔ اور ان کے بعد بھی نسل در نسل یہ نفوس و عزیز جان بنا رہا جو مسلسل اگلی نسلوں کو سپرد کیا جاتا رہا۔

عربوں کا حافظہ

پیغمبرؐ کے وفا کیش صحابہ اسی راستے پر چلا کرتے جو آپؐ ان کے لیے منتخب فرماتے۔ ان میں سے اکثر امی اور بے پڑھے لکھے تھے۔ یہ قدرتی بات ہے کہ جو پڑھنا لکھنا نہیں جانتے وہ اپنے حافظے پر تکیہ کرتے ہیں۔ ہر بات اپنے حافظے کے سپرد کرتے ہیں اور اسی سے بہرہ حاصل کرتے ہیں۔ عربوں کو یہ بات حفظ کر لینے اور اس کو برسوں لفظ بہ لفظ یاد رکھنے کا وصف بدرجۂ کمال حاصل تھا۔ زمانۂ جاہلیت میں وہ اشعار

ابن سعد ۲/۱۱، ۱۳ و ۲/۱۱، ۳۶ - ۳۸ -

کتاب المصاحف۔ ابن ابی داؤد۔ ص ۴ -

Presented by Ziaraat.Com

قصائد اور اپنے قبیلوں کے شجرۂ نسب کو بڑی محبت سے اپنے حافظے میں محفوظ رکھتے۔ یہ ان کا مایۂ افتخار بھی تھا اور کبھی کبھی ان کی روزی کا ذریعہ بھی۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کا حافظہ نہایت قوی اور حیرت انگیز بھی تھا چنانچہ ان کا سینہ ان کی انجیل، اور ان کا ذہن نسب اور تاریخ کی کتاب، اور ان کا حافظہ شاعری کا دیوان اور ان کا افتخار شمار ہوتا تھا۔

اس کیفیت میں قرآن نازل ہوا اور اپنی طاقت بیان سے ان سب کو حیرت زدہ کر گیا۔ وہ اس کو سن کر حیران و ششدر رہ گئے اور پھر اس کے گرویدہ بن گئے۔ اس کے الفاظ اور معانی ان کے لیے ایک گرانبہا تحفہ تھے۔ یہ ان میں زندگی کی روح تلاش کرنے لگے غیر سے دل ہٹا لیا اور اس سے دل وابستہ کر لیا۔[1]

عرب کے لوگ قوت حافظہ اور ذہانت اور صفائی طبع میں بے مثال تھے۔ وہ جو کچھ بھی سن لیتے خواہ کتنا ہی طویل اور تفصیلی ہو اس کو کبھی نہیں بھولتے تھے۔ اس کی ایک مثال عبداللہ بن عباس کا وہ واقعہ ہے جب انہوں نے اسی بیت کا ایک قصیدہ ایک بار سنا اور یاد کر لیا تھا۔ پھر سالوں بعد جب مادی آسائشوں اور لذتوں نے عربوں کو تن پرور اور نازک طبع بنا دیا تھا بصرہ کے ایک شاعر اصمعی[2] کے بارے میں داستانیں مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کو ۱۶ ہزار ارجوزہ (رجز کی بحر میں قصیدے) یاد تھے۔ بیت بازی میں ہر آخر حرف پر ایک قصیدہ پڑھتا تھا[3] جو قصیدہ ایک بار سنتا وہ یاد کر لیتا۔[4] یہ تو شعر و شاعری یعنی تفنن طبع کے معاملات کے بارے میں واقعات ہیں۔ قرآن اور حدیث کے بارے میں اس سے زیادہ تعجب خیز واقعات کا ذکر موجود ہے۔ ابن عقدہ (م ۳۳۲ھ) تین لاکھ حدیثیں بیان کرتا تھا۔ ایک لاکھ حدیثیں متن اور سند کے ساتھ اس کے ذہن میں محفوظ تھیں۔[5] بخاری کا کہنا تھا کہ ایک لاکھ حدیثیں صحیح اور دو لاکھ حدیثیں غیر صحیح مجھے یاد ہیں۔ اس کا یہاں ذکر نہیں کر رہا کہ ایک حافظ حدیث کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کو پانچ لاکھ احادیث یاد تھیں۔ اور احادیث کا "حافظ" کہلانے کے لیے کم از کم بیس ہزار احادیث کا یاد رکھنا ضروری تھا۔[6]

ایسی بہت سی مثالیں ہیں۔ جب صدیوں بعد حافظے کا یہ حال تھا تو کہا جا سکتا ہے کہ شروع میں اور پیغمبر اکرمؐ کے حضور میں اس خلوص و اعتقاد و ایمان کے ساتھ ان لوگوں کا حافظہ کہیں بہتر ہوگا۔ اس کی سب سے بہتر مثال اور اس خصوصیت کی معراج خود پیغمبرؐ کی ذات گرامی تھی کہ آخر عمر تک آپ کو قرآن برابر حفظ تھا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی بھی چیز یاد نہ رہی ہو۔ یہی وجہ تھی کہ قرآن جمع کرنے کے پہلے مرحلے میں حافظہ پر تکیہ کیا گیا۔

علوم قرآن کے معروف محقق الجزری (م ۸۳۳ھ) کا کہنا ہے قرآن کے نقل کرنے میں قلب اور سینوں میں حفظ پر اعتماد ہے مصحف اور

---

[1] مناہل العرفان۔ زرقانی ۱؍۲۳۵۔
[2] عبدالملک بن قریب (م ۲۱۶) راویۂ عرب۔
[3] انباہ الرواۃ ۲؍۱۹۸، تاریخ الادب العربی۔ بروکلمن۔ ۱؍۴۶۷۔
[4] تفسیر نوین۔ شریعتی۔ ۱۲۔
[5] فہرست طوسی ۲۸، رجال نجاشی ۶۸، اعیان الشیعہ ۹؍۲۸۰م۔
[6] تدریب الراوی۔ ۶۔ ۸۔

Presented by Ziaraat.Com

کتابوں کی محتاج نہیں۔ یہ فضل خدا تعالیٰ کا اس امت پر گراں قدر کرم ہے۔[٧]

حدیث میں ہے کہ پیغمبر نے فرمایا: بیشک میرے پروردگار نے مجھ سے فرمایا: ہم نے تم پر ایسی کتاب نازل کی ہے جس کو پانی دھو نہیں سکتا۔ اس کو سوتے جاگتے پڑھا کرو۔[٨] اس طرح خدا نے خود کہا کہ قرآن اس طرح محفوظ ہے کہ وہ کسی کتاب کا محتاج نہیں جو پانی سے دھل جائے۔ بلکہ ہر حال میں وہ پڑھا جاتا ہے، جیسے کہ آپ کی امت کی تعریف میں آیا ہے کہ اناجیلھم صدورھم۔[٩]

صحابہ کی سعی اور کوشش

ان لکھے ہوئے حافظے کے علاوہ پیغمبر کے صحابہ کی بھی اس بارے میں کوشش اور کاوش بہت تھی۔ ان کی توجہ کا مرکز قرآن تھا اس کو سیکھنے اور یاد کرنے کی سعی کرتے۔ اس کے سمجھنے اور اس کی تعلیم میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ نکاح میں یہ مہر قرار پایا کہ شوہر قرآن کی ایک سورہ بیوی کو یاد کرا دے اور سکھا دے[١٠] چار پانچ سال کے بچوں کو قرآن کی تعلیم شروع کرا دیتے۔ کہتے ہیں کہ سفیان بن عیینہ نے چار سال کی عمر میں قرآن یا اس کا بڑا حصہ حفظ کر لیا تھا۔[١١] سلمہ الجرمی کا نوخیز لڑکا عمرو قرآن کا ایسا حافظ تھا کہ جماعت کی امامت عام طور سے اس کو کرنی پڑتی تھی۔[١٢]

یہ سب قرآن کی اپنی گہری جاذبیت کا نتیجہ تھا۔ یہ (رسالت کی تبلیغ اور وحی نازل ہونے کا) آغاز ہوا واقعہ جو ہو گیا تھا وہ ہر شخص کو اپنی طرف مائل کر رہا تھا اور اپنا گرویدہ کر رہا تھا۔ اسلام اور قرآن میں جو انسان کو اپنی طرف جذب کرنے کی قوت ہے وہ شروع سے اپنا اثر دکھا رہی تھی۔ جن کے لیے ممکن تھا وہ رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لاتے۔ مگر یہ جاذبیت دور دور تک کارفرما تھی۔ جن کے دل پاک و پاکیزہ تھے وہ دور ہی سے اس نورانی نقطے کی طرف کھنچے چلے آتے۔ اگر ہو سکتا تو پیغمبر اسلام کے پاس پہنچ کر بیعت کا ہاتھ بڑھاتے۔ اگر ممکن نہ ہوتا تو جہاں ہوتے وہاں ہی سے اسلام کو خوش آمدید کہتے اور اس پر اپنی جان و دل نچھاور کرتے۔ اگر ہو سکتا تو رسول اللہ اور آپ کے صحابہ سے اسلام سیکھتے، نہیں تو مسافروں اور کاروان والوں کی زبان سے قرآن سنتے۔ اس میں اس قدر کشش اور جاذبیت تھی کہ اسلام لانے سے پیشتر لوگ اس کی طرف مائل ہوتے تھے۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ ایک مثال تو اسی نوخیز لڑکے عمرو بن سلمہ الجرمی کی ہے۔ رسول اللہ کی خدمت میں آنے اور اسلام لانے سے پہلے جو لوگ اس کے قبیلے سے ہو کر گزرتے ان سے ظہور اسلام کے قصے سنتا اور ان سے آیات سیکھتا اور

---

٧ النشر فی القراءات العشر۔ ١:٦ ۔

٨ مسلم، جنۃ ٦٣، احمد ٤: ١٦٢ ۔

٩ النہایہ۔ ابن اثیر۔ ٥: ٢٣١ ۔

١٠ المعجم المفہرس۔ ٥: ٢٤٩ س ١، ح ٨، مفتاح کنوز ٣٩٩ س ٣، فضائل القرآن ابن کثیر ٤/ ٦٤۔ اس بارے میں یہ بحث ضرور ہوتی ہے کہ کیا یہ تعلیم بیوی کا مہر قرار پا سکتی ہے یا اس سے اجرت کا تعلق قائم ہوتا ہے کہ وہ اجرت مہر بن سکے۔ جو عام طور سے فقہ کے باب نکاح و اجارات میں بیان کیا جاتا ہے۔

١١ التراتیب الاداریہ۔ کتانی۔ ٢: ٢٩٧۔

١٢ کتانی۔ ٢: ٢٩٦ بہ نقل کشف الغمہ شعرانی، اصابہ۔ حافظ و صحیح بخاری۔ ابن سعد ٧: ١/ ٢٣ ۔

Presented by Ziaraat.Com

یاد کرلیتا۔[۵۴]

بالادار ہاشمی نوجوان مصعب بن عمیر (م ۳ ھ) کو جب پیغمبر ﷺ نے مدینہ میں بطور مبلغ بھیجا تو وہ ہر گھر جا کر قرآن سناتے تھے۔ انہوں نے قرآن کی کشش سے ہی لوگوں کو اسلام کی طرف بلایا اور اسلام کو سچے دل سے قبول کیا۔[۵۵] یہ نازوں میں پلا ہوا نوجوان تھا جو نفیس ترین لباس پہنتا تھا۔ اس کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا کہ اس سے بڑھ کر خوش پوشاک، خوش رو اور نازوں میں پلا ہوا مکہ شہر میں دوسرا نہیں تھا۔ اس شخص نے اپنی ماں اور رشتہ داروں کی نعمتوں اور زیادتیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے فقر و تنگدستی کی زندگی اختیار کر لی۔ اسلام کا ایسا شیدائی بنا کہ جنگ بدر و احد میں اسلام کے لشکر کا علمبردار تھا۔ اسی جنگ احد میں داد شجاعت دیتا ہوا شہید ہوا۔ اس کا پرچم حضرت علیؑ نے اٹھا لیا۔[۵۶]

نوجوان شاعر طفیل بن عمرو دوسی (م تقریباً ۱۲ ھ) اپنے قبیلے کے اشراف میں سے تھا۔ اس نے اپنے قبیلے اور اس کے سارے سلسلوں کو ٹھکرا دیا کیونکہ مکہ کے سرداروں سے کٹ کر رسول خدا ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ روزانہ آپ کی مجلس میں حاضر ہوتا اور قرآن پڑھتا تھا۔[۵۷] وہ سخن شناس تھا اور قرآن کو اپنے علاقے میں کاروان کے مسافروں کی زبانی سن چکا تھا۔ اس نے اس کو اسلام کا فریفتہ بنا دیا تھا۔[۵۸] زید بن ثابت انصاری ایسا نوجوان تھا کہ جب وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو قرآن کی ۱۷ سورتیں حفظ کر چکا تھا۔

یہ چند مثالیں ہیں پیغمبر کے صحابہ کلام الٰہی کا حقیقی احترام کرتے اور اس کی خاطر کسی قربانی سے دریغ نہ کرتے یہاں تک کہ اس کی تلاوت کے لیے موت سے بھی نہ رکتے۔ اس کی مثال وہ واقعہ ہے جو مؤرخین اور محدثین نے پیغمبر کی غزوۂ ذات الرقاع[۵۹] سے واپسی کے سلسلے میں بیان کیا ہے۔

اس غزوے میں ایک مسلمان نے ایک مشرک عورت کو جس کا شوہر موجود نہیں تھا گرفتار کر لیا تھا۔ جب رسول اللہ اپنے اصحاب کے ساتھ وہاں سے واپس ہوئے تو اس مشرک کو خبر ہوئی کہ اس کی بیوی جا چکی ہے۔ اس نے قسم کھائی کہ جب تک پیغمبر کے اصحاب کا خون نہیں بہا لوں گا خاموش نہیں بیٹھوں گا۔ وہ لشکر اسلام کے پیچھے روانہ ہوا۔ اس دوران رات ہو گئی تو پیغمبر اور آپ کے اصحاب نے ایک درے میں پڑاؤ ڈال دیا۔ مجاہدین کے لشکر کی نگہبانی کے لیے صحابہ میں سے دو نفر کو درے کے منہ پر مقرر کر دیا گیا۔ ایک مہاجرین میں سے

---

۵۴ ابن سعد۔ ۷: ۱/۶۳ و ۶۴۔

۵۵ ایضاً۔ ۳: ۱/۸۲۔ داستان اپنا بیوں جیسے۔

۵۶ ابن ہشام ۳: ۷۷ (۵۶۶ گوٹنگن)، ابن سعد ۳: ۱/۸۵، احمد ۵: ۱۰۹۔

۵۷ ابن سعد ۵: ۳۸۳، ابن ہشام ۲: ۵۸۱۔ ۵۸۳ ص۔

۵۸ طبقات۔ ابن سعد ۱: ۲/۶۳، اصابہ۔ ت ۲۹۸۲۔

۵۹ یہ ایک پہاڑ کا نام ہے جس کے پاس ۴ھ میں مسلمان بنی محارب اور بنی ثعلبہ غطفان قبیلہ والوں سے جنگ کے لیے جمع ہوئے۔ مگر جنگ نہیں ہوئی اور پیغمبر واپس تشریف لائے۔ طبقات ابن سعد ۲: ۱/۴۳ (۶۳)، مغازی واقدی ۱: ۳۹۵، ابن ہشام ۳: ۲۱۳ (۶۶۱ گ)، انساب الاشراف ۱: ۳۴۰، ابن سید الناس ۲: ۵۲، ابن کثیر ۴: ۸۳، زاد المعاد ۲: ۱۱۰، الامتاع ۱: ۱۸۸، المواہب ۱: ۱۰۶، تاریخ الخمیس ۱: ۴۶۴۔ بخاری مغازی ۳۱۔ ابن حزم: ۱۸۲، مسلم، جہاد۔ ح ۱۴۹، طبری ۱: ۱۴۵۳ (یا ۳: ۳۹ مصر)۔

Presented by Ziaraat.Com

عمارؓ بن یاسر اور انصار میں سے عبادؓ بن بشر۔

ان دونوں نے آپس میں طے کیا کہ آدھی رات تک عبادؓ انصاری پہرہ دیں گے اور آدھی رات سے صبح تک عمارؓ یاسر جاگیں گے چنانچہ عمارؓ یاسر جا کر لیٹ گئے اور عبادؓ انصاری عبادت میں رات بسر کرنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔

رات گئے ایک کافر مسلمانوں کی چھاپ لینے کی غرض سے کمین گاہ تک آپہنچا۔ اس نے دیکھا کہ ایک شخص کھڑا نماز پڑھ رہا ہے اور دوسرا قریب ہی سو رہا ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ لوگ پہرہ دے رہے ہیں۔ اس نے کمان اٹھائی اور تیر چلے پر کھینچا اور عباد کی حالت نماز میں نشانہ لیا اور تیر چلا دیا۔ وہ ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ عباد نے ہاتھ بڑھا کر تیر اپنے بدن سے نکال کر زمین پر پھینک دیا اور نماز کو جاری رکھا۔ اس کافر نے دوسرا تیر چلایا جو پھر نمازی کے آکر لگا۔ اس دفعہ پھر عباد نے تیر بدن سے نکال کر پھینک دیا اور پھر دل پکڑے ہو کر نماز پڑھنے لگا۔ تیسری بار پھر یہی ہوا۔ مگر عباد نے نماز نہیں توڑی۔ رکوع اور سجدہ کر کے نماز تمام کی۔ پھر اپنے ساتھی عمارؓ یاسر کو اٹھایا اور بتایا کہ میں زخمی ہو گیا ہوں۔ اٹھ جاؤ۔ عمار فوراً اٹھ بیٹھے۔ اس اعرابی نے جب دیکھا کہ ایک دوسرے آدمی کو بھی ہماری موجودگی کی خبر ہو گئی ہے تو بھاگ گیا۔ عمار کو یہ دیکھ کر بہت غصہ آیا۔ پوچھنے لگے کہ جب پہلا تیر آیا تھا تو تم نے مجھے کیوں نہیں نیند سے بیدار کر دیا تھا۔ عباد انصاری کہنے لگے کہ میں قرآن کی ایک سورہ پڑھ رہا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ نماز میں اس سورہ کو ادھورا چھوڑ دوں۔ وہ ختم کر کے رکوع میں گیا کہ تیر چلانا شروع ہو گئے۔ آخر کار نماز ختم کی۔ اور پھر تم کو اٹھایا۔ خدا کی قسم اگر اس کا اندیشہ نہ ہوتا کہ رسول اللہ کے فرمان اور اپنے لشکر کی پاسبانی کی خلاف ورزی ہوگی تو میری جان چلی جاتی مگر قرآن کے سورہ کو ادھورا نہ چھوڑتا۔[١٠]

اصحاب پیغمبر کی ایسی کیسی قربانیاں تاریخ میں درج نہیں ہیں۔ یہ تو سنا کھانا پینا اور ہر قسم کا آرام چھوڑ بیٹھے مگر رات کو قرآن پڑھتے اور اس کی صبح تک تلاوت نہ چھوڑتے۔ یہاں تک کہ نماز فجر کا وقت آجاتا۔ جو اصحاب پیغمبر کے گھروں کے قریب سے رات کی تاریکی میں گزرتا تو وہاں سے تلاوت قرآن کی آواز اس طرح آتی جیسے شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ[١١] یہ تو پہلے صفحات میں پڑھا ہے کہ خود پیغمبر اکرمؐ اپنے اصحاب کے گھروں کو وہاں سے آنے والی قرأت سے شناخت کرتے۔

اسامہ بن شریک کہتا ہے کہ جب ہم رسول اللہ کے پاس جاتے تو ان کے قریب بیٹھے ہوئے اصحاب کی کیفیت یہ ہوتی جیسے ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ ڈر رہے ہیں کہ اگر جنبش کی تو کہیں پرندے اڑ نہ جائیں[١٢]

همچنانکه گفت آن یارِ رسول — چون نبی بر خواندی بر ما فصول
آن رسولِ مجتبیٰ وقتِ نثار — خواستی از ما حضور و صد وقار
آنچنانکه بر سرت مرغی بود — کز فواتش جانِ تو لرزان شود
پس نیاری هیچ جنبیدن ز جا — تا نگیرد مرغِ خوبِ تو هوا[١٣]

---

١٠ ابن ہشام ٣: ٢١٨۔ ٢١٩، حیوۃ القلوب ٢: ٢٤٩۔

١١ واصواتهم بالليل كدوي النحل ، الغازی مقدمہ ٢۔

١٢ كأنما علينا الطير ، الغازی مقدمہ ٣، احمد ٤: ٢٧٨، نہایہ ابن الاثیر ٢: ٥١۔

١٣ مثنوی ٣: ٢٧، طبع نکلسن۔

Presented by Ziaraat.Com

اصحاب جب آیات الٰہی سنتے تو سجدے میں گر جاتے اور بہت گریہ کرتے۔ خداوند عالم فرماتا ہے:

یقیناً وہ لوگ جن کو اس سے پہلے علم دیا گیا ہے جس وقت ان کے سامنے (قرآن) پڑھا جاتا ہے، وہ منہ کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار پاک ہے، بیشک ہمارے پروردگار کا وعدہ پورا ہونا ہی تھا۔ اور ٹھوڑیوں کے بل گر پڑتے ہیں۔ روتے جاتے ہیں۔ (قرآن کا سننا) ان کے خشوع کو بڑھا دیتا ہے۔[۱۱۷] (۱۷: ۱۰۷-۱۰۹)

اسماء بنت ابوبکر کہتی ہیں کہ اصحاب رسولؐ جب قرآن سنتے، جیسا کہ خداوند تعالیٰ نے ان کی توصیف کی ہے، ان کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا جاتیں اور ان کی جلد لرزنے لگتی[۱۱۸] خداوند عالم نے خود فرمایا تھا:

تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ (۲۳:۳۹)

اس سے ان لوگوں کی جلد پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں۔ اور ان کی جلد اور ان کے دل اللہ کی یاد سے نرم ہو جاتے ہیں۔

یہ صحابہ کا حال تھا۔ خدا سے ڈرنے والوں کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔

قدرتی بات ہے کہ جب کوئی شخص نیا نیا مسلمان ہوتا تو شروع ہی میں قرآن یاد کر لیتا تا کہ واجب نماز پڑھ سکے۔ زکوٰۃ کے ادا کرنے اور روزہ، نماز، وضو کی پابندی کرنے اور حلال حرام کی پہچان کے لیے شرع کے احکام سیکھے اور یہ سب مل کر اس کے اسلام لانے کی علامات بن جائیں۔ اس طرح فکری اور اجتماعی تبدیلی حاصل ہو جائے گی اور نئی اقدار اس کی زندگی کا معیار اور مقیاس بن جائیں گی۔ چنانچہ قرآن اور فقہ کی تعلیم اول روز ہی سے ضروری ہو گئی تھی۔ مزید یہ کہ قرآن کی قرائت اور اس کے حفظ کرنے کا عظیم ثواب تھا اور اجر کی امید تھی۔ یہ وجوہات تھیں کہ اس زمانے میں اکثر مسلمان قرآن حفظ کر لیتے تھے۔

شروع میں رسول اللہ خود صحابہ اور نو مسلموں کو قرآن کی تعلیم فرماتے۔ جب معاشرۂ اسلامی نے وسعت پیدا کی تو پیغمبر اکرمؐ ہر ہر فرد کو ذاتی طور سے تعلیم و تربیت نہیں دے سکتے تھے۔ چنانچہ اس کام کو کچھ اور لوگوں کے بھی حوالے کیا جن میں سے بیشتر قرآن کے قاری ہوتے وہ کتاب خدا سے واقف تھے، حلال حرام کی شناخت رکھتے تھے اور احکام شرع جانتے تھے۔ اس زمانے کے برگزیدہ اور زاہدوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

اصحاب رسولؐ کی مختلف تعداد بیان کی گئی ہے۔ لوگوں نے یہ تعداد ۳۵۰۰ سے لے کر ایک لاکھ ۴۲ ہزار افراد تک بتائی ہے (جو قبیلہ کی تعداد ہے)[۱۱۹] بیشک اس کا انحصار "صحابی" کی تعریف پر ہی ہو گا کہ صحابی کس کو کہا جائے۔

---

۱۱۷ مجمع البیان طبرسی ۶: ۴۴۵، ابوالفتوح رازی ۶: ۳۶۷۔

۱۱۸ المرشد الوجیز۔ ۲۰۷۔

۱۱۹ کتانی۔ ۵۱۲-۴۔ کہا جاتا ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر پیغمبر اکرمؐ نے ۱/۲ ۴ لاکھ مسلمانوں سے خطاب کیا تھا۔ مگر شاید یہ قابل اطمینان اندازہ ہو کہ ایک لاکھ صحابی سے زیادہ نے پیغمبر اکرمؐ سے ایک یا ایک سے زیادہ روایت کی ہے۔ مقدمہ۔ ڈاکٹر حمید اللہ، فرانسیسی ترجمہ قرآن۔ ص ۱۲ تا ۱۱۔ بہ نقل اصابہ، ابن حجر، بخاری نے ابن ابی زرعہ سے روایت کی ہے۔ تقریباً ایک لاکھ ۱۴ ہزار افراد: اختصار علوم الحدیث۔ ابن کثیر ۲۲۴۔

Presented by Ziaraat.Com

رسول اللہ کی رحلت کے وقت مدینے میں مسلمانوں کی آبادی ۶۰ ہزار کہی گئی ہے جب کہ قبائلِ عرب کو تیس ہزار تک کہا ہے نجانے یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ کی قبرِ مبارک پر جو لوگ گروہ گروہ آتے گئے ان کی تعداد تیس ہزار تھی[۱۶]

بہر حال تعداد جو بھی ہو یہ کسی خاص طبقے سے تعلق نہیں رکھتے تھے ۔ ان میں مصعب اور فروہ جیسے مالدار اور خوشحال بھی تھے اور ابن مسعود اور ابن ام مکتوم جیسے مفلوک الحال لوگ بھی تھے جو اس نئے دین سے وابستہ ہوئے تھے ۔ یہ اس تحریک کے علمبردار بنے اور خلوص اور ایثار کی مثال قائم کرتے ہوئے پرچم اسلام کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے ۔

مگر اس کام کی ابتدا کہاں سے ہوئی ؟

قراءتِ قرآن کی تعلیم اور قرآن کے سیکھنے اور سکھانے سے ! چنانچہ اس زمانے میں قرآن کا قاری نئے دین کا روشن فکر معتقد اور اس سے لگن رکھنے والا شمار ہوتا تھا جس کو آنحضرتؐ لوگوں کی دعوت پر مامور کرتے ، وہ قرآن حفظ کرتا اور کتاب اور اصول دین کی تعلیم دیتا ۔ جس طرح نمازِ جماعت کی امامت اور بعض موقعوں پر فیصلے اور فتوے بھی اس کے ذمے ہوتے ۔ جنگ کے زمانے میں وہ لشکرِ اسلام کا پرچم اٹھاتا اور امن کے زمانے میں معلم و قاضی بنتا ۔ بعض قاری آنحضرتؐ کے ساتھ سارے غزوات میں شریک ہوتے تھے ۔ جیسے معاذ بن جبل[۱۷]، سعد بن عبید[۱۸]، عبداللہ بن مسعود[۱۹] اور عبادہ بن صامت[۲۰]

جنگ حنین (۸ ھ) میں مسلمان شکست سے دوچار ہونے والے تھے کہ قاریوں کی آواز بلند ہوئی :

" یا اصحاب سورۃ البقرہ و سورۃ آل عمران "

اس للکار نے مسلمانوں کو غیرت دلائی اور وہ شمشیر نکال کر مشرکوں پر پل پڑے اور ان کو شکستِ فاش دی[۲۱]

یہ تو جہاد کے دوران کی باتیں تھیں ۔ امن کے زمانے میں حافظانِ قرآن اور اصحابِ رسولؐ کا کام تعلیمِ قرآن اور قرآن کے حفظ کرنے کو زیادہ پختہ اور مستحکم کرنا تھا ۔ انصار صحابہ میں سے ایک بزرگ شخصیت عبادہ بن صامت کہتے ہیں ، " جب کوئی شخص (مدینے) ہجرت کرتا تو پیغمبر اکرمؐ اس کو ہم میں سے کسی کے پاس بھیجتے کہ قرآن سیکھے ۔ مسجد نبویؐ میں ہر وقت تلاوتِ قرآن کی صدا بلند رہتی یہاں تک کہ رسول اللہ نے حکم دیا کہ ذرا دھیمی آواز میں پڑھا کریں تاکہ غلطی نہ کر پائیں[۲۲] قاریانِ قرآن مسجدِ نبویؐ میں حلقہ باندھ کر بیٹھتے ۔ امی ہونے

---

[۱۷] کتانی ۔ ۲ : ۴۰۷ ۔

[۱۸] کتانی ۔ ۲ : ۴۰۷ ۔

[۱۹] ابن سعد ۔ ۳ : ۲/۲۱ و ۷ : ۲/۱۱۴ ۔

[۲۰] ایضاً ۳ : ۲/۳۰ ۔

[۲۱] ایضاً ۳ : ۱/۱۰۸ و تہذیب ۔ ابن حجر ۔ ۹ : ۲۷ ۔

[۲۲] ابن سعد ۔ ۳ : ۲/۹۴ و ۷ : ۲/۱۱۳ ، اصابہ ۲ : ۲۶۸ ۔

[۲۳] ابن ہشام ۔ ۴ : ۸۷ ، ابن سعد ۲ : ۱/۱۰۸ ، ۱۱۳ ، مقدمتان ۔ ۲۷ ۔

[۲۴] مناہل العرفان ۔ ۱ : ۲۳۴ ۔

Presented by Ziaraat.Com

کی بنا پر حافظے سے ایک دوسرے کو قرآن سناتے اور اسی طریقے سے ایک دوسرے کی قرائت کی تصحیح بھی کرتے جاتے تھے[۲۵]

سید شریف مرتضیٰ کہتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں لوگ قرآن کا درس لیتے اور اس کو حفظ کرتے۔ بعض صحابہ مثلاً عبداللہ بن مسعود اور ابی بن کعب نے کئی بار قرآن پیغمبرؐ کے سامنے ختم کیا۔

شیخ الطائفہ طوسی، شیخ امامیہ، فقیہ اور محدث بزرگ اپنی کتاب امالی میں فرماتے ہیں: ابن مسعود نے ستر سورہ نبی اکرمؐ سے اور باقی حضرت علیؑ ابن ابی طالب سے سیکھے تھے[۲۶]

بعض اصحاب پیغمبر بہت محنت و مشقت کر کے ساری آیات حفظ کر لیتے۔ جو ساری آیات حفظ نہ کر پاتے وہ کچھ سورتیں حفظ کر لیتے اور اسی پر سرور حاصل کرتے۔ قابل غور امر یہ ہے کہ حفظ قرآن کا یہاں تک اہتمام تھا کہ چونکہ ہر شخص سارا قرآن حفظ نہیں کر سکتا تھا اس لیے اصحاب پر حفظ قرآن کو تقسیم کر دیا جاتا۔ ہر شخص کچھ سورتوں اور آیات کو حفظ کرتا[۲۷] جب یہ لوگ یکجا ہوتے تو سب مل کر مکمل قرآن اپنے حافظے سے سناتے۔

حفظ کرنے کا طریقہ نزولِ آیات کے مطابق تھا، جس کی تفصیل پچھلے ابواب میں آ چکی۔ یعنی جس طرح ۵ یا ۶ آیات نازل ہوتیں صحابہ بھی بتدریج قرآن کو حفظ کرتے۔ ابو عبدالرحمٰن سلمی روایت کرتے ہیں جو لوگ قرآن پڑھا کرتے مثلاً عثمان، ابی اور عبداللہ ابن مسعود ان کا کہنا ہے کہ جب ہم پیغمبرؐ سے دس آیات سیکھتے جب تک ان کو اچھی طرح حفظ نہ کر لیتے اور اس کے مفہوم پر عمل نہیں کر لیتے اگلی آیات نہیں سیکھتے تھے[۲۸]

بیشک حفظ قرآن کچھ آسان کام نہیں تھا۔ ان لوگوں میں سے زیادہ تر پڑھے لکھے نہیں تھے کہ وہ کتاب سے رجوع کرتے۔ وہ صرف سننے اور بار بار پڑھتے رہنے ہی سے حفظ کر سکتے تھے۔ لہٰذا ضروری تھا کہ ہر آیت کو اچھی طرح سمجھ لیں، اپنی غلطیوں کو دور کر لیں اور خوب سمجھ کر ان آیات کو ایک دوسرے سے سن کر یاد کریں۔ یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ مختلف قبیلوں اور خطوں کے لوگ تھے۔ ان کے تلفظ میں ایک دوسرے سے فرق تھا۔ بعض اوقات الفاظ کا صحیح تلفظ ان کے بس میں نہیں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک جنگل بیابان کا اجڈ اعرابی "اثیم" کا لفظ نہیں کہہ پاتا تھا اور "طعام الاثیم" (۴۴: ۴۴) کی جگہ "طعام الیتیم" کہتا۔ ابن مسعود نے کتنا چاہا کہ وہ صحیح تلفظ کرے مگر وہ بیچارا مجبور تھا، "اثیم" نہ کہہ پایا۔ ابن مسعود نے پوچھا "طعام الفاجر" تو کہہ سکتے ہو؟ کہنے لگا ہاں۔ ابن مسعود عاجز آ کر کہنے لگے کہ اچھا تو یہی کہو۔

یہی وجہ ہے کہ ایک بڑی سورۃ جیسے سورۃ بقرہ جس کی ۲۸۶ بڑی بڑی آیات ہیں جب تدبر و فہم کے ساتھ یاد کی جاتی تو سالوں لگ جاتے۔ چنانچہ تعجب نہیں ہونا چاہیے جب ہم یہ پڑھیں کہ حضرت عمرؓ نے سورۂ بقرہ سیکھنے میں ۱۲ سال لگائے اور جب اس سورہ کو مکمل کیا تو ایک

---

۲۵ فتوح مصر۔ ابن عبدالحکم ۲۷۲، حدیث میں آیا ہے "یتلون کتاب اللہ و یتدارسونہ بینہم" صحیح مسلم: ذکر ۳۸، ابو داؤد: وتر ۱۴، ترمذی: قرآن ۱۰، ابن ماجہ: مقدمہ ۱۷، الدارمی: مقدمہ ۳۲۔

۲۶ ترجمہ تاریخ قرآن۔ زنجانی ۳۶۔

۲۷ کتانی۔ ۲: ۲۹۲۔

۲۸ ایضاً ۲: ۲۷۹۔ التفسیر والمفسرون ۱: ۵۰۔ نقل از اصول التفسیر ابن تیمیہ: ۵ و ۶، اتقان ۴: ۴۲ جزء ۲ نوع ۷۸۔ بحار الانوار ۱۹: ۲۸ قدیم۔ تفسیر قرطبی ۱: ۳۹۔

Presented by Ziaraat.Com

اونٹ ذبح کیا[29] ان کے لڑکے عبداللہ نے چار یا آٹھ سال کی مدت میں سورۂ بقرہ حفظ کیا تھا[30]
یہی وجہ ہے کہ مالک بن انس کہتے تھے کہ جو سورۂ بقرہ اور آل عمران کو حفظ کر لیتا وہ ہم لوگوں کی نظر میں جدا سمجھا جاتا[31]

ربع قرآن ہر کہ را محفوظ بود ٭ جَلَّ فینا ٭ از صحابہ می شنود[32]

عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ ہم لوگوں نے قرآن کو بہت محنت کر کے سیکھا مگر اس پر عمل با آسانی کیا۔ جب کہ ہمارے اخلاف (آنے والے لوگ) قرآن با آسانی سیکھ لیں گے مگر اس پر مشکل سے عمل کریں گے[33]

ان ساری مشکلات اور تکالیف کے ساتھ ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق قرآن حفظ کرتا۔ ابھی آنحضرتؐ کو مدینہ ہجرت کیے ہوئے زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ قاریان قرآن پروانہ وار آپ کے گرد جمع ہو گئے اور لفظ بہ لفظ اور حرف بہ حرف قرآن آپ کے لب مبارک سے سننے اور حفظ کرنے لگے۔ ان لوگوں نے مسجد نبوی اور اپنے گھروں کے علاوہ قرآن سیکھنے سکھانے کے لیے ایک اور ٹھکانہ حاصل کر لیا۔

مخرمہ بن نوفل (م ۵۴ھ) اسلام کے مخالف قریش میں سے تھا۔ مگر اس کی ماں رقیقہ پختہ اعتقاد مسلمان تھی۔ یہ وہی عورت ہے جس نے رسول اللہ کو قریش کی آپ کے قتل کی سازش سے آگاہ کیا تھا اور آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ کو اپنی جگہ اپنے بستر پر سلایا تھا[34] رقیقہ نے اپنے لڑکے پر بڑی سختیاں کیں کہ شاید اسلام لے آئے مگر اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اس مخرمہ کا مدینہ میں بھی ایک گھر تھا۔ شروع میں قرآن کے قاری اہل صفہ کے ساتھ مسجد نبوی میں بیٹھا کرتے۔ یہ سلسلہ کچھ مدت تک جاری رہا[35] مگر جب ان کی تعداد بڑھی تو کسی دوسری وسیع جگہ کی تلاش شروع ہوئی۔ آخرکار مخرمہ کے گھر کا انتخاب ہوا۔ اس سے کچھ پیشتر اس گھر میں رہائش ہو چکی تھی۔ مکہ سے نکلنے کے بعد مدینہ آ کر کچھ دنوں کے لیے ابن ام مکتوم اس گھر میں آ کر رہے تھے[36] آہستہ آہستہ یہ بیٹھک مستقل ہو گئی۔ چنانچہ اس کا نام "دار القراء" یا قاریوں کا گھر پڑ گیا۔ خود مخرمہ عام الفتح یعنی فتح مکہ کے دن اسلام لایا[37]

اصحاب رسولؐ کی یہ کاوشیں تھیں حفظ قرآن کے سلسلے میں۔ مگر تنہا حفظ قرآن ہی ان کا کام نہیں تھا۔ وہ حد درجہ اس کام میں درستگی اور صحت کے لیے احتیاط برتتے تھے۔ جس وقت قرأت میں ذرا سا بھی اختلاف نظر آتا تو اس وقت تک چین سے نہ بیٹھتے جب تک

---

۲۹ کافی۔ ۲: ۲۸۰۔
۳۰ موطا۔ مالک، القرآن، ح ۱۱، ابن سعد ۴: ۱/۱۲۱، الاتقان ۲: ۲۰۲۔ نوح ۸۷۔
۳۱ الاتقان ۱: ۲۲۹، نوح ۹ و دم ۲: ۲۴۲، نوح ۸، ۱۲۷، احمد ۳: ۱۲۰، ۱۳۰، نہایہ۔ ابن اثیر ۱: ۱۴۷، خیبر نامہ: ۲۹۶۔
۳۲ مثنوی۔ ۲: ۷۸، نکلسن
۳۳ الجامع لاحکام القرآن۔ قرطبی: مقدمہ۔
۳۴ ابن سعد ۸: ۲۵۱، ۱۶۲۔
۳۵ ایضاً ۱: ۲/۲۱۳ و ۲: ۱/۳۸
۳۶ ایضاً ۴: ۱/۱۵۰۔
۳۷ نسب قریش۔ ۲۶۳۔

Presented by Ziaraat.Com

اس کی اصلاح نہ ہو جاتی۔ جیسا کہ عبداللہ ابن مسعود اور اُبی بن کعب کیا کرتے۔ یا سورۂ فرقان میں حضرت عمرؓ بن خطاب اور ہشام بن حکیم کے درمیان قرائت پر اختلاف ہو گیا تھا، حالانکہ دونوں ہی قریشی اور مکی تھے [۴۸] (اس کی تفصیل قرائتِ قرآن کے باب میں دیکھیں) پیغمبرِ خدا موجود تھے اور باآسانی آپ سے رجوع کیا جا سکتا تھا کہ ان کی مشکل حل کر لی جائے۔

قرائت کی صحت میں یہ دقت صرف آنحضرتؐ کے زمانے ہی مخصوص نہیں تھی بلکہ یہ بعد کی نسلوں کی مشکلات کا سبب بنی۔ بعد میں بھی یہ دقت اور باریک بینی موجود رہی۔ اس کی مثال ایک واؤ کی قرائت میں اختلاف کا ظہور پذیر ہونا ہے۔ ابوعبید فضائل میں نقل کرتے ہیں کہ عمرؓ بن خطاب سورۂ توبہ کی آیت ۱۰۰ کو اس طرح پڑھتے:

وَالسَّابِقُونَ الْاَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ

مہاجرین میں سے (ایمان لانے میں) سب سے پہلے سبقت کرنے والے اور انصار جنہوں نے نیکی میں ان کا اتباع کیا۔

زید بن ثابت وہاں موجود تھے۔ انہوں نے اعتراض کیا اور کہا:

"وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ"

صحیح ہے یعنی مہاجرین اور انصار میں سے (ایمان لانے میں) سب سے پہلے سبقت کرنے والے اور وہ لوگ جنہوں نے نیکی میں ان کا اتباع کیا۔

گویا "الذین" سے پہلے "واؤ" ہے اور "انصار" "الذین" کے ساتھ نہیں پڑھا جائے گا۔ حضرت عمرؓ نے زیدؓ بن ثابت کی بات قبول نہیں کی۔ انہوں نے اُبی بن کعب کو بلا بھیجا کہ وہ فیصلہ کریں۔ پیغمبرؐ نے صحابہ سے کہا تھا کہ یہ تمہارے "اقرء" ہیں۔ انہوں نے بھی زید کی بات کی حمایت کی۔ نتیجتاً گرما گرم بحث چھڑ گئی۔ ہر شخص ایک دوسرے پر آواز بلند کر رہا تھا اور دوسرے کی نہیں سن رہا تھا۔ آخر میں اُبی بن کعب کہنے لگے کہ خدا کی قسم کہ پیغمبرؐ نے مجھے یہی سکھایا جب تم اس زمانے میں گندم فروخت کیا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ ہاں اور اُبی کی قرائت کو مان لیا [۴۹]

قرائت کی صحت میں یہ کاوش قرآن کی آیات میں تدبر و تفکر کا ایک حصہ تھی۔ خداوند تعالیٰ بار بار تدبر و تفکر کی دعوت دیتا ہے۔ یوں غور و خوض کرنے کے بارے میں احادیث بھی بہت ہیں۔ علامہ مجلسی علیہ الرحمہ (م ۱۱۱۱ھ) نے اپنی کتاب بحار الانوار کی جلد ۹۲ میں ایسی بہت سی اہم حدیثیں جمع کی ہیں۔

قرآن حیاتِ انسانی کے لائحہ عمل کی کتاب ہے۔ آخرت کے راستے پر گامزن رہنے کے لیے اس کے نور سے روشنی حاصل کرنی چاہیے اور یہ صرف اس میں غور و فکر کرنے کے بعد ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ عقل بھی اس کی گواہی دیتی ہے۔ آیات اور احادیث بھی اس حقیقت کو اجاگر کرتی ہیں۔

کافی میں زہری سے روایت ہے کہ امام سجادؑ نے فرمایا، آیاتِ قرآن ایک خزانہ ہیں۔ جب بھی خزانے کو کھولو تو اس کو دیکھو بھالو

[۴۸] ابوشامہ ۱۲۹، فضائل القرآن۔ ابن کثیر۔ ۳۶۔

[۴۹] مقدمہ تفسیر آلاء الرحمن۔ بلاغی۔ نقل از مقدمہ تفسیر شبر ص ۱۲ ج ۲۔

[۵۰] اصول کافی۔ کتاب فضل القرآن۔

Presented by Ziaraat.Com

اور پھر؟

قرآن کے حافظ

اس سلسلے میں گفتگو ہو چکی کہ قرآن کے حفاظ اور اس کے جمع کرنے والے یعنی وہ سارے لوگ جو رسول اللہ کے زمانے میں سارا قرآن حفظ کر چکے تھے، کون کون اصحاب تھے، ان کی تعداد کیا تھی اور ان میں سے ہر ایک کتنا قرآن جانتا تھا۔

اگر ہم چاہیں کہ فرانسیسی مستشرق بلاشر کی طرح حافظانِ قرآن کی تعداد صرف عام روایات سے مثلاً جو بخاری نے اپنی صحیح میں نقل کی ہیں[1]، دو نظر میں رکھیں تو رسول اللہ کے زمانے میں حافظوں کی تعداد صرف سات آدمی بنتی ہے ــــ ابن مسعود، سالم، معاذ بن جبل، اُبی بن کعب، زید بن ثابت، ابو زید اور ابو الدرداء۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ حتمی طور سے کہہ دیا جائے کہ احادیث سات افراد سے زیادہ کا ذکر نہیں کرتیں۔[2] بلاشر نے صحیح بخاری کے علاوہ صرف ایک حدیث سے استناد کیا ہوتا تو وہ دعویٰ کر سکتا تھا کہ حدیث چار حفاظ سے زیادہ کا ذکر نہیں کرتی۔ اس کی شیطنت کا عالم یہ ہے کہ زید کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ سورۂ توبہ کی آخری دو آیات نہیں جانتا تھا۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ زید ان دو آیات کو بھی جانتا تھا اور اس کو علم اور یقین بھی تھا۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے وہ آیات کی سند اور ان کے نزول کا شاہد بھی تھا۔ علاوہ ازیں اگر بلاشر اپنی محبوب ترین کتاب یعنی نولڈکے[3] کی تاریخ قرآن کی طرف رجوع کرتا تو مندرجہ ذیل حفاظِ قرآن کا بھی ان سات نفر پر اضافہ کرتا۔

علی ابن ابی طالب[4]، عثمان[5]، تمیم الداری[6]، عبادہ بن صامت[7]، ابو ایوب[8]، سعد بن عبید[9]، مجمع بن جاریہ[10]، عبید بن معاویہ[11]، جس کی شناخت نہیں ہو سکی۔[12]

ٹه البیان۔ امام خوئی: ۲۴۹۔

[1] بخاری، فضائل القرآن ۸، صرف تین حدیث میں ذکر ہوا ہے۔

[2] بلاشر: در آستانۂ قرآن، یادداشت ۲۶ — 2. BLACHERE; INTR AU CORAN, NO. 26

[3] 3. T. NOLDEKE; GESCHICHTE DE QORANS, SCHWALLY; S. 7, N. 1.

[4] نولڈکے، از فہرست ط۔ خوگل ۲۷۔

[5] ابن سعد ۲: ۲/۱۱۳ س ۲۴ و ۲۶۔

[6] ایضاً ۲: ۲/۱۱۳ س ۱۲ و ۲۴۔

[7] ایضاً ۲: ۲/۱۱۳ س ۲۰ و س ۱۱۴ س ۲۔

[8] ایضاً ۲: ۲/۱۱۴ س ۲۔

[9] ایضاً ۲: ۲/۱۱۳ س ۲، فہرست خوگل ۲۷۔

[10] در آستانۂ قرآن۔ یادداشت ۲۰ نقل از اسابا ابن حجر ۳: ۸۱ شمارہ ۷۰۲۱۔

[11] ابن سعد ۲: ۲/۱۱۲ س ۲۲، اتقان ۱۴۹ س ۱۳ (نقل از نولڈکے)۔

[12] فہرست خوگل ۲۷۔

Presented by Ziaraat.Com

یہ بات ملتی ہے کہ عہدِ نبوی میں حافظانِ قرآن کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی اس لیے کہ اتنی کم تعداد ہر ماحول کے خلاف ہے۔[13] ان لوگوں نے پیغمبر کے اتنے اہتمام اور حوصلہ افزائی کے بعد ذوق و شوق سے جزئی یا کلی طور پر قرآن کو حفظ کیا تھا۔ اگر ان میں سے کوئی شخص مثلاً مجمع بن جاریہ (م تقریباً ۵۰ھ) رسولِ خدا کے زمانے میں قرآن کی ایک دو سورہ سے ناواقف رہا تو یقینی بات ہے کہ پیغمبرِ اکرمؐ کے بعد اس کو مکمل کر لیا ہوگا۔[14] یہ بھی ممکن ہے کہ اتنے لوگوں میں ایک دو افراد ایسے بھی ہوں جن میں یہ کمی رہ گئی ہو۔[15]

یہاں مشکل یہ ہے کہ روایات میں قرآن جمع کرنے والے صحابہ کی مکمل فہرست نہیں دی گئی ہے۔ رسول اللہ کے زمانے میں قرآن جمع کرنے کا جن احادیث میں ذکر ہے ان میں سے ہر حدیث ۴ یا ۵ یا ۶ افراد کا ذکر کرتی ہے[16] اور مکمل صورتحال نہیں تھی۔

جو روایات موجود ہیں ان میں دو قسم کے حافظانِ قرآن کا ذکر ہے۔ ایک وہ جنہوں نے سارا قرآن کم و بیش حفظ کیا ہوا تھا۔ دوسرے وہ جو حفظ کرنے کے علاوہ پیغمبرِ اکرم کی طرف سے قرآن کی تعلیم و تدریس پر مامور تھے۔

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا: قرآن کو چار آدمیوں سے سیکھو۔ عبداللہ ابن مسعود، ابن حذیفہ کے غلام سالم، معاذ بن جبل اور ابی بن کعب سے[17]۔ اس روایت میں تعداد پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہے۔ کتاب کے معلمین کی تعداد صرف ان چار افراد تک محدود نہیں ہوتی ہے۔ دوسرے اصحاب جیسے اہلِ صفہ، حضرت علی ابن ابی طالب، مصعب ابن عمیر، عتاب بن اسید، عمرو بن حزم، خالد بن سعید، رافع بن مالک، اسید بن حضیر، خباب قرشی اور ان کے علاوہ دوسرے نام جو عہدِ نبوی ہی میں حافظانِ قرآن مشہور ہوئے، ان کا بھی ذکر روایات میں ملتا ہے۔ یہ بات اس حدیث کے برخلاف نہیں پڑتی۔

ممکن ہے اس حدیث سے مراد یہ ہو کہ مدینے میں صحابہ میں سے یہ چار افراد (۲ مہاجروں میں سے اور ۲ انصار میں سے) قرآن کی تعلیم پر مامور کیے گئے ہوں۔

اصل مشکل اس روایت سے پیدا ہوتی ہے جو بخاری نے رسول اللہ کے خادم انس بن مالک سے نقل کی ہے۔ وہ صاف الفاظ میں اور (تعداد) محدود کر کے کہتا ہے: پیغمبرؐ رحلت فرما گئے اور اس وقت قرآن کو صرف چار افراد نے جمع کیا تھا ـــ ابی بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت

---

۱۳ المرشد الوجیز ۳۸۔

۱۴ ابن سعد ۲۱۴/۸۶ س ۱۸، المرشد ۳۸۔

۱۵ چنانکہ گفتہ اند ابن مسعود نیز سورہ ہائی را کہ نمی دانستہ بعداً از مجمع آموخت (ابن سعد ۲: ۲/۱۱۲)۔

۱۶ شرح الطریقۃ المحمدیۃ نابلسی ۱: ۲۵۲۔

۱۷ بخاری: مناقب الانصار ۱۴، مسلم: فضائل الصحابہ ح ۱۱۹ و ۱۲۰، ترمذی: مناقب ۳۲، ابن سعد ۲: ۲/۱۱۲-۱۱۴، احمد ۲: ۲۲۳، ۲۲۷، طیالسی ح ۲۰۱۸، نشر ۱: ۶، ابن عساکر ۵: ۴۴۵۔

۱۸ اتقان ۱: ۲۴۴ نوع ۲۰، الجامع الصغیر ۱: ۲۹ ح ۳۸۸۹، قرطبی ۱: ۵۸، مقدمتان ۹۵، قسطلانی ۱۰: ۲۸، کتاب الاحکام شمارہ ۔، النووی ۲: ۲۷، المرشد ۳۶، ایضاً دیکھیں بخاری: فضائل اصحاب ۲۶ و ۲۷، مناقب الانصار ۱۴، ۱۷، فضائل القرآن ۸، مسلم: فضائل الصحابہ ح ۱۱۹-۱۱۸، ابن سعد ۲: ۲/۱۱۱-۱۱۲، احمد ۳: ۱۹۲، ۱۸۹، ۱۹۵، ۱۹۶، طیالسی ح ۲۲۴۵، ۲۲۴۶۔ CAETANI, ANNALI, 11, 711.

Presented by Ziaraat.Com

اور ابوزید۔ یہ چاروں انصار تھے

ان روایات نے کئی مشکلیں پیدا کر دی ہیں۔ مثال کے طور پر:

۱۔ دوسرے نسخے میں انس سے ابی بن کعب کی جگہ "ابوالدرداء" کا نام موجود ہے[۱۹]

۲۔ یہ ابوزید کون ہے جو قرآن کے ان محدود معلمین میں سے رسول اللہ کے زمانے میں موجود تھا؟ یہ سوال اول روز سے جواب طلب ہے قتادہ نے خود انس سے دریافت کیا کہ یہ ابوزید کون ہے۔ اس نے جواب دیا کہ ہم میں سے ایک (اعمومتی)[۲۰] بعد میں جب قتادہ سے پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ انس کے لوگوں میں سے ایک[۲۱] چنانچہ اس ابوزید کو خود انس کی طرح انصاری اور خزرجی ہونا چاہیے کیونکہ انس اس کو اپنوں میں سے ایک کہتا ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ ابوزید وہی سعد بن عبید ہے[۲۲] بیشک سعد انصار میں سے تھا مگر قبیلہ اوس سے تھا قبیلہ خزرج سے نہیں[۲۳] علاوہ ازیں شعبی (م ۱۰۴ھ) ایک روایت میں انصار میں سے چھ افراد کا نام جامع قرآن کے طور پر ذکر کرتا ہے جن میں ابوزید اور سعد کا بھی نام موجود ہے[۲۴] چنانچہ یہ دو جدا جدا آدمی ہیں۔

پھر سیوطی (م ۹۱۱ھ) کہتا ہے کہ ابن ابی داؤد (م ۳۱۶ھ) ایک روایت نقل کرتا ہے جس سے یہ مشکل حل ہو جاتی ہے۔ اس روایت میں انس وضاحت کرتا ہے "یہ ابوزید دراصل قیس بن السکن (م ۱۵ھ) ہے۔ یہ ہمارے گروہ کا ایک فرد تھا جو رسول اللہ کی رحلت کے کچھ عرصے بعد وفات پا گیا اپنے پیچھے کسی کو نہیں چھوڑا۔ ہم ہی لوگ اس کے وارث تھے"[۲۵] اس روایت سے کچھ لوگوں کا اندازہ ہے کہ وہ انس بن مالک کا چچا تھا[۲۶] چوتھی پشت میں جا کر دونوں مل جاتے ہیں۔

۳۔ یہاں بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ انس بن مالک نے یہ کیوں کہا کہ صرف چار آدمیوں نے قرآن کو جمع کیا تھا اور یہ چار بھی سارے انصار تھے۔ جب کہ مہاجروں اور انصار میں قرآن جمع کرنے والے، حتیٰ کہ اوس قبیلے میں بھی اس تعداد سے کہیں زیادہ تھے۔ جیسا کہ روایات میں کہی ہے

۱۹۔ بخاری، فضائل القرآن ۸، احمد ۳: ۲۳۳، ۲۷۷، طیالسی ۱۸: ۲۰۱، ابن عساکر ۵: ۴۵۱، فضائل القرآن ابن کثیر ۴۶۔

۲۰۔ اتقان ۱: ۴۵ نوع ۲۰۔

۲۱۔ اتقان ۱: ۲۴۵، احمد ۳: ۲۷۷۔

۲۲۔ ابن سعد ۲/۲: ۱۱۳ س ۸۔

۲۳۔ الجامع الاحکام القرآن۔ قرطبی ۱: ۵۷، ابن نمیر کا بھی یہی خیال تھا۔ فضائل القرآن۔ ابن کثیر ۴۶۔

۲۴۔ المحبّر۔ ۲۷۷، ۲۸۶۔

۲۵۔ الانساب ۴۸، المحبر ابن حبیب ۲۸۶۔

۲۶۔ اتقان ۱: ۲۴۹۔ ۲۵۰۔ واقدی اس کو قیس بن السکن بن قیس بن زعوراء کہتا ہے۔ فضائل القرآن۔ ابن کثیر ۴۶۔ ابو داؤد بھی شیخین کی شرائط کے مطابق اس کی تائید کرتا ہے۔ (مناہل العرفان ۱: ۲۲۶)؛ جمہرۃ الانساب۔ ابن حزم ۳۵۱۔ حقیقت میں دونوں بنو عدی بن النجار سے ہیں۔ اور چوتھی پشت میں یعنی حرام بن جندب میں مشترک ہو جاتے ہیں۔ جمہرۃ الانساب۔ ابن حزم ۳۵۱۔

۲۷۔ ماتریال جفری۔ ۲۱۵۔

Presented by Ziaraat.Com

"ابی بن کعب، اور کبھی ابالدرداء" آیا ہے۔ مگر تعداد چار سے زیادہ نہیں بڑھنے دی گئی ہے۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ انس بن مالک خود قرآن جمع کرنے والوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کا مصحف بھی تھا۔ مگر وہ اپنے آپ کو اس فہرست میں نہیں گنتا اور دوسرے چار آدمیوں کی بات کرتا ہے۔

مگر بہت سی روایات ہیں جو اس کی تردید کرتی ہیں۔ ایک تو وہی جو اوپر نقل کی گئی یعنی آنحضرتؐ نے فرمایا کہ قرآن کو چار آدمیوں سے سیکھو۔ ابن مسعود اور سالم جو مہاجروں میں سے اور معاذ اور ابی بن کعب انصار میں سے۔ یہ لوگ خود حافظ اور جامعِ قرآن تھے۔ بہت سی روایات اس کی تائید کرتی ہیں۔

پھر ہم لوگوں نے دیکھا کہ عبداللہ بن عمرو نے کہا کہ میں نے قرآن جمع کیا جس کو ہر رات پڑھا کرتا تھا۔ جب آنحضرتؐ کو خبر ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ ایک مہینے میں ایک بار پڑھا کرو۔۔۔

یا پھر محمد بن کعب قرظی انصار کے پانچ آدمیوں کا نام لیتا تھا اور شعبی نے ۶ آدمیوں کا ذکر کیا ہے۔۔۔۔

چنانچہ یہ سوال لازماً پیدا ہوتا ہے کہ انس بن مالک نے صرف چار آدمیوں کو کیوں گنا کہ انھوں نے قرآن جمع کیا تھا؟ بہت سے لوگوں نے انس کے اس قول کی اپنے اپنے طور سے توجیہ کی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ جمع کرنے سے انس کی مراد کتابت سے تھی اور حفظ کرنا مطلب نہیں تھا دوسرے کہتے ہیں، جمع کرنے سے مراد خود آنحضرتؐ سے آمنے سامنے حاصل کرنا ہے۔ یا پھر ایک کے بعد ایک جمع کرنا ہے یہاں تک کہ وحی کا نزول مکمل ہو گیا۔ یعنی یہ لوگ بظاہر ہر سال اور ہر موقع پر اس وقت تک جو کچھ نازل ہوا تھا حفظ کر لیتے تھے۔

امام ابوبکر باقلانی (م ۴۰۳ھ) اپنی کتاب "الانتصار" میں اس حدیث سے ابہام دور کرنے کے لیے آٹھ جواب دیتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کے جواب سے تسلی نہیں ہوتی۔ ان کو ابن حجر (م ۸۵۲ھ) بھی قبول نہیں کرتا[۳۸]۔ خطیب کی مانند کی (م ۴۳۶ھ) کے بقول انس کو کہاں سے ایسی وسیع معلومات ہو گئیں کہ وہ سارے صحابہ جو مختلف شہروں اور علاقوں میں موجود تھے ان کی صلاحیتوں اور علوم کے بارے میں حتمی روایت بیان کرے۔ اس روایت کا نتیجہ یہ ہے کہ اس سے سند پیش کر کے ملحدوں نے کہنا شروع کر دیا کہ چار آدمیوں سے زیادہ قرآن کو مکمل نہیں جانتے تھے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ سینکڑوں کی تعداد میں صحابہ اس کا علم رکھتے تھے اور سارے اجزاءِ قرآن کا تواتر مسلم ہے[۳۹]۔

ایک قوی امکان یہ ہے کہ انس خود قبیلۂ خزرج سے تھا اور خزرج اور اوس قبیلوں میں پرانی رقابت تھی اور اس بنا پر انس اپنے قبیلے کی حمایت میں قرآن کے صرف ان حافظوں کا نام لیتا ہے جو خزرج کے تھے۔ اس کے نتیجے میں اوس قبیلے کے ساتھ ساتھ مہاجر اور باقی عرب بھی فخر سے محروم ہو گئے۔

خصوصاً اگر ہم یہ یاد رکھیں کہ قتادہ نے انس سے نقل کیا ہے[۴۰] کہ اوس قبیلے والے اپنے چار آدمیوں پر فخر کرتے تھے، حنظلہ بن الراہب غسیل الملائکہ[۴۱]

---

[۳۸] اتقان ۱: ۲۴۴ نوع ۲۰، کتاب الانتصار۔ ۱: ۸۴ قلمی۔ نقل از المرشد الوجیز۔ ۳۹۔

[۳۹] معلم شرح صحیح مسلم ۲: ۴۴۷، ۱۔ قلمی نقل از المرشد الوجیز ۴۰ و اتقان۔ ۱: ۲۴۵۔

[۴۰] فضائل القرآن۔ ابن کثیر ۴، التراتیب الاداریہ۔ کتانی۔ ۲: ۱۰۵۔

[۴۱] حنظلہ بن ابی عامر راہب جنگ احد میں شہید ہوا۔ پیغمبرؐ نے خبر دی کہ فرشتوں نے اس کو غسل دیا۔ جب سے غسیل الملائکہ کے نام سے یاد کیا جانے لگا (ابن ہشام ۳: ۹۰)۔

Presented by Ziaraat.Com

عاصم بن ثابت (م ۴ھ) جن کی لاش کی زنبوروں نے حمایت کی[۲۱] خزیمہ بن ثابت ذو الشہادتین (م ۳۷ھ)[۲۲] اور سعد بن معاذ (م ۵ھ) جن کی موت پر رحمان کا عرش کانپ اٹھا تھا[۲۳]

ان کے مقابلے میں خزرج قبیلے والے بھی اپنے چار آدمیوں پر فخر کرتے تھے کہ انہوں نے عہد نبوی میں قرائت قرآن یکجا کیا اس انداز سے یکجا کہ دوسرے اس طرح نہ کرسکے یعنی اُبی، معاذ، زید اور ابوزید۔

چنانچہ یہ بات واضح ہے کہ قرآن جمع اور حفظ کرنے والوں کی تعداد چار یا چند نفر تک محدود نہیں کی جاسکتی۔ برخلاف اس کے خود اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ صحابہ میں بہت سے افراد حافظِ قرآن تھے۔ اس بات کی گواہی اُحد، بئر معونہ اور یمامہ کے واقعے کے شہیدوں سے ملتی ہے۔ اُحد کے واقعے میں کئی قاری شہید ہوئے۔ احد میں اصحاب میں سے ۷۰ افراد شہید ہوئے[۲۴] جن میں بہت سے قاری تھے۔ ۴ھ کے اواخر میں بئر معونہ کا واقعہ پیش آیا اس میں چالیس یا ستر قاری شہید ہوئے۔ آنحضرتؐ کی رحلت کو ایک سال ہوا تھا کہ واقعہ یمامہ پیش آیا۔ اس طرح کی جنگ کی سختی مسلمانوں نے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ اس میں ایک ہزار یا بارہ سو نفر مارے گئے جن میں سات سو یا ۵۰۰ یا کم از کم ستر صحابہ اور حاملانِ قرآن شہید ہوئے[۲۵]

خود یہ واقعات ہمارے اس دعوے کے بہترین گواہ ہیں کہ حاملانِ قرآن کی جو تعداد کہی گئی ہے اصل اس سے کہیں زیادہ ہے۔

امام ابوعبید قاسم بن سلام ہروی (م ۲۲۴ھ) نے اپنی کتاب "القراءات" اول میں صحابہ قاریوں کے نام دیئے ہیں جن کی تعداد اچھی خاصی ہے[۲۶] یہ جیسے ائمہ حدیث و فقہ مانے جاتے ہیں۔

مگر احادیث و روایات کے مطالعے سے حاملانِ قرآن کے مندرجہ ذیل نام ہم تک پہنچے ہیں:

---

۲۱ کتاب المحبر ۱۱۸، وہ بدر اور احد کا شاہد تھا اور یوم الرجیع میں شہید ہوا۔ کفار چاہتے تھے کہ احد کے انتقام میں اس کا سر تن سے جدا کریں مگر مکھیاں بادل کی طرح امڈ آئیں اور کافروں کو اس سے باز رکھا۔ ابن ہشام ۳/ ۱۸۰، اشتقاق ۳۷۴، احمد ۲: ۲۹۵/ ۳۱۱۔ بخاری، جہاد ۱۷۰، ومغازی ۱۰/ ۲۸، یہ واقعہ خبیب بن عدی انصاری سے بھی منسوب ہے۔ بخاری، مغازی باب ۲۸، طیالسی ح ۲۵۹۷)۔

۲۲ دو آدمی کی جگہ ان کی ایک گواہی قبول تھی۔ استیعاب۔ شیخ سعید ۹۳، اصول کافی نوادر کتاب الشہادات۔ حضرت ابوبکر کے زمانے میں اس کے بارے میں سورہ توبہ کی دو آیت کے بارے میں روایات مشہور ہوئی۔

۲۳ سعد غزوہ خندق میں شہید ہوئے (ابن ہشام ۳/ ۲۴۸، اصابات ۳/ ۱۹۷) اور حدیث یہ ہے: اهتز عرش الرحمن لموت سعد بن معاذ (مفتاح کنوز السنۃ ۲۳۴ س ۲ تا ۱۲ المعجم المفہرس ۱۷، ۸۸ س ۱ تا ۳)

۲۴ ابن سعد کہتا ہے کہ صرف انصار میں سے ستر آدمی شہید ہوئے (طبقات ۳/ ۱۱۲) اور ابن ہشام مہاجر اور انصار ملا کر ۶۵ آدمی کہتا ہے (ابن ہشام ۳: ۱۲۲) واقدی ۷۴ آدمی کہتا ہے (ص ۱۲۷ طبع برلن) دیکھیں: ترمذی تفسیر سورہ ۱۶ ح ۲ ۱۱، احمد ۵: ۱۳۵۔

۲۵ اس کی تفصیل دوسرے باب میں آئے گی، بئر معونہ کا ذکر پچھلے ابواب میں گزر چکا۔

۲۶ المرشد الوجیز ۳۴، البرہان ۱: ۲۴۲، الاتقان ۱: ۲۴۸۔ زرکشی نے قرآن کے حافظوں کے نام ابوعبید سے نقل کیے ہیں۔ سیوطی نے جو فہرست ابوعبید سے نقل کی ہے وہ ابوشامہ کی فہرست سے مختلف ہے۔ ابوشامہ نے جو نام ابوعبید سے نقل کیے ہیں ان میں معاذ یا ابوحلیمہ معاذ کے بھی نام ہیں جن کا سیوطی نے ذکر نہیں کیا ہے۔ انصار میں سے مجمع بن جاریہ کا نام مشترک ہے۔ ابوعبید سے ابن الجزری ۲۷ قاریوں کا نام نقل کرتا ہے (النشر ۱: ۶)

Presented by Ziaraat.Com

مہاجرین

ابوبکر (م ١٣ھ)، عمر (م ٢٣ھ)، عثمان (م ٣٥ھ)، علی (م ٤٠ھ)، طلحہ (م ٣٦ھ)، سعد بن ابی وقاص (م ٥٥ھ)، عبداللہ بن مسعود (م ٣٢ھ)، سالم مولیٰ ابی حذیفہ، حذیفہ بن یمان (م ٣٦ھ)، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر (م ٧٣ھ)، عبداللہ بن عمرو بن العاص (م ٦٣ھ)، عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن سائب (م ٧٠ھ)، ابوموسیٰ اشعری، ابوہریرہ (م ٥٩ھ)، معاویہ (م ٦٠ھ)، تمیم بن اوس الداری (م ٤٠ھ)، عقبہ بن عامر (م ٥٨ھ)

ازواج پیغمبر: عائشہ (م ٥٨ھ)، حفصہ، ام سلمہ (٥٩ھ)۔

انصار:

ابی بن کعب (م ٢١ھ)، معاذ بن جبل، ابوحلیمہ معاذ (م ٢٥ھ)، زید بن ثابت (م ٤٥ھ)، سعد بن عبید (م ١٦ھ)، مجمع بن جاریہ، انس بن مالک (م ٩٣ھ)، ابوزید قیس بن السکن، عبادۃ بن صامت، ابوایوب (م ٥٢ھ)، ابوالدرداء (م ٣٢ھ)، فضالہ بن عبید (م ٥٢ھ)، مسلمہ بن مخلد (م ٦٢ھ)۔

اس فہرست میں ایک نام کا اور اضافہ ہوا ہے یعنی ام ورقہ بنت عبداللہ بن حارث۔ سیوطی نے اس کو پہلی بار جامعانِ قرآن میں شمار کیا ہے۔

اس طرح عہد نبی سے ٣٠ حافظانِ قرآن کا نام ہم کو ملتا ہے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے قاری ہیں کہ ان کا نام ہم تک نہیں پہنچا اور کسی کو یاد نہیں رہا یا پھر کتابوں میں ان کا ذکر ہے مگر وہ زیر مطالعہ نہیں آئی ہیں۔ مثال کے طور پر کہا جاتا ہے کہ شہاب قرشی نے سارا قرآن آنحضرت کے سامنے قرائت کیا تھا (اور آپ کو سنایا تھا) اور بعد میں حمص میں لوگوں کو اس کی تعلیم دیا کرتے تھے یا پھر قیس بن ابی صعصعہ کا ذکر ابن ابی داؤد

مدینے میں عبداللہ بن زبیر پہلے مسلمان مولود تھے مگر ابوعبید ان کو انصار کے مقابلے میں مہاجرین میں شمار کرتے ہیں۔

یہ مکہ کے قاری تھے اور ابن زبیر سے پانچ سال پہلے وفات پائی۔

تمیم بھی مہاجر ہیں مگر ابوعبید کی فہرست میں ان کا نام نہیں۔ مگر ابوعمرو الدانی ان کا ذکر کرتے ہیں۔

فتح مکہ کے بعد معاویہ اسلام لائے (رمضان ٨ھ) اور ظاہر نہیں ہوتا کہ وفات پیغمبر (ربیع الاول سنہ ١١ھ) تک سارا قرآن حفظ کر لیا تھا مگر اہم بات یہ ہے کہ سیوطی ان کا اور ابوہریرہ کا نام حافظانِ قرآن میں شمار کرتا ہے۔

ان دونوں آخری ناموں کا ابن ابی داؤد ذکر کرتا ہے (اتقان ١: ٩٤ نوع ٢٠)

اتقان ١: ٧٥ نوع ٢٠ فائدہ ٢، ابن سعد کہتا ہے کہ جب رسول اللہ ان کو دیکھتے اس کو "شہیدہ" کہہ کر پکارتے۔ انہوں نے قرآن جمع کیا تھا۔ جب پیغمبر جنگ بدر کے لیے جانے لگے تو ام ورقہ نے آپ سے سوال کیا کہ آپ اجازت دیتے ہیں کہ میں بھی ساتھ چلوں کہ زخمیوں کی دیکھ بھال کر سکوں اور بیماروں کی تیمارداری کروں؟ شاید اللہ تعالیٰ مجھے بھی شہادت کے رتبے تک پہنچا دے۔ رسول اللہ نے جواب میں فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے شہادت مقدر کر رکھی ہے۔ پھر ان کو شہیدہ کہہ کر پکارا اور حکم فرمایا کہ اپنے اہل خانہ کے پاس واپس جائیں۔ آخرکار حضرت عمر کے زمانے میں اپنے غلام اور کنیز کے ہاتھوں قتل ہوئیں (ابن سعد)

کتانی ١: ٤٠۔ نقل از شرح المواہب ٢: ٢٦٦ اور دوسرے فوائد۔

Presented by Ziaraat.Com

نے کہا ہے [۵۲]

گویا قرآن کے حافظوں کی تین قسم کی فہرستیں بنتی ہیں۔ ایک وہ لوگ جو پیغمبرؐ کی خدمت میں بیٹھتے اور آتے جاتے رہتے تھے۔ چنانچہ جب بھی چاہتے آپ سے سوال کر کے معنی یا مشکل کا حل حاصل کرتے تھے جیسے ابی ابن کعب، ابن مسعود، زید وغیرہ۔

دوسرے وہ صحابہ جن کے قاری ہونے کا ذکر ہم تک نہیں پہنچا مگر انہوں نے قرآن حفظ کیا ہوا تھا۔ مثال کے طور پر معاذ بن جبل، ابو زید، سالم ہیں۔ [۵۳]

تیسرے وہ جنہوں نے اپنی قرأت ابی ابن کعب کے سامنے مکمل کی جیسے عبداللہ اور عبداللہ بن سائب۔ کہا گیا ہے کہ ابو ہریرہ بھی ان میں تھے کہ جن کی قرأت ہم تک نہیں پہنچی اور ان کا ذکر بھی موجود نہیں چنانچہ شمار میں نہیں آئے۔

علاوہ ازیں ایک دوسرا نکتہ ختم قرآن سے متعلق ہے [۵۴] ختم قرآن کا مطلب قرآن کی شروعات سے آخر تک خاص آداب کے تحت قرأت ہے۔ ہم نے پچھلے صفحات میں دیکھا کہ عبداللہ بن عمرو چاہتا تھا کہ ہر رات قرآن کو ایک بار ختم کیا کرے تو پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا کہ ہر مہینے میں یا زیادہ سے زیادہ تین راتوں میں ایک بار قرآن ختم کیا کرو۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ جو تین رات سے کم میں قرآن ختم کرے وہ اس کو سمجھ نہیں پاتا۔ تمیں ابن مسعود اور سعید بن منذر نے ایسی ہی اجازت لی تھی۔ ابی ابن کعب بھی آٹھ راتوں میں ایک قرآن ختم کرتے تھے [۵۵]۔ ان مثالوں سے پتا چلتا ہے کہ اصحاب پیغمبرؐ قرآن کے حفظ کرنے میں کس قدر کوشش کرتے اور سارے قرآن کو سب سے زیادہ عزیز نادر وجود خزانہ سمجھ کر ذہن میں محفوظ کرتے تھے۔ اس کے علاوہ کتابت بھی اس حفظ کرنے میں ممد و معاون تھی۔

بہر صورت جو بات طے ہے وہ یہ کہ کم یا زیادہ جاننے کی بحث آیات قرآنی کے قطعی تواتر میں کوئی شک نہیں ڈال سکتی۔ جس طرح کہا گیا کہ مجمع بن جاریہ عہد نبوی میں ایک دو سورہ نہیں جانتے تھے اور وہ انہوں نے بعد میں یاد کیں۔ یا ابن مسعود نے خود آنحضرتؐ سے صرف ستر سورہ تک سیکھی تھیں اور باقی دوسروں سے یاد کی تھیں۔ اور زید سورہ توبہ کی آخری دو آیات بھول گئے تھے۔ ان باتوں سے کوئی اثر نہیں

---

[۵۲] اتقان ۱: ۲۴۶، نوع ۲۰ تنبیہ۔

[۵۳] ذہبی، معرفتہ القراء کے شروع میں۔ نقل از زرکشی ۱: ۲۴۲ - ۲۴۳۔

[۵۴] ملحم مصدر ختم کا معنی تمام کرنا، انجام تک پہنچانا اور مہر کرنا: ختم القرآن کے معنی قرآن کو آخر تک تمام کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تین "معوذ" کی سورتوں کو "ختم" کہتے ہیں کہ قرآن کا اختتام ان سورتوں پر ہوتا ہے۔ "ختم اللہ علی قلوبھم" (۲، ۷)، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے۔ یا فرمایا "یسقون من رحیق مختوم ختامہ مسک" (۸۳: ۲۵، ۲۶) سربمہر شراب ناب پئیں گے جس کو مشک سے مہر کیا ہوگا یا آخر میں مشک کی خوشبو آئے گی۔ انگوٹھی کو بھی اسی وجہ سے خاتم کہتے ہیں کہ اس سے خط پر مہر لگاتے ہیں کہ خط میں کمی بیشی نہ کی جا سکے۔ بہر حال ختم قرآن، ایک بڑا اور قابل تعریف کام تھا۔ آج بھی ممالک اسلامی میں اس کو سنت مستحبہ کہا جاتا ہے۔ جنوبی عرب میں بچہ کہ پہلی بار قرآن ختم کرتا ہے تو جشن مناتے ہیں۔ اسی کو ختم قرآن کہتے ہیں۔ مگر یہیں کسی کا لڑکا جب اول بار پورا قرآن پڑھ لیتا ہے تو جشن مناتے ہیں اور اس کو "اقلابہ" کہتے ہیں۔ جب ثلث یا نصف قرآن پڑھ چکا ہوتا ہے تو جشن "اشراقہ" مناتے ہیں۔ مصر میں عام طور سے دعوت کرتے ہیں اور ختم قرآن کرتے ہیں۔

[۵۵] ابن سعد ۳: ۶۰/۲۔ ایضاً ۳: ۵۲/۱/۔

Presented by Ziaraat.Com

پڑتا کیونکہ روایتِ قرآن میں تواتر کی یہ شرط ہی نہیں کہ ہر شخص سارے قرآن کو حفظ کرے۔ یہ کافی ہے کہ سب ساری آیات سے واقف ہوں۔ انس بن مالک کی وہ حدیث اور اس جیسی روایات قرآن کے اس تواتر کو کوئی ضرر نہیں پہنچاتیں کہ وہ ملحدوں کے ہاتھ مضبوط کر سکیں۔

یہ تو خود آنحضرتؐ کے زمانے کے حافظانِ قرآن کا ذکر تھا۔ آپؐ کی رحلت کے بعد اس عظیم کام کو ہزاروں مسلمانوں نے اپنے ذمہ لیا اور نسل در نسل، سینہ بہ سینہ کلام الٰہی کے حفظ کرنے کو آج تک جاری رکھے ہوئے ہیں۔ آج کے تکنیکی دور میں پریس اور سمعی و بصری ہر قسم کی ایجاد کے ساتھ ساتھ قرآن کی تعلیم معلمین کے ہاتھوں آمنے سامنے بیٹھ کر جاری ہے اور حفظ کرنے کا اہتمام پہلے ہی کی طرح نظر آتا ہے۔

سارے اصحابِ رسولؐ میں سے اوپر جو فہرست ابھی نظر سے گذری ان سب ناموں میں سے سات نام ایسے ہیں جنہوں نے قرأت قرآن اور اس کی تعلیم حاصل کرنے میں زیادہ شہرت حاصل کی۔ اور وہ نام یہ ہیں:

علیؑ، عثمان، اُبَیّ بن کعب، زید بن ثابت، ابن مسعود، ابوالدرداء اور ابوموسیٰ اشعری[۱]

اگر صرف حفظ کرنے کی بات کی جائے تو تحقیق کہا جا سکتا ہے کہ ایک سو سے زیادہ ایسے لوگ ہیں جو حافظِ قرآن کہے جانے کے مستحق ہیں۔ اس وقت جو قرأت رائج ہے وہ ابو عبدالرحمٰن عبداللہ بن حبیب سُلَمی تک پہنچتی ہے۔ اس نے اپنی جگہ قرأت علیؑ، عثمان، زید، اُبَیّ اور پیغمبر اکرمؐ سے سیکھی تھی۔

---

[۱] اتقان - ۱: ۷۵، نوع ۲۰، فصل ۔ نقل از طبقات القراء ذہبی

ب۔ قرآن کی کتابت

جیسا کہ عرض کیا گیا رسول اللہ اور ان کے اصحاب کی اس سلسلے میں ساری توجہ قرآن جمع کرنے اور اس کو سینوں میں محفوظ کرنے اور ذہنوں میں حفظ کرنے پر رہی۔ عربوں میں اس کا عام رواج بھی تھا اور پہلے زمانے سے وہ اس کے عادی بھی تھے۔ چنانچہ یہ کام ان کے لیے آسان بھی تھا۔ علاوہ ازیں لکھنے کا سامان، جیسا کہ ہونا چاہیے اس زمانے میں اتنا عام نہیں تھا اور لکھنے والوں کی تعداد بھی زیادہ نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ قرآن بطورِ کتاب تحریر کرنے سے زیادہ توجہ اس کے حفظ کرنے پر رہی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن کے لکھے جانے کا کام قطعی فراموش کر دیا گیا تھا اور لوگ اس کا اہتمام نہیں کرتے تھے۔ بلکہ قرآن کی آیات کو لکھ لینے پر بھی پیغمبر اکرمؐ کی خاص توجہ تھی۔ چنانچہ آپؐ نے وحی لکھنے کے لیے ان لوگوں کو منتخب کیا جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ جو اس میں مہارت نہیں رکھتے ان کی آپؐ حوصلہ افزائی فرماتے تھے اپنے بہت سے [illegible] کو لکھنے پڑھنے کی ترغیب دی۔ جب بھی آیات قرآن نازل ہوتیں لکھنے والوں میں سے کسی نہ کسی کو بلا بھیجتے اور ان سے وحی لکھنے کو کہتے۔ اس کی کتابت میں بہت کوشش اور احتیاط فرماتے۔ اس طرح کتابی صورت میں لکھنے سے قرآن کو حفظ کرنے کی پشت پناہی ہوئی اور حفظ کرنے سے کاغذ پر الفاظ نقش کرنے میں بڑی مدد و کمک ہوئی۔

اس سلسلے میں بھی گواہ اور شاہد بہت ہیں۔ سب سے پہلے تو قرآن خود گواہی دیتا ہے کہ دورانِ اقامت مکہ یعنی ہجرت سے کہیں پہلے قرآن کی آیات لکھی جا چکی تھیں اور ایک سے دوسرے فرد تک پہنچ چکی تھیں۔

پہلی آیات جو نازل ہوئیں؛

پڑھیں۔ اپنے پروردگار کے نام سے جس نے عالم کو خلق کیا انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔ پڑھیں۔ آپ کا پروردگار عظیم و اعلیٰ ہے جس نے قلم سے علم سکھایا۔ انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا (۱۹۶ - ۵)۔

یہ آیات قرآن کو کتابت کے ذریعے محفوظ کرنے پر پیغمبرؐ کو توجہ دینے اور مشغول رہنے کی گواہی دے رہی ہیں۔ قرآن خود گواہی دیتا ہے، سورہ ۸۰ عبس کی آیات ۱۱ تا ۱۶ (بعثت کے دوسرے سال نازل شدہ ۲۴ ویں یا ۳۲ ویں سورہ میں ہے):

آیاتِ الٰہی مکرم صفحات میں لکھی ہوئی ہیں (۸۰ - ۱۳) یا پھر ۸۵، ۲۱، ۲۲، ۵۶، ۷۷ تا ۸۰۔

ممکن ہے کہا جائے کہ یہ سب تو عالم بالا کی باتیں اور نوشتہ آسمان ہے۔ اس سے بھی زیادہ واضح شہادت موجود ہے، سورہ فرقان کی آیت ۵ میں ہے؛

انہوں نے کہا کہ یہ پہلوں کی کہانیاں ہیں جو انہوں نے گھڑ کر لکھوا لی ہیں۔ اور یہی اس پر صبح و شام پڑھی جاتی ہیں۔

یہ آیت بعثت کے چھٹے یا ساتویں سال (اور ہجرت سے ساتنے ہی سال پہلے) نازل ہوئی تھی جس میں مخالفین اور مشرکین کے الزام اور اتہام کا ذکر ہے کہ یہ تو پرانے قصے ہیں جو وہ لکھواتے ہیں اور املاء کرواتے ہیں۔ اس آیت میں لکھنے اور کتابت کا ذکر ہے جس کا خود مخالفین نے اپنے بیانات میں اظہار کیا۔

Presented by Ziaraat.Com

ہجرت کے بعد ایک اور صورت واضح ہے جس کے بارے میں کہا گیا کہ اس کا نام سورۂ البینہ ہے، بعض اسے ہجرت کے چھ ماہ بعد سے متعلق کہتے ہیں یا ہجرت سے دو سال پہلے نازل ہوئی تھی مگر دوسروں نے اس کو ہجرت کے بعد کا سورہ کہا ہے۔ بہر صورت قرآن نے صحیفوں کا ذکر اس طرح فرمایا:

رَسُولٌ مِّنَ اللَّهِ يَتْلُوا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (۹۸ : ۲-۳)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول جو پاک صحیفے پڑھتے ہیں جن میں درست نوشتے ہیں۔

چنانچہ قرآن خود اس بات کا گواہ ہے کہ وحی الٰہی شروع ہی سے لکھی جاتی رہی اور لوگوں تک کتابی صورت میں پہنچتی رہی۔ اور خود پیغمبر اکرمؐ لکھنے پڑھنے کے سکھلانے کا اہتمام فرماتے اور اس کے پیچھے مقصد یہ تھا کہ تعلیم و تعلم اور قرآن کے حفظ اور اس کی کتابت وغیرہ کے سلسلے میں صحابہ کرام کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ یہاں اس کی طرف اشارہ کیا جائے گا کہ شروع ہی سے وحی کے سلسلے میں قلم کا کیا مقام تھا۔ قلم معرفت اور علم کا اولین عنصر ہے اور انسان کی شناخت کا وسیلہ بھی ہے۔ اس کی بڑی اہمیت اور فضیلت ہے۔ چنانچہ پیغمبر اکرمؐ نے بھی قرآن کو کتابت کے ذریعے محفوظ کیا۔ آپ نے وحی الٰہی کو ضبط اور محفوظ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور اپنے زمانے کے لوگوں کی تربیت اور آئندہ نسلوں کی خاطر محفوظ کرنے کے لیے ہر موقع سے فائدہ اٹھایا۔

شروع میں ساری توجہ صرف قرآن کے ضبط اور محفوظ کرنے پر مرکوز رہی ہے خواہ حافظے کے ذریعے ہو یا کتابت اور لکھنے کے ذریعے۔ آپ چاہتے تھے کہ مسلمان قرآن کے لیے خاص اہتمام کریں۔ اس کو پڑھیں بھی اور یاد بھی کر لیں۔ اس کو خود سیکھیں اور دوسروں کو بھی سکھائیں۔ اس کو خود لکھیں اور دوسروں کو بھی لکھوائیں۔ اور پھر اس پر عمل کریں اور ثواب کے مستحق بنیں۔

قرآن پڑھنے اور سیکھنے کے لیے آپ لوگوں کی جس طرح حوصلہ افزائی فرماتے اس کی مثالیں تو ہم نے پچھلے صفحات میں دیکھیں۔ اسی سلسلے میں کہ آپ نے یہ بھی فرمایا تھا: اس سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں کہ کوئی شخص قرآن کی کوئی سورہ یا آیت یاد کرے اور سیکھے اور پھر اس کو بھول جائے اور فراموش کر دے۔ اس طرح قرآن کے قاری کی زبان پر ہمیشہ قرآنی آیات رہیں اور وہ ان سے اس طرح مانوس ہو جائے کہ ان کو پھر فراموش نہ کر پائے۔

اسی دوران اس کا بھی امکان تھا کہ خود آپ کے فرمودات بھی لوگوں نے لکھ لیے ہوں۔ لوگ دور و نزدیک سے آپ کے دیدار کو آتے اور فطری بات ہے کہ آپ سے جو کچھ سنتے اس کو اپنے لوگوں تک تحفے کے طور پر پہنچانے کے لیے لکھ لیتے ہوں گے۔ مگر اس میں اس بات کا خوف تھا کہ کہیں نادانستہ حدیث نبوی کو آیات قرآن سے نہ ملا دیں۔ اور کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ قرآن اور حدیث یعنی خدا کے کلام اور اس کے رسول کے کلام میں فرق نہ کر پائیں۔ چنانچہ آپ نے کلام خدا کے محفوظ رہنے کے اہتمام میں فرمایا کہ میری کوئی بات نہ لکھو جس نے بھی قرآن کے علاوہ کچھ لکھ لیا ہو وہ اس کو مٹا دے[۱] خصوصاً اگر قرآن اور حدیث ایک ہی صحیفے میں موجود ہو[۲] اس کی آپ نے تاکید فرمائی تھی۔

مگر اس کے باوجود آپ کی رحلت کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ آپ نے تفسیر قرآن میں جو کہا تھا یا دعائے قنوت میں پڑھا تھا یا حکم فرمایا تھا اس کے بارے میں بعض لوگوں نے دعویٰ کرنا شروع کر دیا کہ وہ بھی قرآن کی آیت تھی۔ چنانچہ آج بھی صدیوں کے بعد ذکر ہوتا ہے کہ فلاں نے دعویٰ کیا تھا کہ فلاں عبارت یا جملہ آیت الٰہی تھا جب کہ وہ حدیث تھی جو آپ نے فرمائی تھی یا تفسیر قرآن میں ایک جملہ ہے یا حکم ہے جس کو نافذ کرنے کے لیے فرمایا تھا۔

پھر آپ نے کچھ لوگوں کو وحی کی کتابت کے لیے مامور فرمایا تھا۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا یہ لکھنے والے اصحاب میں سے منتخب لوگ تھے۔ اور وہ پیغمبرؐ کے حکم کے مطابق یہ

۱۔ منتخب کنز السنہ ج ۲ ص ۲، مسلم: زہد ۷۲، الدارمی: مقدمہ ۴۲، احمد ۳: ۱۲، ۲۱، ۳۹، ۵۶، علوم الحدیث ابن صلاح ۱۷۰، تقیید العلم خطیب بغدادی ۲۹ تا ۳۵، مجمع الزوائد ۱: ۱۵۰، جامع البیان ابن عبد البر ۱: ۶۳۔

۲۔ [illegible] ۳۰، ۴۴۔

Presented by Ziaraat.Com

لکھ لیا جو دستیاب ہوئی اس پر اور کسی طرح ممکن ہوتا وحی کو لکھ لیتے۔

حاکم مستدرک میں لکھتے ہیں کہ قرآن تین مرتبہ جمع ہوا اس کی توجیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں اس کے بعد وہ فرماتے ہیں کے مطابق زید بن ثابت کے قول کے جو اس نے کہا، ہم رسول اللہ کے پاس ہوتے تھے اور قرآن کو تالیف رقعوں سے جمع کرتے تھے ۵ه

سید مرتضیٰ (رحمہ اللہ) سے نقل کیا گیا ہے کہ قرآن رسول اللہ کے عہد میں جمع کیا جا چکا تھا جیسا کہ آج موجود ہے اور اس پر استدلال کیا ہے کہ قرآن کا درس دیا جاتا تھا اور صحابہ میں سے کچھ اس کام پر مامور تھے۔ نبی کے سامنے قرآن کی قرات کی جاتی تھی اور صحابہ میں سے بعض پیغمبر کے سامنے قرآن ختم کرتے تھے اور کئی بار ختم قرآن ہوتا۔ ان باتوں پر تھوڑا بھی غور کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ قرآن جمع اور مرتب ہو چکا تھا اور کسی پراگندہ اوراق کی کوئی کیفیت نہیں تھی ۶ه مگر زہری کا کہنا ہے کہ آنحضرت کی رحلت کے وقت قرآن جمع نہیں ہوا تھا، بلکہ کھجور کی شاخ اور اس کی چھال پر لکھا رکھا تھا ۷ه

ان دونوں باتوں میں کیا کم و زیادہ ہے اس پر غور کرنا چاہیے۔

پیغمبر اکرم خود ہی وحی کی کتابت کرنے والوں کی کڑی نگرانی کرتے۔ آپ جس طرح جبرئیل سے حاصل کرتے اسی ترتیب سے وحی کا تعین فرماتے ۸ه روایات سے تصدیق ہوتی ہے کہ وحی املا کرانے کے بعد پیغمبر اکرم کاتب وحی سے فرماتے کہ جو لکھا ہے اس کو پڑھ کر سنائے۔ اگر کوئی غلطی ہوتی تو اس کو درست فرماتے ۹ه ابن عباس سے روایت ہے، جب آپ پر کچھ نازل ہوتا تو کاتبوں میں سے کسی کو بلا بھیجتے اور فرماتے ان آیات کو فلاں فلاں جگہ لکھو ۱۰ه عثمان بن ابی العاص سے روایت ہے کہ "میں پیغمبر کے حضور میں تھا کہ آنحضرت نے فرمایا کہ جبرئیل آئے تھے اور حکم دیا کہ اس آیت کو سورہ کی فلاں جگہ لکھیں ۱۱ه

ابن عباس سے یہ بھی روایت ہے کہ جبرئیل آیت

وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ (۲:۲۸۱)

لائے اور کہا کہ خداوند تعالیٰ نے فرمایا کہ اس آیت کو سورہ بقرہ کی ۲۸۰ آیت کے بعد لکھیں ۱۲ه یا کہا کہ خداوند عالم نے اس آیت کو ربا کی آیت (۲:۲۷۶-۲۸۰) اور دین (۲:۲۸۲) کے درمیان رکھا ہے ۱۳ه

اس سلسلے کی بہت سی روایات ہیں۔ آگے ان کا ذکر کریں گے۔ ان سب میں آیت بہ آیت اور سورہ بہ سورہ قرآن کی کتابت کا خود رسول اللہ کے زمانے میں پایا جانا موجود ہے۔ ہو سکتا ہے کہ لکھنے کے دوران ضروری ترتیب تھوڑا خاطر در رہی ہو مگر آیات جو بھی نازل ہو چکی ہوتیں ان کو لکھ لیا جاتا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ جو سورہ نازل ہوئی کاتبان وحی میں سے کوئی شخص اس کو یاد کر لیتا اور اس کو لکھ بھی لیتا اور آنحضرت کو سنا بھی دیتا۔ پھر کسی سریہ (جنگ) یا کسی سفر کے لیے یا کسی اور کام کے سلسلے میں اس کو شہر سے باہر جانا پڑتا۔ اس کے بعد جو آیات یا سورہ نازل ہوتی، جب وہ واپس پہنچتا تو جو کچھ نازل ہو چکا ہوتا وہ دوسروں سے حاصل کرتا۔ کبھی ممکن ہے کچھ اس کے ہاتھ میں نہیں آتا۔ جہاں تک ہوتا لوگوں سے رجوع کرتا اور لوگوں کا اس بارے میں اتباع کرتا۔ اس صورت میں لکھے ہوئے جو بھی باقی ہوتی ایسے صحابہ تھے جو اپنے حافظے پر پورا اعتماد کرتے اور بہت سی چیزوں مثلاً نجوم، نسب اور قصائد وغیرہ بغیر لکھے حفظ کرتے تو قرآن کی آیات کو بھی بغیر لکھے حفظ کر لیتے کہ اس میں کوئی کمی نہ ہوتی اور اسی پر انحصار کرتے تھے ۱۴ه

۳ه علم حدیث کی ایک اصطلاح ہے۔ ۴ه اتقان ۱:۰۲، فتح ۱۸، برہان ۱:۲۳۷، ترمذی مناقب ۳، احمد ۵:۱۸۵، مقدمتان: ۴۹۔ ۵ه مجمع البیان ۱:۱۵ سید المخبتین الصمد ۱:۵۲۶، ۵۲۷۔ ۶ه تفسیر طبری ۱:۲۱ بولاق؛ فتح الباری ابن حجر ۹:۱۹-۲۱۔ ۷ه ابی داؤد صلوٰۃ ۱۲۱؛ احمد ۱:۵۷، ۶۹، ۲۸۱

۸ه مجمع الزوائد ۱:۴۰۹۔ ۹ه مقدمتان ۴۰، مصاحف ۳۱، احمد ۱:۳۳۱، برہان ۱:۲۳۴ لیکن دوسری بہت سی مثالیں ہیں۔ ۱۰ه ابی داؤد صلوٰۃ ۱۲۲ ... ۲۲ نوع ۱۸ فصل۔ ۱۱ه مقدمتان ۴۱۔ ۱۲ه ابو الفتوح رازی ۲:۲۳۹؛ کشف الاسرار ۱:۷۶۱؛ مجمع البیان ۱:۳۹۴؛ قرطبی ۱:۴۱۔ ۱۳ه مقدمتان ۲۱

Presented by Ziaraat.Com

کاتبانِ وحی

پیغمبر اکرمؐ وحی الٰہی لکھوانے کے سلسلے میں بہت سعی اور کاوش فرماتے۔ قرآن کو پڑھنے اور لکھنے کے لیے سب کی حوصلہ افزائی کرتے۔ خصوصاً وحی آسمانی کے لکھوانے میں بہت اہتمام کرتے اور پوری توجہ مبذول فرماتے۔ کہا جاتا ہے کہ بعثت کے شروع میں سارے قبیلۂ قریش میں صرف سترہ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے[1]۔ مدینہ میں اس سے بھی کم آدمی نوشت و خواند سے واقف تھے[2]۔ مگر آپؐ کی حوصلہ افزائی اور لوگوں کو مستعد کرنے سے چالیس سے زیادہ کاتبانِ وحی تیار ہوئے۔ لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہو چکی تھی مگر ان کو بحیثیت کاتبِ وحی شمار نہیں کیا جاتا۔

بہرحال کاتبانِ وحی کی تعداد میں بہت اختلاف ہے۔ حافظ ابن عساکر (م ۵۸۱ھ) "تاریخ دمشق" میں ۲۳ آدمیوں کا ذکر کرتا ہے۔ اسی تاریخ کے خلاصے[3] میں ابوشامہ ۲۵ آدمیوں کا نام لیتا ہے[4]۔ ابن عبدالبر بھی یہی تعداد بتاتا ہے[5]۔ شبراملسی (م ۱۰۸۷ھ) چالیس کاتبانِ وحی کی تعداد کا ذکر کرتا ہے[6]۔ جب کہ اس سے پہلے حافظ عراقی (م ۸۰۶ھ) نے ۴۲ آدمیوں کا نام لیا ہے[7]۔ کتاب "شفا" کے حواشی میں برہان حلبی کاتبانِ وحی کی تعداد ۴۲ بتاتا ہے[8]۔ مجتہد زنجانی بھی اسی تعداد کو نقل کرتے ہیں[9]۔

مستشرقین میں سے جنہوں نے اس بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے فرانسیسی بلاشر کہتا ہے، "کاتبانِ وحی کی تعداد چالیس آدمیوں

---

[1] فتوح البلدان۔ بلاذری ۴۵۷، عقد الفرید ۲: ۳، الاسلام والحضارة العربیہ۔ محمد کرد علی ۴۴: ۱، بلوغ الارب۔ آلوسی ۳: ۳۷۰۔ بعض لوگ اس بات کو قبول نہیں کرتے، عصرِ النبی۔ محمد دروزہ ۴۲۸۔

[2] واقدی کا قول بلاذری نقل کرتا ہے کہ گیارہ افراد تھے جن میں سے ایک زید بن ثابت بھی تھا۔ اس کو زمانۂ جاہلیت کے پڑھے لکھے لوگوں میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ فتوح البلدان ۴۵۹ (ح ۱۴ بھی ملاحظہ کریں)

[3] ابوشامہ اپنی کتاب "روضتین" میں کہتا ہے کہ یہ کتاب اسّی جلدوں میں ۸۰۰ ابواب تھی جو میں نے مختصر کی، اس کو ترتیب دے کر اس کے بیشتر مطالب مزید بڑھائے۔ نقل از حاشیہ ۲ ص ۴۶ المرشد الوجیز۔

[4] ابوشامہ ۴۶۔

[5] استیعاب۔ ترجمۂ زید بن ثابت میں۔

[6] در کتاب قضاء، حاشیہ اش بر منہج در فقہ شافعی۔ نقل از کتانی ۱: ۱۱۵۔

[7] التراتیب الاداریہ کتانی ۱: ۱۱۶ ــ ۱۱۷، بظاہر "نظم الدرر السنیۃ" میں کہا ہے،

"کتابہ اثنان واربعونا زید بن ثابت وکان حیتا
کاتبہ وبعدہ معاویہ ابن ابی سفیان وکان واعیۃ"

[8] کتانی ۱: ۱۱۷۔

[9] تاریخ قرآن ۲۷۔

Presented by Ziaraat.Com

تک پہنچتی ہے[۱۰] کاساناوا نے ان پانچ فہرستوں کا موازنہ کیا ہے جو ابن سعد، طبری، نووی، حلبی اور دیاربکری نے پیش کی ہیں[۱۱] مگر ہمارے نقطۂ نظر سے یہ کافی نہیں۔ اس میں سیوطی کی دی ہوئی فہرست کا بھی اضافہ کرنا چاہیے[۱۲] مگر حتمی رائے قائم کرنے کے لیے بہت سے دوسرے منابع اور کتابوں کا مطالعہ بھی بہت ضروری ہے[۱۳] ایک مشکل اس سلسلے میں یہ ہے کہ کتابتِ وحی رسول اللہ کی مکہ میں اقامت کے دوران جاری تھی۔ اگر ہم مکی اور مدنی آیات کا موازنہ کریں تو قرآن کی ۱۱۴ سورتوں میں سے چھیاسی سورتیں مکہ میں نازل ہوئیں۔ باہم پھر کل ۶۲۳۶ آیات میں سے تقریباً ۱۶۰۰ آیات مدنی ہیں (یعنی ایک چوتھائی سے کچھ زیادہ)۔ ہاں مکی آیات چھوٹی ہیں اور اگر الفاظ کے لحاظ سے شمار کیا جائے تو ایک تہائی قرآن مدینہ میں اور قریب قریب دو تہائی مکہ میں نازل ہوا تھا۔ اس لحاظ سے کاتبانِ وحی کی زیادہ اہمیت مکہ میں نظر آتی ہے خصوصاً جب ہم یہ بھی نگاہ میں رکھیں کہ مکہ میں وحی کے نازل ہونے کے ایک عرصے تک پیغمبر اکرم خانۂ ارقم یا شعب ابی طالب میں پوشیدہ اور خلوت میں تبلیغ فرماتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ ہمارے پاس مدینہ کے مقابلے میں مکہ کے زمانے کی معلومات کم ہیں۔ چنانچہ اس بارے میں روایات و احادیث کا مطالعہ ذرا مشکل کام ہے۔ اس بارے میں ایک خاص مشکل مسلک اور عقیدے کے رجحانات ہیں جو کاتبِ وحی کے نام درج کرتے وقت آڑے آجاتے ہیں۔ اس فہرستِ افتخار میں نام درج ہونے کے لیے ہر شخص کے اسلام کے اظہار کا سال تاریخ میں صحیح طور پر موجود ہونا چاہیے اور ساتھ ہی ساتھ ہر کاتبِ وحی کی خدمتِ رسول اللہ میں اس کام میں جو مدت گذری اس کا بھی تعین ہونا چاہیے۔ مگر یہ صورت تاریخ میں موجود نہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر کاتبانِ وحی، کاتبانِ رسائل اور عہدنامے لکھنے والوں میں فرق کا پتہ نہیں چلتا۔ ان سب باتوں نے اس کام کو پیچیدہ کر دیا ہے۔

اس کے باوجود مطالعہ اور غور و خوض کا آغاز بہرحال کیا جا سکتا ہے۔ دقیق تحقیقات کے لیے زیادہ سے زیادہ منابع تک رسائی ہونی چاہیے۔ اور اس طرح اس کام کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔

محدثین اور مورخین نے جو فہرست مہیا کی ہے وہ کچھ اس طرح ہے۔ مگر ان اصحاب کے اسلام لانے کے زمانے کو بھی مدنظر رکھنا پڑے گا۔

مکہ کے زمانے کے کاتب

چاروں خلفاء، شرحبیل بن حسنہ (م ۱۸ ھ)، عبداللہ بن سعد بن ابی السرح قرشی (م ۳۷ ھ)، خالد بن سعید بن عاص بن امیہ، طلحہ،

---

۱۰ دراساتہ قرآن ۱۲ و ۲۷۔ BLACHERE : INTRO. P. 13, N. 16.

۱۱ 11. CASANORA : MOHAMMED ET LA FIN DU MONDE, PARIS 1911 - 13, P. 96 S Q Q.

۱۲ دراسات قرآن حاشیہ ۱۶ - اتقان ۱ : ۸۸ چاپ ۱۲۷۸ قاہرہ۔

۱ رجوع کریں: جوامع السیرۃ ابن حزم ۲۶، انساب الاشراف ۱ : ۵۳۱، فتوح البلدان بلاذری ۴۷۳ (یا ۴۷۴)، جہشیاری ۹-۱۲، تلقیح الفہوم ۲۷، زاد المعاد ۱ : ۵۹، تہذیب نووی ۱ : ۲۹، ابن سید الناس ۲ : ۳۱۵، تراتیب الاداریہ ۱ : ۱۱۴، محمد (ص) از محمد رشید رضا ۶۵، بحار الانوار جزء ۱ مجلد ۹ فرج ۱۰، مجموعۃ الوثائق السیاسیہ، ہمالکندہ، سیرۃ حلبیہ ۳ : ۳۳۹، مناقب ابن شہر آشوب ۱ : ۱۴۲، سنن بیہقی ۱۰ : ۱۲۶، السیرۃ الحلبیہ ۳ : ۳۳۹، بحار الانوار ۱۹، جزء دوم قرآن، التمہید، ۲۷۱ : ۳، اصابہ ۲ : ۱۵، استیعاب ۱ : ۲۴۱، عقد الفرید ۴ : ۱۶۳، یعقوبی ۲ : ۸۰، طبری ۱ : ۱۷۸۲، تذکرۃ الحفاظ ذہبی، اصول کافی کلینی دکلاش، ابن اثیر، التنبیہ و الاشراف مسعودی ۲۴۵، حیاۃ القلوب مجلسی ۲ : ۹۱۴۔

Presented by Ziaraat.Com

زبیر (م ۳۶ھ)، سعد بن ابی وقاص (م ۵۵ھ)، عامر بن فہیرہ (م ۴ھ)، علاء بن حضرمی (م ۲۱ھ)، مُعَیقیب بن ابی فاطمہ الدوسی (م ۴۰ھ)، ارقم بن ابی الارقم (م ۱۱ھ)، حاطب بن عمرو، حاطب بن ابی بلتعہ (م ۳۰ھ)، مصعب بن عمیر، عبداللہ بن جحش (م ۳ھ)، جہم بن قیس، سالم مولیٰ ابی حذیفہ (م ۱۲ھ)۔

مدینہ کے دور کے کاتب

اس زمانے میں کاتبوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ شروع میں یہ کام زیادہ تر اُبی بن کعب انجام دیتے۔ جب زید بن ثابت نے خوب مہارت حاصل کر لی تو اسیرانِ بدر کے پاس کتابت سیکھی کی[۱۴۷] وہ زیادہ تر آنحضرتؐ کی خدمت میں رہتے۔ ان کے بعد جو لوگ اس فہرست میں شامل ہوتے گئے وہ یہ ہیں:

عبداللہ بن رواحہ (م ۸ھ)، ثابت بن قیس (م ۱۲ھ)، حنظلہ بن الربیع الاُسَیدی (م ۴۵ھ)، حذیفہ بن یمان (م ۳۶ھ)، علاء بن عقبہ، جہیم بن الصلت، عبداللہ بن زید (م ۶۳ھ)، محمد بن مسلمہ (م ۴۳ھ)، حنظلہ بن ابی عامر (م ۳ھ)، عبداللہ بن اُبی بن سلول، ابو زید قیس بن السکن، عقبہ بن عامر (م ۵۸ھ)، معاذ بن جبل، ابو ایوب انصاری (م ۵۲ھ)، مُغیرہ بن شعبہ (م ۵۰ھ)۔

اس کے بعد اور لوگ بھی کاتبانِ وحی کی حیثیت سے شامل ہوئے:

ابان بن سعید بن عاص (برادر خالد) (م ۱۳ھ)، عمرو بن عاص (م ۴۳ھ)، خالد بن ولید (م ۲۱ھ)، سب سے آخر میں ابو سفیان۔

——— اور اس کے دو لڑکے یزید و معاویہ، عبداللہ بن ارقم (م ۴۴ھ)، حویطب بن عبد العزّیٰ (م ۵۴ھ) کے لیے بھی کہا گیا ہے کہ ۸ھ (فتح مکہ) سے ان میں شریک ہوئے۔

اس طرح ۵۴ صحابہ کے نام کی فہرست سامنے آئی جو کتابتِ وحی میں شرکت رکھتے تھے مگر یہ فہرست زیادہ دقیق مطالعے کی محتاج ہے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جن کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ وہ پڑھنا لکھنا جانتے تھے، ان کی قراءت بھی ہم تک پہنچی ہے، ان میں سے بعض کے مصحف بھی تھے جیسے انس بن مالک جو رسول اللہ کے خادم تھے، منذر بن عمرو، اُسَید بن حضیر، رافع بن مالک، ابو عبیدہ بن جراح، سعد بن عبادہ، ابو الدرداء جن کے نام اس فہرست میں موجود نہیں۔

عبادلہ[۱۴۸] آنحضرتؐ کی رحلت کے وقت نوجوان تھے ۔ یعنی عبداللہ بن عمر ۲۰ سال کے تھے، عبداللہ بن عمرو ۱۷ سال کے، عبداللہ بن عباس ۱۳ سال کے اور عبداللہ بن زبیر دس سال کے تھے۔ چنانچہ قدرتی بات ہے کہ ان کے نام بھی اس گروہ میں نہیں ہونا چاہئیں۔

دوسرے عبداللہ بن سعد بن ابی السرح ہے جس کے بارے میں کہا گیا کہ وہ پہلا کاتبِ وحی تھا۔ یہ شخص خوشخط تھا اور کبھی کبھی کتابت بھی کرتا تھا۔ بعد میں مرتد ہو گیا اور مدینہ سے مکہ بھاگ گیا۔ وہاں شیخی کی باتیں کیا کرتا کہ وہ "سمیعٌ بصیر" کی جگہ "سمیعٌ علیم" اور

---

[۱۴۷] روض الانف۔ سہیلی۔ ۵، ۱، ۲۴۔

[۱۴۸] "عبادلہ" سے مراد عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر اور عبداللہ بن عمرو بن عاص ہیں۔ کبھی ان میں عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب اور عبداللہ بن ابی بکر کو بھی شامل کر لیا جاتا ہے۔ مگر جب بطور مطلق "عبداللہ" کہتے ہیں تو اس سے مراد عبداللہ بن مسعود ہوتے ہیں۔

Presented by Ziaraat.Com

عمیر کی جگہ بصیر لکھتا تھا۔ اسی کے بارے میں آیت ۱۶: ۱۰۶ یا ۶: ۹۳ نازل ہوئی[16] یہ ان چھ آدمیوں میں سے ایک تھا کہ فتح مکہ کے دن پیغمبرؐ نے جن کے قتل کا حکم دیا تھا[17] مگر اس کے رضاعی بھائی عثمان چند دنوں بعد اس کو رسول اللہ کے پاس لے کر آگئے اور اصرار کیا کہ اس کی ضمانت لے لیں۔ کچھ دیر رسول اللہ نے تامل فرمایا اور پھر اس کو امان دیدی[18]۔ جب یہ لوگ چلے گئے تو پیغمبرؐ نے صحابہ سے فرمایا کہ تم میں سے کسی نے اس کی گردن کیوں نہیں اڑائی۔ ایک انصاری نے عرض کیا کہ ہم آپؐ ہی کی طرف متوجہ تھے کہ آپؐ اشارہ فرمائیں۔ پیغمبرؐ نے فرمایا: پیغمبروں کے یہاں آنکھوں کے اشارے نہیں ہیں[19]۔

اس طرح یہ شخص بھی طلقاء میں سے تھا۔ بعد میں اس نے توبہ کی۔ سو کیا[20]

ایک دوسرے خیانت کار کاتبِ وحی کا ابن ابی داؤد ذکر کرتا ہے[21] مگر اس کی صحیح شناخت نہیں ہو سکی ہے اور اس کی سرگزشت بھی مختلف ہے۔ اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ زمین نے اس کی میت رد کر دی تھی اور (قبر کے) کونے میں پھینک دیا تھا۔

مگر سارے کاتبانِ وحی صداقت و ایمان کے ایک ہی معیار پر نہیں تھے۔ متقی مومن جیسے حضرت علیؑ، سالم اور کئی پاک و پاکیزہ اعتقاد رکھنے والے اور اسلام پر جان چھڑکنے والے بھی موجود تھے۔ ان کے پاس جو بھی تھا وہ اسلام کی راہ میں قربان کرتے۔ اوپر کی مثالوں میں جن خائنوں کا ذکر ہے ان کا طرزِ عمل ان کی پلید طبیعت اور طینت کا مظہر ہے۔ پیغمبرؐ تو خود جو کچھ نازل ہوا ہوتا اس کو ہر سال جبرئیلؑ سے دہراتے۔ صحابہ سے کہتے کہ جو کچھ قرآن جانتے ہیں وہ آپؐ کو سنائیں۔ رات اور دن قرآن کا مسلمانوں کی زبان سے ورد ہوتا تھا۔ ایسی روشنی کو کون دھندلا سکتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ سارے کاتبانِ وحی ایک ہی معیار کے نہیں تھے۔ بعض کتابت بہت عمدہ طریقے سے کرتے۔ کچھ ایسے تھے جو اس فن میں اتنے ماہر نہیں تھے۔ ان میں سے بعض جیسے زید اور اُبَیّ سریانی اور عبری زبان بھی جانتے تھے۔ زید اور اُبَیّ جیسے لوگ زیادہ تر وحی کی کتابت کرتے۔ کچھ دوسرے آیات بھی لکھتے اور خط اور رسالے بھی لکھا کرتے۔

یہ تو عام فہم بات ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کو، خصوصاً آخری سالوں میں، وحی کی کتابت کے علاوہ لکھنے اور کتابت کے دوسرے کام بھی بہت تھے۔ قرب و جوار کی ریاستوں اور سلطنتوں کے امرا اور حاکموں کے نام خطوط اور اصحاب کے لیے جنگ میں شرکت کے لیے خطوط بھیجے جاتے۔ پھر وہاں سے رپورٹیں آتیں۔ اطراف سے خطوط آتے۔ عہد و پیمان لکھے جاتے۔ آپؐ دستور العمل صادر فرماتے۔ صدقات اور زکوٰۃ معین فرماتے ان سب باتوں کے لیے نظم و تنظیم کی ضرورت تھی اور اس کی بنیاد آپؐ نے رکھی۔ مگر اصلی اور بنیادی کام تو بہر حال وحی

---

[16] ابن سعد ۲: ۱/ ۷۸ س ۱۸ و ۱۹ -

[17] ایضاً ۲: ۱/ ۹۸، سیرہ - ابن حزم ۲۳۲ -

[18] طبری ۱: ۱۶۳۹ -

[19] ابو داؤد: صدود ۱، جہاد ۱۱۷، نسائی: تحریم ۱۴ -

[20] بحار الانوار ج ۱۹ ب ۳ ط۔ قدیم مولوی اشارہ بائی بدو دارد: مثنوی ۱: ۱۹۹۱ دا: بیت ۳۳۹۶ و ۳۴۱۲ -

[21] کتاب المصاحف ۳ -

کی کتابت تھی۔

سب سے زیادہ اور دوسروں سے کہیں پہلے اس کام میں جو آپ کے معاون و مددگار رہے وہ علیؑ تھے۔ ان کے پیچھے اُبیّ اس کام میں معاونت کرتے۔ بعد میں زید نے کتابت سیکھی اور اس گروہ میں شامل ہو گئے۔ وہ جوان بھی تھے اور ان کی رہائش آنحضرتؐ کے قریب تھی اس لیے جب بھی ضرورت ہوتی ان کو بلا بھیجتے اور کتابت کرواتے۔ حضرت علیؑ کے بارے میں سب ہی کا اتفاق ہے کہ آپؑ کاتبانِ اولیا اور ملازم وحی تھے[۱۲۲] پھر اس کے باوجود کہ ابن حجر جیسوں نے آپؑ کا ذکر نہیں کیا ہے[۱۲۳] افسوس اس بات کا ہے کہ جنہوں نے کاتبانِ رسول اللہ کے ناموں کی فہرست دی ہے وہ بغض اور حبِ شخصی سے خالی لوگ نہیں ہیں۔ کبھی یہ فہرست سیاسی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ اسی لیے ان کی تحقیقات تاریخی نقطۂ نگاہ سے دقت اور محنت سے کرنی چاہیے۔ کاتبِ وحی کی حیثیت سے مشہور ہونا افتخار کا باعث تھا۔ اس افتخار کے حصول کے لیے ضروری تھا کہ روایت اس بارے میں نقل کی جائے۔ یہاں لازم نہیں تھا کہ ان ناموں کو آنحضرتؐ کی زبان سے ادا کیا جاتا کیونکہ اس میں بہت احتیاط برتنی پڑتی تھی۔ بس ایک صحابی کی زبان سے کچھ کہلوا دیا جائے دعویٰ کرنے والے کا زور اور زر اس قول کو شہرت دے دیتا۔ یہ ایسا افتخار تھا کہ بڑے سے بڑے لوگوں کے لیے بھی شرفِ عظیم شمار ہوتا۔

ایسے ہی مصنوعی افتخار اموی اور عباسی حکومتوں کی دستاویز کی شکل میں ایجاد ہوئے۔ ابوسفیان، یزید اور معاویہ جن کا نام کاتبانِ وحی کی فہرست میں شامل کیا گیا وہی لوگ تھے جنہوں نے فتح مکہ کے دن تک پیغمبرؐ کے خلاف کسی طرح کی دشمنی سے دریغ نہیں کیا۔ یہاں مناسب ہوگا اگر ایک عرب مصنف سے اس سلسلے میں کچھ اقتباس پیش کیا جائے، جس میں شیعہ رجحان کا شائبہ تک موجود نہیں۔ یہ مصر کے ڈاکٹر طٰہٰ حسین ہیں جو لکھتے ہیں :۔

"ابوسفیان وہی شخص ہے جو خندق کے روز قریش کا سردار تھا، اور عربوں کو پیغمبرؐ کے خلاف اکساتا تھا اور یہود سے دوستی کرتا تھا کہ جو عہد و پیمان انہوں نے پیغمبرؐ اور ان کے صحابہ سے کیے تھے وہ توڑ ڈالیں... مسلمان معاویہ اور اس جیسوں کو جو بالکل آخر میں اسلام لائے یا پیغمبرؐ نے مکہ فتح کرنے کے بعد ان کو معاف کر دیا تھا "طلقاء" یا آزاد کردہ پکارتے تھے۔ یہ پیغمبرؐ کے اس خطاب کی طرف اشارہ تھا جو آپؐ نے فرمایا تھا کہ جاؤ تم کو آزاد کیا"[۱۲۴]

معاویہ کاتبوں میں سے ایک تھا مگر یہ حتمی طور سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کاتبِ وحی تھا یا نہیں۔ مدائنی (م ۲۲۵ھ) کہتا ہے کہ زید بن ثابت وحی لکھتا تھا اور معاویہ پیغمبرؐ اور اعراب (صحرانشینوں) کے درمیان جو ضروری تحریر ہوتی وہ لکھتا[۱۲۵] مگر جو اسناد موجود ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ بعض رسائل اور عہدنامے بھی معاویہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے[۱۲۶] مگر ابوسفیان اور یزید کے بارے میں اور کچھ نہیں

---

۱۲۲ عقد الفرید ۳ : ۵، بحار الانوار ۱۸ : ۲۷۰ جدید، اعجاز القرآن۔ رافعی۔ ۳۵۔

۱۲۳ اصابہ میں ابن حجر حضرت علیؑ کی جگہ معاویہ کو کاتبانِ وحی میں سے شمار کرتا ہے۔ تذکرۃ الحفاظ۔ ذہبی اور اعلام۔ زرکلی بھی خاموش ہیں۔

۱۲۴ علی و فرزندان۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین۔ فارسی ترجمہ احمد آرام ص ۱۲۔

۱۲۵ شرح المواہب ۳ : ۱۹۰، نسیم الریاض۔ شہاب نقل از کتانی ۱ : ۱۲۱، علامہ حلی اپنی کتاب کشف الحق اور نہج الصدق میں امیر معاویہ کا اسلام لانا آنحضرتؐ کی رحلت سے پانچ ماہ پیشتر لکھتے ہیں۔

۱۲۶ مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ۔ کتاب کے آخر میں فہرست ہے۔

Presented by Ziaraat.Com

تھا۔ عمرو بن عاص اور خالد بن ولید جو آخری سالوں میں اسلام لائے وہ بھی اکثر کاموں پر مامور رہے؎ چنانچہ ان کو کتابت کا موقع نہیں ملا۔

کہیں یکساں نام کی وجہ سے بھی مشکل پیش آئی ہے۔ بعض لوگوں نے حصین بن نمیر کو بھی کاتبانِ وحی میں شمار کیا ہے؎ ایسا ہی ایک نام تاریخ میں دوسری نوعیت کی شہرت کا حامل ہے۔ یہ عبداللہ بن زیاد کے لشکر کا سالار تھا اور اس نے کعبہ پر منجنیق برسائی تھیں۔ اس کا بھی یہی نام تھا۔ بظاہر ہے کہ ان دونوں میں محض نام مشترک ہے یہ دونوں دو الگ الگ اشخاص ہیں؎ چنانچہ ان ناموں کا ذکر کرتے ہوئے بہت احتیاط برتنی چاہیے۔ خصوصاً جب وحی کی کتابت کرنے والوں اور رسائل اور عہد نامے اور خطوط لکھنے والوں میں امتیاز نہیں برتا گیا ہے اور سب کے نام گھلا ملا لیے جاتے رہے ہیں۔ ہم کو چاہیے کہ ان دونوں قسم کے ناموں میں امتیاز کریں۔

کچھ حضرات جیسے حضرت علیؑ، عثمان، اُبَیّ، زید، ابو موسیٰ، مصعب، حنظلہ بن الربیع رسولؐ اللہ کی دعوت پر کتابت کرتے۔ دوسرے لوگ اپنے رجحان و میلانات کی بنا پر وحی کو اپنے پاس لکھ لیتے اور قرآن حفظ کرنے کے لیے بھی آیات لکھ رکھتے۔

ایک اور نام جو کاتب کے طور پر آیا ہے سعید بن عاص (م ۵۹ھ) کا ہے۔ سعید حضرت عمر بن خطاب کی سرپرستی میں بڑا ہوا اور حضرت عثمان کے زمانے میں کاتبِ قرآن بنا۔ جب آنحضرتؐ کی رحلت ہوئی اس وقت یہ تقریباً ۹ سال کا لڑکا تھا؎ گویا کاتبانِ وحی میں کسی صورت بھی شمار نہیں ہو سکتا۔

حنظلہ بن الربیع کے بارے میں بھی کچھ بحث ہوئی ہے۔ وہ 'کاتب حنظلہ' مشہور تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب کوئی کاتب موجود نہ ہوتا تو اس کو بلاتے اور اس سے لکھواتے۔ اسی لیے 'کاتب حنظلہ' مشہور ہو گیا؎ جب کہ واقدی سے بلاذری نقل کرتا ہے کہ حنظلہ نے رسول اکرمؐ کے سامنے صرف ایک مرتبہ لکھا تھا؎ اور اس لیے اس نام سے مشہور ہوا۔ بہر حال اکثر کتابت جو اس سے منسوب ہے وہ ان خطوط کی ہے جو آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد خلفاء کے زمانے میں وہ لکھتا رہا؎

ایک مشکل اور بھی درپیش آئی ہے اور وہ محدث یا مؤرخ کا نام یا کسی اور بات میں غلطی کا ارتکاب ہے۔ یہ غلط اندراج مسلسل اگلی کتابوں میں نظر آتا چلا جائے گا اور کچھ عرصے بعد یہ 'حقیقت' کا رنگ اختیار کر لے گا۔ یہ غلطیاں بعض اوقات بڑی مضحکہ خیز ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر کاتبوں کے ناموں کی فہرست کے آخر میں کسی نے 'سجل' کا لفظ لکھ دیا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ یہاں تک فہرست کے ناموں کی تصدیق ہو چکی ہے۔ (تسجیل بمعنی تصدیق)۔ بعد میں اپنی کتابوں میں نقل کرنے والوں نے "السجل" کو کاتبوں کے ناموں میں سے ایک نام کے طور پر

؎ مکاتیب الرسول ۲۶۔

؎ التنبیہ والاشراف، مسعودی ۲۴۵، ان کو ریجانب الامام، عباد، تاریخ یعقوبی، مرحسنین اور وغیرہ کا اکثر خصوصی مکاتبات میں ذکر کرتے ہیں۔ کتانی ۱: ۱۲۳۔

؎ اس شخص کی تاریخی اہمیت واضح نہیں ہے ایسے ایک آدمی کو ابن قتیبہ کاتبوں میں شمار کرتا ہے۔ (معارف ۳۴۲) ابن حجر اس کی حقیقت کی تردید کرتا ہے۔ (اصابہ ۲: ۲۲-۲۱) ابن حزم اس نام کے دو آدمیوں کا ذکر کرتا ہے۔ ایک حصین بن نمیر بن اسامہ (قبیلہ بنی حشیش) جو قاتلانِ امام حسینؑ میں سے تھا (جمہرۃ ۲۲۸) مختار کے زمانے میں کوفے کے نزدیک ابن زیاد کے ہاتھوں قتل ہوا۔ دوسرا حصین بن نمیر بن نائل۔ مگر یہ لوگ کاتبِ وحی نہیں ہو سکتے۔

؎ ابن سعد ۵: ۲۰۔

؎ عقد الفرید ۴: ۱۶۴، التنبیہ والاشراف ۲۴۶۔

؎ فتوح البلدان ۴۵۹، معارف ۳۰۰۔

؎ مجموعۃ الوثائق السیاسیہ ۲۹۲-۳۰۱۔

Presented by Ziaraat.Com

سمجھا اور پیش کر دیا گیا[۳۴] اسی لیے اس پر زور دیا جاتا ہے کہ بغور مطالعہ اور تحقیق کی جایا کرے۔
لکھنے کے طریقے کے بارے میں بھی عرض کیا جا چکا کہ جب کوئی آیت نازل ہوتی تو پیغمبر اکرم کسی کاتب کو بلا بھیجتے اور لکھنے کا حکم فرماتے تھے[۳۵] کاتب بہت احتیاط سے آیت کو لکھ لیتا اور پھر پیغمبر گرامی کو سناتا۔ کبھی کبھی آپ کسی لفظ پر انگلی رکھتے اور اس کے بارے میں دریافت فرماتے۔ آپ خود حکم فرماتے کہ کس آیت کو کہاں رکھا جائے۔ اس کی مثالیں گذشتہ صفحات میں نظر سے گذریں۔ آخر عمر میں صاف صاف اور صحیح طور پر لکھنے اور حروف کشیدہ یا دندانہ دار لکھنے کے بارے میں لوگوں کو سمجھاتے۔

پچھلے صفحات میں ہم نے یہ بھی دیکھا کہ جب بھی کوئی قبیلہ اسلام لے آتا پیغمبر اکرم کچھ صحابہ کو ان کے پاس قرآن سکھانے اور احکام کی تعلیم دینے کے لیے روانہ فرماتے۔ یہ ظاہر بات ہے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ لکھی ہوئی آیات قرآنی بھی یقیناً ہوتی ہونگی۔ "خط وحی" کا ایسا رواج ہو گیا تھا کہ اس کی مثال بیان کی جاتی۔ حسان بن ثابت (م ۵۴ ھ) مداح سرائے محمد کے ان اشعار پر نظر ڈالیں جو انہوں نے جنگ بدر کے بعد آپ کی مدح میں کہے تھے تو ان میں لطیف کاغذ پر "خط وحی" کا ذکر ملتا ہے[۳۶] اس سے ان کی مراد صحائف قرآنی ہیں جو لوگوں کے پاس لکھے ہوئے موجود تھے۔

یہ وہ سلسلہ تھا کہ نزول وحی کے ساتھ ہی ساتھ آیات قرآن سینہ بہ سینہ اور دست بدست پہنچنے لگتیں۔ جو پڑھنا نہیں جانتا تھا وہ سن کر حفظ کرتا اور دوسروں تک پہنچاتا جو لکھنا جانتے وہ اپنے لیے ایک نسخہ تیار کرتے جو ہمیشہ ان ہی کے پاس رہتا۔ معلمین جن کے ذمے قرآن سکھانا تھا اپنے ساتھ ایک نسخہ رکھتے جس سے وہ دوسروں کو تعلیم دیتے۔ ہم کو اس کی مثالیں اسلام اور پیغمبر کی دعوت کے آغاز سے ہی ملتی ہیں جو قرآن کے شروع ہی سے دور دور تک رواج پانے کی گواہ ہیں۔ ان واقعات کو محدثین و مورخین نے طرح طرح سے بیان کیا ہے۔ قدیم ترین اور موثق ترین روایت کا ہم یہاں ذکر کر رہے ہیں۔

اس روایت کو ابن اسحاق سے نقل کیا ہے۔ طول طویل ہونے کے باوجود یہ قرآن کے اندر ایک کشش اور جذب کی کیفیت کو اجاگر کرتی ہے۔ یہ روایت مصدقہ بھی ہے۔ اس کو دوسرے انداز سے بھی نقل کیا گیا ہے اور اس کے مطالب سے اس کے صحیح ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

پیغمبر اسلام کے چچا حضرت حمزہ کے اسلام لانے کے تین چار دن بعد اور بعثت کے ۶ سال بعد اور ہجرت سے سات سال پہلے کی بات ہے۔ عمر بن خطاب اس وقت ۲۶ سال کی عمر کے تھے۔ قوی اور توانا تھے اور اپنے لوگوں میں تفوق بھی رکھتے تھے۔ اپنے زمانے کے مطابق تربیت بھی پائی تھی اور لکھنا پڑھنا بھی جانتے تھے[۳۷]

---

۳۴ ملاحظہ کریں السنن کبری ۔ بیہقی ۱۰، ۱۲۴۔ اسد الغابہ ۲: ۲۹۱، اصابہ ۲: ۱۵۔ ابی داؤد، نسائی اور ابن مردویہ، مکاتیب الرسول ۔ احمدی ۲۵۔ مقدمہ بلاشری ۱۶، کاسانوا ۔ ۱۰۲۔ تاریخ الخمیس ۔ دیار بکری ۔ ۱

۳۵ ملاحظہ کریں: بخاری: تفسیر سورہ نساء ۱۸، فضائل القرآن ۲ و ۳۔ ۱۰ احکام ۲۷، ترمذی: تفسیر سورہ نساء ۔ ۱۹، ابن سعد ۳: ۵۹/۲، احمد ۳: ۱۲۰، ۲۴۵ و ۳۸۱ ۔

۳۶ دیوان حسان ۔ طبع ہرشفلڈ ۔ ص ۱۵۔ اس سے پہلے بھی ایک بار لبید نے اپنے معلقہ اس نوشتے کے بارے میں جو سنگ پر ہو یہ لکھا ہے کہ "فمدافع الریان عری رسمها خلقا کما ضمن الوحی سلامها" (شرح القصائد السبع ۔ انباری ۵۱۹) بظاہر اس کے بھی وہی معنی نکلتے ہیں۔

۳۷ ابن سعد ۳: ۱/۱۹۲، بلاذری ۵۸۰ ۔

اس زمانے میں تبلیغ کے پانچ چھ سال گذرنے کے باوجود ابھی مسلمانوں کی تعداد قلیل تھی۔ اسی چھوٹے سے گروہ کے ۸۲ افراد مکہ والوں کی دشمنی اور عقوبت کی تاب نہ لاکر، وطن چھوڑ کر حبشہ ہجرت کر گئے تھے اور وہاں نجاشی کی پناہ حاصل کی تھی۔ باقی ۳۹ مرد اور ایک خاتون جو مکہ میں رہ گئے تھے وہ اپنی عبادات اور مذہبی رسومات کو پوشیدہ رکھنے پر مجبور تھے، حتیٰ کہ اپنے عزیز و اقارب سے بھی چھپ کر قرآن کی آیات سیکھتے اور پڑھتے تھے۔

اس زمانے میں پیغمبر اکرمؐ کچھ عرصے سے ابن ارقم کے گھر میں رہ رہے تھے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اس زمانے کی جدوجہد اور پوشیدہ تبلیغ و ارشاد کی کیفیت تاریخ میں درج نہیں ہوئی اور آج سب کی نگاہوں سے پنہاں ہے۔ مکہ میں تحریک اسلامی زوروں پر تھی۔ حبشہ میں بھی مہاجرین تبلیغ کی بھرپور کوششیں کر رہے تھے۔ قریش بھی اپنی جیسی کوشش کیے جا رہے تھے۔ انہوں نے مہاجرین کو واپس لانے کے لیے اپنے آدمی بھیجے۔ مگر وہ نامراد واپس آئے۔ مکہ میں بھی پیغمبرؐ اور آپؐ کے پیروؤں کے ساتھ کسی بھی دشمنی سے دریغ نہیں کر رہے تھے۔ مختصر یہ کہ قریش نے اسلام کے پھیلنے کے خلاف ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہوا تھا۔

اس فضا اور غضب و انتقام کے ماحول میں ایک دن عمر نے فیصلہ کیا کہ پیغمبرؐ کو قتل کر دیں اور اس طرح سارے قصے کا خاتمہ ہی کر دیا جائے۔ وہ پرعزم انسان تھے۔ قد ان کا اس قدر بلند تھا کہ مکہ میں ان کے مقابل کا دوسرا نہیں تھا۔ بعد میں جب مدینہ میں مسجد بنائی جا رہی تھی اور عمر مسجد میں آتے تو ان کا سر مسجد کی چھت سے لگتا۔

چنانچہ اس دن انہوں نے ہاتھ میں تلوار لی اور ننگی تلوار لہراتے ہوئے روانہ ہوئے کہ پیغمبرؐ کو تلاش کر کے ان کا کام تمام کر دیں۔ راستے میں ان کو نعیم بن عبداللہ النحام ملے۔ نعیم نے ان کو اس کیفیت میں دیکھا تو پوچھا کہ آخر کہاں جا رہے ہیں اور ارادہ کیا ہے؟ عمر نے جواب دیا میں چاہتا ہوں کہ محمدؐ، اس صابی[۳۹] کو جس نے قریش کے درمیان تفرقہ ڈال دیا ہے، ان کے دانا لوگوں کو دیوانہ بنا رکھا ہے، ان کے خداؤں کا مذاق اڑاتے اور ان کو برا بھلا کہتے ہیں، ان کے دین کو معیوب بتاتے ہیں، ان کو آج قتل کر ڈالوں۔

نعیم پہلے ہی اسلام لا چکا تھا مگر دوسروں پر اظہار نہیں کیا تھا۔ کسی کو ابھی تک خبر نہیں تھی کہ وہ بھی مسلمان ہو چکا ہے اور عمر کی اصطلاح میں وہ بھی "صابی" ہے۔ اس نے خطرے کو بھانپ لیا کہ یہ قدآور شخص فتنہ برپا کرنا چاہتا ہے۔ یہ دیکھ کر نعیم نے ہوشیاری سے بات کا رُخ پلٹ دیا۔

اس نے حضرت عمر کو جواب دیا: تم اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہو۔ کیا تم خیال کرتے ہو کہ اگر تم محمدؐ کو قتل کر دو گے تو بنی عبد مناف تم کو زندہ چھوڑ دیں گے؟ خود اپنے گھر جاؤ اور اپنے عزیزوں رشتہ داروں کی حالت جا کر دیکھو۔

یہ کاری ضرب تھی۔ ایک طرف دھمکی تھی اور دوسری طرف قبیلے کی حمیت تھی۔

حضرت عمر نے فوراً پوچھا: میرا کون سا رشتہ دار؟

نعیم نے بتایا کہ تمہارا چچیرا بھائی اور بہنوئی سعید بن زید[۴۰] اور خود تمہاری بہن فاطمہؓ یہ دونوں مسلمان ہو چکے ہیں اور محمدؐ کے پیرو ہو گئے

---

[۳۹] صَبَا، یعنی مائل ہونا۔ صابی اس کو کہتے تھے جو اپنے باپ دادا کے مذہب کو ترک کر کے نئے دین کو اپناتا تھا۔

[۴۰] سعید بن زید بن عمرو بن نفیل ان چار حنفاء سے تھا جو دین ابراہیمؑ کی جستجو میں رہتے۔ درحقیقت وہ عمر کے چچا کے بیٹے تھے اور ان کے بہنوئی بھی۔ لوگوں نے
(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

Presented by Ziaraat.Com

ہیں۔ تم کو جا کر ان کی خبر لینی چاہیے۔

عمر جو کہ پہلے دیوانہ وار پیغمبر اور مسلمانوں کی تلاش میں گھوم رہے تھے یکایک اچنبھے میں آ گئے کہ اسلام تو ان کی بہن کے گھر میں بھی پہنچ چکا ہے اور خود ان کو خبر نہیں ہے۔ سخت بے چینی اور غصے کی حالت میں بہن کے گھر کی طرف لپکے۔ ان کو اس کی خبر نہیں تھی کہ اس سے پہلے ان کے بھائی زید بھی اسلام لا چکے ہیں۔

اس وقت سعید بن زید کے گھر میں ایک صحابی جن کا نام خبّاب بن الارت تھا[۳۰] دونوں میاں بیوی کو قرآن پڑھا رہے تھے۔ یہ خبّاب پہلے لوہار کا کام کیا کرتے تھے اور تلواریں بناتے تھے[۳۱] یہ ان اولین لوگوں میں تھے جنہوں نے اپنے اسلام لانے کا اعلان کر دیا تھا۔ صاف صاف اور آشکارا اس مصیبت بھرے زمانے میں سب سے کہہ رکھا تھا کہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں[۳۲] اس کی سزا یہ ملی تھی کہ کافروں نے ان کی پیٹھ کی ساری کھال جلا دی تھی[۳۳] مسلمانوں پر سخت دن آ گئے تھے۔ بہت سوں کا روزگار ان کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ پیغمبر نے فرمایا تھا کہ ہر مسلمان اپنے بھائیوں میں سے ایک دو افراد کی کفالت اور سرپرستی کرے۔ اس وقت وہ ان میاں بیوی کو قرآن پڑھانے میں مشغول تھے[۳۴]

اتنے میں دروازے پر کھٹکا ہوا۔ کون ہے؟ میں ہوں عمر!

میاں بیوی فوراً اٹھے۔ خبّاب کو پیچھے کے کمرے میں بٹھا دیا اور صحیفہ جو پڑھ رہے تھے اس کو کسی کونے میں چھپا کر رکھ دیا۔ دروازہ کھولا اور حضرت عمر غصے میں بھرے ہوئے، ہاتھ میں تلوار لیے داخل ہوئے۔

یہ تم دونوں زور زور سے کیا بول رہے تھے؟

فاطمہ اور سعید دونوں نے ایک ساتھ کہا: کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اور تمہارے سننے کی بھی نہیں۔

عمر نے کہا کہ ہم سب جانتے ہیں۔ ہم کو معلوم ہے کہ تم دونوں محمد کے پیرو بن گئے ہو۔ یہ کہہ کر سعید پر حملہ کر دیا۔ فاطمہ اپنے شوہر کو بچانے کے لیے بیچ میں آئی تو زخمی ہو گئی۔ اور خون سے تر بتر ہو گئی۔

میاں بیوی دونوں چیخنے لگے، ہاں ہاں ہم دونوں مسلمان ہو گئے ہیں اور خدا اور اس کے پیغمبر پر ایمان لے آئے ہیں۔ تم کو جو کرنا ہے

بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ: حضرت عمر کا چچا زاد لکھ دیا ہے۔ سعید کی بہن عاتکہ حضرت عمر کی بیوی تھی۔ (جمہرۃ الانساب۔ ابن حزم ۱۵۱، اسد الغابہ ۲: ۸۰)۔ دوسری طرف حضرت عمر کی بہن کا نام فاطمہ نہیں بیان ہوا ہے۔ ان کا اصلی نام 'امیمہ' تھا اور کنیت 'ام جمیل' تھی (جمہرہ۔ ابن حزم ۱۵۱، اصابہ ت ۸۳۷ باب النساء) حضرت عمر کی بیٹی کا نام فاطمہ تھا جو اپنے چچیرے بھائی عبدالرحمن بن زید کی بیوی بنی (نسب قریش ۳۵۷ و ۳۶۲) ممکن ہے راوی نے بیٹی کا نام ان کی بہن کے لیے لکھ دیا ہو۔

[۳۰] ابن سعد ۳: ۱/۱۱۶۔

[۳۱] نسب قریش ۲۶۵، جمہرۂ ابن حزم ۱۲۱۔

[۳۲] ابن سعد ۳: ۱/۱۱۶۔

[۳۳] سنن۔ ابن ماجہ مقدمہ باب ۱۱، احمد ۵: ۱۱۰، ۱۱۱ و ۳۹۵:۶۔

[۳۴] روض الانف ۲: ۲۷۲ و ۲۷۳۔ خبّاب کا جب انتقال ہوا (۳۷ھ) تو اس کو صرف اس کا خوف لاحق تھا کہ تھوڑا بہت جو اس نے جمع جتھا کیا تھا اس کا اس سے حساب لیا جائے گا! (ابن سعد ۳: ۱/۱۱۷) حالانکہ اس سے دو تین سال پہلے حضرت عثمانؓ کے زمانے میں شمالی افریقہ میں عبداللہ بن سعد بن ابی السرح کے ہر ہر سپاہی کو تین ہزار مثقال (ایک مثقال = ۵ گرام) خالص سونا دیا گیا تھا...

www.Ziaraat.com Sabeel-e-Sakina

Presented by Ziaraat.Com

کرلو۔

بہن کا خون آلود چہرہ، اس کے شوہر کی خود اعتمادی اور اس سے بھی بڑھ کر دونوں کے ایمان سے سرشار ہونے کا حضرت عمرؓ پر گہرا اثر پڑا۔

دھیمی آواز سے بہن سے کہنے لگے: میرے آنے سے پہلے جو کچھ تم لوگ پڑھ رہے تھے وہ کیا تھا؟

اس شور شرابے میں وہ صحیفہ نگاہوں کے سامنے آگیا تھا۔ حضرت عمرؓ کی نظر اس پر پڑ گئی۔ کہنے لگے کہ یہ صحیفہ ذرا مجھے دو۔ میں بھی دیکھوں کہ محمد پر کیا نازل ہوا ہے۔

بہن کو اس نرم لہجے سے ایک امید پیدا ہوئی اور وہ یہ کہ اس کا بھائی بھی اسلام لے آئے۔ مگر پھر بھی ہر طرح مطمئن نہیں تھی وہ کہنے لگی مجھے ڈر ہے تم یہ مجھے واپس نہیں کرو گے۔

حضرت عمرؓ نے اپنے خدا کی قسم کھائی کہ وہ اس صفحے کو پڑھ کر بہن کو واپس کر دیں گے۔ پھر بھی بہن راضی نہیں ہوئی۔ آخر کار اپنے بھائی کو آمادہ کیا کہ غسل کریں اور پاک و پاکیزہ ہو کر صحیفہ ہاتھ میں لیں۔ حضرت عمر سخن شناس تھے۔ جو انہوں نے اس صفحے پر پڑھا اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوا۔ اس سے پہلے بھی کئی بار اتفاق ہوا تھا کہ قرآن کی آیات خود محمد کی زبان سے سنی تھیں جنہوں نے ان کے تار و پود کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا؎ وہ خدا کی تعلیمات اور بت پرستوں پر جو الزام تھا اس سے آشنا تھے۔ ان کے سسر زید اسی بات پر مکہ سے جلاوطن کر دیئے گئے تھے۔ اس قسم کی باتیں سن چکے تھے۔ مگر یہ پہلا موقع تھا کہ اس ہیجانی کیفیت کے بعد توجہ اور دلچسپی سے آیات الٰہی کو سنیں یا پڑھیں۔ حضرت عمر نے صحیفے کو اٹھایا اور پڑھنے لگے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"طٰهٰ ۔ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۔ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۔ تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ۔ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۔ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ۔ وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ۔ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۔ (۲۰ : ۱ ـ ۸)

طٰہٰ۔ ہم نے تم پر (یہ) قرآن اس لیے نہیں اتارا کہ تم مشقت میں پڑ جاؤ۔ یہ نصیحت ہے اس شخص کے لیے جو (اللہ سے) ڈرتا ہے۔ (یہ) اس کی طرف سے اترا ہے جس نے زمین اور اونچے آسمان کو پیدا کیا۔ (خدائے) رحمٰن عرش پر مستوی ہے اسی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے اور جو کچھ نمناک مٹی کے نیچے ہے۔ اگر تم پکار کر بات کہو تو یقیناً وہ (اللہ تعالٰی) پوشیدہ راز کو بھی جانتا ہے اور سب سے زیادہ چھپی ہوئی بات کو بھی اللہ تعالیٰ وہ ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسی کے لیے سب اچھے اچھے نام ہیں۔

اس سے پہلے انہوں نے بہت سے عمدہ کلام سنے تھے۔ عرب کے بازاروں اور میلوں ٹھیلوں میں صحرانشین شاعروں کے قصائد سنے تھے

؎ روض الانف ۳، ۲۷۷۔

Presented by Ziaraat.Com

سات معلقات کعب ان کو یاد تھے۔ شاعرانہ کاوشیں خوب سن رکھی تھیں، کاہنوں کے سجع اور ساحروں کی باتوں سے واقف تھے۔ وہ قصے کہانیاں بھی سنی ہوئی تھیں جو بچے سنتے ہیں تو سو جاتے ہیں اور جوان سنتے ہیں تو خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ مگر زندگی میں اس سے پہلے کبھی بھی ایسے عمیق و وسیع کلام سے ان کا واسطہ نہیں پڑا تھا نہ جس کی گہرائی کی حدود تک انسانی نگاہ جا سکتی تھی اور نہ جس کی وسعتوں کا انسانی فکر احاطہ کر سکتی تھی، نہیں! یہ دوسرے انداز کا کلام ہے۔ یہ انسانی ذہن کی پیداوار ہو ہی نہیں سکتی۔ اس میں ایسی روشنی اور ایسا جاذبہ ہے جو عقل کو حیران کر دیتا ہے۔ وہ بھی سنتے ہی اس سے متاثر ہوئے۔ ان ہی چند آیات نے ان کو تبدیل کر دیا۔ ایک بجلی گری جو ان کے وجود پر روشنی بکھیر گئی۔ کفر کا پردہ چاک ہو گیا۔ آخر کار زبان سے اقرار کیا کہ کیا عمدہ اور اعلیٰ کلام ہے!

وہ شخص جو غیظ و غضب میں تعصب جاہلی سے بھرا ہوا آیا تھا کہ جو بھی ہے اس کو نیست و نابود کر دوں گا اس وقت اس لامتناہی عظمت کے سامنے خوار اور زبوں کھڑا ہوا ہے۔ خباب جو اب تک اپنی جان کے ڈر سے چھپے بیٹھے تھے، باہر آئے اور عمر کے پاس جا کر ان کا بازو پکڑ کر ان کو جھنجوڑا اور کہا، عمر! خداوند عالم کی قسم مجھے امید ہے کہ تم پیغمبر کی دعوت قبول کرو گے۔

عمر نے دھیمی آواز میں کہا: محمد کہاں ہیں؟ مجھے وہاں لے چلو۔ میں بھی مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔

وہاں سے مسلمانوں کی پناہ گاہ (خانہ ارقم) گئے اور اپنے اسلام لانے کی خواہش ظاہر کی[۵۵]

دوسری باتوں کے علاوہ اس روایت سے بالکل واضح ہے کہ ان شروع سالوں ہی سے قرآن صحیفوں کی صورت میں لوگوں کے پاس موجود تھا۔ اس سے یہ بات تو قطعی روشن ہے کہ جب مکہ میں چھپ کر اسلام لانے اور مشرکین کے ہاتھوں سختیاں برداشت کرنے کے باوجود مسلمان قرآن لکھتے، پڑھتے اور صحیفے اپنے پاس قرائت کرنے کے لیے رکھتے تھے تو مدینہ میں جب ان کو ہر قسم کی آزادی تھی اور فتح و کامرانی مسلمانوں کے قدم چوم رہی تھی قرآن کے لکھنے لکھانے کا کام یقیناً آسان اور اس کی رفتار تیز ہو گی۔ چنانچہ عہد سعید نبوی کے آخر تک قرآن کے بے شمار نسخے مسلمانوں کے ہاتھوں میں یقیناً ہوں گے۔

حفظ کرنے کی حوصلہ افزائی کر کے اور متن آیات کے لکھنے کی ترغیب دے کر پیغمبر اکرم قرآن کی مکمل حفاظت کا اطمینان کر رہے تھے چاہتے تھے کہ لکھنے میں غلطی یا بھول چوک ہو تو حافظے سے اس کی تصحیح کی جا سکے اور حفظ کرنے میں جو نقص رہ جائیں ان کی لکھے ہوئے قرآن کے ذریعے درستی کر لی جایا کرے۔ کتابت سے حافظہ کی کمک ہوتی تھی اور حافظے سے کتابت کو مدد ملتی تھی۔ یہ بنیادی اور اصولی طریقہ کار ایسا جاری ہوا کہ صدیاں گذر جانے کے بعد آج بھی اس کی افادیت ویسی ہی موجود ہے۔ اب تو اس طریقہ کار کو تقدس بھی مل گیا ہے۔ نسل بعد نسل اس کو برقرار رکھا گیا ہے۔ آج جب کہ کروڑوں نسخے طبع شدہ اور خطی ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں مگر قرآن حفظ بھی کیا جاتا ہے اور حافظے کی تصحیح کے لیے کتابت شدہ قرآن سے مدد لی جاتی ہے۔

---

[۵۵] حضرت عمر کے اسلام لانے کی باقی داستان بھی دلچسپ ہے۔ اور پیغمبر اسلام کی شجاعت جبلی کی اعلیٰ مثال بھی جاتی ہے۔ مندرجہ بالا روایت تفصیلی ترجمہ نہیں ہے مگر ابن اسحاق کی روایت پر مبنی ہے جس کو ابن ہشام نے نقل کیا ہے۔ سیرہ ۱: ۳۶۶۔ مزید ملاحظہ کریں: راہ محمد (ترجمہ عبقریہ محمد از عباس محمود عقاد) ترجمہ فارسی ڈاکٹر اسداللہ مبشری ص ۳۵۔ طبع چہارم۔ سردمن الانف۔ سہیلی۔ ۲: ۲۶۴ طبع وکیل، بخاری، مناقب الانصار ۳۵، ابن سعد ۳: ۱/۱۹۱ و ۵: ۱۹۱ و ۸: ۱۹۵، احمد ۱: ۱۷، تاریخ خمیس ۱: ۳۳۰ طبع اول ۱۳۰۲ مصر۔

Presented by Ziaraat.Com

آیاتِ الٰہی کی ایسے معلّم سے شناخت اور تصدیق کرائی جاتی ہے جو حافظ بھی ہو اور سند کے سلسلے سے اچھی طرح واقف بھی ہو۔ پھر یہ تعلیم تعلم آگے بڑھ کر اگلی نسل کے حوالے کر دی جاتی ہے۔ اس طرح تعلیمِ قرآن جاودان ہو گئی۔ حفظِ قرآن کتابت کا مددگار ثابت ہوا اور کتابت حفظ کرنے میں معاون ہوئی۔

کس چیز پر لکھا جاتا تھا

عرض کیا گیا تھا کہ کاتبانِ وحی قرآن کی آیات کو جس چیز پر بھی لکھ سکتے لکھ لیتے۔ اب یہ پتہ چلانا ہے کہ (اس زمانے میں) ان کے پاس لکھنے کے ذرائع اور وسیلے کیا تھے؟

پہلا ذریعہ اور منبع جو دوسرے مواقع کی طرح اس بارے میں ہماری بہتر رہنمائی کر سکتا ہے وہ قرآن ہی ہے۔ اس کی طرف رجوع کرنے سے ہم کو بہت سی معلومات مل سکیں گی۔ قرآن میں حسبِ ذیل چیزوں کا ذکر ملتا ہے[1]

۱۔ اقلام۔ قلم کی جمع۔ یعنی خامۂ تراشیدہ۔ یہ قرآن میں چار جگہ آیا ہے منجملہ ۳:۴۴۔

۲۔ حریر۔ جو کاغذ کی جگہ لکھنے کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے۔ ۲۳:۲۲۔

۳۔ دہان۔ دہن کی جمع۔ یعنی کھال اور سرخ چمڑہ۔ ۳۷:۵۵۔

۴۔ رَق۔ نازک اور باریک پوست اور کھال جس پر لکھا کرتے تھے۔ ۳:۵۲

۵۔ سجل۔ یعنی عہد نامہ اور نامہ۔ ۱۰۴:۲۱۔

۶۔ صُحف۔ صحیفہ کی جمع۔ یہ قرآن میں آٹھ بار آیا ہے۔ ۱۳۳:۲۰۔

۷۔ قرطاس۔ یعنی کاغذ۔ ۷:۶۔ اس کی جمع قراطیس ہے۔ ۹۱:۶۔

۸۔ کتاب۔ یہ لفظ بہت آیا ہے۔

۹۔ مداد۔ وہ مرکب جو لکھنے کے کام آتا ہے۔ ۱۰۹:۱۸۔

احادیث اور تاریخ کے مطالعے کے دوران پیغمبرؐ کے زمانے میں لکھنے پڑھنے کے ان ذرائع کا اکثر ذکر ملتا ہے۔

اسلامی ذرائع کے حوالے سے شوالی[2] نے ایک مفصل فہرست تیار کی ہے جس میں لکھنے کے مختلف ذرائع کا ذکر ہے جو کاتبانِ وحی استعمال کرتے تھے۔ یعنی:

۱۔ رِقاع۔ رقعہ کی جمع۔ چمڑے، چھال یا کاغذ کا رقعہ۔

۲۔ لِخاف۔ لخفہ کی جمع۔ باریک صفحے اور سفید سنگ

۳۔ عُسُب۔ عسیب کی جمع۔ بغیر پتے کی لکڑی۔ خرما کے درخت کا تنہ۔

---

[1] اسی مصنف کی کتاب فہارس القرآن۔ باب اشات، طبع ۱۳۴۲ تہران۔

[2] تاریخ قرآن۔ نولدکے، ۲: ۱۳ ح ۲، در آستانہ قرآن ۲۸ و ۲۹ ح ۱۸۔

Presented by Ziaraat.Com

۴ ۔ اکتاف ۔ کتف کی جمع ۔ گوسفند یا اونٹ کے کندھے کی ہڈی جس کو رندہ کر لیتے تھے ۔
۵ ۔ اضلاع ۔ ضلع کی جمع ۔ یعنی حیوانات کی پسلی کی ہڈی جو صاف کر لی جاتی تھی ۔
۶ ۔ ادیم یا قطع ادیم ۔ چمڑے یا دباغی کیے ہوئے پوست کے ٹکڑے ۔
۷ ۔ اقتاب ۔ قتب کی جمع ۔ لکڑی جو اونٹ کی پیٹھ پر رکھا کرتے تھے ۔
۸ ۔ قراطیس ۔ قرطاس کی جمع ۔ یعنی کاغذ ۔
۹ ۔ حریر ۔ ریشم کا کپڑا جو اکثر لکھنے کے لیے استعمال ہوتا رہا ۔
۱۰ ۔ لوح ۔ اس کی جمع الواح ہے ۔ لکڑی یا ہڈی وغیرہ کا چوڑا ٹکڑا جس پر لکھا کرتے تھے ۔
۱۱ ۔ قضیم ، صحیفہ بیضاء ۔ سفید رنگ کی کھال ۔

یہ وہ وسائل تھے جو اس زمانے میں استعمال ہوا کرتے تھے[۵۳] قرآن کی آیات لکھنے کے لیے اصحاب رسول بھی ان ہی چیزوں سے استفادہ کرتے ۔ اس سلسلے میں ایک دوسری چیز سے بھی ہماری رہنمائی ہوتی ہے جن کا پیغمبر اکرم کے خطوط کے بارے میں ذکر ہوا ہے ۔ ان خطوط کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں زیادہ تر حیوانات کے دباغت شدہ اور باریک چمڑے استعمال ہوئے ہیں ۔ یہاں تک کہ ہجرت کے موقع پر بیابان کے بیچ میں سراقہ بن مالک نے جب امان لکھ کر دینے کی درخواست کی تو پیغمبر نے حضرت ابوبکر سے اس کو لکھوایا ۔ یہ امان نامہ ادیم ، چمڑے یا کھال پر تھا[۵۴]

ہجرت سے پہلے ایک خط ، داریین ، کو لکھا گیا تھا ۔ اس کے لیے بھی دباغی کیا ہوا باریک چمڑا استعمال ہوا تھا[۵۵] اور آخر عمر میں آنحضرت جب تبوک پہنچے (سنہ ۹ھ) تو مالک بن احمر (یا احیمر) آپ کے پاس آ کر اسلام لایا اور امان نامہ کی درخواست کی ۔ جو نامہ اس کو لکھ کر دیا گیا وہ چمڑے کا ایک ٹکڑا تھا جو چار انگل چوڑا اور ایک بالشت لمبا تھا[۵۶]

اکیدر اور دومۃ الجندل کا خط قضیم (سفید کھال) پر تھا[۵۷] ان خطوں کے علاوہ اوروں کا بھی ذکر ہے[۵۸] جن سے پتہ چلتا ہے کہ زیادہ تر خطوط کھال پر اور دباغت شدہ چمڑے پر لکھے گئے تھے ۔

---

۵۳ منابع : بخاری ، احکام ۳۷ ، تفسیر سورۂ توبہ ۱۲۹ ، ترمذی : تفسیر نسائی ۱۷ ، احمد ۱ : ۴۳۵ ، ۵ : ۱۸۵ ، ۱۹۱ ، اتقان ۱ : ۲۰۳ ، ۲۰۷ و ۲۰۷ لوح ۱۸ ، ابن اثیر ۳ : ۶۸ ، واقدی ۳۸۸ ، ابن خلدون ۲ : ۳۶ ، ۱۳۶ ، مقدمتان ۲۱ ، مقدمہ تفسیر قرطبی ، تفسیر نیشاپوری ۱ : ۲۳ ، ابوالفداء ۱ : ۲۱۲ ، فہرست ابن الندیم ۲۴ ، ۲۷ ، تفسیر طبری ۱ : ۲۰ ، ۱۱ ، تاریخ طبری ۱ : ۱۸۰۶ ۔ ابن سعد ۲ : ۲ / ۳۷ ، فضائل القرآن ۔ ابن کثیر ۔ ۱۷ وغیرہ ۔

۵۴ مجموعۃ الوثائق السیاسیہ ۔ ص ۱۲ ۔

۵۵ ایضاً نامہ ۴۳ ۔

۵۶ ایضاً نامہ ۱۷۴ ۔

۵۷ ایضاً نامہ ۱۹۰ ۔

۵۸ ایضاً نامہ ۱۴۲ و ۲۱۶ و ۹۶ ۔ ۹۷ ، ۷۷ وغیرہ ۔

Presented by Ziaraat.Com

صحابہ کے زمانے میں خطوط رق یعنی باریک کھال خصوصاً پوست آہو پر لکھے جاتے تھے۔
یہ بات صحیح ہے کہ بعض اوقات قرآنی آیات لوح، کتف اور ہڈی پر بھی لکھی گئی تھیں مگر صرف ان ہی پر موقوف نہیں تھا بلکہ کاغذ بھی دستیاب تھا۔ کاتب وحی کی دسترس میں کاغذ بھی ہوتا تھا۔ عرب قدیم زمانے میں کاغذ سے واقف تھے۔ اس زمانے میں کاغذ ہندستان میں تیار ہوتا تھا وہاں سے یمن جاتا تھا۔ پھر گرمیوں اور سردیوں کے کاروانوں کے ساتھ یمن سے شام اور پھر وہاں سے روم بھیجا جاتا۔ عرب جنوب و شمال کی تجارت کا وسیلہ تھا۔ ایران کے جنوب، ہندستان یہاں تک کہ چین تک سے تجارتی سامان پہنچتا تو وہ شمال سے شام اور پھر روم پہنچایا جاتا۔ اسی طرح روم سے مال تجارت شمال سے جنوب کی طرف بھیجا جاتا۔ عرب کے وسط میں مکہ بہت اہم تجارتی مرکز تھا۔ کاروانوں کو مکہ میں ضرور رکنا پڑتا۔ اسی بنا پر مکہ کے لوگ بڑے سرمایہ دار تاجر ہوا کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ابو سفیان کے کاروان میں بار برداری کے دو ہزار اونٹ تھے۔ اس پیمانے کی تجارت کے لیے حساب کتاب اور کھاتہ بھی کی ضرورت ہے۔ لکھنے پڑھنے کی چیزیں ضروری ہیں۔ کاغذ (ہندستان سے) اگر عرب سے دوسرے علاقوں کو جاتا تھا تو عرب میں بھی اس کی بہرحال ضرورت تھی۔ چنانچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس زمانے کے عرب کے لوگ کاغذ و قلم سے واقف نہیں تھے اور ان کے پاس سوائے ہڈی، پتھر اور خرما کی لکڑی کے دوسری لکھنے کی کوئی چیز ہی نہیں تھی جس پر وہ قرآن کی آیات لکھتے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا خود قرآن شریف اس سلسلے میں بہترین گواہ ہے۔ ایک دو مثال سے بات واضح ہو سکے گی۔ قرآن میں آٹھ بار "صُحُف" کا لفظ (جو صحیفہ کی جمع ہے) آیا ہے۔ ایک دفعہ "مُنَشَّرَہ" کی صفت کے ساتھ۔ یعنی وسیع صفحے جو وحی کی طرف اشارہ ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

ان (کافروں) میں سے ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کو کھلے ہوئے صحیفے دے دیے جائیں (۷۴ : ۵۲)۔
یعنی اس پر خود وحی نازل ہو۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں وحی چوڑے صفحات پر لکھی جاتی تھی۔
یہ نزول کے آغاز کی آیات میں سے ہے۔ یعنی پہلی وحی اترنے کے سال دو سال کے اندر یہ وحی نازل ہوئی تھی۔
ایک دوسری جگہ وضاحت سے کتاب کے اوراق اور صفحات کے تہہ کرنے کا ذکر ہے اور آسمان کے تہہ بہ تہہ ہونے کا نوشتے کے تہہ کیے جانے سے تشبیہ دی گئی ہے (۲۱ : ۱۰۴)
قرآن عرب کے لوگوں کی زبان میں ان کے فہم کے مطابق نازل ہو رہا تھا، کیا ممکن ہے کہ اس میں ایسی مثالیں دی جائیں گی جو ان کی سمجھ سے باہر ہوں؟
بہت سی ایسی آیات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں کتابی صورت میں نسخے لکھنے کا رواج تھا اور ان کے لکھنے کے وسائل موجود تھے اور عربوں میں بھی اس کا چلن تھا۔

إِنَّا كُنَّا نَسْتَنسِخُ مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (۴۵ : ۲۹)
"یقیناً ہم لکھواتے جاتے تھے جو کچھ عمل تم کیا کرتے تھے۔"
یہ مکہ والوں سے خطاب ہے۔ اور لکھنے اور کتابت کی بات کی جا رہی ہے۔ پھر
حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهُ (۱۷ : ۹۳)

Presented by Ziaraat.Com

یہاں مکہ کے مشرکین کہہ رہے ہیں کہ ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے،
"جب تک تم ہم پر ایک کتاب نہ نازل کرو جسے ہم پڑھ لیں"
گفتگو کا انداز کہہ رہا ہے کہ کتاب یعنی لکھے ہوئے صفحات کے مجموعے کا تصور واضح ہو رہا ہے اس زمانے میں خاص طور سے یہود اپنی مقدس کتابوں کو کاغذ پر لکھا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں بہترین دلیل یہ آیت قرآن ہے؛

قَرَاطِيسَ تُبْدُونَهَا ... (۶:۹۱)

"(اے رسولؐ) کہہ دیں کہ وہ کتاب کس نے نازل کی تھی جس کو موسیٰؑ لے کر آئے جو انسانوں کے لیے نور اور ہدایت تھی۔ تم اس کو ورق ورق کرتے ہو جن کو تم ظاہر کرتے ہو اور بہت زیادہ کو تم چھپاتے ہو...؟"
چنانچہ یہود کی کتابیں کاغذ پر لکھی جاتی تھیں اور عرب ان سے شناسا تھے۔
علاوہ ازیں رسولؐ اللہ کی رحلت کے وقت صحابہ کے ہاتھوں میں مصاحف کی کچھ تعداد موجود تھی۔ اور مصحف کاغذ کے اس مجموعے کو کہتے ہیں جس پر کچھ لکھا گیا ہو۔
پیغمبرؐ نے خود رحلت کے وقت فرمایا، میرے لیے دوات اور صحیفہ لے کر آؤ تا کہ تمہارے لیے ایسی چیز لکھ دوں کہ میرے بعد گمراہ نہ ہو سکو۔[۹]

ان سب باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں کاغذ کا رواج تھا اور ایسا نہیں تھا کہ قرآن کی آیات صرف ان چیزوں پر لکھی جاتی تھیں جن کے نام پچھلے صفحات میں درج کیے گئے ہیں۔
جو احادیث اس بارے میں آئی ہیں وہ اس بات کو اجاگر کر رہی ہیں کہ قرآن کی جمع آوری کا کام زید بن ثابت کے سپرد کیا گیا تھا۔ ان میں اس کی تفصیل نہیں کہ لکھنے پڑھنے کا کیا سامان استعمال ہوتا تھا چنانچہ اس سلسلے میں کوئی کاوش نہیں کی جا سکی۔ حتیٰ کہ زید کے اس بات کے بیان میں بھی دقت نہیں کی گئی ہے۔ بہر صورت کاغذ کا رواج تھا یہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ و عثمانؓ کے زمانے میں مصاحف مکمل طور پر کاغذ پہ لکھے گئے، تقریباً ۱۵۰ھ تھا کہ یوسف بن عمرو مکی نے ایک قسم کے کاغذ کا بندوبست کیا[۱۰] اور وہ مستقل رواج پا گیا۔
اس زمانے میں کاغذ کے مروج ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ سرکنڈے کا قلم اور دوات لکھنے میں استعمال ہوتا تھا۔ اس کو محبرہ کہتے تھے۔ ایک حدیث بھی ہے کہ آنحضرتؐ نے کاتب کو حکم دیا کہ قلم کو اپنے کان پر رکھا کرے۔ وجہ یہ تھی کہ سرکنڈے کا قلم یہاں وہاں پڑا رہنے سے ٹوٹ جاتا۔

تالیفِ قرآن

ابھی تک ہم لوگ 'جمع قرآن' کی اس تعریف کے تحت کہ اس کے معنی 'حفظِ قرآن' کے ہیں مختلف روایات اور واقعات کی چھان بین

۹۔ "صحیفہ لے آؤ" ۔ احمد ۳: ۳۴۶ ۔ "کتاب لے آؤ" ۔ بخاری، علم ۳۹/ جہاد ۱۷۶، مسلم: وصیۃ ۲۰-۲۲، احمد ا: ۲۲۲ ...
۱۰۔ وفیات الاسلاف ۔ شہاب مرجانی، ۳۳۷، از کتانی ۲: ۲۴۲۔

Presented by Ziaraat.Com

کرتے رہے۔ اس "تعریف" کے بارے میں گفتگو اور بحث کی گنجائش ہے۔ پھر بھی ہم نے دیکھا کہ ۴۰ سے زیادہ صحابہ (مع ان کی فہرست کے) قرآن حفظ کیے ہوئے تھے۔ ان میں سے اکثر کتابت سے بھی واقف تھے۔ اگر مزید تحقیقات کی جائے تو پتہ چلے گا کہ ان کی تعداد ۴۰ سے کہیں زیادہ تھی۔

کاتبانِ وحی کے سلسلے میں بھی میں نے عرض کیا تھا کہ "کاتبِ وحی" کے معنی پر کافی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اگر اس سے مراد وہ "کاتبانِ وحی" ہیں جو رسول اللہ کے لیے مخصوص تھے تو وہ علیؑ، عثمان، ابی اور زید تھے۔ لیکن اگر وہ لوگ مراد ہیں جو اپنے لیے وحی کے نسخے لکھ کر رکھتے تو ان کی تعداد پچاس آدمیوں سے بھی یقیناً زیادہ تھی۔ ان میں سے کچھ حفاظ بھی تھے۔ علاوہ ازیں بہت سے ایسے لوگ ہیں جن سے نہیں پہنچے ہیں، خواہ ان کی قرائت یا مصحف کا ذکر موجود ہے۔ (یعنی ان لوگوں نے سارے قرآن کو دو جلدوں کے درمیان جمع کر لیا تھا مگر ان کے نام کہیں تحریر میں نہیں لائے گئے)۔

یہ بات طے شدہ ہے کہ کچھ لوگوں نے جیسے علیؑ، ابی، ابن مسعود، ابوموسیٰ، انس، عبداللہ بن عمرو، سالم ... نے رسول اللہ کے زمانے میں نزولِ وحی کے ساتھ ساتھ، اپنے اپنے لیے مصحف تیار کیا ہوا تھا۔ بعض نے رسول اللہ کی رحلت کے فوراً بعد ہی وحی جمع کرنے کا کام شروع کر دیا۔

اب یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ کیا اتنا بڑا کام بغیر آنحضرتؐ کے حکم کے انجام پا گیا۔ عقلِ سلیم کہتی ہے کہ ایسا ممکن نہیں۔

مگر اس بارے میں کتاب و سنّت کا کہنا کیا ہے۔

طریقہ یہ ہے کہ "حاکم" کے اتباع میں "جمع قرآن" کو تین دور میں تقسیم کیا جائے:

۱۔ عصر نبویؐ۔ ۲۔ حضرت ابوبکرؓ کا زمانہ۔ ۳۔ حضرت عثمانؓ کا دور۔

مگر ایسا بھی نہیں کہ یہ تقسیم بندی سب کے لیے قابلِ قبول ہو اور سب ہی کا اس پر اتفاق ہو۔

صحیح فیصلہ کرنے کے لیے دوبارہ بات لفظ "جمع" کی تعریف پر آ کر رک جاتی ہے۔ جب بھی جمع قرآن کی بات آئی ہے اس تقسیم بندی کے قبول کرنے والوں نے کبھی لفظ "جمع" کے معنی "حفظ کرنے"، اور کبھی "لکھنے"، اور کبھی تالیف اور گردآوری کے معنی بھی لیے ہیں۔ یہاں تک کہ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں فی الواقع اس سلسلے میں جو کام ہوا اس کو جمع آوری کا ہفتہ کام کہا گیا۔ جب کہ لفظ "جمع" کے خود اپنے معنی ہر حال موجود ہیں۔ ہم کسی صورت میں مطمئن نہیں ہیں جب انس بن مالک یا شعبی کہتے ہیں کہ قرآن چار یا چھ آدمیوں نے جمع کیا تھا یعنی ملر کر حفظ کر لیا تھا۔ اس سے یہ بات کہاں سے ثابت ہوتی ہے کہ مجموعہ اور مصحف موجود نہیں تھا۔

یہاں تک تو ان کی بات قبول کہ انہوں نے حافظوں اور کاتبوں کی فہرست ہم تک نقل کی۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ کتاب و سنت اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔

ابھی تک ہم لوگوں نے اندازہ کیا کہ پیغمبر اکرمؐ لوگوں کے زبانی اور لکھ کر قرآن سیکھنے سکھانے میں کس قدر اہتمام فرماتے اور صحابہ بھی کس قدر شوق و ہمت سے کام انجام دیتے اور اس کے لیے کیا کیا وسائل استعمال میں لاتے۔ اب ہم آخری مرحلے پر پہنچے ہیں اور وہ یہ دیکھنا ہے کہ ان سب کا نتیجہ کیا نکلا۔

اس عظیم تحریک کا نتیجہ یہ تھا کہ رسول اللہ کی رحلت کے وقت قرآن مجید پورے کا پورا اور جس طرح آخر میں صورت پذیر ہوا اسی صورت میں تالیف اور جمع ہو چکا تھا۔ اسی زمانے میں قرآن "تالیف" کے حقیقی معنوں میں جمع ہو چکا تھا۔ اور یہ بات کچھ آج نہیں کہی

Presented by Ziaraat.Com

جاری ہے۔ قدما بھی یہی کہہ چکے ہیں۔ بیہقی (م ۴۵۸ھ) کا بھی یہی نظریہ ہے[1] مگر تالیف سے کیا مراد ہے؟ بیہقی تالیف کو رسول اللہ کے کہنے کے مطابق سورتوں میں آیات کو جمع کرنے کو کہتا ہے[2] ابن عباس اور محمد بن حنفیہ (م ۸۱ھ) بھی اس سے پہلے اس کو "بین الدفتین" یعنی دو جلدوں کے درمیان مجموعہ کہہ چکے ہیں۔

جیسا کہ اس کتاب کا طریقہ کار ہے سب سے پہلے ہم یہ دیکھیں کہ کتاب و سنت سے ہم کو کیا دلائل ملتے ہیں۔ پھر یہ کہ اس بارے میں صحابہ نے کیا کہا ہے اور شہادتیں کیا ہیں۔

قرآن اپنے آپ کا اس طرح تعارف کراتا ہے:

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ (۲:۲)

یہ وہ کتاب ہے کہ جس میں کوئی شک نہیں۔

کتاب تکوین کے مطابق کتاب ہے جس کی اساس فطرت پر ہے اور جو خلقتِ عالم سے ہم آہنگ ہے۔

یہ کتاب ہے پڑھنے کے لیے۔ اس کی آیات جدا جدا کی گئی ہیں۔ ان لوگوں کے لیے جو دانا اور جاننے والے ہیں۔ یہ قرآن فصیح اور صاف کلام ہے۔ (۴۱:۳)

یہ کتاب برکت والی ہم نے تم پر نازل کی تاکہ لوگ اس کی آیات میں تدبر کریں (۳۸:۲۹)

یہ حکمت والی کتاب کی آیات ہیں۔ (۳۱:۲)

کتاب کے وجود کا تقاضا یہ ہے کہ الفاظ، آیات اور سورتوں میں نظم اور ارتباط ہو۔

قرآن خود اپنی جگہ ہمیشہ پیغمبر اکرم اور مشرکین مکہ کے درمیان کشمکش اور گفتگو کا موضوع رہا۔ یہ مشرکین آیاتِ الٰہی کو مکمل طور سے سمجھتے تھے اور اس کی تبلیغ سے آگاہ تھے اور اسی بنا پر اسلام سے جھگڑتے رہتے۔ پیغمبر کی تبلیغ سے شناسائی کے لیے مشرکین اور مومنین تعلیم و تدبر کے لیے آیات کو سنتے، سمجھتے اور یاد رکھتے۔

مشرکین کہتے:

یہ پہلوں کی کہانیاں ہیں جو انہوں نے گھڑ کر لکھوالی ہیں۔ اور یہی صبح و شام ان پر پڑھی جاتی ہیں۔ (۲۵:۵)

چنانچہ یہ بات ثابت ہے کہ مربوط نوشتے اور لکھے ہوئے اوراق موجود تھے کہ مشرکین کہہ سکیں کہ پیغمبر قرآن کو پہلوں کے قصوں سے لے کر لکھواتے ہیں۔

مکی آیات میں بہت سے موقعوں پر قرآن اور کتاب کے الفاظ ساتھ ساتھ آئے ہیں:

الٓرٰ۔ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ۔ (۱۵:۱)

طٰسٓ۔ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ۔ (۲۷:۱)

۱؎ برہان ۱: ۲۳۵۔

۲؎ المرشد الوجیز ۴۴۔

Presented by Ziaraat.Com

یہ کتاب اور واضح قرآن کی آیات ہیں۔
یہ قرآن اور بیان کرنے والی کتاب کی آیات ہیں۔
یعنی پڑھنے والا نوشتہ ہے۔ یہ پیغمبر اور پیغمبری کی سب سے بڑی نشانی ہے۔ یہ اس لیے نازل کیا گیا ہے کہ لوگوں کو پڑھ کر سنایا جائے۔
اس میں بے شمار مثالیں ہیں تاکہ اس کی آیات میں تدبر کریں۔

یہ قبل الہجرت فرمایا تھا:
یہ قرآن کریم ہے۔ جو پوشیدہ کتاب میں ہے۔ سوائے پاک لوگوں کے کسی کا ہاتھ اس تک نہیں پہنچتا۔ (۵۶، ۷۷ تا ۹۷)
اور بعثت کے شروع سالوں میں یہ آیت نازل ہوئی:
پس جو کوئی چاہے اس کو یاد رکھے۔ (وہ) عزت والے صحیفوں میں ہے (۸۰: ۱۲ و ۱۳)
بے شمار آیات ہیں جو اس آسمانی کتاب کے لکھے ہونے اور مجموعہ ہونے پر واضح گواہ ہیں۔

یہ بات بھی واضح ہے کہ جب پیغمبر اکرمؐ نے کافروں کو چیلنج کیا کہ قرآن کی جیسی دس آیات ہی کہہ کر لاؤ (۱۱: ۱۳) تو یقیناً قرآن اس وقت تک لکھا اور تدوین کیا جا چکا ہوگا اور ایک مجموعے کی صورت میں مشرکوں کی دسترس میں ہوگا۔ سورہ ہود مکہ میں نازل ہوئی تھی (بعثت کے تقریباً نویں سال اور ہجرت سے چار سال پہلے) جب ہی قرآن نے کہا کہ اگر چاہو تو سب کی مدد لے کر ایسی سورہ لے کر آؤ۔ یہ مجموعہ جو اس وقت تک ۔۔۴۰ آیات سے زیادہ کا حامل تھا مشرکین کی پہنچ میں لازماً ہوگا کہ ایسا چیلنج ان کو دیا جائے۔ ان کو یہ تو معلوم ہوگا کہ کس چیز سے مقابلہ کرنے کا ان کو چیلنج دیا جا رہا ہے۔ اگر ساری آیات کو نہ جانتے ہوتے تو نامعلوم چیز سے مقابلے کی دعوت کیسی؟ چنانچہ قطعی طور پہ کہا جا سکتا ہے کہ کم از کم بعثت کے آٹھویں نویں سال تک اور ہجرت سے چند سال پیشتر تک قرآن جمع کیا گیا تھا (جہاں تک کہ آیات نازل ہو چکی تھیں)۔

بیشک صرف اسی موضوع تک یہ سلسلہ محدود نہیں تھا۔ ایک اہم موقع وہ بھی ہے جب قرآن کہتا ہے کہ آیات کا نظم حکمِ الٰہی کے تحت ہوتا ہے۔ یہ بات سورۂ نحل میں کہی گئی کہ پیغمبر اکرمؐ خدا کی طرف سے مامور کیے جاتے ہیں کہ آیات میں کسی آیت کی جگہ تبدیل کر دیا کریں یہی جابجا (یا تبدیل) کرنے کا موضوع مشرکین کے ہاتھ آ جاتا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے آیات کو جگہ سے بے جگہ کیا ہے اور آپ اس سلسلے میں دخل اور تصرف روا رکھتے ہیں۔ جیسا کہ آیات سے پتہ چلتا ہے کہ بعض نو مسلم تک اس فریب میں آ جاتے ہیں اور متزلزل ہو جاتے ہیں [۳۴]

وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ، وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ ، قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ، بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ . قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ ، لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ، وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ (۱۶: ۱۰۱، ۱۰۲)

---

[۳۳] سیر تحول قرآن۔ ۱۴۳۔
[۳۴] القرآن المجید۔ ۹۵۔

www.Ziaraat.com
Sabeel-e-Sakina
Presented by Ziaraat.Com

اور جب ہم نے ایک آیت کی جگہ کوئی دوسری آیت رکھی، حالانکہ اللہ تعالیٰ جو کچھ نازل کرتا ہے اس کو بہتر جانتا ہے تو انہوں نے کہہ دیا کہ آپ افترا کرنے والے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔ (اے رسولؐ) کہہ دیں کہ اس کو تمہارے پروردگار کی طرف سے روح القدس نے حق کے ساتھ اتارا ہے تاکہ جو لوگ ایمان لا چکے ہیں ان کو ثابت قدم رکھے اور مسلمانوں کے لیے ہدایت اور خوشخبری ہو۔

یہ واقعہ صرف اس صورت میں درپیش ہوا ہوگا جب قرآن کے کچھ حصے کی تدوین ہو چکی ہو۔ یہ آیات نازل ہوئیں اور ایک عرصے تک ان کی تلاوت ہوتی۔ لوگوں نے ایک دوسرے کو سنایا یہاں تک کہ مکہ کے مشرکین بھی ان سے اچھی طرح آگاہ ہوئے۔ اس کے بعد پیغمبر اس پر مامور ہوئے کہ کسی آیت کی جگہ تبدیل کریں۔

اس عمل کا مقصد آیات کا مرتب اور منظم کرنا تھا۔ اس کو تبدیل کرنا اور جابہ جا کرنا کہا گیا۔ کافروں اور مشرکوں کے اس پر اعتراض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ آیات کا نسخہ لوگوں کے ہاتھوں میں موجود تھا۔ ایک سے دوسرے تک یہ نسخے پہنچ رہے تھے۔ جب ہی تو اعتراض کا موقع آیا۔

نزول کے نقطہ نظر سے بھی یہ آیات بعثت کے تقریباً ساتویں سال نازل ہوئی تھیں اور اس سے پہلے قریب قریب آدھا قرآن نازل ہو چکا تھا[۵۵] چنانچہ مکہ ہی میں قرآن لکھا بھی جاتا رہا اور مرتب بھی ہوا۔

ایک دوسرا موقع وہ ہے جب خداوند عالم مومنوں کی جان و مال بہشت کے عوض خرید لیتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا،

وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ وَالْقُرْآنِ (۹ : ۱۱۱)

توراۃ، انجیل اور قرآن میں اس پر سچا وعدہ (موجود) ہے۔

یہاں خدا کے وعدے کے اثبات میں ان تینوں آسمانی کتابوں کا ذکر ایک ساتھ آیا ہے۔ اس وقت (یعنی تقریباً ۱۰ھ) قرآن کامل لکھا جا چکا تھا اور مرتب کیا جا چکا تھا اسی لیے توراۃ اور انجیل کے ساتھ ساتھ اس کا ذکر بھی ہوا ہے۔

یہ قرآن سے چند مثالیں تھیں جو اس کے کتابت شدہ اور آیاتِ الٰہی کے مرتب ہونے پر گواہ ہیں۔

قرآن کے علاوہ رسول اکرمؐ کے کلام میں بھی اس سلسلے میں مثالیں موجود ہیں۔

آپؐ نے فرمایا: جو مصحف پر نظر کرتا ہے وہ بدی نہیں دیکھتا۔

اس کلام سے کیا بات آشکار ہوتی ہے؟ مصحف پر نگاہ کرنا، ایک کتاب اور مجموعۂ کلام پر نگاہ ڈالنا ہے۔ اگر مراد کوئی دوسری چیز ہوتی تو اسی کا ذکر فرماتے۔ مثال کے طور پر صحیفہ، آیت فرمایا ہوتا۔ جب مصحف کہا تو اس سے یقیناً مراد "کتاب" ہی ہوگی۔

آپؐ نے فرمایا: جس نے ایک تہائی قرآن سیکھا اس کو ایک تہائی نبوت ملی جس نے دو تہائی یاد کر لیا اس کو دو تہائی اور جس نے سارا قرآن سیکھ لیا اس کو ساری نبوت عطا ہوئی۔ بجز اس کے کہ اس پر وحی نازل نہیں ہوتی[۵۶]

---

[۵۵] سیر تحول ۱۲۰، ۱۴۴۔

[۵۶] مقدمہ مبانی۔ ۶۰۔

Presented by Ziaraat.Com

یا پھر فرمایا، جس نے قل یا ایہا الکافرون، پڑھ لیا گویا ایک چوتھائی قرآن پڑھ لیا اور جس نے سورۂ توحید پڑھا ایک تہائی قرآن کا ثواب اس کو ملتا ہے [۵۷]

یہ سب ہی مجموعۂ قرآن اور سارے قرآن پر اشارہ ہے۔ مگر اس بارے میں آپ کا سب سے مشہور کلام آپ کی وہ وصیت ہے جو شیعہ و سنی سب کے یہاں متواتر حدیث کے طور پر جانی پہچانی جاتی ہے۔

انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ و عترتی اہل بیتی

تمہارے درمیان دو وزنی چیزیں چھوڑے جاتا ہوں، کتاب خدا اور ہماری عترت، ہمارے اہل بیت [۵۸]

یہاں کتاب خدا سے مراد مومنین کے ہاتھوں میں بکھرے ہوئے جلد جلد اوراق نہیں ہو سکتے۔ پراگندہ اوراق کو "صحف" کہتے ہیں، کتاب نہیں!۔

آپ نے فرمایا، توراۃ کی جگہ قرآن کی سات بڑی سورتیں، انجیل کی جگہ "مثانی" سورتیں (سورہ ہود سے سورہ نحل تک) اور زبور کی جگہ "مئین" سورتیں (وہ سورتیں جن میں کم و بیش سو آیات ہوتی ہیں) دی گئی ہیں۔ اور مفصل سورتیں (سورہ محمد سے آخر قرآن تک) اس کے علاوہ ہیں۔ قرآن دوسری تمام آسمانی کتابوں کا محافظ ہے [۵۹]

دیکھ لیں کہ یہاں وہی نظم ہے جو آج قرآن میں ہم کو نظر آتا ہے۔ پہلے سات بڑی سورتیں پھر مثانی، اس کے بعد درمیانہ انداز کی (مئین) اور آخر میں چھوٹی سورتیں (مفصل)۔ گویا سورتوں کی ترتیب وہی ہے جیسا پیغمبر نے فرمایا تھا اور آیات ان ہی جگہوں پر ہیں جہاں آپ نے ان کا تعین فرمایا تھا [۶۰] جب آیات اور سورتوں کی جگہیں متعین ہو گئیں تو جمع قرآن کے لیے ہم کو کسی اور معنی کی تلاش کرنی ہوگی؟

آپ نے پھر فرمایا، مجھ پر جھوٹ باندھنے والے زیادہ ہو جائیں گے۔ جب میرے نام سے کوئی حدیث سننا تو اس کو کتاب خدا کے سامنے رکھنا۔ جو کتاب خدا کے موافق ہو اس کو قبول کرنا اور جو موافق نہ ہو اس کو رد کر دینا۔

چنانچہ کتاب کی صورت میں مجموعہ موجود تھا جس سے صحابہ اچھی طرح واقف تھے۔

پیغمبر اکرم دشمن کی سرزمین میں مصحف کے ساتھ سفر کو منع فرماتے تھے [۶۱]

یہ تو ہم جانتے ہیں کہ خود پیغمبر اور آپ کے صحابہ دشمن کی سرزمین تک سفر کرتے تھے۔ اور آپ حضرات خود قرآن جانتے بھی تھے اور

---

۵۷ سفینۃ البحار۔ ۲: ۴۱۶۔

۵۸ یہ حدیث شیعہ اور سنی دونوں کے یہاں تواتر سے آئی ہے۔ ایک دوسری جگہ بھی نقل کی گئی ہے۔

۵۹ طبرسی ۱۴، اتقان ۱: ۲۰۱ نوع ۱۷۔

۶۰ ابی بن کعب سے روایت میں جو سورتوں کے نام کی فہرست آنحضرت سے نقل کی گئی ہے وہ موجودہ قرآن سے مکمل مطابقت رکھتی ہے۔ صرف سورۂ ملک (۶۷) اور سورہ سجدہ کا یکجا ذکر ہوا ہے۔ مقدمتان ۴۴۔

۶۱ المعجم المفہرس ۲: ۶۷، ۴۴ س ۹، مفتاح ۱/۲۹۷، ۴۶/۲: ۱۹، ۴۴ قدیم۔

Presented by Ziaraat.Com

اس کو حفظ بھی کیا جاتا تھا۔ تو یہاں صرف مصحف اور کتاب لے جانا منع فرمایا گیا ہے کہ دشمن کا کہیں اس پر ہاتھ نہ پڑ جائے۔ اگر اس زمانے میں آیات کا مجموعہ نہیں تھا اور ان کی تدوین نہیں ہوئی تھی اور مسلمان اپنے ساتھ قرآن کے نسخے نہیں رکھتے تھے اور یہ کتاب ان کی اپنی ملک نہیں تھی تو آپ نے یہاں پھر کس بات سے منع فرمایا تھا۔

ایک دوسری مثال پیش کرتا ہوں۔

رحلت سے چند ماہ قبل رسول اللہ نے عمرو بن حزم کو یمن بھیجا کہ وہاں کے لوگوں کو قرآن و سنت اور اسلام کے احکام کی تعلیم دے۔ اس کام پر مامور کیا تو ساتھ ساتھ ایک تفصیلی خط بھی ان کو دیا جس میں پیغمبر نے مکمل دستور العمل ان کے لیے مرتب فرمایا تھا۔ اس خط میں یہ بھی تھا کہ "لا یمس القرآن انسان الا و ھو طاھر" یعنی اس قرآن کو کوئی ہاتھ نہ لگائے جب تک وہ طاہر و پاک نہ ہو[۱۲]۔ بعضوں نے نکتہ چینی کی ہے کہ اس دستور العمل میں مذکور بعض احکام بہت سال بعد کے لیے ہیں[۱۳] مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ خداوند عالم نے فرمایا ہے:

لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ

بیشک یہ کتاب مکنون کے لیے ہے مگر کیا قرآن بھی اس میں شامل نہیں۔ چنانچہ یہ حدیث کتاب خدا کے متن کی ترجمانی کرتی ہے اور بس۔ اور یہاں بھی وحی الٰہی کے مجموعے کو قرآن کہا گیا (جو لوگوں کے ہاتھوں میں تھا) اور یہ کہ اس پر ناپاک ہاتھ نہ پڑے۔ یہ بات اس کی نشاندہی کرتی ہے کہ اس زمانے میں لکھا ہوا مجموعہ رائج تھا اور لوگوں کے ہاتھوں میں تھا۔

ایک دوسرا واقعہ ابوامامہ بیان کرتا ہے حجۃ الوداع میں پیغمبر نے فرمایا: علم کو حاصل کرو اس سے پہلے کہ وہ رک جائے اور اس سے قبل کہ وہ اٹھا لیا جائے ذیلیٰ؟

ایک عرب نے سوال کیا: اے پیغمبر خدا! علم ہم سے کس طرح اٹھا لیا جائے گا جب کہ مصاحف ہم لوگوں کے پاس موجود ہیں۔ ہم خود اس کو سیکھتے ہیں اور اپنی عورتوں اور بچوں اور نوکروں کو بھی سکھاتے ہیں[۱۴]۔

نبی اکرمؐ نے سر اٹھایا اور غصے سے بلند آواز میں فرمایا: یہود و نصاریٰ کے پاس بھی ان کی کتاب موجود تھی لیکن وہ اپنے پیغمبر کے پیام سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔

اس واقعے سے صاف ظاہر ہے کہ اس سال گھروں میں مصاحف موجود تھے اور پڑھے جاتے تھے۔

علاوہ ازیں ایسی بہت سی احادیث ہیں جو آگے بیان کی جائیں گی اور جن میں آیات اور سورتوں کی جگہ کے تعین کا تذکرہ ملتا ہے۔

---

۱۲ ابن ہشام ۴: ۲۴۱ یا ۹۶۲ وستنفلڈ، وثائق السیاسیہ ۱۰۵ و ۱۰۶۔ اور باتوں کے علاوہ نمازِ پنجگانہ کا بھی اس خط میں ذکر ہے اس پر بھی اعتراض کیا گیا ہے حالانکہ نمازِ پنجگانہ شبِ معراج میں فرض ہوئی اور واقدی کہتا ہے کہ شبِ معراج ۱۷ رمضان سال ۱۲ بعثت تھی۔ یا ایک روایت کے مطابق ۱۷ رجب تھی۔ بہرحال ہجرت سے پہلے کی بات ہے اور اس خط سے کوئی تضاد نہیں رکھتی۔

۱۳ 13 CAETANI, ISLAM, 11, 19. P. 319, N. 1.

۱۴ مقدمۂ دارمی ۲۶، احمد ۴: ۲۱۹ و ۵: ۲۶۶۔

ان امور سے پتہ چلتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے خود ذاتی طور پر آیات اور سورتوں کے محل وقوع کا تعین فرمایا تھا اور اس کی نگرانی فرماتے تھے۔ بعض اوقات ان تعین سے تعین فرماتے کہ حیرت ہوتی ہے۔

حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ کلالہ کے بارے میں پیغمبرؐ سے میں نے باصرار دریافت کیا۔ آپؐ نے میرے سینے پر ہاتھ مار کر فرمایا: آیۂ تابستانی[۱۵] جو سورۂ نساء کے آخر میں ہے تمہارے لیے کافی ہے۔

پچھلے باب میں ہم نے دیکھا کہ حذیفہ بن یمان کہتے تھے کہ پیغمبر اکرمؐ نے نماز میں سورۂ بقرہ، آل عمران اور نساء کی قرات فرمائی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سورتیں اسی ترتیب سے جو آج بھی موجود ہے، کسی اور ترتیب میں نہیں، پیغمبرؐ کے زمانے میں مکمل ہو چکی تھیں۔

عبداللہ بن زبیر نے حضرت عثمانؓ سے پوچھا کہ آیت منسوخہ کو قرآن میں کیوں لائے۔ حضرت عثمانؓ نے جواب دیا بھتیجے! میں کسی چیز کو جا بجا نہیں کرتا۔

عبداللہ بن مسعود کہتے تھے کہ ہم ایک سورت کو دوسری سورت سے اس وقت الگ سمجھ لیتے جب بسملہ نازل ہوتی۔[۱۶] اس بارے میں دوسرے بہت سے قیمتی شواہد میں سے ایک سورۂ حمد کا نام ہے۔ یعنی فاتحۃ الکتاب۔ پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں بھی اس سورت کا یہی نام تھا اور اسی نام سے یہ سورت پہچانی جاتی تھی۔ گویا اس وقت قرآن کتابی صورت میں موجود تھا۔ اس کا فاتحہ، یعنی کتاب کا اول باب، بھی تھا اور وہ سورۂ حمد تھا۔

آیات اور سورتوں کی ترتیب اور ان کے نظم کا آگے بھی ذکر کریں گے۔

اب ختم قرآن کا بھی ذکر ہو جائے۔ حافظان قرآن کے سلسلے میں ختم قرآن کی بھی گفتگو آئی تھی کہ بعض صحابہ مثلاً عبداللہ بن عمرو، قیس بن صعصعہ اور سعید بن منذر نے پیغمبرؐ سے اجازت لی تھی کہ قرآن کو چند راتوں میں پڑھ کر ختم کیا کریں۔ ابی بن کعب بھی آٹھ راتوں میں ایک قرآن ختم کرتے تھے۔ چند دنوں میں یا ایک ہفتے میں ختم قرآن کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ بعد کی نسلوں میں تابعین میں بھی یہ رسم رہی۔ علقمہ بن قیس (م ۶۲ھ) ہر پانچ چھ راتوں میں ایک بار قرآن ختم کر لیا کرتا تھا۔[۱۷] اس کا بھتیجا اسود بن یزید (م ۷۵ھ) بہت روزے رکھتا۔ ماہ رمضان میں ہر دو راتوں میں ایک بار قرآن ختم کرتا۔[۱۸] دوسرے مہینوں میں ہفتے میں ایک بار قرآن پڑھ کر ختم کرتا۔[۱۹]

اب یہ صحابہ قرآن ختم کرنے کی اجازت چاہتے تو اس سے کیا مطلب ظاہر ہوتا ہے۔ یہی کہ قرآن کتابی صورت میں اس وقت بھی موجود تھا۔

رحلت کے وقت رسول اللہ نے فرمایا کہ دوات و قلم لے آؤ کہ ایسی چیز لکھ دوں کہ میرے بعد پھر گمراہ نہ ہو۔ حضرت عمرؓ نے اس

۱۵۔ سورہ نساء کی آخری آیت شمارہ ۱۷۶۔

۱۶۔ یہ چند احادیث جیسا کہ حدیث میں ہے سے ہیں جو اسی لیے کہ آیات اور سورتوں کی گنتی کے دوران ان کا ذکر پھر کریں گے۔

۱۷۔ ابن سعد۔ ۶: ۵۸/۶۰۔

۱۸۔ ابن سعد۔ ۶: ۴۹۔

۱۹۔ ابن سعد۔ ۶: ۶۰

Presented by Ziaraat.Com

وقت کہا کہ حسبنا کتاب اللہ "یعنی خدا کی کتاب ہمارے لیے کافی ہے"[۶۰] قرآن اس وقت یقیناً کتابی صورت میں موجود تھا ورنہ اس پر اکتفا کرنا کیا معنی رکھتا۔

ابن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ کے زمانے میں محکم سورتوں کو میں نے حفظ کر لیا تھا۔ راوی نے پوچھا کہ محکم سے کیا مراد ہے؟ جواب دیا یعنی مفصل سورتیں۔

ہم جانتے ہیں کہ مفصل سورتوں (سورۂ ق سے آخر قرآن تک) کی رسول اللہ کے زمانے میں وہی ترتیب تھی جو آج ہے[۶۱] محکم یعنی مفصل سورتیں ہیں[۶۲] چنانچہ ان زمانے میں بھی بچے ہمارے زمانے کی طرح چھوٹی سورتوں سے قرآن یاد کرنا شروع کیا کرتے تھے۔

ابھی تک اخبار و احادیث کو بغیر مناسب تجزیے اور مطالعے کے ہم نقل کرتے جا رہے ہیں۔ صرف مثالیں تھیں، اگر گفتگو طولانی ہو جانے کا خوف نہ ہوتا تو بہت سی احادیث اس بارے میں مزید پیش کی جاتیں۔

اس وقت دو دیگر احادیث بھی پیش کی جا رہی ہیں کہ ان کی صراحت بآسانی ممکن ہے۔

بخاری (م ۲۵۶ ھ) نے اپنی جامع صحیح میں ایک باب قائم کیا ہے جس کا عنوان ہے "باب من قال لم یترک النبی الا ما بین الدفتین"۔ اس میں ایک صحیح حدیث ہے کہ عبد العزیز بن رفیع کہتا ہے، میں اور شداد بن معقل ساتھ مل کر عبداللہ بن عباس کے پاس گئے۔ شداد نے ان سے پوچھا کہ کیا نبی نے (اپنے بعد) کوئی چیز چھوڑی تھی؟ ابن عباس نے جواب دیا: آپ نے کوئی چیز نہیں چھوڑی بجز "ما بین الدفتین" کے۔ یعنی بجز اس مجموعے کے جو دو جلدوں کے درمیان تھا۔

ان ہی دو حضرات نے محمد بن حنفیہ سے بھی پوچھا تھا۔ انہوں نے بھی یہی جواب دیا تھا[۶۳]

اس طرح حدیث ثقلین اور حسبنا کتاب اللہ اور جو کچھ ابھی بیان ہوا وہ سب ہی واضح طور سے تائید کر رہے ہیں کہ آپ کے زمانے میں قرآن جمع ہو چکا تھا۔

اس نظریے کی تائید میں ایک اور حدیث زید بن ثابت سے موجود ہے۔ یہ وہی شخص ہے جو حضرت ابوبکر و عثمان کے زمانے میں قرآن کے جمع اور تدوین کے کام کا اصلی نگران اور منتظم تھا۔ رسول اللہ کے زمانے میں بھی ہم نے دیکھا کہ کاتب وحی تھا۔ وہ کہتا ہے: رسول اللہ کی خدمت میں ہم ہوا کرتے تھے اور قرآن کو رقعوں سے تالیف کیا کرتے تھے۔

حاکم اپنی "مستدرک" میں اس حدیث کو "شرط شیخین" (بخاری و مسلم) کے مطابق صحیح قرار دیتا ہے[۶۴]

---

[۶۰] بخاری: علم ۳۹، مغازی ۸۳، مرضی ۱۷، اعتصام ۲۶، مسلم: وصیۃ ۲۲، احمد ا: ۳۲۵، ۳۳۶۔

[۶۱] احمد ۴: ۱۰۹/۳۴۳۔

[۶۲] المعجم المفہرس ۵/۱۵۱ س ۱، الدارمی: فضائل القرآن ۱۳، احمد ۱: ۷/۱۷۸، ۲۱۸۔

[۶۳] احمد ا: ۲۸۶، ۳۳۷۔

[۶۴] بخاری: فضائل القرآن ۱۶، فضائل القرآن ابن کثیر، ایک حدیث کو لیا ہے کہ ما ترک رسول اللہ الا ما بین هذین اللوحین احمد ا: ۲۲۱، گو حدیث کی عبارت مختصر

[۶۵] مستدرک حاکم ۲: ۲۱۱/۱ اس حدیث کو ابو شامہ مرشد، اور دلائل بیہقی سے نقل کرتا ہے۔ حاشیے میں شعب الایمان ۱/۹۹۱ سے اور طبرانی اور کتاب الانتصار ۱۰۱: ۸۹۔ المرشد الوجیز ص ۴۴ و ح ۵، مقدمتان ص ۴۹۔

Presented by Ziaraat.Com

بیہقی کا کہنا ہے کہ زید جس تالیف کا ذکر کر رہا ہے وہ متفرق آیات کا رسول اللہ کے کہنے کے مطابق سورتوں میں جمع کرنا تھا[۲۶] ان احادیث میں بھی جمع کرنا اور قرآن کی گرد آوری کا ذکر ہے۔ خصوصاً جب کہا گیا کہ رقعوں سے تالیف کیا کرتے تھے، یہی تو جمع کرنا ہوا۔

ایک اہم نکتہ اس بار بار دہرائی گئی حدیث میں موجود ہے۔ یہی حدیث اس نظریے کی بنیاد ہے کہ قرآن حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں مکمل ہوا۔ اسی حدیث میں ہم دیکھیں گے کہ حضرت ابوبکر، زید سے کہتے ہیں کہ قرآن کی جمع آوری شروع کریں۔ زید کو قائل کرنے کے لیے کہتے ہیں: کنت تکتب الوحی لرسول اللہ ۔ [۲۷] تم ہی تو وحی کو رسول اللہ کے لیے لکھتے تھے۔ یعنی زید رسول اللہ کے کاتب تھے اور خود پیغمبر کے لیے وحی لکھا کرتے تھے۔

چنانچہ یہ خیال کرنا قدرتی بات ہے کہ وحی کا اصلی نسخہ پیغمبر اکرمؐ کے پاس رہتا تھا اور اسی سے صحابہ نسخے تیار کرتے۔

جب آنحضرتؐ کسی کاتب کو بلا بھیجتے کہ اگر آیت یا آیات لکھے تو اس سے مراد کیا تھی۔ نظر میں یہ رہنا چاہیے کہ مختلف زمانوں میں مختلف کاتب اور مختلف تعداد میں ہوا کرتے تھے۔ کیا اس سے مقصد یہ ہوتا تھا کہ وہ کاتب آئے، آیات کو لکھے اور اپنے ساتھ لے کر چلا جائے اور یہ لکھی ہوئی آیات لوگوں کے ہاتھوں میں یہاں وہاں بکھری رہیں۔ یا پھر مقصد یہ ہوتا تھا کہ ان لکھی ہوئی آیات اور سورتوں کا مجموعہ ایک جگہ محفوظ رہے، اور اس طرح کسی تبدیلی اور گم ہو جانے سے بچا رہے۔ یہ تو عام فہم بات ہے کہ اگر کوئی شخص کسی چیز کے لکھنے کا حکم دیتا ہے اور کاغذ پر ثبت کرنے کا اہتمام کرتا ہے تو یقیناً اس کا ارادہ اس کے جمع کرنے اور اس کی حفاظت کرنے کا ہے۔

یہ عبارت کہ "زید رسول اللہ کے لیے لکھتے تھے" بار بار نقل ہوئی ہے۔ بغوی اپنی "شرح السنہ" میں کہتا ہے "زید بن ثابت آخری نزول وحی کے زمانے کا گواہ تھا کہ اس دوران جو بھی نسخ ہوا اور جو بھی باقی رہا وہ روشن اور آشکار ہوا اور زید اس کو رسول اللہ کے لیے لکھتا اور لکھ کر آپ کو سناتا..."[۲۸]

اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کا اصلی نسخہ پیغمبر کے لیے لکھا گیا۔ بیشک یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ یہ نوشتہ (اور نسخہ) کیا ہوا؟

یہی لکھے ہوئے نوشتے تھے کہ جو حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں جمع آوری کے کام کی اساس بنے۔ اہلِ تشیع کی روایات میں ہے کہ جب نبی اکرمؐ کی رحلت کا وقت قریب آیا تو آپ نے حضرت علیؑ سے فرمایا کہ میرے سرہانے قرآن کی آیات صحائف اور رقعوں پر موجود ہیں ان کو جمع کر لو کہ گم نہ ہو جائیں[۲۹]

حارث محاسبی (م ۲۴۳ ھ) کہتا ہے کہ رسول اللہ کے گھر میں اوراق ملے جن پر قرآن لکھا ہوا تھا۔ ان اوراق کو یکجا کرنے والے

---

۲۶ ابو شامہ ۴۴، اتقان، اوائل نوع ۱۸۔

۲۷ بخاری، تفسیر سورہ ۹، ۲۰، فضائل القرآن ۳،۴ نیز احکام ۳۷، ترمذی، تفسیر سورہ ۹، ۱۸/۱۸۹، احمد ۱۰:۱/۱۳، ۵:۱۸۸۔ اتقان ۲۰۴:۱ نوع ۱۸۔

۲۸ اتقان ۱:۱۷۷۔

۲۹ صافی ۱: ۲۴۔ دوسری جگہوں پر بھی ہے۔

Presented by Ziaraat.Com

نے جمع کیا اور دُوری سے ان سب کو سی دیا تاکہ ان میں سے کوئی چیز گم نہ ہو سکے[۲۹]

بہر حال یہ بات مسلّم ہے کہ یہی نوشتے تھے جو بعد کی جمع آوری اور نسخے تیار کرنے کی بنیاد بنے۔

اس کے مقابل ایک حدیث اور ہے جو زہری اسی زید بن ثابت سے نقل کرتا ہے۔ زید کہتا ہے کہ پیغمبر دنیا سے تشریف لے گئے اور قرآن جمع نہیں ہوا تھا[۳۰] مگر پہلی حدیث زیادہ معتبر اور معقول حدیث وہ ہے جو پہلے نقل کی گئی۔ یہاں بھی زید کا مقصد شاید خود اس کی نگرانی میں قرآن کی جمع آوری ہو ورنہ زید تو خود کہہ چکا تھا کہ ہم لوگوں نے رسول اللہ کی موجودگی میں اس کی تالیف کی۔

علاوہ ازیں حضرت ابوبکر کے زمانے میں قرآن جمع کرنے سے رسول اللہ کے زمانے میں اس کے تالیف ہونے میں کوئی تضاد نہیں۔ جمع آوریٔ قرآن میں مختلف مراحل آئے۔ ان میں سے ہر مرحلے کو الگ الگ دیکھنا چاہیے۔ جیسا کہ بعد میں ذکر آئے گا ممکن ہے حضرت ابوبکر نے محسوس کیا ہو کہ لوگوں کے پاس جو اپنے اپنے نسخے ہیں ان کے مقابلے میں ایک مستقل نسخہ بھی ہونا چاہیے۔ آنحضرتؐ کے بعد قرآن کے جمع کرنے کے بارے میں جو روایات ہیں وہ اسی سوچ کی نشاندہی کرتی ہیں۔ غالباً یہی وہ نسخہ ہے جس کی تدوین حضرت ابوبکر چاہتے تھے اور حضرت عثمان نے نسخوں کی نقل اور ترویج کے لیے اور آنحضرتؐ کی معروف ثابت شدہ قرأت کو رواج دینے کے لیے اسی کو بنیاد اور اساس بنا رہے تھے۔ وسیع تبلیغ جو صدیوں تک پھیلی اس کی اساس یہی نسخہ تھا۔

مگر یہ جو کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ کے زمانے میں قرآن شریف ایک جلد میں جمع نہیں ہوا تھا اور اس کی وجوہات جو پیش کی جاتی ہیں اس بات میں کوئی وزن نہیں۔ آخر اس سے کیا مطلب لیا جائے کہ قرآن کا مجموعہ موجود نہیں تھا اور وہ ایک جلد میں نہیں تھا؟ یہ تو طے ہے کہ سارا قرآن رسول اللہ کے زمانے میں لکھا جا چکا تھا۔ اب یہ لکھے ہوئے اوراق خواہ دو جلدوں کے درمیان ہوں یا بغیر جلد کے، جب بھی یکجا کیے جائیں گے وہ مجموعہ بن جائے گا اور مجموعہ کہلائے گا۔

اس طرح ہم اس گفتگو کے آخری حصے میں پہنچتے ہیں کہ کتاب و سنت کے مطالعے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ جس طرح وحی کے لکھنے کا اہتمام کرتے تھے اسی طرح اس کے جمع کرنے اور اس کی حفاظت کے لیے بھی کوشاں تھے۔

قابل غور بات یہ ہے کہ مغربی مصنفین بھی رسول اللہ کے زمانے میں قرآن مجید کے لکھے ہوئے مجموعے کی موجودگی کا انکار نہیں کر سکے ہیں۔ بوئر (BAUER) کہتا ہے: رسول اللہ کے زمانے میں سورتوں کے چھوٹے مجموعے تیار کیے گئے تھے۔ مثال کے طور پر بعض وہ سورتیں جو "الٓمٓ" اور "الٓرٰ" سے شروع ہوتی ہیں اور آج متن میں موجود ہیں نزول کی ترتیب پر مرتب کیے گئے تھے[۳۱] "حٰمٓ" سورتوں کا مجموعہ

---

۲۹ برہان ۱: ۲۳۸۔

۳۰ اتقان ۱: ۲۰۲، اوّل نوع ۱۸۔

۳۱ 31. BAUER (H), UBER DIE ANORDNUNG DER SUREN UND UBER DIE GEHEIMNISOLLEN, BUCHSTABENIM QORAN, DANS ZDMG, LXXV (1921), 1 - 20.

٭ داستانہ قرآن، ص ۲۰۔ بلاشر اس پر یہ اضافہ کرتا ہے: ملاحظہ کریں: بوئر، اور بعد اور جلد اول شمارہ ۴ تا ۷ ۱۰۰-۱۷ (پرنس سے اسری تک)
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے)

Presented by Ziaraat.Com

بھی اسی طرح مرتب کیا گیا تھا۔

اسی حقیقت کو رچرڈ بل (BELL –) بھی قبول کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ جنگ بدر کے بعد وحی ہدایت و فرقان کے عنوان سے قرائت کے واسطے بہت سے ٹکڑے ملتے۔ اور ان سے ترتیب پاتے ہیں کہ کا ماوریت ہیں اس کے آثار نہیں ملتے ڈاکٹر ٹوری کیل (YALE) کے پروفیسر ٹوری (TORREY) اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ قرآن کہتا ہے بے شمار حوالہ جات ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پیغمبر کرم فعالی طور سے قرآن جمع کرنے پر لگے رہتے تھے کہ وہ کتابی صورت میں تشکیل پا جائے۔

ایک مثال بلاشیر کے نقطہ نظر کی ہے۔ وہ جب تین مختلف قرائتوں کی بات کرتا ہے یعنی حضرت علیؑ سے منسوب قرائت، ابی سے منسوب قرائت اور سورہ والعصر (١٠٣) کے بارے میں موجودہ جاری قرائت اور ابتدائی اطلاعات کی بنا دیتا ہے جو بعد کی دی ہیں: اول یہ کہ۔ اس کا کہنا ہے! بہرصورت اس کا بہت کم امکان ہے کہ ایک متن واحد میں تبدیلی کی وجہ سستی اور کاہلی ہوگی کہ اس متن کے نقل میں پیش آئی ہو۔ اس قرائت کو شروع سے موجود ہونا چاہیے۔ اگر اس قرائت کو صرف حافظے کے سپرد کر دیا گیا ہوتا تو کیا آج بھی صورت یہی ہے اس صورت میں اتنے عرصے محفوظ رہی ہوگی؟ یہ بات قابل بحث و گفتگو ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ بہت کم ایسا اتفاق ہوا ہے کہ وہ اختلافات جو ہماری نظروں کے سامنے ہیں ایسے تضاد پیدا کرنے کا باعث نہیں۔ چنانچہ آدمی اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ یہ اختلافات بہت پرانے ہیں۔ اول زمانے سے متعلق ہیں۔ اور کتابت کے وسیلے سے پیدا ہوئے تھے۔ جب اس پر نظر پڑتی ہے کہ آج ان سارے مصاحف کے آثار ناپید ہیں اور ان مصاحف کے کوئی اثر باقی نہیں رہے تو ان کی کتابت کے بارے میں مختلف طریقے پر بھی قیاس آرائی کا امکان باقی

بقیہ حاشیہ صفحہ سابق: کی سورتوں کا تعلق جو ایسے ایک مجموعے کی تشکیل کی خبر دیتی ہے۔ اور مصاحف میں ان کی تقسیم بندی یہی حقیقت ہے جو سورتوں (حم) سے شروع ہوتی ہیں، میں نظر آتی ہے۔

بوہل (F. BUHL) بھی بلاشیر کے اس نظریے کو اس طرح نقل کرتا ہے، بعض سورتوں کے شروع میں حروف تہجی کے بعض حروف کی تکرار ہوتی ہے۔ یہ حروف مختصر ایک مجموعے کی تشکیل دیتے ہیں مثلاً حم سورۃ ۴۰ تا ۴۶ کے شروع میں (بلاشیر کے نظریے کے مطابق درحقیقت سورۃ ۳۹ کے شروع میں اور اسی طرح سورۃ ۴۲ میں حم۔ عسق۔ ق کے حروف کے اضافے کے ساتھ) ۱۰ ۔ ۱۵ کی سورتوں کی شروع میں الر (اور سورۃ ۱۳ میں المر) طسم اور ۲۶، ۲۸ ... الم ایک استثنا ہے۔ ... بآسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سورتوں میں آیات کی کمی کے مطابق ... مجموعوں میں بھی نظر آتا ہے۔ اس طرح سے ... سورتوں کو بعد میں جگہ ملی ... ایک بات کی نشاندہی کرتا ہے ... مجموعوں کی الگ تشکیل ... ترتیب سے ملیں اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس نظم اور ترتیب کو توڑے

SHORTER ENCYCLOPADIA OF ISLAM, PP. 278 - 9

مصنف کی نگاہ میں یہ نظریہ قابل توجہ اور مطالعہ ہے۔ بہرصورت بحث اور گفتگو کی گنجائش موجود ہے۔ ان مجموعوں میں سے کسی میں بھی آیات کی کمی نظر نہیں آتی اور حتیٰ ان کے نزول کی ترتیب۔ یہاں اصل مطالعے کی طرف رجوع کرنے کی بیحد ضرورت ہے۔

W. MONTGOMERY WATT; BELL'S INTRODUCTION TO THE QURAN, P. 139.

JEFFERY, MATERIALS; P. 5.

Presented by Ziaraat.Com

نہیں رہتا۔

ان میں سب سے بڑا سبب سے قدیم ہے اگر اس پر کام کی بنا رکھی جائے تو قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ مصاحف ایک قدیم رسم الخط (الفبائے سنتی) کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یعنی ان مصاحف کا رسم الخط جن پر گفتگو ہو رہی ہے۔ یہ مصاحف اپنی جگہ پر یا کم از کم حضرت ابوبکر کے مصحف کو ان سورتوں کا مجموعہ ہونا چاہیے جو سنہ کے زمانے سے متعلق تھا۔[illegible]

چنانچہ تقیدا و اعتقاد کی خاطر جانے اس بات نہیں بجز اس کے کہ مختلف قرائتوں کو جو صحابہ سے منسوب ہیں، قبول کیا جائے کہ وہ رسول اللہ کے زمانے (اور آپ کی نگرانی) میں لکھے ہوئے مصاحف ہیں اور اس زمانے میں رائج تھے۔

اہل تسنن کے دانشور اور علما بھی اس نقطۂ نگاہ سے نا مانوس نہیں ہیں۔

حارث محاسبی (م ۲۴۳ھ) اپنی کتاب 'فہم السنن' میں کہتے ہیں، قرآن کا لکھا جانا (حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں) کوئی نیا کام نہیں تھا کیونکہ خود پیغمبر نے اس کے لکھنے کا حکم دیا تھا۔ مگر قرآن رقعوں، شانے کی ہڈیوں پر اور بار یک سفید پتھروں پر لکھا ہوا موجود تھا اور صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ یہاں وہاں سے نسخہ یکجا کیا جائے۔ یہاں اوراق کی جگہ تھا جو رسول اللہ کے گھر میں ملا تھا اور قرآن ان صفحات میں بکھرا ہوا تھا۔

بغوی 'شرح السنہ' میں کہتا ہے، رسول اللہ قرآن کو جس طرح جبرئیل لے کر آتے تھے املا فرماتے۔ اس کے لکھنے کی نگرانی فرماتے۔ صحابہ نے بھی قرآن کو بے کم و کاست اور بغیر پس و پیش کے دو جلدوں کے درمیان جمع کیا۔

مصری عالم زرقانی بھی کہتا ہے: (ابوبکر کے زمانے میں) جمع قرآن کوئی نئی چیز یا بدعت اور اسلام میں کوئی اضافہ نہیں تھا۔ بلکہ ان قاعدوں میں سے ایک تھا جس کی پیغمبر اکرم نے قرآن کے لکھنے کی تشریح اور کاتبانِ وحی کے انتخاب سے بنا ڈالی تھی۔ اور آپ جو بھی لکھوا لیا جاتا اس کو جمع فرماتے یہاں تک کہ رحلت ہو گئی۔[illegible]

بہت سے علمائے اہل تسنن آیات اور سورتوں کی ترتیب کی حد بندی (توقیت) کے قائل ہیں۔ اس سے بھی یہی مطلب نکلتا ہے کہ پیغمبر کے فرمان سے آپ ہی کے زمانے میں جمع قرآن ہوا تھا۔

علمائے اہل تشیع سے بھی اس سلسلے میں بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں۔ سید مرتضیٰ علم الہدیٰ (۴۳۶ھ) جیسا کہ امین الاسلام طبرسی نے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں، نقل قرآن کی صحت کا علم، شہروں کے وجود اور اہم واقعات اور حوادث کے علم کی طرح ہے کہ اس کی بہت سی نشانیاں موجود ہیں.... قرآن رسول اللہ کے زمانے میں جمع اور تالیف ہو چکا تھا (اسی حالت میں) جیسا کہ آج ہے۔[illegible]

ہمعصروں میں فقیہ بزرگوار اور زعیم حوزۂ علمیہ آیت اللہ العظمیٰ آقای خوئی مدظلہ نے بھی تفصیلی بحث کے دوران روایتی اور عقلی محکم دلائل سے اسی نقطۂ نظر کی تائید کی ہے۔[illegible]

[illegible] BLACHERE; INTR AU CORAN. PP. 50,. 51

[illegible] در آستانۂ قرآن ـ ۹۹

[illegible] برہان ۱: ۲۳۸، اتقان ۱: ۲۰۶/۲۰۷ ـ

[illegible] مناہل العرفان ۱: ۲۴۲ و ۲۴۳ ـ

[illegible] مجمع البیان ۱: ۱۵ ـ

[illegible] البیان ۲۵۵ ـ ۲۷۸ ـ

Presented by Ziaraat.Com

خلاصہ:

ہم نے قرآن مجید کے حفظ و کتابت میں پیغمبر اکرمؐ اور آپؐ کے اصحاب کے اس حد سے زیادہ اہتمام کو دیکھا ہے کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کے حفظ، ترتیب اور جمع میں یہ خاص اہتمام بغیر نتیجہ کے رہ گیا تھا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ جب روح پیغمبرؐ وحی الٰہی سے پیوستہ تھی اور آپ قرآن کو ایک بہت بڑا عطیۂ خداوندی سمجھتے تھے آپ نے اس کے جمع و تالیف پر توجہ نہ فرمائی ہوگی۔ یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ قرآن کریم کی تعلیم و کتابت میں ایسی عظیم ہمت و کوشش کریں اور اس کے جمع کرنے سے یکسر عدم توجہ کا اظہار فرمائیں؟ وہ قرآن جس نے خود اعلان کیا کہ وہ تا قیامت انسانی تمدن کا مرکز و محور ہے، یہی جاننے میں آپ اس کتاب کے مستقبل سے بے فکر و متردد رہیں؟ پس اگر ہم اس بارے میں نقلی دلیل اور تاریخی ثبوت نہ رکھتے ہوں تو بھی عقل سلیم اور قرائن کے اعتبار سے ہمیں یہ بات ماننا چاہیے کہ قرآن پیغمبر اکرمؐ کے حکم سے جمع و تالیف ہوا ہے۔ حالانکہ اس کے لیے ہم قرآن و سنت اور تاریخ و سیرت میں بہت سے شواہد و دلائل بھی رکھتے ہیں۔

بنا بریں اس بحث سے ہم اس قطعی نتیجہ پر پہنچے ہیں:

قرآن کریم رسول اکرمؐ کے عہد مبارک میں علاوہ اس کے کہ لوگوں کے سینوں میں محفوظ تھا، اوراق پر کتابت کی شکل میں بھی پوری طرح تحریر ہو گیا تھا جو اصحاب رسولؐ کے پاس اجزاء کی صورت میں اور خود پیغمبر اکرمؐ کے پاس بھی موجود تھا۔

سورتوں میں آیات کی ترتیب (اس وقت) رسول کریمؐ کے حکم سے متعین ہوئی جو آج بھی موجود ہے۔ مگر شاید سورتوں کی ترتیب تمام و کمال وہ نہ ہو کہ جو اب ہے، کیونکہ بعض سورتوں کے مجموعے مثلاً مسبّحات، طواسین، حوامیم، الٓمٓ اور الٓر خاص مقامات پر رکھے گئے تھے۔

وہ ایک بات جو کہی جا سکتی ہے، حالانکہ اس کے مخالف دلائل بھی ہیں، یہ ہے کہ اجزائے قرآن کے جابجا ہونے کی وجہ سے ممکن ہے کہ بعض سورتوں کے کچھ حصوں میں (نہ پوری سورت میں) موجودہ ترتیب کے اندر کچھ غلط سلط ہو لیکن بہت سی روایات موجود ہیں جو اس شبہ کی تردید کرتی ہیں۔

Presented by Ziaraat.Com

۹۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں جمعِ قرآن

پہلا جامعِ قرآن

اصولی طور پر رسول اللہ کے زمانے میں قرآن کی جمع آوری کو "تالیف" اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں "جمع" کا نام دیا گیا ہے۔ اب ہمیں دیکھنا ہے کہ رسول اللہ کے بعد وہ پہلا شخص کون تھا کہ جس نے قرآن کو ایک کتاب کی صورت میں دو دفتیوں کے درمیان اکٹھا کیا۔

ہمیں یہ تو معلوم ہے کہ رسول اللہ کے زمانے میں بعض ایسے لوگ موجود تھے کہ جنہوں نے قرآن کو جمع کیا تھا[1] اور شعبی نے ایسے چھ آدمیوں کا نام لیا ہے۔ رسول اللہ کی رحلت کے بعد بھی کچھ لوگوں نے یہ کام اپنے ذمے لیا[2] اور ان میں سب سے آگے حضرت علیؑ کا نام ہے۔ کیونکہ رسول اللہ کے بعد حضرت علیؑ نے اپنے کندھوں پر ردا نہیں ڈالی جب تک کہ قرآن جمع نہ کر لیا[3] اگرچہ بعض لوگوں نے اس جمع کرنے کو سارا قرآن "حفظ" کرنے کے معنی میں لیا ہے[4] مگر یہ بات صرف شیعہ حلقے ہی میں نہیں سنی گئی بلکہ اس کی مثال اہلِ سنت کی معتبر روایات میں بھی ملتی ہے[5] تاہم اس کا جو بھی فرک رہا ہو اس سلسلے میں پہلا سرکاری اور رسمی اقدام حضرت ابوبکرؓ نے کیا اور اسی لیے ان کے اس اقدام پر ہم پہلے گفتگو کریں گے۔ اس کے بعد دوسرے مصاحف کی تلاش میں نکلیں گے جو اسی زمانے میں مروج رہے ہیں۔

سُدّی (م ۱۲۷ھ) نے چند طریقوں سے عبد خیرؒ سے نقل کیا ہے کہ امام علیؑ نے فرمایا،

---

[1] بحار الانوار مجلسی ۲۹ : ب ۷، ص ۱۱ ۱۲، ابن سعد ۳ ، ۲ / ۱۳۲۔

[2] لامنس ؛ معاویہ ۔ ۳۴۸۔

[3] اتقان ۱ : ۲۰۴ نوع ۱۸ ؛ اسد الغابہ ۳ : ۲۳۴ ، مصاحف ۔ سجستانی ۱۰ ۔ نولدکے ؛ ۱۹۱۔

[4] عبد خیر بظاہر ابو عمارۃ بن یزید ہمدانی کوفی تابعین میں سے تھا (تہذیب التہذیب ۶ : ۲۳) یا خیران بن ہمدان اصحاب امیر المومنین علیؑ سے تھا (معجم رجال الحدیث ۔ آقائی خوئی ۹ : ۲۹۷) یا عبد الخیر الخیوانی (رجال ۔ ابن داؤد ۲۲۱ ، دانشگاہ تہران ۱۳۴۲) ہیں اور بقول نووی ان کے ثقہ ہونے پر سب کا اتفاق ہے ۔ مزید تحقیق کریں : تہذیب ۵ : ۳۴ ، ابن سعد ۹ : ۲۰۹ ، کبیر بخاری ۳ : ۲ / ۱۳۳ ، الکنی ۔ دولابی ۲ : ۲۰ ، الجرح ۔ ابن ابی حاتم ۳ / ۲۰ ، ۱۱۲ ، ... ۱۱۱ ، ... خطیب ۱۱ : ۱۲۴ ، رجال ۔ تبریزی ۱۴ الف ، تہذیب عسقلانی ۶ : ۱۲۴۔

Presented by Ziaraat.Com

"خدا ابوبکر پر رحمت فرمائے۔ وہ پہلا شخص ہے جس نے (قرآن کو) دفتیوں کے درمیان جمع کیا۔"
یا "مصاحف کے بارے میں سب سے زیادہ اجر ابوبکر کے لیے ہے جو پہلے آدمی تھے جنہوں نے (اس کی) دو دفتیوں کے درمیان جمع کیا۔"[۵۵]

صعصعہ بن صوحان (م ۶۰ ھ) جو حضرت علیؑ کے اصحاب[۵۶] میں سے تھے، انہوں نے بھی دوسرے لوگوں کی طرح اس بات کی تائید کی ہے۔[۵۷]

مگر دوسری روایات بھی ہیں جن میں دیکھا جا سکتا ہے کہ پہلا جامع قرآن کون تھا ہے اور اس کے نتیجے میں حضرت ابوبکرؓ پہلے جامع قرآن نہیں رہتے۔ ان میں سے ایک سجستانی ہیں جو روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے قرآن کی ایک آیت کے بارے میں پوچھا تو ان کو جواب دیا گیا کہ یہ فلاں کے پاس تھی جو یمامہ کے دن قتل ہو گیا۔ وہ کہنے لگے: انا للہ اور حکم دیا کہ قرآن جمع کیا جائے پس وہ پہلے آدمی تھے جنہوں نے قرآن کو مصحف میں جمع کیا۔

سیوطی کہتا ہے: اس روایت کی اسناد منقطع ہیں اور یہاں جمع کرنے سے مراد قرآن جمع کرنے کا مشورہ ہے۔[۵۸] اس سلسلے میں ایک اور روایت بھی موجود ہے جس کی بنا پر شاولی مستشرق کو حضرت ابوبکرؓ کے پہلے جامع قرآن ہونے پر شک ہے[۵۹] کیونکہ کہا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ کی وفات تک قرآن جمع نہیں ہوا تھا۔

علاوہ ازیں سیوطی نے یہ بھی کہا: عجیب بات ہے کہ ابن اشتہ (م ۳۶۰ ھ) اپنی کتاب مصاحف میں نقل کرتا ہے کہ ابن بریدہ نے کہا پہلا شخص جس نے قرآن ایک مصحف میں یکجا کیا وہ ابی حذیفہ کا غلام سالم تھا... مگر اس کی اسناد منقطع ہیں اور ممکن ہے کہ وہ حضرت ابوبکرؓ کے جامعین قرآن میں سے ایک ہو۔[۶۰]

گویا سیوطی اسے خود ہی فراموش کر بیٹھا کہ جو اس نے باب کے آغاز میں نقل کیا تھا یعنی یمامہ کا واقعہ کہ جو حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں قرآن کی جمع آوری کے خیال کا باعث بنا اور شہید اس میں ہونے والوں میں پہلا نام سالم کا تھا چنانچہ سالم اس جمع آوری سے

---

۵۵ مصاحف سجستانی ۵، ابو شامہ ۵۲، ۵۴ فضائل القرآن ابن کثیر ۱۵ سجستانی ۲۳، ابن سعد ۱۱، ۲۳۹ بیان آقائی خوئی (م) ۲۴۰/۲، ۲ نقل از منتخب کنز العمال ۴۵/۲

۵۶ سادات عبدالقیس سے تھے۔ خطیب بلیغ اور اچھے شاعر تھے۔ جنگ صفین میں حضرت علیؑ کے ساتھ شریک تھے۔ بعد میں معاویہ سے جھگڑنے کی وجہ سے مغیرہ نے معاویہ کے حکم سے کوفہ سے جلا وطن کر دیا۔ معجم رجال الحدیث۔ آقائی خوئی ۹: ۱۰۸

۵۷ تفسیر طبری ۱: ۲۲ ح ۶۴۔

۵۸ مصاحف سجستانی ۱۰، اتقان ۲۰۴ نوع ۱۸ ابن حجر جلد ۹ صفحہ ۱۲، الطبقات ۳: ۲۰۲/۱: ۳۶۴، فضائل القرآن، ابو کثیر ۱۶

۵۹ SCHWALLY; TESTSCHRIFTS SECHAU, 321-5FF. NOLDEKE;GESCHICHTE DES QORANS, 11 : 18...

۶۰ اتقان ۱: ۲۰۵ نوع ۱۸۔

Presented by Ziaraat.Com

پہلے ہی فوت ہو چکا تھا اور اس کام میں اس کی شرکت ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

حضرت ابوبکرؓ کے زمانے کی جمع آوری کے ساتھ ہم دوسرے مصاحف بھی دیکھتے ہیں، لیکن اس میں بعض قابلِ توجہ نکتے بھی سامنے آتے ہیں، یہاں تک کہ عبداللہ بن شقیق یافعی کا دعویٰ تھا کہ اس نے ان سے پہلے قرآن جمع کیا ہوا تھا[۱۱] تاہم یہ جمع پورے قرآن کا احاطہ کرتا ہی تھا۔ بہرحال صحابہ کے ان خصوصی مصاحف کے علاوہ سرکاری طور پر قرآن کی جمع آوری کا کام اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانے ہی میں شروع ہوا تھا۔

اب ہم یمامہ کی اس روئداد کا مطالعہ شروع کرتے ہیں کہ جس کو اس جمع آوری کا باعث بتایا گیا ہے۔

روئدادِ یمامہ

دوشنبہ کے روز ۱۲ ربیع الاوّل کو جب ہجرت کو گیارہ سال ہو چکے تھے[۱] رسول اللہ خداوند تعالیٰ کے دیدار کے لیے اس جہان سے رحلت فرما گئے۔ مختصر سوچ بچار اور بحث مباحثے کے بعد حضرت ابوبکرؓ (عبداللہ بن عثمان) خلافت کی گدی پر بیٹھے۔ جن لوگوں کو اسلام کے عروج سے نقصان پہنچا تھا اب ان کو موقع ملا کہ مزاحمت شروع کریں۔ مگر انہوں نے جو طریقے سوچے تھے وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ چنانچہ بعض قبیلے کسی امید پر جلد ہی دوبارہ خلیفہ کے مطیع ہو گئے۔ مگر ان میں سے بعض نے ارتداد کا راستہ اختیار کیا۔ اس دوران میں جن فتنوں نے سر اٹھایا ان میں سب سے بڑا مسیلمہ کذاب کا فتنہ تھا۔ پیغمبرؐ کے زمانے (سنہ ۹ھ) میں مسیلمہ نامی شخص[۲] کچھ لوگوں کے ساتھ یمامہ سے خدمتِ رسولؐ میں آیا[۳] مگر جب واپس گیا تو مرتد ہو گیا۔ اس نے ایک خط لکھا جس میں پیغمبری میں شرکت کا دعویٰ کیا[۴] اور رسول اللہؐ نے اس کو مسیلمہ کذاب کے نام سے پکارا[۵]۔ رسول اللہؐ کی رحلت اور بعد میں جن فتنوں نے سر اٹھایا ان میں اس کو موقع ملا کہ کچھ مسلمانوں کو اپنے جال میں پھانسے اور لوگوں کو بہکانے کے کام کو آگے بڑھائے۔ آخر کار خلافت کے دوسرے[۶] سال کے آغاز پر ماہ ربیع الاوّل سنہ ۱۲ھ میں حضرت ابوبکرؓ نے خالد کو اس سے جنگ کرنے کے لیے بھیجا اس

---

۱۱ اتقان ۱: ۲۲۶ نوع ۱۹۔

۱ یہ روز مطابق ہے ۸ جون ۶۳۲ء کے۔

۲ اس کا نام ہارون بھی کہا گیا ہے (خمیس ۲: ۱۵۷)

۳ بعض کا کہنا ہے کہ مسیلمہ خود نہیں آیا تھا بلکہ شہر کے مضافات میں رک گیا تھا۔ بخاری: مناقب ۲۵، مغازی ۷۰، ۷۱، مسلم: رؤیا ۲۱، ابن ہشام ۴: ۲۲۳۔

۴ سنن ابوداؤد، جہاد ۱۵۴؛ احمد ۳: ۴۸۷ - ابن ہشام ۴: ۲۴۷؛ ترجمہ یعقوبی ۲: ۷۔

۵ ابن سعد ۱: ۲/۲۵۔ اس سے پہلے وہ رحمانِ یمامہ مشہور تھا۔ مگر مسیلمہ کذاب مشہور ہو گیا۔ یہاں تک کہ اس کی مثال دی جاتی تھی "اکذب من مسیلمۃ" یہ مسیلمہ کا آخر تھا۔ ابن ہشام ۴: ۲۴۷۔

۶ مطابق جون ۶۳۳ء۔

Presented by Ziaraat.Com

نے چالیس ہزار سپاہی جمع کر رکھے تھے اور خالد کے ساتھ ۱۰۰۰۰ کا لشکر تھا بلکہ اس کے لشکریوں کی تعداد ایک لاکھ تھی اسلامی لشکر تیرہ ہزار افراد پر مشتمل تھا۔ ان دونوں کا "عقرباء" میں تصادم ہوا اور یہ بے انتہا خونی جنگ تھی کہ اس وقت تک مسلمانوں نے ایسی ہولناک جنگ نہیں لڑی تھی۔ وہاں مقابلہ ناممکن نظر آتا تھا، حتیٰ کہ اسی کشت و خون کے دوران ابوحذیفہ نے للکار کر کہا "اپنے کارناموں سے قرآن کو زینت دو" اس نے یہ کہہ کر دشمن پر حملہ کیا۔[۸] اور میدان میں شہید ہوا۔ جو لوگ قرآن کو حفظ کیے ہوئے تھے وہ گروہ در گروہ آگے بڑھتے اور حملہ کرتے۔ ثابت بن قیس، وہی جو رسول اللہ کا خطیب تھا اور جسے قاری کہا جاتا تھا وہ انصار کا پرچم لیے آگے بڑھا اور شہید ہوا۔ عبداللہ بن حفص بن غانم کو وہ بھی قرآن کا قاری کہلاتا تھا وہ مہاجرین کا علمبردار ہوا اور لڑتا ہوا شہید ہوا۔ تب سالم نے پرچم اٹھا لیا، وہ قیدی تھا جس کو اسطخر سے لائے تھے۔ مدینہ میں ایک عورت (سہلہ، سلمیٰ یا عمرہ) نے اس کو خریدا اور بعد میں آزاد کر دیا تھا۔ سالم کی دانش اور اس کا ایمان ایسا تھا کہ مسلمان اس کو کاموں میں مقدم سمجھتے یہاں تک کہ نماز جماعت کی امامت اس کے ذمے تھی۔ ایک عرصے بعد حضرت عمرؓ نے کہا تھا کہ اگر سالم زندہ ہوتا تو میں اس کو خلیفہ بنا دیتا۔[۹] اس نے ابوحذیفہ قریشی کی ولاء قبول کی تھی، مگر جب خدا کا فرمان آیا کہ غلام کو اس کے باپ سے نسبت دی جائے تو زید جو رسول اللہ کا متبنّیٰ تھا اسے زید بن حارثہ کہا جانے لگا۔ مگر چونکہ سالم کے نسب کو لوگ نہیں جانتے تھے، اس لیے کہا کرتے کہ سالم نیکوں میں سے ہے یہی وجہ ہے کہ کتب رجال مثل اعلام زرکلی میں اس کا نام نہیں آیا۔ بہرحال وہ حاملِ قرآن تھا اور جب اس نے پرچم اٹھایا تو مسلمانوں میں شور اٹھا کہ کہیں یہ بھی پہلے علمبرداروں کی طرح قتل نہ ہو جائے۔ مگر سالم نے جواب دیا کہ میں کیسا برا حاملِ قرآن ہوں گا کہ اپنے پیشروؤں سے کمتر جدوجہد کروں۔[۱۰] جنگ نے شدت اختیار کی تو کہنے لگا "ہم پیغمبر کے زمانے میں اسی طرح جنگ کرتے تھے" یہ کہہ کر ایک گڑھا کھودا اس میں اپنے پیر جمائے اور مہاجرین کے پرچم کو بلند کیا لیکن وہ بھی سخت ترین جنگ کے بعد بہت بری طرح شہید کیا گیا۔[۱۱] زید بن خطاب نے بھی نعرہ لگایا "فتح یا موت" پھر سخت جنگ کرتا ہوا شہید ہوا۔[۱۲] جنگ شدت اختیار کرتی گئی اور کہتے ہیں کہ وہ ایک دن مسلمانوں کے لیے سالہا سال کے برابر تھا کہ ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔

---

[۷] جنگ بدر میں ۳۱۲ مسلمان ۹۵۰ مشرکین کے مقابل تھے۔ احد میں ۷۰۰ مسلمان ۳۰۰۰ کافروں کے مقابل اور جنگ خندق میں ۱۵۰۰ مسلمان دس ہزار دشمن کے سپاہیوں کے مد مقابل تھے۔

[۸] طبری ۱ : ۱۹۴۵؛ ابن اثیر ۲ : ۲۷۷۔

[۹] کتانی ۲ : ۳۲۶۔ نقل از استیعاب۔ ابن عبدالبر و تہذیب۔ نووی۔

[۱۰] ابن سعد ۳ : ۱/۶۱۔

[۱۱] ابن سعد ۳ : ۱/۲۷۴

[۱۲] ابن سعد ۳ : ۱/۶۱-۶۲، طبری ۱ : ۱۹۴۵۔ کہا گیا ہے کہ اس کے ہاتھوں اور پیروں کو بھی کاٹ دیا گیا۔ اصابہ ۳ : ۱۴ ، ۵۵

[۱۳] طبری ۱ : ۱۹۴۴ - ۱۹۴۷، ابن سعد ۳ : ۲۷۴ - ۲۷۵۔ کہتے ہیں اس کا قاتل ابومریم تھا جو اسلام لے آیا اور بعد میں حضرت عمرؓ نے اس کو عہدہ قضا دیا۔ انساب الاشراف۔ ابن حزم ۳۱۱۔

Presented by Ziaraat.Com

جنگ کا مسیلمہ مارا گیا اور مسلمان کامیاب ہو گئے مگر یہ کامیابی بہت مہنگی پڑی کہ مسلمانوں میں سے ۱۰۰۰ شہید ہوئے اور ان میں ۷۰۰ یا ۴۵۰ (یا کم از کم ۱۰۰ افراد) صحابہ اور حاملانِ قرآن تھے[13] اسی واقعے کے بعد حضرت ابوبکر نے خالد کو خط میں سرزنش کی کہ تم نے ۱۲۰۰ مسلمانوں کے خون سے شادی کی ہے[14] کہا جاتا ہے کہ صرف مدینہ کے ۳۶۰ افراد نیز ۳۰۰ تابعین اور مدینے سے باہر کے لوگوں میں سے ۱۳۰۰ افراد شہید ہوئے[15]

مصنفین اور دانشوروں میں یمامہ کے دن حفاظ میں شہید ہونے والوں کے بارے میں بہت بحث ہوئی ہے۔

ان میں سے کائتانی کہتا ہے[16] ان شہید ہونے والوں میں قرآن کے قاریوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں تھی اور ان میں بیشتر لوگ نومسلم تھے۔ اس نے شہدا کی جو فہرست لکھی ہے وہ ۱۰۵ ناموں پر مشتمل ہے۔ ان میں صرف دو نام (سالم اور عبداللہ بن حفص) ایسے ہیں جن کا قاری ہونا ظاہر ہے!

شوالی بھی اس بات کو متضاد عبارتوں کے ساتھ نقل کرتا ہے[17] جو اس کے بعد یورپ کی بیشتر کتابوں میں نقل ہوئی ہے۔

کائتانی نے جو فہرست مرتب کی ہے اوّل تو وہ مکمل نہیں اور آج اس فہرست کو کسی بھی تفصیل سے ترتیب دیا جا سکتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس قسم کے اعداد و شمار اور فہرستیں کبھی مکمل نہیں ہو سکتیں۔ اسی لیے کسی بھی مؤرخ نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس نے سارے شہیدوں کے نام شامل کیے ہیں۔ کسی نے مفصل فہرست بھی نہیں دی اور اختلاف بھی بہت ہیں۔ مثلاً اگر ہم ابن حزم کی "انساب الاشراف" سے یمامہ کے شہیدوں کے نام اخذ کر کے ان کا مقابلہ اس فہرست سے کریں جو بلاذری نے "فتوح البلدان" میں دی ہے تو معلوم ہوگا کہ ابن حزم نے ۲۰ آدمیوں کی ایک فہرست دی ہے، جب کہ بلاذری کی فہرست میں ۳۲ نام ہیں اور ان دونوں میں ۱۲ نام مشترک ہیں۔

ابن اثیر نے جو فہرست دی ہے وہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس نے جنگِ بدر کے شرکا میں سے ۱۵ اور جنگِ احد میں سے ۹ افراد کو اس روز کے شہیدوں میں شریک کیا ہے۔ یہ بات خود اس واقعے اور حادثے کی عظمت کی نشاندہی کرتی اور اس دعوے کو قطعی رد کرتی ہے کہ اس معرکے کے شہیدوں میں زیادہ تر نومسلم تھے۔ چنانچہ یہ فہرست کا تعلق ایک ماخذ سے ہے جو مؤرخ کے اختیار میں تھا وہ تمام کتب

---

۱۳ سنہ ۱۱ اور ۱۲ ہجری کے واقعات کی تاریخ کی کتابیں۔ بشمول طبری ۱: ۱۹۴۰، ۱۹۴۵، ابن اثیر ۲: ۲۴۶، بلاذری ۹۴-۱۰۰ (یا ۹۰ وغیرہ)، ابن قتیبہ ۱۳۹، ترجمہ یعقوبی ۲: ۷، تاریخ مختصر الدول ابن عبری ۹۳، ۹۵، شذرات الذہب ۱: ۲۳، تاریخ الخمیس ۲: ۱۵۷، البدء والتاریخ ۵: ۱۶۲، تاریخ الشعوب الاسلامیہ - بروکلمن ۱: ۱۰۰، ابن ہشام ۳: ۲۲۴، ۲۶۴، ۲۷۴، کنز العمال ۱۱ شمارہ ۷۰، ۴ طبع ۴ ۳۱۲، اسد الغابہ ۳: ۲۰۸، قسطلانی ۷: ۴۴۷، روض الانف ۲: ۳۴۰، البدایہ ۱: ۳۵، مجموعۃ الوثائق السیاسیہ ۹۱، ۱۲۷، نسب قریش ۳۲۱، زہر الآمل ۶: ۱۳۳، فضائل القرآن - ابن کثیر - ۱۵۔

۱۴ طبری - ۱: ۱۹۵۶۔

۱۵ طبری - ۱: ۱۹۵۱۔

۱۶

17. CACTANI, ANNALI DELL ISLAM; 11/1, P. 71? INFRA

۱۸ تاریخ قرآن - نولڈکے - ۲۰۱۲

Presented by Ziaraat.Com

جو موجود ہیں، اگر ان کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بہت سے نام ہی جو ہر فہرست میں نہیں ملتے چنانچہ جو بھی فہرست ہما اور وہ کتنی ہی کوشش سے تیار کی گئی ہو، اس کے کامل ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔

کاشانی نے جو یہ کہا کہ یمامہ کے دن شہید ہونے والوں میں قاریوں میں سے صرف یہ دو اشخاص تھے، مگر مختلف تاریخوں پر نگاہ ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ قاریوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی اور ان میں سے بعض یہ ہیں:

۱۔ ثابت بن قیس جو انصار کے خطیب تھے اور پھر خطیب نبوی بنے (مدینہ میں) کاتب وحی اور قاری قرآن تھے [illegible]

۲۔ ابو حذیفہ کے غلام (سالم بن معقل)، جو ابن حزم کے بقول افاضل صحابہ میں سے تھے [illegible]

۳۔ عبداللہ بن عبداللہ بن اُبی بن سلول جو فضلائے صحابہ میں تھے اور کاتبان وحی میں سے ایک تھے [illegible]

۴۔ فاطرہ بن سمرہ جو رسول اللہ کے صدقات پر مامور تھے [illegible]

۵۔ طفیل بن عمرو بن طریف بن العاص اشراف عرب میں سے ایک شاعر تھے جو قرآن سن کر ہجرت سے قبل اسلام لائے تھے [illegible]

۶۔ زید بن خطاب، حضرت عمر کے بڑے بھائی جو ان سے پہلے اسلام لائے تھے [illegible]

۷۔ سائب، زبیر بن عوام کے بھائی تھے [illegible]

۸۔ یزید، زید بن ثابت انصاری کے بھائی تھے [illegible]

یہ فہرست بہت طولانی ہو سکتی ہے، مگر ان چند حضرات ہی کو دیکھتے ہوئے یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ معرکہ یمامہ میں صرف دو قاری شہید ہوئے اور وہ بھی سالم اور عبداللہ بن حفص!

حضرت عمرؓ کی تجویز

کہتے ہیں کہ یہ حادثہ حضرت عمرؓ پر بہت بھاری تھا، ان کے اپنے بھائی کا مارا جانا اور بہت سے ایسے دینی بھائیوں کا شہید ہونا جو اپنے عقیدے اور ایمان میں پختہ اور محکم تھے، ان کے لیے پریشانی کا باعث ہوا، خصوصاً جب وہ قرآن کی ایک آیت تلاش کر رہے تھے تو کسی نے ان سے کہا کہ یہ آیت فلاں کے پاس تھی جو جنگ یمامہ میں شہید ہو گیا۔ تب ان کو سب سے زیادہ قرآن کا خیال آیا کہ

[illegible] انساب الاشراف۔ ابن حزم ۳۴۲ ۔

[illegible] ایضاً ۷۷، بلاذری ۱۰۰، معارف ۲۷۲ ۔

[illegible] ابن حزم ۳۵۵، بلاذری ۱۰۲ ۔

[illegible] ابن حزم ۲۰۸ ۔ [illegible] ایضاً ۳۸۲، بلاذری ۱۰۰ ۔

[illegible] ابن حزم ۱۵۱، نسب قریش ۳۴۸، بلاذری ۱۰۱ ۔

[illegible] معارف ۲۲۰، بلاذری ۱۰۰ ۔

[illegible] بلاذری ۱۰۲ ۔

Presented by Ziaraat.Com

اگر ایسی جنگیں جاری رہیں اور جذبۂ شہادت سے سرشار اصحابِ پیغمبر اسی طرح خود کے لیے اپنی جان دیتے رہے تو زیادہ مدت نہیں گذرے گی کہ قرآن کو نقصان پہنچنے کا امکان پیدا ہو جائے گا۔ یہی شاید اس بات کے کرنے کی ضرورت سے جاتی رہی ہے تاکہ لوگ قرآن کی آیات میں اختلاف اور انتشار پیدا ہو جائے۔

کہا جاتا ہے کہ اس واقعے نے حضرت عمرؓ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ حضرت ابوبکرؓ سے کہیں کہ قرآن کو جمع کیا جائے یا بہتر طور پر کہا جائے کہ مقامِ خلافت کے لیے اس کا ایک نسخہ تیار کیا جائے۔ اس واقعے کی اہمیت کے پیشِ نظر یہاں اس کی تفصیل بیان کی جائے گی۔

یہ داستان جانشین روایات کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے ظاہر ہے کہ ان ساتوں روایات کو دہرانا یہاں گفتگو کو بہت طولانی کر دے گا۔ اس لیے ان میں سے صرف دو تین روایات ذیل کی جاتی ہیں تاکہ کوئی واضح نتیجہ اخذ کیا جا سکے۔

بظاہر اس بارے میں سب سے معتبر اور باوثوق روایت بخاری نے نقل کی ہے جو وہ عبید بن السباق سے نقل کرتا ہے کہ خود زید بن ثابت (یعنی اس معاملے کا عامل اور نگران) اس طرح بیان کرتا ہے:

"اہلِ یمامہ کے قتلِ عام کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے مجھ کو بلا بھیجا، جب کہ حضرت عمرؓ بن خطاب بھی ان کے پاس موجود تھے۔ حضرت نے کہا: عمرؓ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ جنگِ یمامہ کے دن کا قتلِ عام قرآن کے قاریوں پر سخت گذرا تھا لہٰذا مجھے ڈر ہے کہ مختلف موقعوں پر ان قاریوں کا قتلِ عام بہت سی مشکلات پیدا کرے گا اور قرآن کا بہت سا حصہ باقی نہیں رہ پائے گا۔ بس میرا خیال ہے کہ قرآن کی جمع آوری کا حکم دیں۔ میں نے عمرؓ سے کہا: وہ کام کس طرح کرو گے جو رسول اللہ نے انجام نہیں دیا ہے۔ عمرؓ کہنے لگے: خدا کی قسم یہ کارِ خیر ہے۔ عمرؓ ہمیشہ مجھ سے رجوع کیا کرتے رہے یہاں تک کہ خداوند تعالیٰ نے میرا سینہ کھول دیا ہے اور اب میں اسی کام میں بھی ان کا ہم خیال ہوں۔

پھر حضرت ابوبکرؓ مجھ سے کہنے لگے تم نوجوان سمجھدار اور نیک شخص ہو نیز تم رسولِ اکرمؐ کے حکم سے وحی کی کتابت بھی کیا کرتے تھے ہاں، اب تم قرآن کو جمع بھی کرو۔

خدا کی قسم! اگر وہ مجھ (زید بن ثابت) پر یہ ذمہ داری ڈالتے کہ پہاڑ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ ہٹاؤں تو وہ آسان ہوتا بہ نسبت اس کے کہ مجھے قرآن جمع کرنے کا حکم دیا گیا۔

میں نے کہا: تم وہ کام کس طرح کرو گے جو پیغمبرؐ نے انجام نہیں دیا؟

حضرت ابوبکرؓ نے کہا: خدا کی قسم! یہ نیک کام ہے۔

چنانچہ حضرت ابوبکرؓ مجھ سے رجوع کرتے رہے یہاں تک کہ خداوند تعالیٰ نے میرا سینہ کھول دیا جس طرح اس نے اس کام کے لیے ابوبکرؓ اور عمرؓ کا سینہ کھولا تھا۔ چنانچہ میں مستعد ہوا اور قرآن کی تلاش میں نکلا پھر اس کو خرما کی شاخوں سے، سفید پتھروں اور لوگوں کے

ے بخاری، کتاب ۶۶ فضائل القرآن باب ۳، ایضاً کتاب ۹۳ احکام ۳۷، توحید ۲۲ ترمذی تفسیر سورۂ توبہ ۱۸، ابن سعد ۳، ۲/۲۰۱، احمد ۱۰، ۱/۱۳۹۱، طبع شاکر ۱۰/۱۸۱ حدیث ۷۶، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۳، ۲۷۳، مصاحف، بیہقی ۷، ۳ اتقان ۱/۳۲، طیالسی ج ۳، قرطبی ۱/۵۰، فضائل القرآن، ابن کثیر ۱۳-۲۵، فضائل القرآن ابو عبید [illegible]

سینوں سے جمع کیا۔ لیکن سورۂ توبہ کی آخری دو آیات کسی کے پاس نہ ملیں اور آخر کار یہ ابو خزیمہ انصاری سے حاصل کیں۔

لَقَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ سے آیت ۱۲۹ کے آخر تک۔

یہ مصحف حضرت ابوبکر کے پاس رہا یہاں تک کہ وہ دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان کے بعد عمر کی زندگی تک ان کے پاس رہا اور پھر ان کی بیٹی حفصہ کے پاس آ گیا۔

اس بات سے قطع نظر کہ یہ روایت معتبر ہے یا نہیں جیسا کہ اس کا مضمون واضح ہے کہ اس میں بہت سی تفصیلات بیان نہیں ہوئی ہیں۔ بعض نکات ان میں ایسے بھی ہیں جن پر بحث کی گنجائش ہے نیز اس سے متضاد روایات بھی موجود ہیں۔ مگر سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ اس روایت میں اس تجویز کی پہل حضرت عمر کی طرف سے ہوئی اور ان کے اصرار سے حضرت ابوبکر جو پہلے راضی نہیں تھے انہوں نے یہ کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ پھر وہ اپنے طور پر زید پر تصدیق کرتے رہے یہاں تک کہ ان کو بھی اس کام کے لیے راضی کر لیا۔

ایک روایت اس سے ذرا مختلف ہے جو طبری اپنی اسناد سے عمارہ بن زید بن ثابت کے قول سے نقل کرتا ہے[1] جہاں بیٹا اپنے باپ (زید) کا قول بیان کر رہا ہے۔

جب یمامہ میں اصحاب پیغمبر اکرم شہید ہوئے تو عمر بن خطاب حضرت ابوبکر کے پاس گئے اور کہا:

یمامہ میں رسول اللہ کے صحابہ نے جنگ کی آگ میں پروانہ وار کود کر اپنے کو قربان کر ڈالا مجھے ڈر ہے کہ وہ ہر جگہ ایسا ہی کریں گے اور قتل ہوتے رہیں گے۔ یہ حاملان قرآن ہیں۔ اور ایسا نہ ہو کر قرآن ناپید ہو جائے اور فراموش کر دیا جائے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہم اس کو جمع کر کے لکھ لیں۔ شروع میں یہ بات حضرت ابوبکر کو پسند نہ آئی اور انہوں نے کہا: کیا ہم ایسا کام کریں جو رسول خدا نے نہیں کیا تھا؟

اس سلسلے میں باہم گفتگو ہوئی اور پھر حضرت ابوبکر نے زید بن ثابت کو بلا بھیجا۔

زید نے کہا: میں ان کے پاس پہنچا اور حضرت عمر (ایک کونے میں) چادر لپیٹے بیٹھے تھے۔

حضرت ابوبکر نے کہا: بالیقین یہ شخص مجھے ایک کام کے لیے آمادہ کرنا چاہتا ہے جب کہ میں اس کام سے پرہیز کر رہا ہوں۔ تم کاتب وحی تھے اور اگر تم ان کے ہم خیال ہو تو میں تمہاری پیروی کروں گا۔ اگر تم میرا ساتھ دو گے تو پھر میں یہ کام نہیں کروں گا۔

زید نے کہا: تب حضرت ابوبکر نے مجھ سے حضرت عمر کی گفتگو دہرائی اور عمر خاموش بیٹھے رہے۔ میں نے اس کام کو پسند نہیں کیا اور کہا کہ ہم لوگ وہ کام کریں جو خود رسول اللہ نے نہیں کیا! حضرت عمر نے سختی سے کہا کہ اگر یہ کام کر لو گے تو اس میں نقصان کیا ہو گا؟

زید نے مزید کہا کہ میں نے کچھ دیر اس پر غور کیا اور پھر کہا: خدا کی قسم اس میں کوئی ایسی بات تو نہیں اور اس کام میں کوئی نقصان بھی نظر نہیں آتا۔

زید کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر نے مجھے حکم دیا اور میں نے اس کو چمڑے کے پارچوں، ہڈیوں اور خرما کی لکڑی پر لکھا...۔

اس روایت میں حضرت ابوبکر خود فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے اور اس کو ناپسند کر رہے تھے کہتے تھے کہ میں اس کام سے پرہیز کرتا

---

[1] تفسیر طبری ۱: ۲۰ طبع بولاق، حدیث ۵۹ و ۶۰، ایضاً فتح الباری [illegible]

رہوں۔ اگر تم میرے ہم خیال ہو تو یہ کام نہیں کروں گا اور اگر ان کا ساتھ دیتے ہو تو انجام دوں گا۔ یعنی فیصلہ زید کے ہاتھوں میں ہے اور تجربہ کار افراد، دنیائے اسلام کے دو بڑے حاکم، اس زمانے کے دو بڑے فاتحین ایک بڑے کام کا فیصلہ ایک نوجوان کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں جس کا واحد امتیاز یہ ہے کہ وہ رسول اللہ کے حکم سے وحی کی کتابت کرتا تھا۔

اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہاں بیٹا اپنے باپ کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ یہ روایت باپ کے رتبے کے بلند کرنے کا ذریعہ ہے۔ جو اکابرین ہیں وہ گوشوں میں بیٹھے ہیں اور بیٹا باپ کے قدموں میں تکریم و تعظیم کے پھول نچھاور کر رہا ہے۔

اکثر خارجہ بن زید سے ایک دوسری روایت بھی ہے جس میں (باپ کی) یہ عظمت اپنے اوج پر پہنچ جاتی ہے۔ پہلے یہ عرض کر دوں کہ خارجہ بن زید بن ثابت مدینے کے سات فقہا میں سے ایک تھا اور اس نے ۱۰۰ھ میں وفات پائی۔ وہ نقل کرتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے قرآن کو اوراق میں جمع کیا اور زید بن ثابت سے کہا کہ اس پر ایک نظر ڈال لے۔ مگر زید نے انکار کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس سلسلے میں حضرت عمرؓ سے مدد چاہی کہ وہ زید کو اس کام پر راضی کریں۔ یہ اوراق حضرت ابوبکرؓ کے پاس رہے یہاں تک کہ وہ فوت ہو گئے۔ ان کے بعد حضرت عمرؓ کے پاس رہے اور ان سے بی بی حفصہؓ کے پاس پہنچ گئے۔

گویا حضرت ابوبکرؓ نے خود قرآن کو اوراق میں جمع کیا۔ حضرت عمرؓ کا اس کام میں کوئی حصہ نہیں تھا اور وہ حضرت ابوبکرؓ اور زید کے درمیان محض ثالثی کا کام کر رہے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے بھی رسول اللہ کے وفادار صحابہ جن کے بارے میں پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ قرآن ان سے سیکھنا چاہیے یا وہ صحابہ جو آپؐ کے بعد قرآن کی جمع آوری میں سرگرم تھے۔ ان میں سے کسی کے ساتھ رابطہ نہیں کیا۔ بلکہ ہزاروں صحابہ میں سے صرف ایک نوجوان زید کو چاہا کہ قرآن کے اوراق پر ایک نگاہ ڈال لے۔ زید نے انکار کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے مجبور ہو کر اس سلسلے میں حضرت عمرؓ سے مدد مانگی۔ آخر کار حضرت عمرؓ کی وساطت سے یہ کام انجام پایا۔ غرض کہ زید کے علاوہ کوئی دوسرا آدمی اس اہم کام کو انجام دینے کے لیے دستیاب نہیں تھا اور تنہا یہی شخص تھا جو جامع اور حافظ قرآن تھا۔

یہ روایت بس اتنی ہی نہیں اور اس سے آگے بھی قدم رکھا گیا ہے۔ ابن شہاب زہری جو خارجہ بن زید کا ہم عصر ہے وہ نقل کرتا ہے کہ زید بن ثابتؓ تھا جو یمامہ کے واقعے کے بعد حضرت عمرؓ سے ملا اور کہنے لگا کہ یہ قرآن ہے اور اس میں ہمارے دین کے احکام جمع ہیں۔ اگر قرآن ہاتھ سے نکل گیا تو پھر دین بھی چلا جائے گا۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ قرآن کو ایک کتاب کی شکل میں جمع کر دوں۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ تم ابھی صبر کرو تاکہ ہم حضرت ابوبکرؓ سے پوچھ لیں۔ پھر دونوں ایک ساتھ حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئے اور یہ موضوع ان کے سامنے پیش کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا کہ جلدی مت کرو کہ میں پہلے مسلمانوں سے مشورہ کر لوں۔

چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے لوگوں کے سامنے خطبہ دیا اور ان سب کو مطلع کیا۔ لوگوں نے کہا کہ آپ ٹھیک کہتے ہیں (یا حق آپ کے ساتھ ہے)۔ اس طرح جمع قرآن کا آغاز ہوا اور حضرت ابوبکرؓ نے حکم دیا کہ ایک منادی لوگوں میں ندا کرے کہ جس کے پاس بھی قرآن میں سے کچھ ہو وہ لے کر آئے۔[۲]

---

[۱] البیان۔ آقائی خوئی۔ ۲۶۰۔ نقل از منتخب کنز العمال، الرشاد ۵۷، مصاحف ۹، اتقان ۱: ۲۰۷۔

[۲] البیان۔ خوئی۔ ۲۶۲۔ نقل از منتخب کنز العمال۔

Presented by Ziaraat.Com

۔۔۔ اب تک کی روایت میں گویا زید کی پہلی شکل اور پیش کش کی طرف سے پہلی اعلان دونوں خلفاء کے بعد حضرت عثمان نے دوبارہ اس کی منظوری حاصل کر لی ہے۔

جس روایت پر بھی نگاہ کی جائے اس میں افراد کو چھپانے کی کوشش واضح اور نمایاں ہے یہاں تک کہ زید کو خلفاء سے بھی کچھ بڑھ کر دکھایا گیا ہے۔ حضرت عمرؓ بن خطاب کی مدد اور ان کی طرف سے تجویز بعض روایات میں دکھائی نہیں دیتی بلکہ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کو تعاون کی دعوت بھی زید ہی نے دی تھی۔

ابن ابی داؤد کی کتاب "المصاحف" سے ابو شامہ نقل کرتا ہے: زید نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا: اے خلیفۂ رسولؐ اگر میں اور عمرؓ ساتھ ہوں تو بہتر ہو گا۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا۔ انہوں نے قبول کیا اور یہ کام ہم لوگوں کے ذمے لگ گیا۔ ہم دونوں وہاں سے نکلے اور مسجد میں جنازہ رکھنے کی جگہ کے پاس بیٹھ گئے۔ تب لوگ اپنے اپنے قرآن لاتے گئے کہ بعض نے صحیفوں میں اور بعض نے خرما کی شاخوں پر لکھا ہوا تھا حتیٰ کہ ہم لوگ ان سے مطمئن ہو گئے[56]

چنانچہ ان دونوں آدمیوں میں تعاون زید کی تجویز پر ہوا تھا۔ ہاں ایک دوسری روایت بھی ہے جس میں حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ سے کہتے ہیں: "تم اور عمرؓ زید کی مدد کرو"[57] اس سے پتہ چلا کہ اپنا اپنا اور زمانی کام بھی پروپیگنڈے اور روایتی نمود و نمائش کے لیے کسی نہ کسی حد تک استعمال ہوتا رہا۔ جب زید اپنے اس کام کی مشکلات اور دشواریوں کا ذکر کرتا ہے تو خود اس کے پاس اوراق میں جو اصلی اور اساسی منبع موجود ہے اس کو اہمیت نہیں دیتا بلکہ دوسروں کے ہاں قرآن کے اوراق کی تلاش و تجسس کا زیادہ ذکر کرتا ہے۔ حالانکہ جو کچھ خود اس کے پاس (ایک جہت کا تب وحی کے۔ مترجم) تھا وہ دین کی سب سے اہم دستاویز تھی اور کمال اتقان والا کام میں سند تھی۔ پھر اس سے بڑھ کر قابل اطمینان اور کیا چیز ہو سکتی تھی؟

زید کے کام کی قدر و قیمت اپنی جگہ مگر جو اوراق اور نوشتے خود اس کے پاس تھے ان کو کوئی خاص اہمیت نہ دینا تعجب خیز ہے وہ سب پیغمبر اکرمؐ کے سامنے اور آپ کی مکمل نگرانی میں لکھا اور ترتیب دیا گیا تھا۔ وہ یادگار ہوتی تھی اور زید کا سارا کام اسی پر مبنی تھا۔ چنانچہ زید کا یہ کام اتنا بڑا اور اہم نہیں تھا کہ اس نے خرما کی شاخوں اور ہڈیوں کے ٹکڑوں پر لکھی ہوئی آیات کو جمع کیا تھا۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ اس زمانے میں مکہ اور مدینہ میں کاغذ تھا اور پیغمبرؐ کے بہت سے خطوط یہاں تک کہ اگر بیابان میں سفر کے دوران بھی لکھے جاتے تو دباغت شدہ چمڑے کے ٹکڑے اس کام کے لیے تیار ہوتے تھے۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ جو کچھ بھی لوگوں نے لکھ رکھا تھا وہ اس قسم کی چیزوں پر تھا جن کا زید ذکر کر رہا ہے؟ کیا یہ لکھی ہوئی چیزیں وہ تو نہیں تھیں جو رسول اللہ کے گھر میں تھیں اور زید نے ان سے اپنے مجموعے جمع کیے؟ اگر ایسا ہے تو اس بارے میں خاموشی کیوں ہے؟

مگر ان پہلے کی دو روایات میں اصلی نکتہ حضرت ابوبکرؓ کا انکار کرنا اور ان کی بے دلی ہے۔ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ رسول اللہ کے زمانے

---

۵۶ ابو شامہ ۶۲ و ۶۳۔

۵۷ ابو شامہ ۶۳۔

۵۸ مقدمتان ۲۷۴۔

Presented by Ziaraat.Com

میں قرآن بار بار دہرایا گیا، مرتب کیا گیا، حفظ کیا گیا اور لکھا گیا۔ ساری آیات اور بہت سی سورتیں الگ الگ تختیوں کی شکل میں۔ چنانچہ قرآن کا لکھنا اور جمع کرنا کوئی نیا کام نہیں تھا کہ وہ بدعت ہو جاتا۔ اب ان ساری باتوں کی توجیہ کیا معنی رکھتی ہے؟ قرآن کے مختلف لکھے ہوئے نسخے موجود تھے اور ان نسخوں کی موجودگی، آنحضرتؐ کا اصلی نسخہ اور قاریانِ جامع سبب اس بات کی ضمانت تھے کہ قرآن میں خلل واقع نہ ہو سکے گا اور نہ وہ بھلا دیا یا فراموش ہو سکے گا۔ پھر اب کیا ضرورت پیش آئی تھی کہ یہ کام انجام دیا جائے۔

حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ اور زید کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس سے ہم کو جو حاصل ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے بار بار حضرت ابوبکرؓ سے رجوع کیا تاکہ ان کو راضی کیا جا سکے اور حضرت ابوبکرؓ نے بھی زید سے بار بار اصرار کیا کہ وہ قبول کر لے۔ ان کے سارے دلائل بس یہ ہیں کہ یہ کارِ خیر ہے اور اس کے کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر یمامہ کے واقعے سے قاریوں کے ختم ہو جانے اور قرائت کے ہاتھوں سے نکل جانے کا خوف پیدا ہو گیا تھا تو (قرآن کی جمع آوری کا) یہ کام قطعی واجب اور لازم تھا نہ کہ صرف ایک کارِ خیر اور بے ضرر کام تھا۔ اگلے باب میں اس پر مزید گفتگو ہوگی۔

بہرحال ان کمزوریوں کے علاوہ ان روایات کے مثبت پہلو بھی ہیں کہ حقیقت کو بیان کرتی ہیں۔ ان روایات سے قرآن کی حفاظت میں صحابہ اور معاشرۂ اسلامی کا اہتمام اور کاوشیں نگاہ میں آتی ہیں۔ کلام خدا سے ان کی دلی وابستگی کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

زید کام شروع کرتا ہے

قرآن چونکہ قریش کی لغت میں نازل ہوا تھا، حضرت ابوبکرؓ نے فصحائے قریش میں سے ایک شخص کو زید کے ساتھ کر دیا اور حکم دیا کہ اگر کوئی مشکل درپیش ہو تو مجھ سے رجوع کرنا۔ زید نے کام شروع کیا۔ اس نے بڑا سخت طریقہ منتخب کیا، وہ پختہ اور دشوار تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ قرآن جس طرح نبیؐ کی زبانِ مبارک سے ادا ہوا تھا بالکل اسی کو حفظ و ضبط کرے۔ چنانچہ جو اس نے خود حفظ کیا تھا یا لکھا تھا یا سنا تھا اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اتباع اور جستجو سے آغاز کیا اور اس عظیم کام میں سب ہی سے تعاون چاہا۔ حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ نے لوگوں میں منادی کرا دی اور ان کو قرآن کی جمع آوری کی طرف بلایا[1]

انہوں نے اس کام کے لیے دو محکم منبع منتخب کیے:

اول جو کچھ رسول اللہ کے سامنے لکھا گیا تھا، خواہ وہ رسول اللہ کے پاس تھا یا دوسروں نے پیغمبر گرامی کے سامنے اپنے لیے لکھا تھا۔

دوسرے جو لوگوں کے سینے میں محفوظ تھا۔ وہ اس کام میں اس پر سختی سے کاربند تھا کہ جب تک دو شاہد عادل گواہی نہ دیتے کہ یہ آنحضرتؐ کے سامنے لکھا گیا تھا اس کو قبول نہیں کرتا۔

کئی روایات اس بات کی گواہ ہیں:

---

[1] المرشد الوجیز۔ ۶۳ ۔

Presented by Ziaraat.Com

ابن ابی داؤد نے المصاحف میں یحییٰ بن عبدالرحمٰن بن حاطب سے نقل کیا ہے کہ وہ کہتا ہے، حضرت عمرؓ نے اعلان کیا کہ جس شخص نے قرآن کا کچھ حصہ براہِ راست رسول اللہؐ سے حاصل کیا ہو وہ پیش کرے لا کے۔ پھر انہیں کاغذ کے ٹکڑوں، تختیوں اور کھجور کی شاخوں پر لکھے اور کسی سے کوئی چیز قبول نہیں کی جاتی تھی جب تک دو گواہ اس کی گواہی نہ دیتے۔[۵۲]

زید خود بھی کاتبِ وحی تھا اور خود پیغمبرؐ نے اس کو وحی املا فرمائی تھی۔ بیان ہوا کہ ان میں سے ایک مقامات کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ مسلسل قرآن کے آخری حصے کے نازل ہونے کے شاہد تھے۔[۵۳] انہوں نے سارے قرآن کو حفظ کیا ہوا تھا اور نسخ کی کیفیت کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود حضرت ابوبکرؓ کے حکم سے لکھے ہوئے کے بعد ایک کاتب قرآن کا تلاش کرنا ضروری تھا۔

یہی ابن ابی داؤد ہشام بن عروہ (ابن زبیر) سے اس کے باپ کا قول نقل کرتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے عمرؓ اور زید کو حکم دیا کہ مسجد کے دروازے پر بیٹھیں اور کسی سے بھی قرآن میں سے کوئی چیز اس وقت تک قبول نہ کریں جب تک دو مرد اس پر گواہی نہ دیں۔ اس کے بعد اسے لکھ لیں۔[۵۴]

اگرچہ یہ روایت منقطع ہے مگر اس کے رجال ثقہ ہیں۔ ابن حجر کہتا ہے: دو گواہوں سے مراد حفظ اور کتابت ہے۔[۵۵] سیوطی نے یہاں گواہی کے معنی حفظ کرنے اور کتابت کے مطلب لیے ہیں، تاکہ قرآن کے قبول کرنے کا مسئلہ ایک عمدہ حل ہو جائے اور اس کا تواتر محفوظ رہے۔ مگر اس کی عمومیت نہیں دی جا سکتی یعنی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے ساری آیات کو قبول کرنے میں اس نقطۂ نگاہ کو ملحوظ رکھا ہے۔ اس صورت میں ممکن ہے کسی آیت کا تواتر تو مسلّم ہو مگر لکھا ہوا موجود نہ ہو تو اس کو قبول نہ کیا جائے، لہٰذا عقل، تاریخ اور مسلمانوں کا اجماع اس نظریے کے خلاف ہے۔[۵۶]

سخاوی (م ۶۴۳ھ) جمال القراء میں کہتا ہے: اس سے مراد یہ تھی کہ وہ شہادت دیں کہ وہ نوشتہ رسول اللہؐ کے سامنے لکھا گیا یا نازل شدہ آیات میں سے ہے۔ مگر ابو شامہ کہتا ہے: ان کی غرض یہ تھی کہ لکھا جائے تو اس کے ذریعے جو نبیؐ کے سامنے لکھا گیا تھا، صرف حفظ کے ذریعے نہیں اور اسی لیے زید نے کہا کہ سورۂ توبہ کی آخری دو آیتیں سوائے ابو خزیمہ کے کہیں نہیں ملیں۔ یعنی وہ دوسروں کے پاس لکھی ہوئی نہیں ملیں اور بغیر لکھے ہوئے کے صرف حفظ کے ذریعے ان کو قبول نہیں کیا۔[۵۷]

---

۵۲ مصاحف ۳۱؛ اتقان ۱ : ۲۰۷ نوع ۱۸؛ موطا ۔ مالک ۔

۵۳ بخاری جلد ۶، فضائل القرآن ۴؛ نسائی جلد ۴؛ ابن سعد ۴ : ۱۵۴/۲؛ احمد ۱ : ۳۸۹ ۔

۵۴ اتقان ۱ : ۷۷؛ نوع ۱۶؛ ابن مسعود کو بھی کہا گیا ہے (ابن سعد ۲ : ۳۴۲)؛ ابی بن کعب کو تمام بھی کہا گیا ہے (... ۹۳) ۔

۵۵ بیان ۲۴۰/۵ ۔ نقل از منتخب کنز العمال یا کنز العمال جلد دوم جمع قرآن، طبع دوم؛ مصاحف سجستانی ۱۰؛ ابو شامہ ۵۵ ۔

۵۶ فتح الباری ۹ : ۱۲؛ اتقان ۱ : ۲۰۵ نوع ۱۸ ۔

۵۷ بیان ۲۷۵ ۔

۵۸ اتقان ۱ : ۲۰۶ نوع ۱۸؛ المرشد الوجیز ۵۷ ۔

Presented by Ziaraat.Com